پاکستان
عسکری ریاست

ابتدا، ارتقا اور نتائج

(1947-2011)

ڈاکٹر اشتیاق احمد

ترجمہ: ایم وسیم

مشعل

پاکستان۔ عسکری ریاست

ابتدا، ارتقا اور نتائج

(1947-2011)

ڈاکٹر اشتیاق احمد

ترجمہ: ایم وسیم

مشعل بکس

آر۔بی5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان۔

پاکستان۔ عسکری ریاست

ابتدا، ارتقا اور نتائج

(1947-2011)

ڈاکٹر اشتیاق احمد

ترجمہ: ایم وسیم

ناشر: مشعل بکس

آر۔بی۔5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

پرنٹرز: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

قیمت: -/990 روپے

فہرست

باب صفحہ

ابتدائیہ

دسمبر 2008ء میں میری راولپنڈی میں آرمی چیف ہاؤس میں جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ملاقات ہوئی۔اس ملاقات کا اہتمام ہمارے مشترکہ دوست کرنل (ر) اسلم چیمہ نے کیا تھا۔ جنرل مشرف کچھ ہی عرصہ قبل صدر پاکستان کے منصب سے الگ ہوئے تھے۔ہماری ملاقات ایک گھنٹے تک خوشگوار ماحول میں جاری رہی۔ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ جب تک پاکستان کی فوج مضبوط ہے پاکستان کی بقا اور سالمیت برقرار ہے- میرے ذہن میں یہ سوال گونجا کہ یہ نظریہ ذہن نشین رکھیں تو 1971 میں سابق مشرقی پاکستان میں کیا ہوا تھا جب وہاں تلخ اور خونی خانہ جنگی چھڑ گئی تھی- غالباً مشرف مغربی حصے میں بچے کھچے پاکستان کے بارے میں سوچتے تھے جہاں فوج ہی ہمیشہ طاقت کا حقیقی سرچشمہ رہی ہے-

البتہ یہ بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی کہ مضبوط فوج کا لازمی مطلب ریاست یا معاشرے میں ملٹرائزیشن کا کلچر ہونا ہوسکتا ہے-لیکن یہاں بالکل ایسا ہی ہوا- کم از کم 1980ء کی دہائی سے بنیاد پرست سیاسی اسلام پاکستان کی اندرونی اور بیرونی سیاست کی صف اول میں موجود رہا ہے- پاکستان آنے والا کوئی بھی غیر ملکی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام پسند بیانیہ نے معاشرے کو انتہائی متاثر کیا اور تشدد نواز سوچ کو جنم دیا ہے- آج کے پاکستان میں دہشت گردی بہت نمایاں اور زندگی کو مسلسل اجیرن بنائے ہوئے ہے- سرکاری عمارت اور دفاتر پر مسلح محافظوں کی تعیناتی کے مناظر عام ہیں- البتہ اس عمل سے یہ مراد نہیں کہ حکومتی دفاتر بند کر دیئے گئے ہیں - مارچ 2011ء کے اوائل میں، میں نے کراچی، لاہور اور اسلام آباد کا دورہ کیا تو مجھے بڑے ہوٹلوں،

پرائیویٹ فرموں اور دفاتر کے باہر خودکار ہتھیاروں سے لیس گارڈ ہر طرف تعینات نظر آئے۔ایسی ہی صورتحال نئی دہلی میں دیکھی جاسکتی ہے لیکن وہاں سکیورٹی انتظامات کم سطح کے ہیں اور ملٹرائزیشن کے کلچر کی حکومتی سرپرستی نظر نہیں آتی۔

پاکستان میں پاکستان کو ''اسلام کا قلعہ'' قرار دینے کے نعرے کو قومی شناخت کے طور پر پروان چڑھایا جاتا رہا۔ آخر کیوں؟۔ یہ سوال اسی صورت میں سازش سے بھرپور اور الجھا دینے والا لگتا ہے جب پاکستانی مردم شماری کے اعداد و شمار ملاحظہ کئے جائیں۔ان اعداد و شمار میں کم از کم 1971ء سے یہ کہا جارہا ہے کہ مسلمان 96 فیصد کی انتہائی بالادست اکثریت میں ہیں۔اگر مسلم قوم پرستی اور اسلامی امہ کی نظریاتی اساس کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایسی مرتکز اکثریت والے علاقے میں یقینی ثقافتی اور مذہبی ہم آہنگی، سماجی امن اور یکجہتی ہونی چاہیئے۔لیکن ایسا یہاں نہیں ہے۔تو پھر پاکستان کو کس قسم کا وجودی خطرہ لاحق ہے۔

اپنے اردگرد پاکستان کے خلاف نفرت آمیز عزائم کے حامل ممکنہ امیدواروں کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی شخص مخصوص اور انجانی جارحیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔مثال کے طور پر پاکستان میں کمیونسٹوں کی کوئی شورش برپا نہیں۔اس کے برعکس بھارت میں نکسل باڑیوں کی مسلح تحریک موجود ہے۔اسی طرح سپین کی ایٹا (ETA) اور آئرش ری پبلکن آرمی جیسی بھی کوئی مسلح تحریکیں پاکستان میں نہیں جو کچھ عرصہ قبل تک بالترتیب سپین اور برطانیہ میں کسی بھی جگہ پر حملے کرسکتی تھیں، بلوچستان میں اگرچہ خونیں شورش جاری ہے لیکن بلوچ چھاپہ ماروں نے اپنی کارروائیاں صرف اپنے صوبے تک محدود کر رکھی ہیں۔البتہ نفسیاتی۔نظریاتی اصطلاح میں پاکستانی قوم کے ذہن میں اکیسویں صدی کے شروع سے ہی پراپیگنڈا مسلط کیا جارہا ہے کہ ہنود، یہود اور نصرانیوں کی گہری سازش کا وجود پایا جاتا ہے۔لب لباب یہ ہے کہ یہ منطق بگھاری جاتی ہے کہ چونکہ پاکستان دنیائے اسلام کا واحد ایٹمی طاقت کا حامل ملک ہے اس لئے وہ ایسی تمام قوتوں کی ہٹ لسٹ پر ہے جو مسلمانوں کو اپنا مطیع اور غلام بنانے کی درپے ہیں اور یوں دنیا کے کونے کونے سے اسلام کی سربلندی کو مٹانا چاہتی ہیں۔یہ نظریہ ہر اس شخص کو لبھاتا ہے جو دارالاسلام اور دارالحرب کے اندرونی تصادم پر یقین رکھتا ہے۔

ممکن ہے کہ پاکستان کے خلاف سازشوں کا وجود ہو لیکن یہ من گھڑت قیافہ بھی ہوسکتا ہے۔البتہ جو بات ناقابل تردید ہے وہ اگر کلی طور پر نہیں تو کافی حد تک یہ ہے کہ پاکستان میں تشدد

اور دہشت گردی کی خونریزی ملکی ساختہ ہے۔ملکی ساختہ دہشت گردی مختلف گروہوں اور دھڑوں پر مشتمل ہے جن کے اقلیتوں،خواتین کے خلاف اور فرقہ وارانہ اور نیم فرقہ وارانہ ایجنڈے ہیں۔ دسمبر 2003ء میں جنرل پرویز مشرف پر قاتلانہ حملوں کے بعد سے حکومتی تنصیبات،عمارات بشمول مسلح افواج کے مراکز ملکی ساختہ دہشتگردی کا نشانہ ہیں۔ان دہشت گرد تنظیموں کا موقف ہے کہ دہشتگردی کے خلاف سابق امریکی صدر بش کی نام نہاد جنگ میں شریک ہوکر پاکستانی حکمرانوں نے عالمگیر جہاد کے ساتھ غداری کی ہے۔

سکیورٹی اور عسکری فورسز کے اندر ریٹائر یا حاضر سروس خودسر عناصر کی مدد اور معاونت کے بغیر ملکی ساختہ دہشتگردی کیلئے پورے معاشرے کو نشانہ بنانا ممکن نہیں۔لہذا پاکستان کے خلاف حقیقی یا تصوراتی سازش کا خاتمہ کرنے کیلئے ضروری ہوگا کہ ملکی ساختہ دہشت گردی کے مراکز اور نیٹ ورکس کو جڑ سے اکھاڑ کر تباہ کردیا جائے۔

ایسا ممکن ہے کہ اگر پاکستان اپنی سرزمین پر دہشت گردی سے نمٹتا ہے اور خطے یا بین الاقوامی سطح پر ذمہ دارانہ رویے کا اظہار کرنا سیکھ لیتا ہے تو ممتاز عالمی طاقتوں کو پاکستان کے خلاف رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔بہر حال پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے اور بین الاقوامی قانون اور ضابطوں کی آڑ میں اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے کا سوچنا آسان کام نہیں۔دوسری طرف ایک ریاست کی طرف سے بین الاقوامی ضابطوں کی مستقل خلاف ورزی اس کے خلاف ان طاقتوں کی یقینی سازشوں کا دروازہ کھول دے گی جو اس کو اپنے لئے خطرہ سمجھتی ہیں۔لازمی طور پر یہ بات اتنی سادہ نہیں لیکن عموماً بین الاقوامی منظرنامے میں ریاستیں ایسا ہی برتاؤ کرتی ہیں۔ریاستوں کے عالمی نظام میں چند ہی ملک ایسے ہوں گے جو مستقل دوست یا مستقل دشمن ہوتے ہیں۔

ماضی میں پاکستان کی جیوسٹریٹجک محل وقوع کو پاکستانی مقتدر اشرافیہ اور بڑی طاقتوں اور سپر پاورز کی طرف سے عسکری اور سکیورٹی کے حوالے سے کم ہی پذیرائی ملی ہے۔اس کتاب میں عسکری اور سکیورٹی پہلو پر طویل بحث کی گئی ہے۔البتہ کوئی بھی اپنی توجہ زیادہ پرکشش انجام کی طرف مبذول کراسکتا ہے۔21 ویں صدی کو ایشیاء کی صدی قرار دیا جارہا ہے۔درحقیقت 1960ء کی دہائی سے ہی ایشیائی صدی کی وضع قطع بننا شروع ہوگئی تھی اور ستم ظریفی یہ ہے کہ فائدہ اٹھانے والے اولین ملکوں میں پاکستان شامل ہے۔1960ء کے عشرے کے پہلے نصف میں پاکستان کی

معیشت نے اتنی ترقی کی کہ جنوب مشرقی ایشیا کے کئی ممالک بھی اس کے معترف ہو گئے اور انہوں نے پاکستان کی صنعتی منصوبہ بندی کا مطالعہ کیا اور بعدازاں خود بڑی معاشی طاقت بن گیا۔

البتہ اس امر کا آغاز مشرقی ایشیا بعید سے ہوا۔ جاپان جو دوسری جنگ عظیم کے دوران تباہ و برباد ہو گیا اس نے اپنی ہی راکھ سے انگڑائی لی اور 1960ء کی دہائی میں صنعتی اور معاشی ترقی کا سرخیل بن کر سامنے آیا۔ 1970ء کے عشرے سے آگے تک ایشیا کے کئی ملکوں نے ارتقائی منازل طے کیں اور ''ایشین ٹائیگر'' بن کر ابھرے۔ اس عمل کی تقلید چین نے 1980ء کے عشرے سے کی اور اب دنیا کی دوسری بڑی طاقت بن چکا ہے۔ بھارت 1990ء کی دہائی میں اس دوڑ میں شامل ہوا اور اس وقت سے متاثر کن کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایشیا میں معاشی نمو اور ترقی کی تحریک مغرب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اب اس سے مستفید ہونے کی باری پاکستان کی ہے۔

پاکستان کا آئیڈیل جغرافیائی محل وقوع اسے دستیاب موجودہ مواقع سے فائدہ اٹھانے کا اہل بناتا ہے۔ قوموں کو تاریخ کے ان مواقع یا پھر تاریخی لمحوں سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ اب یہ لمحہ پاکستان کا ہے۔

حال ہی میں پاکستان اور چین کے درمیان 46 ارب ڈالر کی اقتصادی راہداری کا معاہدہ طے پایا ہے جس کے تحت روایتی اٹاری، واہگہ سرحد کے بجائے مغرب کی طرف پاکستان معاشی نمو اور توسیع کا عمل وقوع پذیر ہوگا۔ چینی قیادت کی طرف سے پاکستان کو نہایت واضح الفاظ میں پیغام دیا گیا ہے کہ اتنی بڑی سرمایہ کاری صرف ایسی صورت میں عملی جامہ پہن سکتی ہے اگر پاکستان دہشت گرد تنظیموں کا مکمل قلع قمع کرے اور سرمایہ کاری کے لئے موزوں ماحول پیدا کرے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ بھارت کو اس منصوبے میں ہونے سے نہیں روکا جائے گا، لہذا بھارت سے تعلقات معمول پر لانے کی سفارش کی گئی ہے اس کے علاوہ پاکستان کے مغربی اور وسطی ایشیا کے ساتھ ثقافتی اور مذہبی روابط ایک گرانقدر اثاثہ ثابت ہو سکتے ہیں بالخصوص تیزی سے ابھرتی وسط ایشیائی ریاستوں کے حوالے سے جہاں صورتحال منفرد نوعیت کی ہے۔ پاکستان کے پروفیشنلز، نیم کاریگر یا غیر ہنرمند ورکر وسطی ایشیا کی کئی مارکیٹوں کیلئے دلچسپی کے حامل ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ماننے والی ہے کہ فی الوقت افغانستان میں صورتحال خراب ہے جبکہ خلیج فارس میں حالات پرامن بنانے میں ایران اور سعودی عرب رکاوٹ ہیں لیکن ضروری نہیں کہ یہی صورتحال وسطی ایشیا میں بھی

ہو۔ چنانچہ پاکستان کو مثالی یا خوش کن حالات کیلئے کچھ توقف کرنا پڑے گا۔ روشن خیال عملیت کیلئے وہ نظریاتی سیاست میں سے انتخاب کرسکتا ہے۔ اس تبدیلی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے پاکستان کو اپنے اندر بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کتاب میں پریشان کن پہلوؤں کی نشاندہی اور تاریخی پس منظر میں ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب میں دسمبر 2011 ءتک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جہاں تک اخبارات سے لئے گئے حوالوں کا تعلق ہے تو ایک بات ذہن نشیں رہے کہ میں نے صرف آن لائن ایڈیشنوں سے استفادہ کیا ہے کیونکہ ان تک آرکائیوز کے توسط سے باآسانی رسائی ممکن ہے۔

اشتیاق احمد

سولینتونہ (گریٹر سٹاک ہوم)

24 فروری 2012ء

باب 1

اسلام کا قلعہ: عسکری ریاست کا استعارہ

اس تحقیقی کتاب میں ایک معمہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے: 1947ء میں آزادی کے وقت پاکستانی فوج کے پاس اسلحے کی کمی تھی اور ریاست کے مؤثر عضو کے طور پر کام کرنے کے لئے اسے انفراسٹرکچر اور ٹریننگ کی ضرورت تھی۔ وہ سیاست میں براہ راست ملوث نہیں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ فوج نہ صرف ایٹمی صلاحیت کی حامل درمیانی سطح کی قوت بن گئی بلکہ یہ ملک کا ایسا طاقتور ادارہ بھی بن گیا جس کے پاس سیاست کے معاملات میں ''ویٹو'' پاور بھی آ گئی۔ ایسا 'کیسے' اور 'کیوں' ہوا اور اس کے نتائج 'کیا' ہوئے؟۔ اس کا کھوج پاکستان کو لاحق حقیقی اور تصوراتی خطرات اور بین الاقوامی سیاست کی نوعیت کے ملغوبے میں ملتا ہے۔ جس کے تحت پاکستان کے فوجی اور سول دونوں قسم کے حکمرانوں نے پاکستان کو فرنٹ لائن ریاست کے طور پر پیش کر کے امریکی حکومت کو اس کے حریف روس کے مقابلے میں ایکسپلائٹ کیا۔ اس کا مقصد بھارت کے مقابلے میں اسلحے اور وسائل کے حصول کی امید تھی۔ اندرونی طور پر دیکھا جائے تو نااہل بیوروکریسی اور بعدازاں فوج ریاست کے استحکام کی علامت کے طور پر آ گے آئی۔ اس کے علاوہ قومی شناخت میں ابہام نے پاکستان کو ایک ایسی شناخت کی تلاش کیلئے تحریک دی جو اسلامی بھی ہو اور جمہوری بھی۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ کوشش زیادہ نظریاتی خدوخال اور بنیاد پرستانہ مضمرات کی حامل بنتی چلی گئی۔ ایسے خارجی اور داخلی عوامل نے پاکستان کے اسلام کے قلعے کے طور پر استعارے کو جنم دیا۔

میں نے پہلی بار ''اسلام کا قلعہ'' کا نعرہ 2001ء کے آخر یا 2002ء کے شروع میں سنا جب

بین الاقوامی سرحد اور لائن آف کنٹرول پر پاکستان اور بھارت کے تقریباً 10 لاکھ فوجی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ غیر معمولی عسکری اجتماع اس لئے ہوا کیونکہ کچھ عسکریت پسندوں جن کا تعلق مبینہ طور پر پاکستان سے تھا نے بھارتی پارلیمنٹ ہاؤس پر اجلاس کے دوران حملے کی کوشش کی تھی۔ حملہ آور پارلیمنٹ میں گھسنے میں تو کامیاب نہ ہو سکے تاہم 6 پولیس اہلکار اور 5 حملہ آور فائرنگ کے تبادلے میں مارے گئے۔ بھارتی حکومت اس کارروائی پر سخت اشتعال میں آ گئی اور بھارتی میڈیا اور سیاسی جماعتوں نے اس جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے اور انتقام لینے کا مطالبہ کیا۔ جنوبی ایشیا کی دونوں طاقتوں کے درمیان ایک اور جنگ ناگزیر نظر آ رہی تھی۔ دونوں ایٹمی طاقتوں کے درمیان مکمل جنگ چھڑ جاتی تو برصغیر کے یہ دونوں حصے ہزاروں برس کے لئے ویرانے میں تبدیل ہو جاتے۔ امریکی صدر بل کلنٹن نے یہ خطرہ فوراً بھانپ لیا کہ اگر جنگ ہوئی تو بھارت پاکستان کی 17 کروڑ آبادی میں سے 12 کروڑ افراد آناً فاناً صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا لیکن اس سے پہلے خود اس کی 50 کروڑ آبادی نیست و نابود ہو جاتی۔

پورے فوجی یونیفام میں اور سینے پر فوجی تمغے سجائے جنرل پرویز مشرف نے سرکاری ٹی وی پر پاکستانی قوم سے خطاب کیا۔ انہوں نے عوام کو یقین دلایا کہ مسلح افواج بھارت کی طرف سے کسی بھی قسم کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے یہ اصطلاح بھی استعمال کی کہ ''پاکستان اسلام کا قلعہ'' ہے۔ مجھے یہ جان کر دھچکہ لگا کیونکہ پرویز مشرف عموماً اسلام پسندوں کی ایسی اصطلاح سے دور رہتے تھے۔ لیکن اس تقریر میں انہوں نے وہی مخصوص لہجہ اختیار کیا جو اسلام پسند اور انتہائی اسلام پسند عناصر طویل عرصے سے اختیار کرتے آئے ہیں: وہ یہ کہ پاکستان ایک بالاتر عسکری روایت (تاریخی اور معاصر دونوں حوالے سے) کا حامل خطہ ہے۔ اگر چہ جہاں تک مؤخر الذکر دعوے کا تعلق ہے تو وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان مسلح تصادم کی تاریخ سے شاید ہی کوئی میل کھاتا ہو۔ اگر جنگ چھڑ جاتی تو یہ 1947ء کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان پانچواں تصادم ہوتا۔ انگریزوں سے آزادی کے بعد شروع سے ہی پاکستان سکیورٹی کی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ بھارت کو تاریخی اعتبار سے امن کا دشمن گردانا گیا۔ دوسری طرف افغانستان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ بھی بھارت جیسا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اگر وہاں بھی کوئی جارحیت پسند قوتیں برسر اقتدار آ گئیں جو پاکستان افغان سرحد کے تعین پر نظر ثانی کا

مطالبہ کر سکتی ہیں۔ درحقیقت ایک مضبوط قلعہ -- چھاؤنی بنانے کیلئے خطرے سے دوچار ہونے کے احساس کو تقویت دینا نہایت ضروری تھا۔ اس تناظر میں پاکستان اسٹیبلشمنٹ نے سکیورٹی اور دفاع کے پہلوؤں کو نمایاں کر کے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی۔

اب ''اسلام کا قلعہ'' کا استعارہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کثیر پہلوی مفہوم کا حامل ہے۔ غالب امکان ہے کہ مشرف نے اس کا استعمال قلعے کی تشکیل کے لئے فوج کے بنیادی کردار کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا ہو۔ ایک قلعے میں نہ صرف فوجی موجود ہوتے ہیں بلکہ وہ سویلین لوگ بھی ہوتے ہیں جو مختلف امور انجام دیتے ہیں اور یوں ایک قابل رہن سہن کمیونٹی تشکیل پاتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی گیریژن کمیونٹی یا عسکری معاشرہ ہوتا ہے جو مسلح اور چوکس ہوتا ہے اور اپنے دفاع، آزادی کے تحفظ اور دشمن کی جارحیت پسپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک گیریژن یا چھاؤنی کسی ریاست، مملکت یا سلطنت کی بیرونی چوکی ہوتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو مختلف ریاستوں نے اپنی سرحدوں کے ساتھ چھاؤنی نما شہر آباد کئے تھے۔ دراصل یہ ریاستیں خود بھی عملاً گیریژن ریاست تھیں۔ (یونگ 2005ء) حالیہ سرد جنگ کے دوران گیریژن ریاستیں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان بین الاقوامی مقابلے کے حصے کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔

پاکستان نے دونوں متحارب سپر پاورز امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان عسکری سرد جنگ سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے امریکہ کے ساتھ فوجی روابط کو ترجیح دی۔ امریکہ کی مدد کرنے کے کام کا آغاز پاکستان کی فوج اور سویلین دونوں قسم کی اشرافیہ نے کیا۔ شروع میں امریکہ کو اس طرف زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیونکہ اس کی توجہ کا مرکز مغربی یورپ تھا اور امریکہ وہاں اتحاد کی تشکیل میں مصروف تھا۔ اس کا نتیجہ نیٹو جیسی تنظیم کے قیام کی شکل میں سامنے آیا۔ البتہ پاکستان کی انتھک لابنگ کے باعث آخر کار امریکہ پاکستان کو اپنی بین الاقوامی سٹریٹجی میں شامل کرنے میں قائل ہو گیا تا کہ سوویت کمیونزم کے آگے بند باندھا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو کی طرف سے غیر جانبدار رہنے کے فیصلے نے (گنگولی: 2010ء) امریکہ کے ساتھ کمیونزم کے خلاف کام کرنے کے پاکستان کے مقدمے کو استحکام بخشا۔ اس کا آغاز 1951ء میں اسلحے کی پہلی کھیپ کی آمد سے ہوا اور اس کے بعد 1954ء اور 1959ء میں عسکری اتحاد کے معاہدے کئے گئے۔

1960ء کے عشرے میں یہ فوجی اتحاد دونوں فریقوں میں پائی جانے والی بدگمانی کے باعث کم وبیش معطل ہوکر رہ گیا۔

چنانچہ پاکستان نے چین کے ساتھ سٹرٹیجک روابط استوار کرنے کی کوششیں شروع کردیں جس کے پہلے ہی بھارت کے ساتھ تعلقات خراب تھے۔اس کے بعد پاکستان نے انواع واقسام کے بیرونی انحصار کے اقدامات کئے۔اب کی باری سعودی عرب تھا۔ پاکستان کے تینوں مہربان انتہائی مختلف نظریات کے حامل تھے، امریکہ سرمایہ دارانہ لبرل دنیا کا سرخیل تھا۔چین کمیونسٹ تحریک کے اندر سوویت یونین کا بڑا مقابل تھا جبکہ سعودی عرب اسلامی بنیاد پرستی کا قائد تھا۔ 1978ء میں افغانستان میں کمیونسٹ اقتدار، ایران میں شیعہ آیت اللہ صاحبان کے انقلاب اور افغانستان میں ریڈ آرمی کی آمد نے پاک امریکہ اتحاد میں نئی روح پھونک دی لیکن اس بار اتحاد میں سعودی عرب کی انتہائی مؤثر بلکہ چین کی نسبتاً کم نظر آنے والی شراکت داری بھی شامل کر لی گئی۔ جہاں اس اتحاد میں امریکہ اور چین اس لئے شامل تھے کہ منہ زور روسی سیلاب کے آگے بند باندھا جاسکے وہاں سعودی عرب کو شریک کرنے کا مقصد ایران ہزار یہ Millenariam اسلام کا پھیلاؤ روکنا تھا۔ان تینوں ''مہربانوں'' کو اپنے مقاصد کے پاکستان کے ذریعے حصول کا اندازہ تھا۔اس عمل نے وہ صورتحال پیدا کردی جسے پاکستان میں مقتدر اشرافیہ نے اپنے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی: اسے اس مقصد میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی اس کا اندازہ آنے والے صفحات میں لگایا جائے گا۔

یہاں محض اتنا کہنا کافی ہے کہ کم ازکم 1980ء کی دہائی سے آگے تک سخت گیر پاکستانی فوجی افسروں نے پاکستان کے ایک ایسے تصور کی پرورش شروع کردی جو علاقائی حدود سے متجاوز ریاست کے طور پر تھا۔انتہا پسند اسلام پسندوں کے ساتھ ان ''عقابوں'' نے پاکستان کا تصور ایک عظیم، وسیع اور علاقائی طاقت کے طور پر پیش کیا جس کی حدود مغربی اور وسطی ایشیا سے آگے تک ہوں گی جبکہ کشمیر کو بھارت کے قبضے سے چھڑایا جائے گا۔اس خواہش کی اس سے بڑھ کر یہ منظر کشی کی گئی کہ پاکستان اسلامی دنیا میں خلافت بحال کرنے کیلئے جہاد کا نقطہ آغاز ہوگا۔اس خلافت کا خاتمہ 1924ء میں ترک اصلاح پسند مصطفیٰ کمال اتاترک کے ہاتھوں ہوا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پان اسلام کے یہ عزائم ایک ایسی دنیا میں پروان چڑھے جس میں فوجی توسیع پسندی کے

ذریعے سلطنت بنانے کی مزید کوئی گنجائش نہیں رہی۔

چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے ورلڈ آرڈر جو تمام ریاستوں کی قانونی سطح پر برابری پر مبنی تھا سے پان اسلام ازم مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ سرحدی ابہام ختم کر کے اس کی جگہ سرحدوں کی واضح حد بندی کا نظام رائج کیا گیا۔ البتہ بین الاقوامی نظام میں ریاستوں کے اندر طاقت اور حاکمیت سے مماثل چین آف کمانڈ کی کمی تھی۔ اس کی بجائے بین الاقوامی نظام عالمگیر اور علاقائی طاقت میں بے ربط پہلوؤں کا حامل تھا۔ 2 سپر پاورز۔ امریکہ اور روس۔ ان کے علاوہ کئی بڑی، درمیانی، چھوٹی ریاستیں اور ''کمزور مملکتیں'' جوڑ توڑ اور ری ایڈجسٹمنٹ کے امکان پیش کرتی تھیں۔ ایسا بین الاقوامی نظام طوائف الملو کی پر مبنی تھا جو مستحکم ورلڈ آرڈر کے امکانات سے میل نہیں کھاتا تھا۔

افغان جہاد کے تناظر میں پوری دنیا میں اسلام پسندوں کے احیائے نو نے پاکستان کو جنوبی، وسطی اور مغربی ایشیا کے بعض حصوں میں سپر اسلامی ریاست کے قیام اور خلافت کی بحالی کے تصور میں ایک اہم کردار کا حامل بنا دیا، چنانچہ اسلام کے قلعے کے بارے میں استعارے کی ایک ممکنہ تعبیر یہ ہو سکتی تھی کہ یہ قوتیں یقینی بنائیں کہ پاکستان نہ صرف ایک خود مختار ریاست ہو، عسکری لحاظ سے طاقتور اور چوکس بھی ہو اور اس کے علاوہ ایسا چیمپئن ہو جو مسلم اُمہ کو درپیش کسی بھی چیلنج کا آگے بڑھ کر سامنا کر سکے۔ لہٰذا چاہے یہ مشرف کی طرف سے نعرہ تھا یا وسیع تر اسلام پسند اور الٹرا نیشنلسٹ لابیوں کی مہم کا حصہ تھا یا پھر کسی لحاظ سے علاقائی اور مقامی سطح پر پاکستان کو اس کا کردار دینے کی کوشش تھی۔ سیاسی حوالے سے یہ تصور ''اسلام کا قلعہ'' کی گہری نظریاتی تعبیر تھی۔

وقت کے ساتھ یہ رجحان تقویت پکڑتا گیا اور ایک طرح سے عارضے کی شکل اختیار کر لی۔ چند قسم کے استثنیٰ کے سوا پاکستانی ٹی وی ٹاک شوز میں دن میں کئی بار ''قلعے'' کے تصوراتی خاکے پیش کئے جانے لگے۔ دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں، ان کے رہنماؤں اور صحافیوں نے ان تصورات کو خوب پھیلایا۔ پاکستان کی درسی کتب ان مسلمانوں کی فتوحات کی کہانیوں سے بھر دی گئیں جنہوں نے ماضی میں ہندوؤں کو شکست دی تھی۔ اسی طرح 1947ء کے بعد بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی فرضی جنگی کامیابیوں پر جشن منایا جاتا رہا۔ اس تمام مشق کا بنیادی مقصد طاقتور فوج کی موجودگی پر زور دینا تھا۔ ایسے عسکری تصور سے وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان کی شناخت بین الاقوامی دہشت گردی کے مرکز کے طور پر ابھری، ایک خود سر ریاست یا اس جیسے کئی دیگر ہیجان انگیز

القابات اسے ملے۔ عسکری عظمت کے یہ تمام تصورات اس وقت پیش کئے گئے جبکہ پاکستان بدستور ایک غیر ترقی یافتہ اور غریب ملک رہا۔ کہیں بھی معاشی تبدیلی کے ذریعے اسے ایسی صنعتی یا فوجی طاقت میں تبدیل نہیں کیا گیا جو علاقائی یا عالمگیر جہاد کے تقاضے پورے کر سکے۔ محض ماضی کی عظمت کے امتحانوں کو استعمال کیا گیا۔

پاکستانی تجزیہ نگار

عائشہ جلال (1990ء) حسن عسکری رضوی (2000، 2003)، حسین حقانی (2005ء)، حسن عباس (2005ء)، احمد رشید (2009ء)، زاہد حسین (2009ء) اور شجاع نواز (2008ء) نے پاکستان میں فوج کے بطور طاقتور ترین ادارہ اُبھرنے کے موضوع پر پُرمغز تصانیف لکھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل طاقت بری فوج کی ہی ہے جو تعداد میں بہت بڑی ہے جبکہ ائیر فورس اور نیوی بہت چھوٹی تعداد میں ہیں۔ ایسی عساکر پسند پالیسی Militarism کا مطلب ایک غریب اور ترقی پذیر ملک میں وسائل کا بڑا حصہ فوجی ضروریات پر خرچ کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے 12-2011ء کے سالانہ وفاقی بجٹ میں فوجی بجٹ میں 12 فیصد اضافہ کیا گیا۔ راجہ محمد خان کا مؤقف ہے کہ بظاہر عسکری اخراجات میں اضافہ ہوا ہے لیکن عملاً 11-2010ء کے جی ڈی پی کے 2.6 فیصد کے مقابلے میں اخراجات کم ہو کر 2.4 فیصد ہوئے ہیں۔ پاکستان کی بقاء کو بھارت کی طرف سے لاحق خطرات -- بھارت کا فوجی بجٹ 34 ارب ڈالر ہے جبکہ پاکستان کے فوجی اخراجات 5.57 ارب ڈالر ہیں-- کے باوجود پاکستانی معیشت اسلحے کی دوڑ کی متحمل نہیں ہو سکتی چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان زبردست ڈیٹرنس (ایٹمی اسلحہ اور میزائل ٹیکنالوجی کو ترجیح دے (خان: 2011)۔ احمد فاروقی (2003) نے بھی اسی نہج پر فوج کو استوار کرنے کی بات کی ہے۔ البتہ وہ بہتر تربیت یافتہ اور بہتر طور پر مسلح لیکن چھوٹی فوج کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سویڈن کے سٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے مارچ 2011ء میں بھارت کو بین الاقوامی منڈی میں اسلحے کا سب سے بڑا درآمد کنندہ قرار دیا ہے۔ (ایس آئی پی آر آئی، 14 مارچ 2011ء)۔ پاکستان کے نقطہء نظر سے اس بات کا مطلب بھارت سے لاحق خطرات میں زبردست اضافہ ہے۔ اس لئے سکیورٹی اور اس کے نتیجے میں عسکری

اخراجات میں اضافے پر زور دینا لازمی امر ہے۔ البتہ عسکری اخراجات میں اضافے کو تعلیم اور صحت کے بجٹ سے منسلک کرنے کی ضرورت ہے۔ 2009ء میں پاکستان نے دفاع پر کل بجٹ کا 23.1 فیصد جبکہ صحت پر صرف 1.3 فیصد اور تعلیم پر 7.8 فیصد خرچ کیا۔ اس کے مقابلے میں بھارت نے کل بجٹ کا دفاع پر 18.6، صحت پر 3.4 اور تعلیم پر 12.7 فیصد خرچ کیا۔ انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں دفاع اور سماجی بہبود کے شعبوں پر اخراجات میں توازن رکھا جاتا ہے۔ کچھ ترقی پذیر ملک بھی ایسا کرنے لگے ہیں۔ (ویژول اکنامکس 2010)۔ البتہ پاکستان اور بھارت کے معاملے میں ایسا نظر نہیں آتا۔ اگرچہ بھارت کے پاس عسکری اخراجات پورے کرنے کے لئے کہیں بڑی معاشی اساس موجود ہے۔ دونوں ریاستیں اپنے شہریوں کے بنیادی، سماجی اور معاشی حقوق سے پہلو تہی کرنے کی مرتکب ٹھہری ہیں۔ جہاں بھارتی معیشت گزشتہ کئی برسوں سے متاثر کن ترقی کر رہی ہے وہاں پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا۔ لاہور میں قائم انسٹی ٹیوٹ آف پبلک پالیسی کی تیسری سالانہ رپورٹ (یکم جون 2010ء) میں کہا گیا کہ پاکستان کی معیشت کی صورتحال انتہائی خوفناک ہے۔ سب سے زیادہ تشویشناک حالت بجلی، گیس اور پانی جیسی خدمات کی فراہمی کی ہے جس میں تقریباً ناکامی کا سامنا ہے۔ (صفحہ 3)۔ مقتدر اشرافیہ یا تو ٹیکس دیتی ہی نہیں یا بہت کم دیتی ہے۔ بالخصوص طاقتور جاگیردار تمام قسم کی آسائشیں اور رعایت سے لطف اندوز ہونے کے باوجود ٹیکس نہیں دیتے۔ (ایضاً)۔ یہ صرف شہروں کی مڈل اور لوئر مڈل کلاس ہے جس کے پاس شدید گرمی میں بجلی کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والی تکلیف کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ بار بار لوڈ شیڈنگ سے صنعتی پہیہ جام رہتا ہے۔ یوں انتہا کی غربت، جہالت اور بیماریاں آبادی کی اکثریت کا مقدر بن کر رہ گئی ہیں۔

مظہر عزیز (2008ء) نے فوج کی بالادستی کی وضاحت کیلئے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے وہ ادارہ جاتی تھیوری اور اس سے منسلک طفیلی رستے پر مشتمل ہے۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر سول ادارے نظام حکومت پر سختی سے کاربند نہیں رہیں گے تو فوج اور سول بیوروکریسی کی نمائندگی کرنے والے ریاستی عناصر سیاسی نظام پر غلبہ پالیں گے۔ ایسی بالادستی کا مطلب ہے کہ فوج حکومت کے سول امور میں بھی مداخلت کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں سول ادارے اپنی اتھارٹی کھو دیتے اور کارکردگی دکھانے میں ناکام رہتے ہیں۔ جب ایک بار ایسا ہوتا تو ایک قسم کا طریقہ کار بن جاتا ہے

جس پر بعدازاں نظام حکومت کو عمل کرنا پڑتا ہے۔

عائشہ صدیقہ نے فوج کے غلبے کی وضاحت کرنے کے لئے ایک سیاسی معاشی اساس پیش کی ہے۔ انہوں نے حمزہ علوی کی مابعد نوآبادیاتی ریاست کے نقطہ نظر سے اخذ کردہ ایک فریم ورک تیار کیا ہے۔ جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ فوج کے نام نہاد مالی مفادات کی سیاسی معیشت کا درحققت مطلب یہ ہے کہ سینئر فوجی افسر زراعتی اراضی، رئیل اسٹیٹ، بزنس اور صنعتی کاروبار کی ملکیت کے ذریعے مالیاتی وسائل پر بڑے پیمانے پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں۔ معیشت پر اس قسم کے کنٹرول کا مطلب ہے کہ جب بھی فوج اقتدار میں نہیں بھی ہوتی تو اعلیٰ افسروں پر مشتمل طبقہ پاکستانی سیاست پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یوں اعلیٰ فوجی افسروں کے مفادات ادارہ جاتی مفادات بن جاتے ہیں اور یوں ملک کے مفادات کا روپ دھار لیتے ہیں۔ عائشہ صدیقہ کا اندازہ ہے کہ جنرلوں کے قانونی اثاثہ جات کی مالیت 150 سے 400 ملین روپے کے لگ بھگ ہے۔ بالواسطہ معاشی قوت اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ جنرلوں کے رئیل اسٹیٹ کے کاروبار کے فروغ میں متحرک کردار نے انہیں پاکستان کا ایک نیا جاگیردار طبقہ بنادیا ہے۔ (2007ء: صفحہ 174-205)۔

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ریاستی خدوخال

اپنے مضمون ''نوآبادیاتی نظام کے بعد کے معاشروں کی صورتحال: پاکستان اور بنگلہ دیش'' (1972) میں حمزہ علوی نے نیو مارکسسٹ مکتبہ فکر کی سیاسی معیشت، جس میں امریکی محور کے گرد گھومنے والے عالمگیر سرمایہ دارانہ ڈھانچے کا سراغ لگایا گیا ہے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ترقی پذیر معیشتوں کو بیرونی کنارہ قرار دیا گیا ہے، میں انہوں نے مختلف طبقات اور نوآبادیاتی نظام کے بعد کی ریاست کے درمیان طاقت کے حیرت انگیز توازن کا انکشاف کیا ہے۔ ریاست کی مارکس نے جو کلاسک تعریف کی ہے وہ اس اندازے پر مبنی ہے کہ ریاست محض مقتدر طبقے کے ہاتھوں استحصال کرنے کا آلہ ہے۔ البتہ کسی بحران کے دوران ریاست مختلف طبقات میں متعلقہ خودمختاری حاصل کرسکتی ہے اور ان کے مفادات کے لئے ثالثی کرسکتی ہے۔ اس کے برعکس حمزہ علوی نے قرار دیا کہ نوآبادیاتی نظام کے بعد کی ریاستوں جیسا کہ پاکستان میں اضافی خودمختاری

مستقل نوعیت کی رہی۔ چنانچہ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان نوآبادیاتی دور کے ریاست اور معاشرے کے درمیان عدم توازن کا تسلسل ہے۔ جبکہ اول الذکر یعنی ریاست مؤخرالذکر معاشرے کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ جماعت جس نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا اور پھر اس مطالبے میں کامیابی حاصل کی وہ ''ون مین شو'' تھی۔ یعنی بانی پاکستان محمد علی جناح کو سپریم اختیارات حاصل تھے۔ ان کی رحلت کے بعد مسلم لیگ دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور سویلین بالادستی قائم نہ کر سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز دور کے قائم کردہ ادارے سول سروس اور فوج وہ ادارے بن گئے جنہوں نے ایک اشرافیہ بنا کر سیاسی اور اقتصادی دونوں قسم کے شعبوں پر بالادستی حاصل کر لی۔ حمزہ علوی نے اس کے ڈھانچہ جاتی فریم ورک کے باعث قرار دیا ہے کہ اشرافیہ کا یہ غلبہ ابتدا ہی سے کافی زوردار تھا لیکن اس کے ثبوت میں انہوں نے کوئی ٹھوس شواہد پیش نہیں کئے۔ بہرحال علوی سمجھتے ہیں کہ اس اشرافیہ نے میٹروپولیٹن نئی قسم کی نوآبادیاتی بورژوائی (مغربی سرمایہ دارانہ نظام کا محور امریکہ تھا) اور دو مقامی استحصالی طبقوں یعنی پاکستانی بورژوا اور جاگیردار طبقے کے مقابلے میں زیادہ خودمختاری کا لطف اٹھایا۔ ایسی خودمختاری نے اشرافیہ کو اپنے مفادات جواب متنازعہ نہیں بلکہ اعزازی بن چکے تھے کیلئے مصالحت کے قابل بنایا دیا۔ ان تینوں طبقوں نے مل کر محنت کشوں اور پاکستانی کسانوں کی اضافی پیداوار کا استحصال کیا۔ مزید یہ کہ پاکستان کے دونوں مقامی طبقے یعنی جاگیردار اور بورژوا طبقہ ''ترقی پذیر'' تھے۔ تجزیہ کرتے ہوئے حمزہ علوی نے مغرب کے بورژوائی طبقے جس نے جمہوریت کی جدوجہد کی قیادت کی کا موازنہ نوآبادیاتی نظام کے بعد پاکستان جیسے ملک کے بورژوائی طبقے سے کیا جہاں ریاست کو پھلنے پھولنے کیلئے جمہوریت کو پابند کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک زمیندار طبقے کا معاملہ ہے تو دنیا میں کہیں بھی اس طبقے کے جمہوریت کے فروغ کیلئے کردار کا ریکارڈ موجود نہیں۔ اس لئے حمزہ علوی لازماً جمہوریت کے تناظر میں صرف پاکستانی بورژوا طبقے کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ اپنی تصنیف میں آگے چل کر مصنف نے دائیں بازو کے قدامت پسند جنرلوں، انتہا پسند بائیں بازو اور دائیں بازو اور سخت گیر عناصر کے درمیان مفید فرق بیان کیا ہے۔ فوج کے ان تمام طبقوں کا تعلق معاشرے کے مختلف حلقوں اور مکتبہ فکر سے ہوتا ہے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ بنیاد پرست زیادہ تر دائیں بازو کی سوچ کے حامل طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سخت گیر (Hawks) ان عناصر سے منسلک ہوتے ہیں جو فوج

کے مفادات کی حفاظت کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں (ایضاً۔صفحہ 67,69)۔اگر چہ حمزہ علوی نے صرف اشارہ کیا ہے لیکن انہوں نے نوآبادیاتی نظام کے بعد کی اشرافیہ کی متعلقہ خودمختاری کے سرد جنگ کے دوران سیاسی مضمرات اور پیچیدگیوں کی تفصیل کھل کر بیان نہیں کی۔اس کے علاوہ اسی عرصے کے دوران سرد جنگ کی اہمیت نے بھی حمزہ کی زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔علاوہ ازیں طفیلیت کا جو نقطہءنظر حمزہ علوی بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ مرکز کی طرف سے بیرون کے استحصال کا مستقل نوعیت کا ڈھانچہ ہے۔

چنانچہ ایسے نقطہءنظر نے سرد جنگ کے دوران نظریاتی اور عسکری مسابقت کو نہ صرف دھندلا دیا بلکہ اس کی قدر و قیمت بھی کم کر دی۔بالکل اسی طرح اس نقطہءنظر میں بین الاقوامی تعلقات کی طوائف الملوک نوعیت پر بھی روشنی نہیں ڈالی گئی۔اس کی اہمیت نہ صرف سامراجیت کو طول دینے میں ہے بلکہ سرد جنگ کیلئے بھی اس کی اہمیت جیوسٹریٹجک ہے۔اس کے علاوہ نوآبادیاتی نظام سے نجات حاصل کرنے والے ملک کے طور پر پاکستان کا جنوبی ایشیا میں محل وقوع امریکہ سے بہت فاصلے پر ہے۔جس کی وجہ سے اسے کافی خودمختاری حاصل ہوئی۔اس کی بہ نسبت لاطینی امریکہ کے ممالک جو امریکہ کے ہمسائے میں واقع ہیں کو اتنی آزادی حاصل نہیں۔سرد جنگ کی مجموعی حرکیات Dynamics اور بین الاقوامی نظام میں تغیر و تبدل کے تناظر میں کسی پر انحصار کے تنوع کا لازم و ملزوم امکان اور اتحاد سازی اپنا وجود رکھتے ہیں۔اس صورتحال سے پاکستان نے کافی فائدہ اٹھایا اگر چہ جوڑ توڑ کی ایسی گنجائش میں آزادی کے بعد امریکہ اور دیگر طاقتوں پر انحصار کم نہیں ہوا۔

نظریاتی فریم ورک کی طرف پیش رفت

سیموئیل ایڈورڈ کی مشہور کتاب ''دی مین آن ہارس بیک: ملٹری ان پالیٹکس'' جو دراصل 1962ء میں شائع ہوئی اور 1976ء میں نظرثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا میں اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ فوجی بغاوتیں زیادہ تر ان ملکوں میں ہوتی ہیں جہاں نہ لبرل جمہوریت ہے نہ کمیونزم بلکہ یہ صرف شخصی آمریت اور اشرافیہ کے کنٹرول کے حامل ممالک ہیں۔ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک اس تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ایسے ملکوں میں فوج اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے کیونکہ وہاں وہ عددی اور اسلحے کے لحاظ سے کافی مضبوط ہوتی ہے۔فوج جمہوری آزادی تو

نہیں البتہ استحکام اور سکیورٹی ضرور یقینی بنا سکتی ہے۔ ایڈورڈ سیموئیل فائنر کے مطابق فوجی آمریت کو اس وقت تقویت ملتی ہے جب جمہوریت کی بجائے شخصی آمریت اور اشرافیہ کا اقتدار ہو۔ یہ بات کافی حد تک درست ہے کیونکہ پاکستان ایک جدید جمہوریت کے فروغ میں ناکام رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشتگردی نے پاکستان کے ایک جدید مسلم ریاست بننے کے امکانات معدوم کر دیئے ہیں۔

ان تمام نتائج و عواقب کا 1960ء کی دہائی کی مغرب کی ترقی کی تھیوری میں کم ترین اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس کے برعکس ایسے ممالک جن میں مضبوط مڈل کلاس کی کمی ہوتی ہے وہاں فوج کو ایک جدید فورس سمجھا جاتا ہے۔ سیموئیل ہننگٹن جو اس نظریے کے با اثر حامی ہیں نے کہا ہے کہ غریب اور وسائل کی کمی والے معاشروں میں مڈل کلاس اور ہنر مند طبقے کی کمزوری سے یونیفارم میں ملبوس افراد ملک کی معاشی اور سماجی ترقی کے ایجنٹ بن سکتے ہیں۔ (ہنگٹن 1962ء صفحہ 32 سے 35)۔ البتہ انہوں نے ایک کاٹ دار آبزرویشن یہ دی ہے کہ "سیاست میں فوج کی طویل شراکت کا لازمی مطلب یہ ہے کہ فوج سیاست کی کمزوریوں، تقسیم اور تناؤ کی عکاس کرتی ہے"۔ (ایضاً، 36)۔ ہننگٹن نے کبھی فوج کی طاقت اور وقار کی گہری، نظریاتی اور ثقافتی جڑوں پر روشنی نہیں ڈالی۔ دوسری طرف ایڈورڈ فائنر نے اشرافیہ اور فوج کے درمیان جو ربط ظاہر کیا ہے اس سے پاکستانی اشرافیہ کے گہرے نظریاتی، ثقافتی، ڈھانچہ جاتی اور تاریخی عوامل کا سراغ لگانے کے راستے کھل جاتے ہیں۔

نیشنل سکیورٹی سٹیٹ

نیشنل سکیورٹی سٹیٹ ڈاکٹرن امریکی صدر ہیری ٹرومین کے دور میں یو ایس نیشنل سکیورٹی ایکٹ 1947ء کے تحت وجود میں آئی۔ اس کا مقصد پوری دنیا میں کمیونزم اور سوویت اثر و نفوذ کا خاتمہ کرنا تھا۔ جیک نیلسن پالمیئر نے نیشنل سکیورٹی سٹیٹ کے سات خواص کا سراغ لگایا ہے کیونکہ امریکہ کے تعاون سے اس کا پوری دنیا میں اطلاق کیا گیا۔

1: فوج سب سے بڑی اتھارٹی ہے کیونکہ یہ قومی مفادات کی محافظ ہونے کی دعویدار ہے اور یہ سیاسی، معاشی اور عسکری امور پر اثر انداز ہوتی ہے۔

2: ایک نیشنل سکیورٹی سٹیٹ جمہوریت کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ٹوٹی پھوٹی جمہوریت رسماً قائم ہو تو بھی اصل اختیارات فوج کے ہی پاس ہوتے ہیں۔

3: فوج بہت زیادہ سیاسی اور معاشی اختیارات کا استعمال کرتی ہے۔

4: ایسی ریاست دشمنوں، اندرونی اور بیرونی دونوں، میں گھری ہوتی ہے۔

5: دشمنوں کو مفاد پرست اور بے رحم قرار دیا جاتا ہے۔ اس لئے انہیں کچلنے کیلئے ہر قسم کے اقدامات کو جائز سمجھا جاتا ہے۔

6: نیشنل سکیورٹی سٹیٹ خفیہ طریقے یا خوف کے ذریعے عوام مباحثوں یا ان کی قومی امور میں شرکت کو محدود کر دیتی ہے۔

7: ایسی ریاست چرچ (مذہبی اداروں) سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنے مالیاتی، نظریاتی اور مذہبی وسائل سکیورٹی سٹیٹ کی حمایت کیلئے استعمال کریں۔ (نیلسن پالمیئر، 1993)۔ نیلسن پالمیئر کہتے ہیں کہ امریکہ نے 1991ء میں عراق پر اس لئے حملہ کیا تاکہ صدام حسین کو کویت پر چڑھائی اور عالمی امن تہہ و بالا کرنے کی پاداش میں سزا دی جا سکے لیکن اس کے ساتھ وہ خود بھی وسطی امریکہ میں سازشی جنگی کارروائیوں میں ملوث رہا۔ جس کے باعث خطے کی معیشتوں کی کمر ٹوٹ گئی اور وسیع پیمانے پر غربت اور مصائب پھیل گئے۔ حتیٰ کہ خود ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پہلے کی نسبت دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے غربت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

عسکری ریاست کا تصور

ایسا لگتا ہے کہ نیلسن پالمیئر پہلے سے موجود گیریژن سٹیٹ کے اہم تصور سے آگاہ نہیں جو ہیرلڈ لاس ویل نے 1930ء کے عشرے کے آخر میں پیش کیا، جس پر انہوں نے خود ہی جرمن نازیوں کی ابھرتی لہر کے تناظر میں نظر ثانی بھی کی۔ گیریژن سٹیٹ کے تصور کا فائدہ یہ ہے کہ لاس ویل نے تشدد کی ماہر۔ یعنی فوج۔ کے سماجی اور ثقافتی خواص کو مفصل طریقے سے بیان کیا ہے جو معاشرے پر حاوی طبقہ ہے۔ اس تصور سے مذہبی ثقافتی روایات کے کردار کی تحقیق کا بھی موقع پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میکس ویبر کی کاٹ دار آبزرویشن یاد کرنا بھی اہمیت کی حامل ہے کہ جنگجو طبقے نے اسلام کے بہت شروع میں مسلم معاشروں پر بالادستی حاصل کر لی تھی چنانچہ رسول اکرمؐ کی

طرف سے تاجروں کی اہمیت کا نظام گہنا گیا اور پس منظر میں چلایا گیا۔ (ویبر:1993)۔ اس کے علاوہ گیریژن سٹیٹ کا تصور قبل از نو آبادیاتی نظام اور بعد از نو آبادیاتی نظام سے متصل مقامی جڑوں کی حامل پاکستانی گیریژن سٹیٹ سے جڑا ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر پاکستان میں فوج کی بالادستی کو محض سرد جنگ کا شاخسانہ نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ یہ دراصل تاریخی اور معاصر اندرونی اور خارجی عوام کا ارتقا اور مذہبی ثقافتی اور سماجی پہلوؤں کا حامل ہے۔

قبل از نو آبادیاتی نظام عسکری شہر

قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں جبکہ ریاستیں باقاعدہ حد بندی کے تحت قائم نہیں تھیں تو بڑی سلطنتوں اور بادشاہتوں نے عسکری شہر یا قصبے بسائے جنہوں نے اقتدار کی منتقلی میں مرکزی کردار ادا کیا۔ سلطنت روما کئی صدیوں تک اس لئے اپنا وجود برقرار رکھ سکی کیونکہ سلطنت روما کی طاقت کی علامت کئی مضبوط گیریژن ٹاؤن یا چھاؤنیاں دور افتادہ علاقوں میں قائم تھیں۔ چنانچہ یہ چھاؤنیاں سلطنت روما کے مفتوحہ علاقوں میں روم کی بالادستی قائم رکھنے کا کام کرتی تھیں۔ ترک۔ افغان حملہ آوروں کی طرف سے گیارہویں سے تیرہویں صدی کے دوران شمالی ہندوستان کی فتح میں مسلم ترکوں جن میں سے اکثریت غلاموں کی تھی پر مشتمل چھاؤنیوں (نوٹ: انگریزی لفظ گیریژن سٹیٹ کا استعمال مصنف نے وسیع تر معنوں میں کیا ہے۔ البتہ ان سطور میں لفظ چھاؤنی مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس لئے چھاؤنی کا لفظ ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر چھاؤنی مفہوم پورا نہیں کرتا: مترجم) نے مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ فوجی دستے تھوڑی تعداد میں تھے اور پرتعیش انداز میں زندگی گزارتے تھے اور دولت کی ریل پیل تھی جبکہ ان چھاؤنیوں کے اردگرد رہنے والی دہقانوں کی بڑی آبادی ایک مختلف طرز زندگی گزارتی تھی۔ ان میں سے کچھ نے بعد از اں اسلام قبول کر لیا۔ یہ عمل سولہویں صدی سے شروع ہوا اور سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا، (ونک 1997ء)۔ یہ چھاؤنیاں خانہ بدوشوں کی مجہول دنیا اور دولت کی ترسیل اور اضافے کا مرکز بن گئیں۔ (ایضاً: صفحہ 212)۔ ضروری نہیں کہ چھاؤنیاں سرحدوں پر واقع ہوں بلکہ یہ ایک ایسا برسرپیکار اکھاڑا تھا جہاں مستحکم معاشروں اور سرحدوں کے درمیان ادغام کا عمل بھی وقوع پذیر ہوتا تھا۔

چھاؤنیاں بنانے کا یہ عمل مغلیہ سلطنت اور پھر ہندوستان میں انگریز راج کے دوران بھی

جاری رہا۔ آج کے دور میں پاکستان اور بھارت میں بھی سرحدی چوکیاں بنانے کی روایت نظر آتی ہے۔ ان کا بنیادی مقصد دور دراز کے مرکز گریز صوبوں یا علاقوں پر نظر رکھنا ہے۔ بالخصوص علیحدگی پسندی اور تقسیم پسندی سے نمٹنا ہے۔ ایسے مقامات شہری سہولتوں سے مزین ہیں جہاں ایسی جدیدیت اور مرکز پسندی پائی جاتی ہے جو روایتی قبائل اور قبائلی سرداروں کی طاقت اور اثر ورسوخ سے متصادم ہوتی ہے۔ برطانوی دور سے قائم کئی فوج قلعے آج بھی صوبہ بلوچستان اور صوبہ خیبر پختونخوا میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد بڑھی ہے کیونکہ اب سندھ میں بھی ایسے قلعے قائم کئے گئے ہیں۔

انگریز سلطنت کے دور کا ہندوستان: ایک عسکری ریاست

انگریز دور میں ہندوستان پر تسلط برقرار رکھنے کے لئے سویلین اداروں کے کردار پر زور دینے والے کئی مؤرخین اور ماہرین سیاسیات کے برعکس تان تائی یونگ کا مؤقف ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی گیریژن سٹیٹ کے طور پر قائم رکھی گئی۔ انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ انہوں نے بزور طاقت ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اور یہ قبضہ اب طاقت کے ساتھ ہی برقرار رکھا جا سکتا ہے، (یونگ 23:2005)۔ چنانچہ انہیں ایک مضبوط اور مؤثر فوج کی ضرورت تھی۔ انگریز افسروں کے زیر کمان مقامی ہندوستانی افراد بھرتی کئے گئے اور اس عمل کے دوران مخصوص خطوں سے تعلق رکھنے والی ذاتوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا (ایضاً)۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے روس کی طرف سے ہندوستان پر حملے کا خوف انگریزوں کی سٹرٹیجک منصوبہ بندی کو متاثر کرنے لگا۔ جغرافیائی محل وقوع کے باعث قدرتی طور پر پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ روسی خطرات سے نمٹنے کیلئے برطانیہ کی گریٹ گیم میں فرنٹ لائن بن گئے۔ (ایضاً: صفحہ 69)۔ اس کا نتیجہ پنجابیوں کی اکثریت پر مشتمل ایک طاقتور لیکن انگریزوں کی پابند فوج کی صورت میں نکلا۔ ان فوجیوں کو ہندوستان سے باہر کے ممالک میں بھی بھیجا گیا اور انہوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔

پنجاب میں برطانوی حکمرانی کا دارومدار پنجاب کے جاگیرداروں پر تھا۔ جن کی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہ لوگ انگریزوں کی حکومت کے زبردست حامی تھے۔ پاکستان کو ورثے میں

اسی فوج کا بڑا حصہ ملا۔ طاقتور مسلمان جاگیردار طبقہ انگریزوں کا آخر دم تک وفادار رہا۔ (ایضاً: صفحہ 240 تا280)۔ یہ گیریژن سٹیٹ اس وقت کمزور ہونا شروع ہوگئی جب دو مخالف قوم پرست تحریکیں -- ایک تحریک انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں جبکہ دوسری مسلم لیگ کی قیادت میں -- ہندوستان کو متحد رکھنے کیلئے شراکت اقتدار کے فارمولے پر متفق نہ ہوسکیں۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کا بٹوارہ ہوا بلکہ پنجاب کی خونیں تقسیم بھی عمل میں آئی۔ فرقہ وارانہ فسادات میں غیر فعال پنجابی فوجیوں کی شرکت کے باعث تشدد اور خونریزی پنجاب کا جزو لاینفک بن کر رہ گئے۔ تان تائی یونگ نے لکھا ہے کہ سول ملٹری حکومت کی باقیات بالخصوص مغربی پنجاب میں فوری طور پر نومولود ریاست پاکستان کی سرخیل بن گئی۔ انہوں نے مزید لکھا کہ

''اس تناظر میں بعد از نوآبادیاتی نظام کے پاکستان کی تصویر کشی کیلئے نوآبادیاتی دور کے پنجاب کی عسکری ہیئت کی کہانی نہایت اہم ہے۔ جہاں 1947 کے بعد داخلی، علاقائی اور بین الاقوامی عوامل کی کھینچا تانی نے پاکستان کا بطور ریاست ڈھانچہ بنانے میں بیوروکریسی اور فوج کی برتری کی راہ ہموار کی وہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ پنجابیوں کے کنٹرول والی فوج اور بیوروکریسی کا گٹھ جوڑ پورے ملک پر کنٹرول اور برتری کی زبردست طاقت رکھتا تھا لیکن آزادی کے بعد پاکستانی ریاست نے نوآبادیاتی پنجاب میں بیسویں صدی کے پہلے نصف میں رونما ہونے والی پیشرفت کے باعث جڑ پکڑ لی''۔ (ایضاً۔ صفحہ 9-308)

تان تائی یونگ کے دلائل کا لب لباب یہ ہے کہ اقتدار کا وہ ڈھانچہ جس نے پاکستان میں مضبوطی حاصل کی وہ ایسا تھا کہ جس میں پاکستان میں گیریژن سٹیٹ بدستور اپنا وجود برقرار رکھ سکتی تھی۔ بالخصوص علاقائی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں ... یہ ایک دلچسپ بات ہے کیونکہ پاکستان کو گیریژن سٹیٹ بنانے کا تصور جو بیرونی آقاؤں کی خدمت کیلئے تیار تھا وہ پاکستان کے قیام سے پہلے ہی وجود میں آچکا تھا۔ جناح اور ان کے قریبی ساتھیوں نے پاکستان میں امریکی مفادات کا تحفظ اس کے قیام سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔

امریکی ماہر علم سیاسیات ہیرالڈ لاس ویل کا نظریہ عسکری ریاست

علم سیاسیات کے شعبے میں سب سے پہلے گیریژن سٹیٹ کا تصور امریکی ماہر ہیرلڈ لاس

ویل نے 1937ء میں متعارف کرایا۔ چین، جاپان جنگ کے پس منظر میں تیار کئے جانے والے اس نظریے کی بنیاد یہ منطق تھی کہ فوج کے اندر ٹیکنالوجی کی تبدیلیاں فوجی اداروں اور بڑے سویلین معاشروں کے درمیان تعلقات تبدیل کر دیتی ہیں۔ لاس ویل نے 1942ء میں اپنی اس تعریف میں اس وقت تبدیلی کی جب نازی ازم اور فاشزم مغربی یورپ کے لئے بڑا خطرہ بن کر سامنے آئے۔ لاس ویل نے یہ متنازعہ دعویٰ کیا کہ گیریژن سٹیٹ ایسے جدید صنعتی معاشروں میں ابھرے گی جہاں تشدد کے ماہر عناصر قیادت پر قبضہ کر لیں گے اور یوں ریاست اور معاشرے پر فوج کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ (سٹینلے 1997: صفحہ 22,23)، لاس ویل (1997: صفحہ 59) نے لکھا کہ: ''جدید ٹیکنیکل معاشرے میں جو فوجی بالادستی حاصل کریں گے وہ تاریخ اور روایت کے افسروں سے بہت مختلف ہوں گے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ تشدد کے یہ ماہرین اپنی تربیت میں ایسے ہنروں میں مہارت حاصل کر لیں جنہیں روایتی طور پر ہم جدید سویلین انتظامیہ کا حصہ سمجھتے ہیں''۔

مزید برآں انہوں نے مؤقف اختیار کیا کہ افسروں کے کور (Corps) مقتدر طبقے یا اشرافیہ کی محدود سماجی اساس کی بجائے وسیع سماجی اساس میں سے بھرتی ہوں گے اور گیریژن سٹیٹ پر بالادستی حاصل کریں گے۔ ان کا مقصد یہ ہوگا کہ ایسی بڑی اور قابل فوجی قوت قائم کی جائے جو سکیورٹی کے ساتھ وسیع قسم کی سماجی خدمات بھی مہیا کر سکے۔ گیریژن سٹیٹ معیشت اور پیداوار بہتر رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرے گی تاکہ روزگار اور دیگر خدمات کی فراہمی ممکن بنائی جا سکے۔ لیکن ایک متحرک شہری کلچر تشکیل دینا ہرگز اس ریاست کا مطمح نظر نہیں ہوگا بلکہ اس کے برعکس ایک ایسی فرمانبردار اور تابعدار آبادی تیار کی جائے گی جو جنگ کی ناگزیریت کے فلسفے پر یقین رکھے اور گیریژن سٹیٹ کا انتظام چلانے کی ضرورت سمجھے۔ ''خطرے کو سماجی رنگ'' دینے کو نظریاتی پہلو دینے اور پراپیگنڈا کرنے کے لئے ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا جائے گا۔ (ایضاً: صفحہ 64 سے 66)۔ آہستہ آہستہ گیریژن سٹیٹ مزید مضبوط اور مستحکم ہوتی چلی جائے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''فیصلے جمہوری سے زیادہ آمرانہ ہوں گے۔ جدید جمہوریت سے طویل عرصے سے جڑی ادارہ جاتی روایات منظر عام سے غائب ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ فعال جمہوریت معطل حالت میں ہوگی تاہم علامتی جمہوریت کی نشانیاں بلاشبہ جاری رہیں گی۔ فعال جمہوریت وہاں ملتی ہے جہاں ریاست کے ارکان میں اتھارٹی اور کنٹرول منتشر ہو جاتا ہے۔ پورے وثوق سے کہتا

ہوں کہ علامتی ''جمہوریت'' کسی بھی لحاظ سے جمہوریت نہیں ہوتی کیونکہ یہ ایسی جگہ پر پائی جاتی ہے جہاں اختیار اور کنٹرول تو مخصوص جگہوں پر مرتکز ہوتا ہے لیکن عوام کا نام لینے کی روش پائی جاتی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی آمریت اپنی ''جمہوریت'' کا جشن منا سکتی ہے اور انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والے ''میکانیکی'' عناصر کی توہین کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ (ایضاً: صفحہ 67-66)۔

اس خیال کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ایسے ''معاشرے، جنہیں جدید جنگ کا دائمی خطرہ لاحق ہوتا ہے ان کے گیریژن سٹیٹ بننے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ (ایضاً)۔ مزید یہ کہ ''بحرانوں کی مستقل موجودگی معاشروں کا ڈھانچہ بدل کر رکھ دیتی ہے''۔ (ایضاً) مختصر یہ کہ ''جنگ کے مستقل خطرے کے ماحول کے تحت نمایاں سطح کا خوف جنم لے گا جس کے بدلے میں ٹیکنیکل مہم جوئی کی راہ ہموار ہوگی۔ (صفحہ 26)۔

سکیورٹی، خطرہ اور خطرے کا ادراک

تمام ریاستیں بیرونی جارحیت کے خلاف دفاع یا دشمن کے خلاف جارحیت کیلئے فوجیں اور ہتھیار رکھتی ہیں۔ نظریہ حقیقت پسندی Realism Paradigm کے مطابق یہ ہر درندے کی خصلت میں شامل ہوتی ہے یا یوں کہہ لیں 'چونکہ' بین الاقوامی سطح پر اس نوعیت کی ہوبسین Hobbesian ایسی پیش کش جہاں آپ کو جو مل رہا ہے وہ لے لو ریاست بدستور موجود ہوتی ہے اس لئے ریاستوں اور ان کی حکومتوں کو کسی تصادم کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ (مورجن تھاؤ، 1948: والٹز 1979)۔ میکاولی نے بھی یقیناً حقیقت پسندی کی اصطلاح استعمال کی تھی تاکہ ریاست کو مضبوط بنانے کے شہزادے کے لئے تمام اقدامات کو جائز قرار دیا جائے۔ ان میں جھوٹ اور دغا کا استعمال اور اندرونی مخالفت کو بزور طاقت کچلنا بھی شامل ہے۔ میکاولی نے اس بااثر نظریے کی حمایت کی تھی کہ طاقتور اور مضبوط فوج کے ساتھ ہی اقوام کی آزادی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ فوج کو جدید دور میں ریاست سازی کے منصوبوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن کسی مقام پر حقیقت پسندی اپنا راستہ بھٹک کر مایوسی میں بدل جاتی ہے۔ اس لئے دھوکہ دہی اور توڑ جوڑ کا عمل قوم کے مفادات کا تحفظ کرنے کی بجائے محض حکومت کے تحفظ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس پر میکاولی نے واضح بات نہیں کی۔ بہر حال اتنا کہنا کافی ہوگا کہ وہ طاقت اور دوامی سازش کے عمل کو ملک اور

قوم کے بھلے کیلئے استعمال کرنے کا حامی نہیں تھا۔ اس نے طاقت کے نظریے کو تعلیم اور اصلاح سے منسلک کرتے ہوئے کہا کہ عوام کو ذمہ دار شہری کے طور پر پروان چڑھایا جا سکتا ہے تاکہ قانون کی حکمرانی پر مبنی ریاست وجود میں آ سکے۔ اس کا طاقتور فوج کی موجودگی پر زور بہرحال ایک جدید ریاست کے اس کے نظریے کا اہم حصہ رہا۔ بسا اوقات ریاست کے وجود کو اندرونی اور بیرونی ذرائع سے لاحق فرضی خطرہ بہت شدید اور حاوی نظر آتا ہے اور سکیورٹی ریاست کا اہم ترین مسئلہ بن جاتا ہے۔

یہ بات مدنظر رکھی جائے کہ سکیورٹی دراصل خطرے کے ادراک کا ایک پہلو ہے۔ دانشور حضرات ''خطرے اور خطرے کا ادراک'' میں فرق کی لکیر کھینچتے ہیں۔ (والٹ، 1987)۔ جہاں خطرے کا صرف مطلب مشکل یا خطرہ ہے وہاں مؤخرالذکر سے مراد یہ ہے کہ آپ خطرے کو کس طرح محسوس کرتے ہیں۔ پرویز اقبال چیمہ نے لکھا ہے کہ: غلط اطلاعات، مس انفارمیشن، حقائق مسخ کرنے یا گمراہ کن خیالات کی قوت اور گمراہی پھیلانے والے کے پیشہ ورانہ تعصب کے نتیجے میں تصورات کو حقیقت سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ (1990: صفحہ 68)۔ اس مؤقف کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ کیا جا سکتا ہے کہ خطرے کا ادراک بڑھا چڑھا کر یا کم کر کے پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی آمرانہ انداز میں تعریف یا بیان کر کے وہ اپنے مخصوص مفادات کیلئے اسے غلط طور پر پیش کرے گا تاکہ اپنی برتر پوزیشن برقرار رکھ سکے۔ یوں مثال کے طور پر بھاری بھرکم فوج اور دفاعی اخراجات کو جائز قرار دینے کیلئے قومی سلامتی کو لاحق خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال فوج کی طرف سے قومی سلامتی اور بقا کو لاحق خطرے کے بیان کرنے کے تمام پہلوؤں کا لُب لباب یہ دعویٰ ہے کہ ریاست اپنے وسائل اس (فوج) کے کنٹرول میں دے دے۔

سوویت کمیونزم کے آگے پاکستان اور امریکہ کا بند

وہ گیریژن سٹیٹ جس کے بارے میں لاس ویل نے خدشہ ظاہر کیا تھا وہ امریکہ میں کبھی نمودار نہیں ہوئی۔ وہاں جمہوری ادارے برقرار رہے۔ حالانکہ 1940ء کی دہائی سے 1950ء کے عشرے کے اختتام تک جاری رہنے والے میکارتھی دور میں بائیں بازو کے دانشوروں اور ممتاز افراد کے خلاف کئی اقسام کے ہتھکنڈوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ 1962ء میں لاس ویل نے اس

روشنی میں گیریژن سٹیٹ کے اپنے نظریے پر نظر ثانی کی کہ جوہری ہتھیاروں کے استعمال کے ذریعے کوئی بھی مکمل جنگ ہونے کے موہوم امکانات ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ یہ لفظ سنگین طاقت کے دیرینہ خطرے سے نسبتاً آزاد دنیا میں جلد داخل نہیں ہو رہا چنانچہ ایک ایسی پالیسی جو انسانی وقار میں اضافے اور ''عسکریت پسندی'' کے برخلاف ''تہذیب پسندی'' کے حق میں ہو اس سے آزاد معاشرے کے قیام میں مددگار مؤثر ادارے قائم کرنے میں تعاون مل سکتا ہے۔ (لاس ویل 1997:7-106)۔ بالفاظ دیگر لاس ویل چاہتے تھے کہ امریکہ میں ممکنہ گیریژن سٹیٹ کو ابھرنے سے روکنے کیلئے ریاست پر سویلین کنٹرول کی مضبوطی کے حوالے سے پبلک پالیسی ہونی چاہیئے۔

فوج کی طرف سے طاقت اور اثر ورسوخ حاصل کرنے کے خوف کا اظہار صدر ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور جو دوسری جنگ عظیم کے ہیرو تھے، نے بھی کیا تھا۔ انہوں نے امریکہ میں ایک ایسے عسکری، صنعتی کمپلیکس کے عروج کے بارے میں خبردار کیا جو اس خدشے سے منسلک تھا کہ سوویت یونین ایٹمی حملہ کرے گا۔ 17 جنوری 1961ء میں انہوں نے مختصر الفاظ میں یہ کہا کہ:

''امریکہ کے تجربے میں بھاری بھرکم ملٹری اسٹیبلشمنٹ اور بڑی فوجی صنعت ایک نئی بات ہے۔ معاشی، سیاسی حتیٰ کہ روحانی ہر طرح کا اثر ورسوخ ہر شہر، ہر گھر اور وفاقی حکومت کے ہر دفتر میں محسوس کیا جا سکتا ہے .... ہمیں حکومتی کونسلوں میں فوجی، صنعتی کمپلیکس کے غیر اعلانیہ اثر ورسوخ، مطلوب یا غیر مطلوب، کی حوصلہ شکنی کرنا ہوگی۔ اپنی جگہ سے نہ ہلنے والی طاقت کے تباہ کن عروج کا خطرہ موجود ہے اور موجود رہے گا۔ ہمیں اس گٹھ جوڑ کو اپنی آزادیوں یا جمہوری عمل کیلئے خطرہ نہیں بننے دینا چاہیے۔ ہمیں اس کیلئے کچھ کرنا ہوگا۔ صرف ایک ایسا تعلیم یافتہ شہری معاشرہ بڑے صنعت اور عسکری مشینری کے گٹھ جوڑ کا پر امن طریقوں اور مقاصد کے ذریعے دفاع یقینی بنا کر توڑ کر سکتا ہے تاکہ سلامتی اور آزادی ایک ساتھ فروغ پائیں''۔

امریکی صدر کے اس بیان میں یہ امکان ظاہر کیا گیا تھا کہ اسلحے کی صنعت اطلاعات کو توڑ مروڑ کر یا خطرے کے امکانات کو مسخ کر کے اپنے مفادات کیلئے استعمال کر سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر آئزن ہاور کو خوف لاحق ہوا کہ اس عمل سے کہیں امریکہ گیریژن سٹیٹ میں تبدیل نہ ہو جائے جہاں معیشت پر فوجی اخراجات کا غلبہ ہو اور شہری آزادیاں ختم ہو جائیں۔ (شوارٹز 2005ء)۔

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس حقیقت کا ادراک کرنے کے باوجود آئزن ہاور ممکنہ سوویت خطرے کے خوف سے پوری دنیا میں امریکی اڈے قائم کرنے سے باز نہ رہے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کئی دیگر ممالک کے ساتھ فوجی اتحاد بھی بنائے۔ (کوکس 51:2001)۔ یوں آئزن ہاور انتظامیہ نے پوری دنیا میں چھاؤنی سازی کی فعال پالیسی پر عملدرآمد کیا۔

1970ء کی دہائی میں یہ تصور نئی بلندیوں تک پہنچ گیا کیونکہ کمیونزم حکمت عملی کے تدارک کے لئے فوجی آمروں کی سربراہی میں مطلق العنان حکومتوں سے بھرپور اشتراک کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں امریکہ کو کئی خطوں میں فوجی تصادم اور جنگوں میں مصروف ہونا پڑا۔ اس پالیسی کا بدترین شاخسانہ بھارت اور چین کی جنگ تھی۔ امریکی مفادات سے متصادم جمہوری طور پر منتخب حکومتوں کو الٹانا اس پالیسی کا جزو تھا۔ اس کی سب سے اعلیٰ مثال 1973 میں چلی کی منتخب حکومت کا خاتمہ تھا۔ صدر سلواڈور آیلندے Salvador Allende کو خونیں فوجی بغاوت کے ذریعے برطرف کرنے کی منصوبہ سازی سی آئی اے کی تھی۔ فوجی اڈے قائم کرنے کا نظام سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کی تحلیل کے باوجود برقرار رہا کیونکہ اس دوران اُفق پر کئی دیگر خطرات بالخصوص بنیاد پرست اسلام اور چین کا خطرہ نمودار ہو چکا تھا۔

عسکری ریاست بعد نوآبادیاتی نظام کے تناظر میں

پاکستان کے لیڈروں نے ملک کے قیام سے بھی پہلے ہی امریکہ کی مدد مانگنا شروع کر دی تھی اور پاکستان کو سوویت کمیونزم کے خلاف جغرافیائی اور سٹریٹجک طور پر اتحادی کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس پالیسی پر پاکستان بننے کے بعد پوری شد و مد سے عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ شروع میں امریکہ نے پاکستان کو درخواعتنا نہ سمجھا کیونکہ نیٹو کا قیام اس کی ترجیح تھی۔ لیکن 1951ء تک جا کر پاکستان کی افادیت کے متعلق امریکی سوچ میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ جب آئزن ہاور صدر بنے تو نئی امریکی انتظامیہ کی عالمگیر گیریژن بلڈنگ سٹریٹجی میں پاکستان ایک بڑا عنصر بن کر ابھرا۔ گیریژن ریاستیں 1950 اور 1960 کے عشروں میں ایشیا اور افریقہ میں نمودار ہوئیں۔ (لاپورٹ 1969ء:842)۔ پاکستان کے ساتھ امریکہ نے اسرائیل، ترکی، تائیوان، جنوبی کوریا اور انڈونیشیا میں فوجی حکومتوں کی حمایت کی۔ دوسری طرف سوویت یونین نے مشرقی یورپ، مشرق

وسطیٰ، جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا میں گیریژن سٹیٹس قائم کرنے کی حمایت کی۔ سرد جنگ کے بعد حالات میں تبدیلی آنے لگی۔ ترکی، تائیوان، انڈونیشیا اور جنوبی کوریا نے بتدریج جمہوریت کی طرف مراجعت کی لیکن وہاں مضبوط عسکری تنظیم بدستور موجود رہی۔ جہاں تک اسرائیل کا تعلق ہے تو باقاعدگی سے انتخابات کے انعقاد سے قطع نظر عربوں سے یکے بعد دیگرے جنگوں کے باعث وہ ایک گیریژن ریاست کا ہی رویہ اختیار کئے رہا۔ عربوں کے ساتھ جنگوں کے علاوہ عربوں کا اسرائیل کے وجود کے خلاف جارحانہ رویہ اور مقبوضہ علاقوں میں مزاحمت بھی اس کے پیش نظر تھی۔ اسرائیل کے طرف سے قبضے کی پالیسی اور فلسطینی زمین ہتھیانے کے باعث اس کے لئے بارڈر کنٹرول، داخلی اور خارجی چیک پوائنٹس اور عربوں اور یہودیوں کو تقسیم کرنے والی اونچی دیواروں کا قیام ناگزیر تھا۔ اس تناظر میں اسرائیل واضح طور پر ایک گیریژن ریاست ہے، باقاعدگی سے انتخابات اور جمہوریت کے باوجود۔ ایک ایسی ریاست جو یہودیوں کو غیر یہودیوں پر واضح ترجیح دیتی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت نے اگست 1947ء کے وسط میں آزادی حاصل کرلی؛ بھارت ایک جمہوری ملک بن گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ جمہوریت گہری ہوتی چلی گئی۔ (اولڈنبرگ 2010)۔ بھارتی فوج کے لیفٹیننٹ جنرل کلدیپ سنگھ کھجوریا، میجر جنرل افسر کریم اور بریگیڈئر وجائی کے نائیر اور بھارتی نیوی کے کموڈور سی اودے بھاسکر نے مجھے بتایا کہ بھارت میں کبھی پارلیمنٹ کی بالادستی اور منتخب حکومت کے سیاسی فیصلے کرنے کے اختیار کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ کموڈور اودے بھاسکر نے اپنے خیالات کو پاکستانی جریدے فرائیڈے ٹائمز میں شائع ہونے والے مضمون میں مختصراً بیان کیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ بیرونی خطرات کے بارے میں بھارتی پریشانی پاکستان -- جس کے ساتھ اس کی کئی جنگیں ہوئیں -- کے خلاف نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ چین کے حوالے سے ہے۔

بریگیڈئر (ر) اے آر صدیقی اپنی کتاب ''دی ملٹری ان پاکستان'' کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست کافی حد تک لاس ویل کی تصوراتی ریاست جیسی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ :''چونکہ نظم وضبط اور سب سے بڑھ کر تشدد پر قابو پانے کے معاملے میں کوئی اور ادارہ فوج کا مقابل نہیں۔ اس لئے اس کا امیج کافی بہتر ہو جاتا ہے اور پھر برتری اور اقتدار کے اس نقطے پر پہنچ جاتا ہے جہاں یہ عوام کے احترام یا خوف کی علامت بن جاتا ہے۔ ایک قسم کا پروشین ازم

prussianism ایک ایسی فوج پیدا کرتا ہے جو قوم کے ساتھ ہوتی ہے نا کہ ایک قوم جس کے ساتھ فوج ہو۔ قومی شناخت اور مفاد کو فوج کے بڑھتے امیج کے سامنے سرنگوں کر دیا جاتا ہے''۔ (1996)۔

مسلم لیگ کی اولین قیادت نے جمہوریت کے فروغ کا عزم ظاہر کیا تھا۔ عمومی طور پر اسے مسلم جمہوریت یا روحانی جمہوریت یا اسلامی جمہوریت کہا گیا۔ اس قسم کے نقطۂ نظر کا مطلب یہ تھا کہ جمہوریت کو اسلامی خوبیوں کا مالک ہونا چاہیے۔ دیگر الفاظ میں پاکستان میں عام قسم کی جمہوریت نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی کتاب ''کانسپٹ آف اسلامک سٹیٹ'' (1987) میں لکھا تھا کہ الفاظ اور منطق کے ساتھ کھیلنے والے تصور سے قطع نظر جمہوریت کے اسلامی معیارات نے جمہوریت کے مقاصد کو ناکام بنا دیا ہے۔ موجودہ دور میں جمہوریت میں تمام شہریوں کو بلاامتیاز رنگ و نسل، عقیدہ اور جنس مساوی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستان کے جدت پسند رہنما جنہوں نے 1947ء سے 1977ء تک حکمرانی کی وہ اسلامی ریاست کا متبادل نظام دینے میں ناکام رہے۔ اس کے برعکس پاکستانی شناخت میں ایک سے بڑھ کر ایک نظریاتی رنگ شامل کئے گئے۔ حتیٰ کہ 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے عام جمہوریت کو سرے سے ہی مسترد کرتے ہوئے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کا کام شروع کر دیا جس کے لئے انہوں نے صرف فوجی نہیں بلکہ مؤثر قانونی اور ثقافتی اقدامات بھی کئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کے پاکستان میں نہ صرف قلعہ بند ریاست کا رنگ ملتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا معاشرہ بھی ہے جو سیاسی، نظریاتی، فرقہ وارانہ، فوجی اور دیگر اقسام کے تصادم کا حامل ہے۔ ایسے حالات میں یہ بات حیران کن نہیں کہ فوج ایک انتہائی طاقتور ادارہ بن گیا ہے۔ جو ہر اندرونی اور بیرونی پالیسیوں کو ویٹو کرنے کی عملی طاقت رکھتا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق 2008ء میں پاکستان میں ساڑھے 6 لاکھ فعال فوجی، 5 لاکھ 28 ہزار فعال ریزرو فوجی اور 3 لاکھ 2 ہزار نیم فوجی دستے تھے۔ (گلوبل فائر پاور، 2011)۔ اس سے قبل عائشہ صدیقہ نے یہ اعداد و شمار پیش کئے تھے کہ پاکستان میں ساڑھے 5 لاکھ فعال فوجی، 45 ہزار ائیر فورس اور 25 ہزار نیوی کے اہلکار تھے۔ (صدیقہ 59:2007)۔ پاکستان کی مسلح افواج میں شمولیت پڑھے لکھے نوجوانوں کے لئے خاص کشش کا باعث رہی ہے۔ جو لوگ فوج میں شامل ہوتے ہیں وہ گویا ایک ایسے گروہ کا حصہ بن جاتے ہیں جو طاقتور اور مراعات یافتہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اگرچہ فوج میں بھرتی

کو جمہوری بنایا گیا ہے جہاں مڈل اور نچلے طبقے کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی ہے۔ البتہ پنجابیوں کی تعداد اب بھی غالب ہے۔ (نواز، 2008ء)۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز تک فوج میں بھرتی ہونے والے 75 فیصد فوجیوں کا تعلق پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ (اب خیبر پختونخوا) سے تھا۔ اس کے علاوہ بھرتی والے اضلاع بھی وہی ہیں۔ یعنی راولپنڈی، جہلم، اٹک، چکوال، خوشاب اور میانوالی پنجاب کے علاقے جبکہ صوبہ سرحد کے دو اضلاع کوہاٹ اور مردان ہیں۔ یہ خطہ جو آپس میں جڑا ہوا ہے وہ پاکستان کی مجموعی طور پر صرف 9 فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔ (کوہن 1918:44)۔ البتہ شجاع نواز نے دعویٰ کیا ہے کہ اب کافی تبدیلی آرہی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''فوجی ہیڈکوارٹر (جی ایچ کیو) سے دستیاب فوجیوں اور افسروں کے ڈیٹا سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب میں 1991ء میں فوجیوں کی بھرتی کی شرح 63.86 فیصد تھی جو 2005ء میں کم ہوکر 43.33 فیصد ہوگئی ہے اور وسطی پنجاب سے بھرتی کی تعداد روایتی بھرتی والے علاقے شمالی پنجاب سے بڑھ گئی ہے۔ 2005ء میں شمالی پنجاب کی تعداد 7500 سے کم ہوکر 5000 رہ گئی۔ جنوبی پنجاب کے 1800 رنگروٹ ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور فاٹا سے بھرتی کی شرح 20.91 فیصد ہوگئی۔ سندھ سے بھرتی کی شرح 8.85 فیصد ہوگئی۔ اس میں دیہی علاقے کے رنگروٹوں کی اکثریت تھی۔ (5095 کی تعداد میں سے 2005 میں 2500 دیہی علاقے کے تھے)۔ اسی طرح بلوچستان میں 0.49 کی شرح بڑھ کر 1.52 فیصد ہوگئی۔ 200 رنگروٹ شہری علاقوں کے تھے جبکہ 300 دیہات کے تھے۔ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات سے فوج میں بھرتی کی شرح 5.86 سے بڑھ کر 9.70 فیصد ہو گئی۔ جہاں تک کمیشنڈ افسروں کا تعلق ہے تو 89-1970ء کے عرصے کا 2006-1990ء کے دورانیے سے موازنہ کریں تو اس میں بھی ہمیں ملک کے مختلف علاقوں کے متناسب حصے میں فرق نظر آئے گا۔ پنجاب کے حصے میں 66.46 سے 66.93 فیصد کا معمولی اضافہ نظر آتا ہے لیکن افسروں کے آبائی اضلاع میں نمایاں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں وسطی حتیٰ کہ جنوبی پنجاب کے زیادہ گنجان آباد اور اُبھرتے ہوئے شہری علاقوں سے افسروں کی تعداد بڑھتی نظر آتی ہے۔ شاید اس کا تعلق پورے ملک میں بڑھتی اربنائزیشن سے ہے۔ یہ بڑے شہر اور قصبے مضبوط ہوتی اسلام پسند پارٹیوں اور قدامت پسندی کے روایتی مضبوط گڑھ ہیں جو معمولی حد تک بورژوائی بھی ہیں''۔ (571:2008)۔

شجاع نواز نے اسے ''ضیا بھرتی'' قرار دیا ہے کیونکہ انہیں سابق فوجی آمر جنرل ضیاالحق کے دور (88-1977) میں بھرتی کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس عرصے میں بھرتی ہونے والے اکیسویں صدی میں فوج میں کمانڈنگ عہدوں پر فائز ہوں گے۔ (ایضاً۔572) رونما ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود پنجابی پختون فوج سمجھی جانے والی آرمی کو ان صوبوں میں مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے جن کی فوج میں نمائندگی کم ہے۔ بالخصوص بلوچستان میں جہاں فوج نے عسکریت پسندی اور مزاحمت کی تحریکیں کچلنے کیلئے کئی چھاؤنیاں اور اڈے قائم کئے ہیں۔ یہ رجحان اس وقت شروع ہوا جب خودمختار ریاست قلات کو 1948ء میں ضم کر لیا گیا۔ ایوب خان کی پہلی فوجی حکومت کے دوران بڑے پیمانے پر چھاؤنیاں قائم کرنے کا آغاز ہوا۔ یہ رجحان اب تک جاری ہے۔

لیکن مجموعی طور پر پاکستان کی مسلح افواج میں توسیع دراصل بھارت کی مسلح افواج کو مسلسل اپ گریڈ کرنے کے جواب میں کی گئی اور یوں پاکستان کی عدم سلامتی کے احساس کو بڑھایا چڑھایا گیا۔ مثال کے طور پر 2008ء میں بھارت کے پاس 13 لاکھ 25 ہزار فعال فوجی، 11 لاکھ 55 ہزار فعال ملٹری ریزرو اور 12 لاکھ 93 ہزار 300 فعال نیم فوجی دستے موجود تھے۔ (گلوبل فائر پاور، 2011ء)۔ بھارت نے اب فوجی اخراجات میں چین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے شعبے کے ماہرین، جیسا کہ بیری بوزن، سمجھتے ہیں کہ جیسے جیسے حریف یا دشمن ریاستوں نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کیا ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہتھیاروں کی دوڑ میں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ اس چکر میں زیادہ مؤثر اور مہلک ہتھیار حاصل کئے گئے ہیں۔ نتیجتاً ان ریاستوں کی تباہ کن صلاحیت بھی بڑھ گئی ہے۔ لیکن صلاحیت بڑھنے سے غیر محفوظ ہونے کے احساس میں کمی نہیں آئی بلکہ اس کی بجائے اس میں اضافہ کیا جاتا ہے تا کہ حریف دشمن ریاستیں مزید تباہ کن اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں۔ (بوزن: 1991)۔ جوہری اسلحے سمیت بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا حصول غیر محفوظ ہونے کے احساس میں اضافے کا باعث بنتا ہے چنانچہ ایک ایسا شیطانی چکر وجود میں آتا ہے جو آخر کار اپنے ہاتھوں خودکشی کر لیتا ہے۔

خود فوجی کیا کہتے ہیں......؟

پاکستان آرمی اپنی طاقت کی تردید نہیں کرتی لیکن یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ پاکستان کی سالمیت اور بقا کو اپنے قریبی ہمسائے بھارت سے سنگین خطرہ ہے۔ (خان 2006، خان 1973)۔ انٹرسروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی نے پاکستان کو ''نیشنل سکیورٹی سٹیٹ'' قرار دیا ہے۔ یہی بیان سابق آرمی چیف مرزا اسلم بیگ، سابق سربراہ آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی اور افغان امور کے سابق ڈائریکٹر آئی ایس آئی بریگیڈیئر (ر) یعسوب علی ڈوگر (1991-1992) نے دیا۔

اس کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان کو بھارت کی طرف سے لاحق مستقل خطرے سے بچاؤ کیلئے اپنی بقا یقینی بنانا ہے۔ ان تینوں فوجی افسروں نے نشاندہی کی کہ بھارت پاکستان کے مقابلے میں آبادی اور رقبے کے لحاظ سے کہیں بڑا ملک ہے۔ اس نے 1974 میں ایٹمی تجربہ بھی کیا۔ بھارت نہ صرف اسلحے کی خریداری پر بھاری رقوم خرچ کرتا ہے بلکہ اس کی فوج دنیا کی سب سے بڑی فوجوں میں شامل ہے اور اس نے کئی بار پاکستان کے ساتھ جنگیں بھی کیں۔ 1971ء کی جنگ میں تو پاکستان دولخت ہو گیا۔ لہذا پاکستان کو بھارتی عزائم کا مقابلہ کرنے کیلئے مضبوط دفاع قائم کرنا ہوگا۔ جہاں تک فوج کے امریکہ پر انحصار کرنے کا تعلق ہے تو سابق آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت، لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی، لیفٹیننٹ جنرل (ر) نشاط احمد، میجر جنرل (ر) محمود علی درانی، میجر جنرل (ر) سرفراز اقبال، بریگیڈیئر (ر) یعسوب ڈوگر اور کرنل (ر) اسلم چیمہ نے مجھے بتایا کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ تعاون محض اس لئے کرتا ہے کیونکہ اس میں اس کا اپنا بھی مفاد ہے۔ البتہ سابق آرمی چیف اسلم بیگ اور سابق آئی ایس آئی چیف حمید گل کا مؤقف ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تعاون پاکستان کے مفاد میں نہیں۔ چین کو ہر موسم کا دوست قرار دینا بھی فوج کے مرکزی دھارے کا نقطہ نظر ہے۔ سعودی عرب پر انحصار کرنے کی پالیسی کو فوج کی اعلیٰ قیادت کے لبرل اور سیکولر طبقات میں کم پذیرائی ملتی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی اور میجر آغا ہمایوں امین نے بے لاگ انداز میں جنرل ضیاالحق کی طرف سے فوج میں اسلامی بنیاد پرستی کے خیالات متعارف کرنے اور یوں اس کی پیشہ ورانہ ساکھ کو متاثر کرنے کو

ہدف تنقید بنایا ہے۔

ان سابق افسروں میں سے بیشتر نے اس تاثر کو مسترد کیا ہے کہ طاقتور فوج بننے کا لازمی مطلب فوج کا سول اداروں پر غلبہ ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے نااہل اور کرپٹ سیاستدانوں پر امن و امان کی ایسی صورتحال پیدا کرنے کا الزام لگایا جس سے فوج کی مداخلت کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ میں نے جو انٹرویوز کئے ان میں علاقائی قوم پرستوں اور علیحدگی پسندوں کی طرف سے ملک توڑنے کی سازشوں میں تیزی کا ذکر ملتا ہے۔ ان افسروں نے یہ بھی بار بار کہا کہ وہ جمہوریت کے خلاف نہیں اور یہ بھی تسلیم کیا کہ فوجی مداخلت نہ صرف ملک کیلئے بہتر نہیں بلکہ فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فوج کے تھانیداری والے کردار میں اس کی مرضی نہیں شامل ہوتی بلکہ یہ ضرورت بن جاتی ہے۔ پاکستانی کالم نگار شاہد صدیقی نے اس منطق کو پاکستان کے چاروں فوجی آمروں کی تختہ الٹنے کے بعد پہلی تقریر میں مختصراً نوٹ کیا ہے۔ ان جنرلوں میں ایوب خان، یحیٰی خان، ضیاالحق اور مشرف شامل ہیں۔ شاہد صدیقی کے مطابق ان جنرلوں نے پہلی تقریر میں کہا کہ:

''یہ کہ ملک تباہی کے دہانے پر ہے، سیاستدانوں اور معزول حکومت کی مذمت، عوام کی حوصلہ افزائی کی، فوج کی بہادری کی تعریف کی، تختہ الٹنے کے یہ قدم کو ''ناخوشگوار'' کام قرار دینا: عوامی سطح پر حکومت ختم کرنے کے کام میں ''ہچکچاہٹ'' کا برملا اظہار، یہ کہنا کہ اقدام قوم کے وسیع تر مفاد میں اٹھایا گیا۔ یہ دعویٰ کرنا کہ فوجی اقدام کے ذریعے ملک کو بچالیا گیا ہے اور عوام کو سبز باغ دکھانا''۔

یہ جان کا حیرت ہوتی ہے کہ کیا شاہد صدیقی یہ بیان کرتے ہوئے خوفزدہ تھے یا پھر محض انہوں نے اقتدار پر قابض ہونے والے جنرلوں کا نقطہ نظر بیان کیا۔ دونوں تشریحات میں سچ کا عنصر موجود ہے۔ یہ بات مدنظر رہے کہ فوجی بغاوت کی وجوہات میں بھارت کی طرف خارجی خطرے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ ہمیشہ ٹیک اوور میں اندرونی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ اگر چہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ فوج اتنی طاقتور تھی کہ اس نے ٹیک اوور میں تعاون کیا اور اس عمل کے دوران یہ بھی روایت قائم کی گئی جس کے جنرلوں کو ترغیب ملی۔

اندرونی منقسم نقطہءنظر

''بھارت کو بطور خارجی خطرہ'' پیش کرنے اور پاکستان کو خون آشام سیاستدانوں یا جارحیت پسند علیحدگی پسندوں سے بچانے کے کلیے پر مسلح افواج کے اندر مختلف نقطہءنظر پایا جاتا ہے۔ پاکستان کے سابق ائیر چیف اصغر خان جنہیں پاکستان کی ائیرفورس کو منظم کرنے کا اعزاز دیا جاتا ہے کا یہ مؤقف ہے کہ بھارت کے ساتھ لڑی گئی چاروں جنگیں پاکستان کی مہم جوئی کا نتیجہ تھیں۔ اس مہم جوئی میں مقصدیت کا فقدان تھا جس کا پاکستان کو فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان ہوا۔ (خان 2005ء:46-235)۔ اصغر خان کا یہ بھی مؤقف ہے کہ فوج کی مداخلت اور ملک میں بالادست کردار کی وجہ یا تو اچھی سیاسی قیادت کی عدم موجودگی تھی یا پھر پاکستان توڑنے کے مختلف منصوبے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ایسے سیاستدانوں کی نشاندہی بھی کی ہے جن کی سرگرمیوں نے جمہوریت اور سول اقتدار کے کاز کو نقصان پہنچایا۔ لیکن یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کیونکہ فوج خود منفی سیاست کرنے کی خواہش مند تھی۔ (خان 2008ء:13-11)۔ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ ایسے خیالات ڈھکے چھپے نہیں۔ نجی طور پر یا بے نام طریقے سے فوجی افسر (مراد چھوٹے رینک والے) اپنے جنرلوں پر سیاسی عزائم رکھنے پر تنقید کرتے آئے ہیں۔

نوآبادیاتی نظام کے بعد گیریژن سٹیٹ کا نظرثانی شدہ نظریہ

ایک دلیل یہ دی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی ریاست غیرملکی جارحیت کے خطرے میں گھری ہو تو اس میں گیریژن سٹیٹ کے خواص پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایسا صنعتی طور پر پسماندہ معاشرے میں ممکن ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ معاشرے میں ہوتا ہے کیونکہ ایک گیریژن سٹیٹ کا لازمی طور پر تعلق خطرات کے تصورات اور ان خطرات کے خلاف خود کو مسلح کرنے کی صلاحیت سے ہوتا ہے۔ گیریژن سٹیٹ بننے کی یہ بنیادی شرط پاکستان پوری کرتا ہے۔

بیرونی جارحیت اور اندرونی خلفشار کے خوف نے جمہوریت کی کمزور اساس کے ساتھ مل کر نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارہ پانے والی ریاستوں میں تشدد کے ماہرین کی بڑی تعداد کے لئے اسلحہ حاصل کرنے اور تربیت لینے کے مواقع اور یوں چھاؤنی سازی کی بنیاد فراہم کردی ہے۔

اگر ایسی ریاست طاقتور سرپرست ریاست یا ریاستوں کی مدد سے اپنی معاشی اور فوجی

طاقت بڑھانے کی تگ و دو کرتی ہے تو ترقی پذیر ہونے کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور وہ اپنی عسکری صلاحیتیں بڑھا کر گیریژن سٹیٹ کی خوبیاں پیدا کر سکتی ہے۔ البتہ غیر ملکی معاشی اور عسکری امداد کا مطلب یہ بھی ہے کہ۔ ڈونر ریاست نو آبادیاتی نظام سے نجات پانے والی ریاست پر غلبہ حاصل کر لے۔ ایسی ریاست کے لئے عموماً پیار اور مار دونوں کے استعمال کی پالیسی اپنائی جاتی ہے۔

بین الاقوامی سیاست کی انارکی والی نوعیت کو دیکھتے ہوئے کسی طفیلی Dependent ریاست میں بھی توڑ جوڑ کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ مؤخر الذکر ریاست اپنی خودمختاری کے تنوع کے ذریعے ڈونر ریاست کے دباؤ کی مزاحمت کر سکتی ہے۔ اگرچہ ڈونر کو بہر حال غلبہ حاصل رہتا ہے۔ پاکستان کا طویل ترین اور انتہائی گہرا انحصار امریکہ پر رہا جبکہ چین اور سعودی عرب 2 دیگر بڑی ڈونر ریاستیں ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی جارحیت کے خوف کے علاوہ تاریخی اور ثقافتی عوام بھی گیریژن سٹیٹ کا نظریہ پیدا کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ایسے نظریے کے بنیادی عناصر میں دشمن کو مطعون کرنا خودشناختی کا شکار ہونا اور مضبوط اور طاقتور فوج کو لازمی قرار دینا شامل ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان جیسی نظریاتی ریاست کیلئے قومی شناخت کا سوال ایسے پہلو کا حامل ہے جو اس ریاست کے ارفع مقاصد اور عزائم کا حوالہ دیتا ہے۔ سیاسی اسلام اپنے تمام تر جادوئی تاثرات اور منشور کے ساتھ تصوراتی اور نظریاتی امنگیں پیدا کرتا ہے جس سے ایک ریاست اپنا نظریہ ماخوذ کر سکتی ہے۔

پاکستان اس وقت تک مابعد نو آبادیاتی گیریژن سٹیٹ کے طور پر چلتا رہ سکتا ہے جب تک ڈونر ممالک اسے مطلوبہ وسائل فراہم کرنے کی خواہاں رہتے ہیں اور یہ اپنے عوام کو قائل کر کے یا جبراً یہ کہہ سکتا ہے کہ ملک کی بقا کے لئے فوج اور سکیورٹی کے نقطہ نظر سے وسائل کی بے انتہا فراہمی ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

عباس، حسن، 2005ء: Pakistan,s Drift into Extremism
نئی دہلی، پینٹا گون پریس

احمد، اشتیاق، 1987ء: The Concept of an Islamic State
لندن، فرانسس پرنٹر
علوی، حمزہ، 1972ء: The State in post colonial socities
عزیز مظہر، 2008ء، ملٹری کنٹرول ان پاکستان: لندن، نیویارک، بوزن بیری،
1991ء: Peoples, states and Fears
نیویارک، لندن، ہارویسٹرویٹ شیف
بھاسکر، اودے، 18 تا 23 اکتوبر 2008ء: Revisiting Civil=military relations
لاہور: دی فرائیڈے ٹائمز
چیمہ پرویز اقبال، 1990ء پاکستان ڈیفنس پالیسی 58-1947ء: لندن: میک ملن پریس
کوہن، سٹیفن، 1998ء، دی پاکستان آرمی: آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس
آئزن ہاور، ڈوائٹ ڈی۔ 17 جنوری 1961ء کو صدر کا امریکی قوم سے الوداعی
خطاب (23-04-2008) Hyperlink,
فاروقی، احمد 2003ء: Rethinking the National Security of Pakistan,
ہمپشائر: ایش گیٹ
منز، ایس ای، 1976ء دی مین آف دی ہاؤس بیک: دی ملٹری ان پالیٹکس: پینگوئن بکس: ٹڈل
ایسکس گنگولی، سمٹ، 2010ء، انڈیا
The Genesis of Nonalignment
نئی دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس
گلوبل فائر پاور، 2011ء، انڈیا Hyperlinic
(6 مئی 2011ء کو ویب سائٹ وکی)
حقانی، حسین Pakistan between mosque and Military
واشنگٹن، کارنیگی انڈ ومنٹ
ہننگٹن سیموئل پی، Changing Pattern of Military Politics
نیویارک، فری پریس آف گلینکو

حسین، زاہد 2008ء، فرنٹ لائن پاکستان، لندن: آئی بی ٹوریٹس اینڈ کمپنی لمیٹڈ
جلال عائشہ 1990ء، دی سٹیٹ آف مارشل لاء، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج
جھاللت، 2009ء: India and Pakistan very casual in talking nuking of each other
بل کلنٹن، انڈین ایکسپریس، 30 ستمبر 2009ء
خان فضل مقیم 1973ء، Pakistan's Crisis in leadership
اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن
خان، ایم اصغر 2008ء، میری سیاسی جدوجہد، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی
خان، محمد ایوب 2006ء، فرینڈز نات ماسٹرز، اسلام آباد، مسٹر بکس
خان، راجا محمد، 2011ء (6 جون) پاکستان: ان سائیڈ دی ملٹری بجٹ، www.opinion-maker.org (یکم جنوری 2012ء کو ویب سائٹ)
خان ذوالفقار علی، 1998ء پاکستان سکیورٹی، لاہور، پروگریسو پبلشرز
کوکس ڈینس، 2001ء: یونائیٹڈ سٹیٹس اینڈ پاکستان 1947-2000ء نیویارک، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔
راپورٹ، جونیئر رابرٹ، 1969ء: Succession in Pakistan
ایشین سروے، جلد 9 شمارہ نمبر 11 (نومبر 1969ء)۔
راس ویل، ہیرالڈ، 1947ء: Esseys on the Garrison State نیوجرسی، ٹرانسیکشن پبلشرز۔
میکاوی، نکولو، 1982ء: The Prince and othe political writings لندن: ایوری مین لائبریری۔
مارگینتھو، ہنیس 1948ء، پالیٹکس امنگ نیشنز، نیویارک: الفریڈ کنوپ۔
نواز شجاع 2008ء کراسڈ سورڈز، کراچی، آکسفورڈ یونیورسی پریس۔
نیلسن پالمیئر، جیک 1993ء بریونیو ورلڈ آرڈر، میری کنول، نیویارک: اوربس بکس۔
اولڈنبرگ، فلپ 2010ئانڈیا پاکستان اینڈ ڈیموکریسی، لندن روٹ لیج۔
راشد احمد، 2009ء: Desent in to chaos لندن: پینگوئن بکس۔
رضوی، حسن عسکری، 2000، دی ملٹری اینڈ پالیٹکس ان پاکستان 1947-1997ء، لاہور، سنگ میل

پبلی کیشنز۔
رضوی، حسن عسکری، 2003ء: ملٹری، سٹیٹ اینڈ سوسائٹی ان پاکستان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔
شوارتنز، ہیوویل 2005ء، Fear and the Garrision State واشنگٹن، رینڈ کارپوریشن (6 مئی 2011ء کو ویب سائٹ کے ذریعے رسائی)۔
صدیقہ، عائشہ 2007ء، Military Inc; Inside Pakistan,s Military Economy کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔
صدیقی، اے آر (بریگیڈیئر ریٹائرڈ)، 1996ء، دی ملٹری ان پاکستان: امیج اینڈ ایبلٹی، لاہور، وینگارڈ،
ایس آئی پی آر آئی، 2011ء، 14 مارچ 2011، SIRRI کے نئے اعداد و شمار کے مطابق بھارت دنیا کا سب سے بڑا اسلحے کا خریدار ہے۔ WWW.Sipri.org(media)
سٹینلے جے اینڈ سیگل، ڈیوڈ آر 1997ء، گیریژن سٹیٹ پر ہیرالڈ راس ویل کے مضامین پر مبنی کتاب۔ Landmarks in Defense Literature نیوجرسی، ٹرانزیکشن پبلشرز۔
ویژوئل اکنامس، 2010ء، ہاؤ کنٹریز سپینڈ ڈیرمنی، بذریعہ ویب سائٹ۔
والٹ، سٹیفن ایم، 1987ء The Origins of Alliancess
والٹز، کینتھ، 1979ء، تھیوری آف انٹرنیشنل پالیٹکس، نیویارک۔
وسیم، محمد 2009ء، سول ملٹری ریلیشنز ان پاکستان، نئی دہلی
ویبر میکس، 1993ء، دی سوشیالوجی آف ریلیجن، بوسٹن
ونک، آندرے، 1997ء، الہند، میکنگ آف انڈو اسلامک ورلڈ، جلد دوم
یونگ تان تائی، 2005ء، دی گیریژن سٹیٹ، نئی دہلی، مینیج پبلی کیشنز۔
غیر جانبدار رپورٹ: آئی پی پی کی تیسری سالانہ رپورٹ 2010ء، لاہور انسٹی ٹیوٹ آف پبلک پالیسی، بیکن ہاؤس یونیورسٹی۔

انٹرویو

پاکستان

جنرل مرزا اسلم بیگ، 31 اکتوبر 2007ء، راولپنڈی۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) نصیر اختر، سابق کور کمانڈر کراچی، 7 دسمبر 2008ء، لاہور

بریگیڈیئر (ر) یعسوب علی ڈوگر، 25 جنوری 2008ء، سنگار پور

لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد اسد درانی، 31 اکتوبر، راولپنڈی

کرنل (ر) اسلم چیمہ، 12 دسمبر 2008ء، راولپنڈی

میجر جنرل (ر) سرفراز اقبال، 14 دسمبر 2008ء، راولپنڈی

لیفٹیننٹ جنرل (ر) حمید گل، 17 دسمبر 2008ء، راولپنڈی

لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید اشرف قاضی، 19 دسمبر 2008ء، راولپنڈی

جنرل جہانگیر کرامت، 22 دسمبر 2008ء، لاہور

لیفٹیننٹ جنرل (ر) نشاط احمد، 22 دسمبر 2008ء، لاہور

میجر جنرل (ر) محمود علی درانی، 20 مارچ 2009ء، سنگار پور

میجر جنرل (ر) آغا ہمایوں امین، 10 نومبر 2011، لاہور

بھارت

لیفٹیننٹ جنرل (ر) کلدیپ سنگھ کھجوریہ، 10 نومبر 2010، نوئیڈا، دہلی

میجر جنرل (ر) افسر کریم، 10 نومبر 2010ء، نوئیڈا، دہلی

کموڈور (ر) سی اودے بھاسکر، 29 نومبر 2011ء بذریعہ ای میل

باب 2

قیام پاکستان کے بارے میں برطانیہ، امریکہ اور سوویت یونین کا رویہ

برطانیہ عظمیٰ

پاکستان کے قیام کا مطالبہ 1937ء میں ہندوستان میں صوبائی انتخابات کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آیا۔ الیکشن میں آل انڈیا مسلم لیگ کو اس دعوے کے باوجود زبردست ہزیمت اٹھانا پڑی کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس نے 1585 نشستوں میں سے 711 نشستیں جیت لیں۔ کانگریس نے پہلے 6 اور بعد ازاں 8 صوبوں میں وزارتیں قائم کر لیں۔ برصغیر کے شمال مغربی سٹریٹیجک خطے میں مسلمانوں کی اکثریت والی علاقائی جماعتوں نے مسلمانوں کیلئے مخصوص نشستیں حاصل کر لیں۔ اس بات کے کچھ شواہد موجود ہیں کہ صوبہ متحدہ (یوپی) میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مخلوط حکومت کے قیام کا معاہدہ طے پایا تھا لیکن ملک کے دیگر حصوں میں مسلم لیگ کا صفایا ہونے پر کانگریس معاہدے سے مکر گئی۔ اس کے ردعمل میں مسلم لیگ نے اپنا راستہ الگ کر لیا جو ہندوستان کی تقسیم پر منتج ہوا۔ (جلال 1985: سیروائی 1989ء: وہ لپرٹ 1984)۔ 1939 میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور برطانیہ نے ہندوستانی قیادت سے مشاورت کئے بغیر ہندوستان کو بھی جنگ میں دھکیل دیا۔ کانگریس نے احتجاجاً اپنے وزراء کو مستعفی ہونے کا حکم دیا اور خود مختاری کی تحریک شروع کر دی۔ انگریزوں نے مشکل وقت میں عدم تعاون کو غداری سے تعبیر کیا، البتہ مسلم لیگ نے کچھ جھجک کے بعد جنگ کی

کوشش کی حمایت کا فیصلہ کیا۔

مسلم لیگ کا الگ مسلم ریاستوں کا مطالبہ

23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ نے باضابطہ طور پر شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں کی الگ ریاست/ریاستیں بنانے کا مطالبہ کر دیا۔ اس وقت کے وائسرائے لنلتھگو نے انگریز نواز احمدی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے لیڈر سر ظفر اللہ خان کے ذریعے مسلم لیگ کی الگ ریاستوں کے قیام کے مطالبے کی حمایت کی۔ اس اقدام کا مقصد باغی کانگریس لیڈروں پر دباؤ ڈالنا تھا جو آٹھ صوبوں میں حکومت قائم کرنے کے باوجود جنگ کی کوششوں میں تعاون کرنے سے گریزاں تھے۔ (خان 1987: 30-29)۔ البتہ برطانیہ پر امریکیوں کا دباؤ تھا کہ وہ اقتدار ہندوستان کے مقامی رہنماؤں کے حوالے کرے۔ وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے برطانوی کابینہ کے رکن سر سٹیفورڈ کرپس کو مارچ 1942 میں ہندوستان بھیجا تا کہ وہ برطانوی عملداری کے اندر ہندوستانیوں کو اقتدار کی منتقلی کے امکانات کا جائزہ لیں۔ کرپس مشن نے الگ مسلم ریاست کے قیام کا موہوم اشارہ ضرور دیا لیکن اس ضمن میں کوئی ضمانت نہیں دی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے مشن کی سفارشات مسترد کر دیں کیونکہ اس سے ان دونوں کے بنیادی مطالبات کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ کانگریس ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتی تھی جبکہ مسلم لیگ الگ ریاست کا قیام چاہتی تھی۔ (مینسر گ اینڈ لومبی 1970: 51-745)۔

اگست 1942ء میں مہاتما گاندھی نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کا آغاز کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ میں پھنسا برطانیہ اس وقت کمزور ہے لہٰذا ایک فعال تحریک کے ذریعے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ ان کی ایک خام خیالی ثابت ہوئی۔ کانگریس کو پورے ملک میں مطلق اکثریت حاصل نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ پنجاب جیسے بعض اہم صوبوں جہاں سے انگریزوں کو فوج کی بھرتی ملتی تھی کے علاقائی لیڈر جنگ کی حمایت کر رہے تھے۔ قومی سطح پر مسلم لیگ بھی برطانیہ کی حمایت کر رہی تھی۔ وائسرائے لنلتھگو نے پوری طاقت کے ساتھ کریک ڈاؤن شروع کر دیا چنانچہ چند ہفتوں کے اندر کانگریس کی پوری قیادت سلاخوں کے پیچھے تھی۔ کوڑوں اور دیگر سر عام سزاؤں کے ذریعے عام لوگوں کا جوش ٹھنڈا کر دیا گیا۔ ''ہندوستان

چھوڑ دو' تحریک سے جہاں کانگریس اوراس کی قیادت کوانگریزوں کی توہین کا مرتکب قرار دیا گیا وہاں مسلم لیگ اوراس کے لیڈر محمد علی جناح کو اہم اتحادی سمجھا جانے لگا۔ (فرینچ 1997: سریلا 2005، ٹالبوٹ 1996ء)۔

وائسرائے لارڈ ویول

فیلڈ مارشل لارڈ ویول 20 اکتوبر 1943ء کو ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے۔ اگر چہ ان کے پیشرو لنلتھگو نے کامیابی کے ساتھ کانگریس کی تحریک کو کچل دیا تھا تاہم لارڈ ویول اس بات کے قائل تھے کہ انگریزوں کو ہندوستان میں زیادہ طویل عرصے تک نہیں رہنا چاہیے۔ مسلم لیگی رہنماؤں کی مقبولیت میں ڈرامائی انداز میں اضافہ ہوگیا جبکہ کانگریس کے لیڈر بدستور عتاب میں رہے۔ جون 1945ء میں لارڈ ویول نے شملہ میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا تا کہ ہندوستانیوں کو انتقال اقتدار کی شرائط پر بات کی جا سکے۔ کانگریس کے لیڈر چند روز قبل جیلوں سے رہا کئے جا چکے تھے۔ یہ لوگ ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے وقت 1942ء سے جیلوں میں بند تھے۔ محمد علی جناح نے اصرار کیا کہ صرف مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے طور پر مدعو کیا جائے۔ لارڈ ویول نے مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اگر چہ یہ کانفرنس ناکام رہی لیکن عملاً جناح مسلمانوں کے واحد ترجمان کے طور پر ابھر کر سامنے آئے (جلال 1985)۔ حکومت نے 1946ء کے اوائل میں صوبائی انتخابات کا اعلان کیا۔ دسمبر 1945ء میں وائسرائے ویول نے ایک ٹاپ سیکرٹ دستاویز تیار کی جس کا عنوان تھا دی بریک ڈاؤن پلان۔ مقصد یہ تھا کہ اگر ہندوستان میں امن وامان کی صورتحال قابو سے باہر ہو جاتی ہے تو فوری طور پر انگریز یہاں سے نکل سکیں۔ اس پلان میں سفارش کی گئی کہ اگر مسلمان ہندوستان کی تقسیم پر زور دیں تو مسلمانوں کی اکثریت والا ملک پاکستان بنا دیا جائے۔ البتہ پاکستان والے علاقے میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد وہاں نہیں رہنا چاہے گی۔ اس لئے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا جائے تا کہ وہاں کی غیر مسلم آبادی والے علاقے بھارت کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ ویول کا خیال تھا کہ ہندوستان کی ایسی انتہائی تقسیم جناح کو ہندوستان کی تقسیم پر اصرار کرنے سے روکے گی۔ (مینسرگ اینڈ مون 1976)۔ بریک ڈاؤن پلان میں انہوں نے دونوں نئے ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد بھی تجویز کی۔ (ایضاً: صفحہ 912)۔ چنانچہ 17

اگست 1947ء کو ریڈ کلف نے سرحد بندی کا جو ایوارڈ اعلان کیا وہ ہو بہو ویول کے پلان سے مشابہہ تھا۔ ویول کا پلان انتہائی خفیہ تھا جس کا لندن اور دہلی کے چیدہ چیدہ افراد کو ہی علم تھا۔

فروری 1946ء کے انتخابات

اس دوران محمد علی جناح پاکستان کے منصوبے کی حمایت کے لئے انتھک مہم جاری رکھے ہوئے تھے۔ مسلمان ووٹروں کو متوجہ کرنے کیلئے انہوں نے مسلمان علما اور مشائخ کی خدمات حاصل کیں جن کی مسلمانوں میں کافی شنوائی تھی۔ یہ لوگ مساجد اور مزارات کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ رابطے میں تھے۔ 1944ء سے تقسیم ہند تک علما اور پیروں کو پاکستان کے مطالبے کی حمایت کے لئے متحرک رکھا گیا۔ پاکستان کو ایک ایسی تصوراتی ریاست کے طور پر پیش کیا گیا جہاں انصاف اور نیکوکاری اسلام کی حقیقی روح کے مطابق ہوں گے۔ اس مہم کے نتیجے میں مسلم لیگ نے عوامی اجتماعات میں جذباتی نعروں کے ذریعے اسلامی جذبات کو ابھارا۔ اس بات کا واضح ثبوت وائسرائے ویول کو گورنر پنجاب سر برٹرینڈ گلینسی کی طرف سے 2 فروری 1946ء کو ارسال گئی 15 روزہ خفیہ رپورٹ میں ملتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

''مسلم لیگی مقررین اپنی تقریروں میں بتدریج انتہا پسند بنتے جا رہے ہیں۔ مولوی اور پیر اور طلبا پورے پنجاب میں گھوم کر یہ تبلیغ کر رہے ہیں کہ وہ مسلمان جو مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیں گے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ ان کے نکاح ٹوٹ جائیں گے۔ اور وہ مسلم کمیونٹی کا حصہ نہیں رہیں گے...... ان حالات میں یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ انتخابات کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس بات میں کم ہی شبہ ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے ''اسلام خطرے میں ہے'' کے نعرے کے بعد اسمبلیوں میں اس کی نشستیں نمایاں تعداد میں بڑھیں گی جبکہ یونینسٹ پارٹی کے امیدواروں کی سیٹوں میں کمی آئے گی''۔ (کارٹر 2006ء صفحہ 171)۔

اس قسم کی سرگرمیاں شمال مغربی سرحدی صوبے میں نظر آئیں۔ محقق آرلینڈ جانسن نے انڈیا، پاکستان یا پختونستان کے عنوان سے اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھا کہ:

''پیر صاحب مانکی شریف نے اپنی تنظیم انجمن الصوفیا بنائی۔ اس انجمن نے اس شرط پر مسلم لیگ کی حمایت کا وعدہ کیا کہ پاکستان کے قیام کے بعد وہاں شریعت نافذ کی جائے گی۔ اس پر

جناح نے رضامندی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ پیر صاحب مانکی شریف نے پاکستان کے قیام کیلئے جہاد کا اعلان کر دیا اور اپنی انجمن الصوفیا کے ارکان کو حکم دیا کہ وہ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کریں''۔ (صفحہ:166)۔

اس ضمن میں محمد علی جناح کی طرف سے نومبر 1945ء میں پیر مانکی شریف کو لکھا گیا خط انکشاف انگیز ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:

''یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ آئین ساز اسمبلی جس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہوگی مسلمانوں کیلئے ایسے قوانین بنا سکے گی جو شرعی قوانین سے متصادم نہیں ہوں گے۔ اور مسلمان غیر اسلامی قوانین پر عمل کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ (آئین ساز اسمبلی پاکستان میں ہونے والی بحثیں، جلد5، 1949، صفحہ 46)۔

مسلم لیگ نے انتخابات میں کلین سویپ کیا۔ اس نے مسلمانوں نے کیلئے مخصوص 495 میں سے 440 نشستیں جیت لیں۔ دوسری طرف کانگریس نے 1505 میں سے اکثریتی 905 عام نشستیں جیت لیں۔ قبل ازیں جولائی 1945ء برطانیہ میں لیبر پارٹی برسراقتدار آچکی تھی۔ وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی انگریزوں سے اقتدار ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کے زیادہ مخالف نہیں تھے۔ تاہم وہ ہندوستان ترجیحاً متحدہ ہندوستان کو دولت مشترکہ میں رکھنے کے ضرور خواہاں تھے۔

برطانوی فوج کا بھارت اور پاکستان پر نقطہ نظر

مئی 1946ء میں برطانوی فوجی اسٹیبلشمنٹ کا مؤقف یہ تھا کہ برطانیہ کو ہندوستان پر بدستور مؤثر کنٹرول برقرار رکھنا چاہیے اور یہ کہ ہندوستان کو متحدہ ہی رہنا چاہیے۔ چاہے کافی حد تک خودمختار حکومت کیوں نہ قائم ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آنے والے کئی برسوں تک برطانیہ دفاع اور سکیورٹی کے موضوعات پر ہندوستانی قیادت کے ساتھ ذمہ داریوں کی شراکت جاری رکھے۔ اس مقصد کی بنیادی وجہ طاقتور اور غیر منقسم ہندوستانی فوج برقرار رکھنا تھا۔ یوں 11 مئی 1946ء کو فیلڈ مارشل سر کلاؤڈ آکن لیک Sir Claude Auchinleck نے ''پاکستان کی دولت مشترکہ میں شمولیت کے سٹریٹجک مضمرات'' کے عنوان سے ایک ٹاپ سیکرٹ نوٹ تیار کیا۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام -- چاہے شمال مغرب میں ایک یونٹ یا شمال مشرق میں

دوسرے زون پر مشتمل حصہ-- کے نتائج وعواقب کی طویل اور تفصیلی سٹڈی میں فوج کے سربراہ آکن لیک نے نتیجہ اخذ کیا کہ یہ بات برطانیہ کے مفاد میں نہیں ہوگی کہ بحر ہند میں فوجی اور معاشی لحاظ سے ایک کمزور ریاست (پاکستان) ہو جبکہ ایک طاقتور ملک بھارت برطانیہ کی گرفت سے نکل کر سوویت یونین کی گود میں جا سکتا ہے۔ اپنی رپورٹ کے آخر میں انہوں نے مؤقف کو اس طرح بیان کیا:

''اگر بحر ہند کے علاقے میں سمندری اور فضائی طور پر اپنی طاقت کی آزادانہ نقل وحرکت چاہتے ہیں، جو کہ میرے نزدیک برطانوی دولت مشترکہ کی بقا کیلئے ضروری ہے تو یہ کام ہم صرف ہندوستان کو متحد رکھ کر ہی کر سکتے ہیں۔ یہ متحد ملک دولت مشترکہ کا ایک ایسا فعال رکن ہوگا جو اپنے دفاع کو اپنے وسائل تک محدود رکھے گا''۔ (ایضاً: صفحہ 806)۔

آکن لیک کے مؤقف سے ان کے ہم عصر جنرلوں کا اتفاق ہونا ضروری نہیں تھا۔ جنرل مین General Mayne نے خفیہ نوٹ میں اس فقرے ''جو میرے نزدیک ضروری ہے...... دولت مشترکہ تک'' کی جگہ'' میں اتفاق نہیں کرتا'' کا اضافہ کیا۔ ایسٹرن کمانڈ کے جنرل آفیسر کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹوکر General Sir Francis Tuker نے پاکستان کی طرف سے کمانڈ کی چھڑی سنبھالی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ہندوازم ایک تو ہم پرست مذہب ہے اور ذات برادری کے نظام نے ہندوؤں کے درمیان یکجہتی قائم نہیں ہونے دی۔ یوں ایک بفر زون قائم ہونے تک مجبور اور مقہور ہندوستانی برابری اور سماجی شراکت کے کمیونسٹ نظریے سے مسحور ہو کر اس کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔ ہندو بھارت کے مایوس کن پہلو پر آگے چلتے ہوئے جنرل ٹوکر نے لکھا کہ:

''چنانچہ برطانوی سائنس کی حمایت سے ایک نئی مسلم طاقت کیلئے بہت کچھ کیا'' جا سکتا ہے۔ اگر ایسی طاقت بنائی جا سکتی ہے اور اگر ہم شمالی افریقہ سے اسلامی صحرائی خلیج سے ہوتے ہوئے ایران، افغانستان سے ہمالیہ اور شمالی ہندوستان تک ایک مسلمان پٹی وجود میں لاتے ہیں تو اس بات کے امکانات ہیں کہ ہم روس کو خلیج فارس کی طرف بڑھنے سے روک سکیں گے۔ ان اسلامی ملکوں میں اگر ترکی بھی شامل کر لیں تو بھی یہ کوئی اتنی بڑی طاقت نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر شمالی ہندوستان میں کروڑوں کی آبادی والا اسلامی ملک قائم ہوتا ہے تو اس بات کی توقع کرنا

مناسب ہوگا کہ روس اسے اتنی جلدی چھیڑنے کی کوشش نہیں کرے گا''۔(ایضاً:صفحہ 27-26)۔

کابینہ مشن پلان

1945ء میں برطانیہ میں ہونے والے انتخابات میں ونسٹن چرچل کی کنزرویٹو پارٹی کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور لیبر پارٹی کے کلیمنٹ ایٹلی ملک کے نئے وزیراعظم بن گئے۔انہوں نے 1946ء کے شروع میں ہی برطانوی کابینہ کے 3 ارکان پر مشتمل وفد ہندوستان بھیجا تا کہ انتقال اقتدار کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکے۔طویل ملاقاتوں اور سیر حاصل بحث میں کابینہ مشن کا مطمح نظر زیادہ تر ہندوستان کو متحد رکھ کر انتقال اقتدار رہا۔اس دوران انہیں اندازہ ہوا کہ کانگریس ہندوستان کو متحد رکھنے پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں۔جبکہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کیلئے الگ وطن پاکستان کا مطالبہ کیا۔اس کے علاوہ جناح نے حکومت میں ففٹی ففٹی نمائندگی کا مطالبہ کیا۔حالانکہ ہندوستان کی کل آبادی کا مسلمان محض ایک چوتھائی حصہ تھے۔(مور1983:7-556)۔نتیجتاً 16 مئی 1946ء کو مشن نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا۔اس نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ یکسر مسترد کر دیا تاہم مسلمانوں کے تحفظات کو تسلیم کیا۔

''اس فیصلے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم مسلمانوں کے ان حقیقی خدشات کی طرف آنکھیں بند کر لیں کہ ان کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی خالصتاً متحدہ ہندوستان میں متاثر ہو سکتی ہے جہاں ہندو بہت بڑی تعداد میں ہونے کی وجہ سے غالب عنصر ہوں گے''۔ (مینسرگ اینڈ مون 1977)۔

کابینہ مشن نے جو حل پیش کیا اس میں دیگر چیزوں کے علاوہ یونین آف انڈیا کا مقام شامل تھا جو برطانیہ کی عملداری والے ہندوستانی علاقوں اور خودمختار ریاستوں کے خارجہ امور، دفاع اور مواصلات کے شعبوں کا نگران ہو۔وفاقی حکومت کے پاس انہی تینوں شعبوں کے حوالے سے فنڈ جمع کرنے کے بھی اختیارات ہوں۔ماتحت سیکشن یا گروپ صوبوں پر مشتمل ہوں گے۔گروپ اے ہندو اکثریت والے صوبوں مدراس، بمبے، یوپی، بہار، سی پی اور اوڑیسہ، گروپ بی مسلم اکثریت والے صوبوں پنجاب، شمال مغربی سرحد صوبہ اور سندھ جبکہ گروپ سی شمال مشرق میں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں والے صوبوں بنگال اور آسام پر مشتمل ہو گا۔اس کے علاوہ

''مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے آئین میں یہ شق شامل ہو کہ متعلقہ قانون ساز اسمبلی کے اکثریتی فیصلے سے ہر 10 سال بعد وہ آئینی پابندیوں میں تبدیلی کر سکیں''۔(ایضاً)

کانگریس نے 24 مئی 1946ء کو ایک قرارداد کے ذریعے تجاویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ: آزاد ہندوستان ہر لحاظ سے مرکزی اتھارٹی کا حامل ہوتا کہ وہ قوت اور وقار کے ساتھ اقوام عالم میں اپنی قوم کی نمائندگی کر سکے۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے 6 جون 1946ء کو ایک قرارداد منظور کر کے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان کے قیام کے مطالبے کو پوری طرح پذیرائی نہیں بخشی گئی۔ تاہم کابینہ مشن پلان اس لئے منظور کیا جاتا ہے کہ اس میں بہرحال گروپ بی اور گروپ سی پر مشتمل مسلمانوں کے الگ صوبے یکجا کئے گئے ہیں۔

16 جون 1946ء کو کابینہ مشن نے عبوری حکومت کے قیام کی تجویز دی۔ 25 جون کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے عبوری حکومت کے قیام کی تجویز مسترد کر دی لیکن آئینی تجاویز قبول کرتے ہوئے تجویز دی کہ وہ کابینہ مشن پلان کی اپنی تشریح کرے گی۔ ٹھیک اسی روز مسلم لیگ نے عبوری حکومت کی تجویز قبول کر لی لیکن کانگریس کی طرف سے اپنی تشریح کرنے کا مطالبہ رد کر دیا۔ 10 جولائی کو بمبئی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران نہرو نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی میں داخل ہونے کے بعد کانگریس کسی معاہدے کی پابند نہیں ہوگی۔ (مینسرگ اینڈ مون 1975ء:25)۔ مسلم لیگ نے 29 جولائی کو ایک بیان میں اعلان کیا کہ پارٹی کو نہرو کے ریمارکس سے سخت تشویش لاحق ہوئی ہے۔ کیونکہ ان میں ہندوستانی اقلیتوں کا مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے۔ کچھ روز بعد مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان کی حمایت کا فیصلہ واپس لیتے ہوئے دھمکی دی کہ وہ پاکستان کے حصول کے لئے راست اقدام کرے گی۔ (ایضاً۔9-135)۔ چنانچہ راست اقدام کے لئے 16 اگست کی تاریخ مقرر کی گئی۔

عبوری حکومت اور فرقہ وارانہ فسادات

مسلم لیگ کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب وائسرائے ویول نے جواہر لال نہرو کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی۔ 13 اگست کو نہرو نے جناح کو خط لکھ کر عبوری قومی حکومت کے قیام میں تعاون کرنے کی درخواست کی لیکن مسلم لیگ کی طرف سے راست اقدام کی کال کا نتیجہ

بالخصوص کلکتہ میں غیر معمولی فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں نکلا۔ اگر چہ ابتدائی حملے مسلمان شر پسندوں نے کئے لیکن کچھ روز بعد ہندوؤں نے خوفناک ردعمل کا مظاہرہ کیا جس سے 2 ہزار سے 4 ہزار افراد خون میں نہا گئے۔ گھروں اور جھونپڑیوں کو نذر آتش کرنے سے ایک لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ (ایضاً 40-239-304-293)۔

بہر حال عبوری حکومت نے 24 اگست کو اقتدار سنبھال لیا جس میں نہرو نائب سربراہ تھے جبکہ وائسرائے بدستور ملک کے چیف ایگزیکٹور ہے۔ حکومت نے ایک بار پھر مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مسلم لیگ نے حکومت میں شمولیت کیلئے شرط لگائی کہ اسے ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ یہ شرط مان لی گئی چنانچہ مسلم لیگ بھی 15 اکتوبر کو کابینہ میں شامل ہو گئی۔ لیکن عبوری حکومت کے وزراء کے درمیان دشمنی، بداعتمادی اور شکوک وشبہات مزید بڑھ گئے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے وزراء ایک دوسرے کے الٹ چلتے رہے۔ مرکز میں شراکت اقتدار کے کسی فارمولے کی عدم موجودگی میں ہندوستان کی تقسیم ناممکن نظر آ رہی تھی۔

اس کے علاوہ کلکتہ کے فسادات بھی طاعون بن کر پھیل گئے اور ہندوستان کے کئی علاقوں میں پرتشدد واقعات رونما ہوئے۔ بمبئی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم میں دونوں طرف سینکڑوں افراد کا جانی ضیاع ہوا۔ مشرقی بنگال کے علاقے نواکھلی میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کر کے 400 کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندوؤں نے بھی 27 ستمبر کو جوابی کارروائی کی اور پھر 25 اکتوبر سے نومبر کے پہلے ہفتے تک بہار میں مسلمانوں کے خلاف بربریت کا مظاہرہ کیا گیا۔ بعض مبصرین کے مطابق یہ وہی ہندو مزدور تھے جو کلکتہ میں خونریزی سے بھاگ کر بہار آئے اور انتقاماً مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑ دیے۔ بہار کے گورنر سرایچ ڈاؤ نے انکشاف کیا کہ بہار میں کانگریس کی حکومت نے قتل و غارت روکنے میں نیم دلانہ دلچسپی لی۔ (مینسرگ اینڈ مون 1980)۔ بہار میں 5 ہزار افراد کا قتل عام کیا گیا اور تقریباً یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ شمالی ہندوستان کے صوبہ متحدہ (یوپی) میں اکا دکا تشدد کے واقعات ہوئے۔ دسمبر 1946ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ میں خونریز فسادات پھوٹ پڑے اور مسلمانوں نے ہندو اور سکھ اقلیت کو نشانہ بنایا۔ مارچ 1947ء کے شروع میں پنجاب کے کئی شہروں میں متعدد فسادات ہوئے جن میں 2 سے

5 ہزار افراد مارے گئے۔ (احمد 2012ء:-127-193)۔

20 فروری 1947ء کا اعلان اور ماؤنٹ بیٹن بطور آخری وائسرائے

20 فروری 1947ء کو وزیراعظم ایٹلی نے شاہ معظم کی حکومت کے اس ارادے کا اعلان کیا کہ جون 1948ء سے پہلے ہر صورت میں اقتدار ہندوستان کو منتقل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وزیراعظم ایٹلی نے شاہ برطانیہ کے ایک کزن ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کے آخری وائسرائے کے طور پر منتخب کیا تا کہ وہ انتقال اقتدار کے عمل کی نگرانی کر سکیں۔ اس عرصے میں پنجاب میں جو خونریزی ہوئی اس نے سکھوں کو کافی مشتعل کر دیا تھا۔ (مینسرگ اینڈ مون 198، صفحہ 69-965)۔ مارچ 1940ء میں قرارداد لاہور منظور ہونے کے بعد سکھوں نے اصرار کیا تھا کہ اگر ہندوستان کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تو پھر اس بنیاد پر پنجاب کے ان علاقوں کو جہاں سکھوں اور ہندوؤں کی اکثریت ہے ان علاقوں سے الگ کیا جائے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ کانگریس پارٹی نے بھی 2 مارچ 1947ء کو ایک قرارداد کے ذریعے سکھوں کے اس مطالبے کی حمایت کی۔ (احمد 2012ء: صفحہ 139)۔

ماؤنٹ بیٹن نے 24 مارچ 1947 کو اقتدار سنبھالا اور انتقال اقتدار کیلئے تمام کمیونٹیز کے ہندوستانی لیڈروں سے طویل مشاورت کا سلسلہ شروع کیا۔ وائسرائے کو برطانوی حکومت کی طرف سے خصوصی طور پر کہا گیا تھا کہ ہندوستان چاہے متحد رہے یا منقسم ہو۔ اس کی ہر صورت میں دولت مشترکہ میں موجودگی یقین بنائی جائے۔ جناح کے ایک قریبی ساتھی نواب آف بھوپال نے ماؤنٹ بیٹن کو ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں کہا گیا کہ اگر پاکستان کا مطالبہ مان لیا گیا تو جناح کو دولت مشترکہ میں رہنے پر قائل کیا جا سکتا ہے۔ (مینسرگ اینڈ مون 1981: 36)۔ البتہ وائسرائے نے جناح کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ نہ کریں کیونکہ متحدہ ہندوستان ایک طاقتوار اور مضبوط ملک ہوگا جبکہ پاکستان معاشی اور عسکری لحاظ سے کمزور ہوگا لیکن جناح اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ اس کی بجائے انہوں نے کہا کہ پاکستان الگ ہو کر دولت مشترکہ کی رکنیت لے گا اور اس رکنیت سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔ وائسرائے کی یکم مئی 1947ء کو پرسنل رپورٹ نمبر 5 میں انہوں نے لکھا کہ جناح کہتے ہیں:

''تمام مسلمان بہت شروع سے انگریزوں کے وفادار رہے ہیں۔ہم نے انگریز فوج کیلئے بڑی تعداد میں سپاہی مہیا کئے جو دونوں عظیم جنگوں میں لڑتے رہے۔ ہمارا کوئی لیڈر کبھی غیر وفاداری پر جیل نہیں گیا۔آئین ساز اسمبلی میں اس وقت مسلم لیگ کا ایک بھی رکن نہیں تھا جب خود مختار اور آزاد جمہوریہ کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی (22 جنوری 1947ء کو قرارداد منظور ہوئی) ہم میں کسی نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمیں دولت مشترکہ سے بیدخل کرنے کا مستوجب سمجھا جائے۔آپ کا دیگر 2 ریاستوں کے بارے میں کیا خیال ہے--نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا-- کیا دیگر ریاستیں اس کو قبول کریں گی کہ ہمیں ہماری مرضی کے برخلاف بے دخل کیا جائے؟۔کیا ویسٹ منسٹر (برطانوی حکومت کا مرکز) کے قانون میں ایسی کوئی چیز ملے گی جس کے تحت آپ کسی ملک کو دولت مشترکہ سے محض اس لئے باہر رکھیں کہ اس کا ہمسایہ ملک ایسا نہیں چاہتا؟۔جب میں لندن میں تھا تو میں نے مسٹر چرچل اور سر سٹیفورڈ کرپس سے ان کے خیالات معلوم کئے۔مسٹر چرچل نے مجھے یقین دلایا کہ برطانوی عوام اس بے دخلی کی کبھی حمایت نہیں کریں گے۔سر سٹیفورڈ کرپس نے مجھے مطلع کیا کہ ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ قانون سازی کس نوعیت کی ہوگی اور کیا ہمیں اس بات کا موقع فراہم کیا جائے گا کہ ہم اپنے طور پر دولت مشترکہ میں رہنے کا فیصلہ کریں''۔(ایضاً)

وائسرائے نے جناح کو جواب دیا کہ اگرچہ میں آپ کے ساتھ جذباتی طور پر تو متفق ہوں کیونکہ اگر صرف ایک حصہ-- پاکستان-- دولت مشترکہ میں رہتا ہے اور اس بنیاد پر برطانوی افسروں کو برقرار رکھتا اور برطانوی امداد حاصل کرتا ہے تو دوسرے حصے--بھارت سے جنگ کی صورت میں۔عجیب وغریب صورتحال پیدا ہو جائے گی۔چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے خبردار کیا کہ اگر بھارت دولت مشترکہ میں شمولیت سے انکار کرتا ہے تو آپ کی تنظیم میں شمولیت کی درخواست بھی مسترد کر دی جائے گی۔اس پر مبینہ طور پر جناح نے کہا کہ ایسی صورت میں ہم شاہ انگلستان کی حکومت کے حکام سے اپیل کریں گے۔ جناح کو امید تھی کہ برطانوی عوام ان کے مؤقف کی حمایت کریں گے۔(ایضاً)۔

دوسری طرف ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ اس مسئلے پر کانگریس میں گرما گرم بحث جاری تھی کیونکہ انہیں جناح کی چال کا اب اندازہ ہو رہا ہے اور وہ اس کے نتائج وعواقب سے خوفزدہ

ہیں۔(ایضاً صفحہ 1542)۔اس کے باوجود وائسرائے کو یقین تھا کہ کانگریسی رہنماؤں کو دولت مشترکہ میں شامل رہنے پر قائل کرنے کیلئے یہ زور دینا ضروری تھا کہ پاکستان تنظیم میں شامل رہنا چاہتا ہے اور بھارت کا باہر رہنا اس کے لئے فائدہ مند نہیں ہوگا۔

برطانوی مسلح افواج کے سربراہوں کی طرف سے پاکستان کی حمایت

اس مرحلے پر برطانوی فوج کے رویے میں تقسیم ہند اور پاکستان کے قیام کے مسئلے پر ڈرامائی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔سینئر فوجی اور سول افسروں--رائل ایئر فورس مارشل لارڈ ٹیڈر کی صدارت میں اجلاس میں ایڈمرل سرجان ایچ ڈی کننگھم، فیلڈ مارشل منٹگمری لیفٹیننٹ جنرل سرلیز لی سی ہولس، وزیر دفاع، اے وی الیگزینڈر، چیف آف وائسرائے سٹاف، لارڈ اسمے اور میجر جنرل لے کاک کی شرکت--نے چیفس آف سٹاف کمیٹی کی 12 مئی 1947ء کی میٹنگ میں ایک میمورنڈم تیار کیا جس میں اس خیال کی حمایت کی گئی کہ پاکستان اگر بدستور دولت مشترکہ میں رہتا ہے تو برطانیہ کیلئے خوش آئند ہوگا۔کمیٹی نے تقسیم ہند کی حتمی تجاویز پر بھی بحث کی جو سیاسی تصفیے کی ممکنہ بنیاد سمجھی گئی۔اس میں توقع کی گئی کہ پاکستان سندھ، بلوچستان این ڈبلیو ایف پی، مغربی پنجاب، آسام اور ممکنہ طور پر بنگال کے ایک حصے پر مشتمل ہوگا۔یہ قرار دیا گیا کہ ''ایسا ممکن ہے کہ جناح...... دولت مشترکہ میں رہنے کیلئے مسلمانوں کے طرز عمل کا اعلان کریں۔کئی خود مختار ریاستوں کے سربراہ ایسا کر سکتے ہیں۔دوسری طرف ہندوستان کانگریس کے عزائم کے مطابق خود مختار ملک ہونے کا اعلان کر سکتا ہے اگر چہ اس بات کے اشارے بھی موجود ہیں کہ کانگریس کے بعض لیڈروں کو اس بات پر شبہ ہے کہ برطانوی مشیروں کے بغیر ہندوستان کی حکومت کا انتظام و انصرام چلایا جا سکتا ہے''۔(ایضاً۔788)۔

منٹگمری نے دعویٰ کیا کہ ''یہ ہمارا عظیم اثاثہ ہوگا اگر پاکستان بالخصوص اس کا شمال مغربی حصہ دولت مشترکہ میں رہے۔شمال مغربی ہندوستان کے فوجی اڈے، ایئر فیلڈز اور بندرگاہیں دولت مشترکہ کے دفاع کیلئے گرانقدر ثابت ہوں گی''۔(صفحہ 791)۔سیر حاصل غور کے بعد مسلح افواج کے سربراہوں نے اتفاق کیا کہ وہ اپنے خیالات برطانوی وزیراعظم کے سامنے پیش کریں گے۔انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ:

''سٹر ٹیجک نقطہ ءنظر سے اس بات کے زبردست دلائل موجود ہیں کہ مغربی پاکستان دولت مشترکہ میں رہے۔اس سے ہمیشہ زبردست سٹر ٹیجک سہولتیں میسر آئیں گی۔کراچی کی بندرگاہ، ہوائی اڈے اور مستقبل میں مسلمانوں کی افرادی قوت۔اس طرح ہم افغانستان کی سالمیت کا تسلسل برقرار رکھیں گے اور پوری مسلم دنیا میں اپنی وقعت بڑھانے اور حیثیت بہتر بنانے کے قابل ہوسکیں گے۔گویا مغربی پاکستان کے دولت مشترکہ کا حصہ بننے سے ہم سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔اور اس سے انکار کی صورت میں ہم برطانیہ سے وفادار لوگوں کو دولت مشترکہ سے دور رکھیں گے۔اور پھر ہمیں ہندوستان میں کہیں بھی سٹر ٹیجک سہولتیں میسر آنے کے امکانات یقیناً ختم ہو جائیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا میں ہماری ساکھ بھی خراب ہو جائے گی۔عسکری نقطہء نظر سے اس کا نتیجہ تباہ کن ہوگا''۔(ایضاً:2-791)۔

یوں برطانیہ کے اعلیٰ سول اور فوجی حکام نے دولت مشترکہ میں رہنے کی صورت میں پاکستان کے قیام کا جواز تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا۔پاکستان کا تعاون ملنے سے برطانیہ خلیج فارس کے قریب ہو جاتا جہاں اہم آئل فیلڈز موجود تھے۔

کانگریس پر دولت مشترکہ میں رہنے پر رضامند ہونے کے لئے دباؤ

اس دوران ماؤنٹ بیٹن نے پورے ہندوستان کو دولت مشترکہ میں شامل رکھنے کی کوششیں جاری رکھیں۔انہوں نے کانگریس پر دباؤ بڑھا دیا اور بیشتر لیڈر یہ سمجھنے لگے تھے کہ تنظیم کی رکنیت بھارت کے لئے فائدہ مند ہوگی۔وائسرائے سٹاف کے 7 مئی 1947ء کو 27ویں اجلاس کی رپورٹ میں یہ کہا گیا کہ انگریز حکومت سردار پٹیل کو منانے میں کامیاب ہوگئی اور نہرو بھی مان جائیں گے۔نہرو کی قیادت میں کانگریس کے بائیں بازو کے دھڑے نے شروع میں برطانوی مطالبے کی مزاحمت کی کیونکہ وہ بھارت کی مکمل آزادی چاہتے تھے۔

ایک تاریخ کے بغیر--غالب امکان ہے کہ مئی کا مہینہ تھا۔وائسرائے سٹاف کی 29ویں میٹنگ میں یہ کہا گیا کہ ''وائسرائے نے یہ کہا کہ وہ سمجھتے ہیں ہندوستان کو جون 1948ء کی بجائے 1947ء کے دوران الگ ملک کا درجہ دے دیا جائے''۔انہوں نے بھارت کے دولت مشترکہ میں رہنے کے فوائد کا ان الفاظ میں احاطہ کیا۔''برطانوی سلطنت کے دفاع کے نقطہءنظر سے بھارت

کی دولت مشترکہ میں شمولیت پوری دنیا کی حکمت عملی کی حامل ہے۔ایک غیر جانبدار ملک ایک خلا چھوڑ جائے گا جس سے مسئلہ انتہائی گمبھیر ہو جائے گا۔ایک جارحیت پسند بھارت کا مطلب ہوگا کہ ہم آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے عملاً کٹ کر رہ جائیں گے"۔(ایضاً:704)۔

بظاہر ماؤنٹ بیٹن کا اندازہ یہ تھا کہ اگر کانگریس پارٹی مان جاتی ہے تو یہ برطانیہ کے مفاد میں ہوگا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو اقتدار منتقل کر دے۔اس طرح صورتحال پیچیدہ نہیں ہو گی اور بھارتی لیڈروں کو بھی مزید اضطراب نہیں ہوگا۔مئی 1947ء کے وسط تک واضح ہو گیا تھا کہ پاکستان اور بھارت دونوں دولت مشترکہ میں شامل رہیں گے۔

امریکہ

دوسری جنگ عظیم سے پہلے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو برصغیر کی سیاست سے برائے نام دلچسپی تھی لیکن جب جنگ شروع ہوگئی تو صورتحال میں اچانک تبدیلی آ گئی۔1940ء سے آگے تک امریکہ نے ہندوستان میں ہونے والے واقعات میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی اور برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ہندوستانیوں کو خودمختاری دے دیں۔جب مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی تو امریکہ میں اس کو چنداں اہمیت نہ دی گئی تھی۔

میثاق بحراوقیانوس Atlantic Charter

12 اگست 1941ء کو امریکہ کے صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ اور برطانوی وزیراعظم نے اپنے متعلقہ سٹاف سمیت بحراوقیانوس کے ایک جنگی جہاز پر خفیہ ملاقات کی تاکہ جنگ کے دوران محوری قوتوں اور جنگ کی عمومی حکمت عملی پر غور کیا جاسکے۔اس ملاقات کا نتیجہ دونوں رہنماؤں کے درمیان اٹلانٹک چارٹر (میثاق اوقیانوس) کی صورت میں نکلا۔جو مستقبل کی اقوام متحدہ کے قیام کا بھی نقیب ثابت ہوا۔اٹلانٹک چارٹر میں سرعام نازی جرمنی،طاقت کے استعمال اور جارحیت کی مذمت کی گئی۔مزید برآں اس میں کہا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک عوام کو بنایا جائے جنہیں اس سے محروم رکھا گیا ہے۔چرچل نے اس کی تشریح یہ کہ عوام کے مقتدر حقوق کی ان ملکوں میں بحالی محدود حوالے سے کی جائے جنہیں دوسری جنگ عظیم میں بزور طاقت تقسیم کیا گیا۔روز ویلٹ نے اسے نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کا عمومی اصول سمجھا۔امریکی صدر کو گمراہ کرنے کے لئے چرچل نے ان

سے جھوٹ بولا اور کہا کہ انڈین آرمی کا 75 فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ (فرنچ 1987)۔ انہوں نے کانگریس پارٹی کو برہمن سماج کے بچاؤ اور خون آشام ذات برادری نظام کا علمبر دار قرار دیا۔ یہ بھی کہا کہ کانگریسی نہ صرف نازی جرمنوں کے خفیہ اتحادی ہیں بلکہ جاپان کے ہمدرد بھی ہیں۔ اگر چہ ایسی اطلاعات سے امریکہ کے دباؤ میں کچھ نرمی آئی لیکن بہرحال اس نے دباؤ جاری رکھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے پہلے ہزاروں امریکی فوجی شمال مشرقی ہندوستان میں تعینات تھے لیکن امریکی صدر روز ویلٹ کی زیادہ تر معلومات کا ماخذ سفارتکار اور امریکی میڈیا رپورٹر تھے۔

اجتماعی سلامتی کا تصور

انگریز پوری ایک صدی تک پہلے زار روس اور پھر سوویت یونین کے ساتھ گریٹ گیم میں مصروف رہے۔ اس طویل عرصے میں برطانوی اسٹیبلشمنٹ میں روسی عزائم کے بارے میں سخت شکوک وشبہات پیدا ہوئے کیونکہ وہاں بالشویکی انقلاب کے بعد کافی خون خرابہ ہوا۔

یالٹا کانفرنس

ایسے مجہول نقطہء نظر سے روز ویلٹ نے اتفاق نہ کیا۔ مثال کے طور پر جب 11 سے 14 فروری 1945ء کو روز ویلٹ، چرچل اور سٹالن یالٹا کے مقام پر جنگ کے بعد یورپ کی تنظیم نو کے معاملے پر غور کیلئے اکٹھے ہوئے تو روز ویلٹ اس بات پر قائل تھے کہ اگر سٹالن مشرقی یورپ میں قانونی کردار ادا کرنے کے حقیقی خواہاں ہیں تو وہ دنیا کے امن اور جمہوریت کے مفاد کیلئے مغرب کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔ چنانچہ سوویت یونین نے امریکہ کی طرف سے اقوام متحدہ میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی۔ (ایضاً: 2004)۔ نازی جرمنی کی شکست کے 90 روز بعد سوویت یونین نے جاپان کے خلاف جنگ میں شمولیت اور اپنے زیر کنٹرول ملک پولینڈ میں انتخابات کا بھی وعدہ کرلیا۔ اس موقع پر برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں دارالعوام میں اظہار خیال کرتے ہوئے چرچل نے کہا کہ:

''مجھے کریمیا کے دورے اور دیگر ذرائع سے جو تاثر ملا ہے وہ یہ ہے کہ مارشل سٹالن اور سوویت لیڈر مغربی جمہوریتوں کے ساتھ آبرومندانہ دوستی اور برابری کے ساتھ رہنے کے خواہاں

ہیں۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ وہ اپنے قول کے پکے ہیں۔ بلکہ مجھے تو سوویت یونین سے بڑھ کر اور کوئی حکومت نظر نہیں آئی جو اتنی ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سے آگاہ ہو"۔ (ایضاً صفحہ 35)۔

البتہ مارچ 1946ء میں چرچل نے اپنے مؤقف میں اس وقت ڈرامائی تبدیلی کی جب انہوں نے اپنی مشہور زمانہ "آہنی پردے" والی تقریر کی جس میں انہوں نے سوویت یونین کو جنگ کے بعد امن کیلئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ برطانیہ کی سکیورٹی پالیسی میں جنوبی ایشیا میں اس کی پوزیشن کیلئے روس ایک بڑی رکاوٹ تھا۔ چنانچہ انگریزوں کے اقتدار کے آخری ایام میں پاکستان کے قیام کے منصوبے کو پذیرائی ملنا شروع ہوگئی۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ انڈین آرمی کو مزید متحد نہیں رکھا جا سکتا اور مسلم لیگ اور مسلمان فوجی افسر الگ ریاست چاہتے ہیں۔ ایسی کوئی ریاست نہرو کی سربراہی میں ہندوستان کی بجائے فوجی اتحاد کے لئے زیادہ موزوں ہوسکتی تھی۔

امریکہ کی خارجہ پالیسی میں حقیقت پسندی نے لبرل آئیڈلزم کی جگہ لے لی

تیسری بار صدر منتخب ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد روز ویلٹ کا انتقال 12 اپریل 1945ء کو ہوگیا۔ ان کے جانشین نائب صدر ہیری ٹرومین سٹالن کے امن پسند عزائم کے حوالے سے کافی شکوک وشبہات رکھتے تھے۔ دائیں بازو کے طاقتور ری پبلک حلقوں نے یقینی بنایا کہ صدر ٹرومین سوویت یونین کے خلاف سخت گیر مؤقف اپنائیں۔ آسوینی رے نے اسے دانشورانہ بغاوت Intellectul Coup قرار دیا ہے جس نے بین الاقوامی تعاون پر مبنی لبرل آئیڈلزم کی جگہ جنگ کی ناگزیریت اور ریاستوں کے درمیان تنازعات پر مبنی حقیقت پسندی نے لے لی۔ (2004: 3-5)۔ اس تبدیلی کا اظہار صدر ٹرومین کے غیر دوستانہ اور اکھڑ رویے سے ہوا جو انہوں نے 23 اپریل 1943ء کو واشنگٹن میں سوویت وزیر خارجہ مولوتوف سے ملاقات میں اپنایا۔ اس طرز عمل کی ری پبلک سینیٹر آرتھر اینچ وینڈ نبرگ نے بھی حمایت کی جو یالٹا میں طے پانے والے معاہدے کے مخالف تھے۔ (ہوروویٹز 1967: 37)۔ سخت گیر حلقوں کو امید تھی کہ روس اس رویے کا جواب آنجہانی روز ویلٹ کی طرف سے بلائی گئی سان فرانسسکو کانفرنس کے بائیکاٹ سے دے گا۔ جس میں اقوام متحدہ کا باضابطہ قیام عمل میں آنا تھا لیکن سوویت یونین نے تعمیری انداز میں کانفرنس میں شرکت کی اور اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی امن کیلئے تیار کردہ لبرل فریم ورک کو قبول کر

لیا۔(ایضاً،38:اے2004)۔

ٹرومین انتظامیہ نے سوویت یونین کو اشتعال دلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ دوسری طرف یالٹا کانفرنس میں سٹالن کے صدر ٹرومین سے وعدے کے مطابق سوویت یونین نے جرمنی کی شکست کے 90 روز بعد مشرقِ بعید میں جاپان کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کی تیاری شروع کردی۔ ابھی ایسا ہونا باقی تھا کہ امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم برسا دیے۔ ان 2 دھماکوں سے 4 لاکھ جاپانی لقمہ اجل بن گئے چنانچہ جاپان نے جنگ میں ہتھیار ڈال دیے۔ ان دھماکوں سے سوویت یونین میں عدم سلامتی کا شدید قسم کا احساس پیدا ہوا۔ سوویت یونین نے جنگ کی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ کم از کم 2 کروڑ سوویت شہری مارے گئے اور اس کے شہروں اور دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ روسی صنعتیں تباہی سے دوچار تھیں اور خوراک کی پیداوار میں نمایاں کمی آئی۔ ایسی دگرگوں صورتحال میں روس امریکہ کے ساتھ اسلحے کی دوڑ میں شریک ہونے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف امریکہ نے اسلحے کی فروخت سے دولت کے انبار لگائے تھے۔ بہر حال ٹرومین کے دور میں سوویت یونین سے متعلق پالیسی میں نمایاں تبدیلی سے قطع نظر جنوبی ایشیا میں آزادی کی جدوجہد کے بارے میں امریکی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس طرح برطانوی حکومت پر متحدہ ہندوستان کو اقتدار کی جلد منتقلی پر دباؤ برقرار رہا۔

مسلم لیگی لیڈروں کی امریکیوں سے پینگیں

حقیقت میں جناح صاحب اور مسلم لیگ کے دیگر لیڈر جانتے تھے کہ امریکہ مغربی دنیا کے قائد کے طور پر ابھر رہا ہے۔ لہٰذا پاکستان کے قیام کے کاز میں امریکہ کی عدم دلچسپی اور عدم تعاون ان کے لئے نہایت تشویش کا باعث تھا۔ نومبر 1946ء میں ایم اے ایچ اصفہانی جو بعدازاں امریکہ میں پاکستان کے سفیر رہے نے دورہ امریکہ کے بعد محمد علی جناح کو خط لکھا اور امریکیوں کی بڑھتی اہمیت کا ادراک کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے لکھا کہ ''میں نے یہ جانا ہے کہ میٹھے الفاظ اور اولین تاثرات کو امریکی کافی زیادہ اہمیت دیتے ہیں''۔ (کوکس 260:2001)۔ اس سے پہلے امریکی جریدے ''ٹائم'' پر جناح صاحب کی کور فوٹو کے ساتھ اس عنوان سے ایک سٹوری شائع ہوئی...... ''اقتدار کی ہوس کی داستان، ایسی داستان جو پہاڑوں میں چھکڑوں کی طرح موڑ اور خم رکھتی ہے''۔ امریکی میڈیا اور

حکومت کی طرف سے ایسے منفی طرزِ عمل کے باوجود مسلم لیگ پریشان نہ ہوئی۔ 27 دسمبر 1946ء کو یاقت علی خان نے ہندوستان میں امریکی ناظم الامور جارج میرل کو لکھا کہ بہار میں مسلمانوں کے قتل عام سے ایسی شورش پیدا ہو سکتی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر سوویت یونین برصغیر میں داخل ہو سکتا ہے۔ (سریلا2005) تاہم ایسا کوئی ہتھکنڈہ کسی قسم کا اثر نہ پیدا کر سکا۔ 4اپریل 1947ء کو امریکہ کے انڈر سیکرٹری ڈین اچیسن نے لندن میں امریکی سفارتخانے کو ٹیلی گرام بھیجا جس میں لکھا تھا کہ "دنیا میں ہمارا سیاسی اور معاشی مفاد ہندوستان کی سالمیت کے تسلسل میں مضمر ہے"۔

یکم مئی 1947ء کو جناح صاحب نے امریکی دفتر خارجہ کے عہدیدار ریمنڈ ہیئر کو بتایا کہ "ہندوسامراج کا مشرق وسطی تک پھیلاؤ روکنے کیلئے پاکستان کا قیام ضروری ہے۔ تمام مسلم ممالک روس کی ممکنہ جارحیت کے خلاف کھڑے ہوں گے اور مدد کیلئے ہماری (پاکستان کی) طرف دیکھیں گے۔ (کوکس2000:13)۔ اس کے باوجود اس وقت تک امریکہ نے ہندوستان کی قیمت پر پاکستان کو اتحادی بنانے کیلئے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں۔ (سریلا2005:311)۔ جہاں ایک طرف برطانیہ روس کی گرم پانیوں کی طرف بڑھنے کی مبینہ خواہش کے تناظر میں ایک صدی سے 'گریٹ گیم' میں مصروف تھا تاہم امریکہ کی زیادہ تر دلچسپی چینی قوم پرست کومن تانگ کی طرف تھی جو کچھ عرصے سے ہزیمت کا شکار تھے۔ ایک متحدہ ہندوستان جس کے پاس بڑی فوجی طاقت ہو وہ ایشیا میں چین سے نمٹنے کیلئے اہم سمجھا گیا۔ (کوکس2001:16-15)۔ البتہ یہ بھی سچ ہے کہ جب بالآخر دونوں ملک معرض وجود میں آ گئے تو امریکہ نے بھارت اور پاکستان دونوں کے ساتھ خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کیا۔

سوویت یونین

نوآبادیاتی نظام پر سوویت یونین کی پالیسی کا اظہار ولادی میر لینن کے مشہور زمانہ کتابچے "امپیریلزم" جسے کیپٹل ازم کی بلند ترین سٹیج کہا جاتا ہے میں کیا گیا۔ اس میں لینن نے کہا کہ کارل مارکس نے ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے بارے میں جس فہم کا فکری طور پر ادراک کیا ہے وہ نہ صرف پرانے نظام کی تباہی کا شاخسانہ ہے بلکہ نئے اور جدید سرمایہ دارانہ نظام کی نقیب ہے۔ وہ فکری ادراک متروک ہو چکا ہے۔ یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں براہ راست سرمایہ کاری کے ذریعے اپنے زیر نگین کالونیوں میں سے سستی مزدوری اور سستے میٹریل کا استعمال

کر رہی ہیں۔ یہ لوگ مقامی چھوٹی صنعت اور سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کر رہے تھے۔ چنانچہ سوویت یونین نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا حمایتی ہو گیا۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے پہلے روس کی نوآبادیاتی نظام کی مخالفت زیادہ تر یورپی کالونیوں میں مارکس لٹریچر کے پھیلاؤ اور وہاں کمیونسٹ پارٹیوں کی شاخیں کھولنے تک محدود تھا۔ اس میں ایک استثنیٰ چین کو حاصل تھا جہاں روس نے مشورہ دیا کہ کمیونسٹ اپنی جدوجہد وسیع تر قوم پرست محاذ کے تحت جاری رکھیں جب کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کا ٹکراؤ ہوا تو روس نے کمیونسٹوں کی حمایت کی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی

روس کے انقلاب کے کچھ عرصے بعد ہندوؤں/سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل چند ہندوستانیوں نے سوویت یونین کا دورہ کیا اور روسی انقلاب کا مطالعہ کر کے نہایت متاثر ہوئے۔ اس سے پہلے ہندوستان سے مسلمان اس وقت روس گئے جب 1920ء میں تحریک خلافت کے دوران انگریزوں کی طرف سے خلافت عثمانیہ کو تحلیل نہ کرنے کا مطالبہ پورا نہ کیا گیا اور تحریک ہجرت شروع کی گئی۔ (1919ء سے 1924ء تک)۔ ان مہاجرین میں سے کچھ واپس ہندوستان آ گئے اور نوآبادیاتی اور جاگیردارانہ نظام اکھاڑ پھینکنے کا عزم کیا۔ شدید جبر کی تاب نہ لاتے ہوئے معاشرے کے کچھ حصے انقلابی بن گئے۔ کمیونسٹوں نے انہیں منظّم کر کے صنعتی ورکروں کی کئی ہڑتالیں کرائیں اور کسانوں کی تحریک شروع کرائی۔ انگریزوں نے اس کا جواب کمیونسٹوں کے خلاف سازش کے مقدمے درج کر کے اور سخت سزائیں دے کر دیا۔ ان سزاؤں میں پھانسی اور عمر قید تک شامل تھیں۔ حتیٰ کہ بعض کمیونسٹوں کو عمر بھر کیلئے جزائر انڈیمان (کالا پانی) بھی بھیج دیا گیا۔

سوویت یونین نے ہندوستانی کمیونسٹوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ سامراجی حکومت کے خلاف جدوجہد آزادی میں شامل ہوں تاہم کمیونسٹ اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان تحریک آزادی کے مقاصد اور حکمت عملی پر اختلاف نے ایک دوسرے سے الگ رکھا۔

اس کے علاوہ 1930ء کے عشرے میں سوویت پولٹ بیورو نے بائیں بازو کے مؤقف میں ایک بنیادی تبدیلی کرتے ہوئے ہندوستان میں گاندھی کی عدم تشدد (اہنسا) کی تحریک کے خلاف عسکریت پسند ونگ کی جدوجہد کی حمایت شرع کر دی۔ سٹالن سمجھتے تھے کہ ''گاندھی کی حکمت عملی کا

مقصد لوگوں کو غیر مسلح رکھنا اور ترقی کا عمل پست کرنا ہے''۔ (سریلا 2005: 10-309)۔ سوویت قیادت کو پریشانی تھی کہ ایک متحدہ ہندوستان آزادی کے بعد انگریزوں کیلئے ایک بڑا فوجی اڈہ بننے والا ہے۔ مزید پیچیدگی اس وقت پیدا ہوگئی جب ہندوستانی کمیونسٹوں نے سوویت یونین پر جرمنی کے حملے میں انگریزوں کی حمایت کر دی۔ ہندوستانی کمیونسٹوں کے پراپیگنڈے میں جہاں اب تک جنگ کو سامراجیت کا شاخسانہ قرار دیا جارہا تھا وہاں یکا یک اسے عوام کی جنگ قرار دیا جانے لگا۔ کئی کمیونسٹوں نے نو آبادیاتی انتظامیہ میں ملازمتیں حاصل کر لیں اور حکومت کے اتحادی بن گئے۔ اس امر سے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (سی پی آئی) میں مزید بدگمانیوں نے جنم لیا کیونکہ کانگریس جنگ کی کوششوں کے خلاف تھی۔

پاکستان کا منصوبہ

پاکستان کے قیام کے حوالے سے سوویت لیڈروں کا رویہ مبہم اور اُلجھا ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ انگریزوں کی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی ہے۔ دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی نے قیام پاکستان کے مطالبے کو پسے ہوئے اقلیتی مسلمانوں کی ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات کے طور پر بھی پیش کیا۔ یہ دراصل سوویت یونین کے سرکاری مؤقف سے متضاد تھا جس میں مذہب کی بنیاد پر اقوام کی حیثیت کو مسترد کیا جاتا تھا۔ بہر حال سی پی آئی کا یہ تصور کہ- برصغیر کے مسلمان ایک قوم ہیں-1944ء میں پارٹی کے سربراہ ڈاکٹر جی ادھیکاری نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ سی پی آئی نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کریں اور محض مذہب کی بنیاد پر سیاست کی بجائے مسلم لیگ کو وسیع تر سیاسی سوچ کی طرف راغب کریں۔ مسلمان کمیونسٹوں نے 46-1945ء کے انتخابات میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ اہم صوبہ پنجاب میں سی آر اسلم اور عبداللہ ملک جیسے کمیونسٹ مقررین نے مسلم علماء کے ساتھ انتخابی جلسوں میں تقریریں کیں اور پاکستان کو ایک ایسی معاشرتی جنت کے طور پر پیش کیا جہاں اسلامی سوشلسٹ انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ (پاکستانی کمیونسٹوں سے انٹرویوز)۔ تاہم ایسے ابتدائی اقدامات کو مسلم لیگی حلقوں میں زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔ وہ کمیونسٹوں کو نہایت شکوک وشبہات کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ بہر حال سوویت دانشور یوری زخوف جنہوں نے مارچ 1947ء میں ہندوستان کا دورہ کیا وہ اس یقین کے ساتھ واپس گئے کہ پاکستان کے قیام سے برصغیر میں سوویت مفادات کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

باب 3

پاکستانی فوج کی نوآبادیاتی جڑیں

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوج میں ہندوستانیوں کی بھرتی شروع کر دی۔ اس کے نتیجے میں بنگال، بمبئی اور مدراس کی فوجیں وجود میں آئیں۔ بنگال آرمی میں پنجابیوں بالخصوص سکھوں کی بھرتی پہلے ہی شروع کی جا چکی تھی لیکن 1857 تک ان کی تعداد بہت کم تھی۔ (یونگ 2005ء:38)۔ بنگالیوں، شمالی ہندوستان کے علاقوں بہار اور متحدہ صوبہ پر مشتمل بنگال آرمی کی وفاداری اس وقت ختم ہو گئی جب 1857ء میں ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت نے سر اٹھایا۔

بھارت اور پاکستان کی ادبی تحریروں میں 1857ء کی بغاوت کو آزادی کی پہلی جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ بغاوت کے آغاز کی ایک وجہ تو انگریز افسروں کا نسل پرستانہ رویہ تھا جبکہ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی فوجیوں کو معلوم ہوا کہ انگریزوں نے فوج میں جو نیا اسلحہ متعارف کرایا ہے اس کی گولیوں میں سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ اس گولی کو این فیلڈ رائفل میں ڈالنے سے پہلے دانت سے کھولنا پڑتا تھا۔ اس طرح یہ بات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مذہبی عقیدے کے منافی تھی جس کا انہوں نے سخت ردعمل ظاہر کیا۔ بغاوت کرنے والے سپاہیوں کی اکثریت بنگال، بہار اور یوپی سے بھرتی کی گئی تھی۔ ان یونٹوں کو پنجاب میں بھی تعینات کیا گیا تھا لہذا پنجاب میں بھی بعض مقامات پر بغاوت ہوئی۔ (یونگ 2005ء:49-44)۔

ان باغیوں نے برائے نام مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا حاکم قرار دیا۔ بعض خودمختار راجوں اور رانیوں جنہوں نے قبل ازیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی برتری تسلی کر لی تھی نے بھی اس بغاوت

کی حمایت کی کیونکہ یہ خودمختار حکمران ۔ڈاکٹرن آف لیپس Doctrine of Lapse، سے بری طرح متاثر تھے جس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر کوئی خودمختار ریاست غیر جانبدارانہ رہے تو اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔اس تحریک میں جن دیگر قوتوں نے حصہ لیا ان میں وارلارڈز اور مذہبی شخصیات شامل تھیں۔شاہ ولی اللہ کے خانوادے نے فتویٰ جاری کر کے اسے انگریزوں کے خلاف جہاد قرار دے دیا۔سید احمد شاہ شہید بریلوی کے پیروکاروں جنہیں وہابی بھی کہا جاتا ہے، نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔(ایلین 2006)۔البتہ مقامی خودمختار حکمرانوں کی اکثریت یا تو بغاوت سے لاعلم رہی یا انہوں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیا۔عام آدمی کی اس لڑائی میں شرکت غیر منظم، الگ تھلگ اور غیر مسلسل تھی۔

باغیوں کو کچلنے کے لئے انگریزں نے آنجہانی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے ریٹائر سپاہیوں، خودمختار شہزادوں، شمال جنوبی ہندوستان کے مسلم قبائلیوں اور پنجاب اور فاٹا کے قبائلی سرداروں کے سپاہیوں کی بڑی تعداد کو استعمال کیا۔جنگ میں ایک مالی فائدے کیلئے شریک ہونا ان علاقوں کی طے شدہ روایت تھی۔ستم ظریفی دیکھیں کہ محض چند برس پہلے ہی انگریزوں نے سکھ فوجیوں کو شکست دینے کیلئے بنگال، بہار اور یوپی کے سپاہیوں کو استعمال کیا جس کا نتیجہ 1849ء میں پنجاب کی سقوط کی صورت میں نکلا۔اس کے بعد وہ پنجابی عمائدین جنہوں نے اس لڑائی میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔انہیں انگریزوں نے نہ صرف خطابات بلکہ بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا۔ اس کے علاوہ ٹرانس فرنٹیئر Trans-Frontier Areas علاقے جنہیں 1905ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کا نام دیا گیا تھا کو الگ کر کے بندوبستی علاقے قرار دے دیا گیا۔یوں وفادار جاگیرداروں کا ایک مرتکز علاقہ وجود میں آ گیا۔

1857ء کی بغاوت میں قیادت اور واضح مقاصد کے تعین کا فقدان تھا۔شروع میں باغیوں نے کئی انگریزوں اور ان کے خاندانوں کو ہلاک کر دیا لیکن انگریزوں کی جوابی کارروائی اس سے بھی شدید اور بے رحم تھی۔بعد میں انگریز اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سازش کے کرتا دھرتا مسلمان تھے اور ہندوستان میں اسلامی ریاست بنانے کے اس نظریے کا مرکز بہادر شاہ ظفر تھا۔البتہ انہوں نے یہ ضرور اتفاق کیا کہ شہنشاہ خود اس میں ملوث نہیں تھا بلکہ باغیوں نے اسے شہ دی۔بہادر شاہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی سے تصادم سے گریز کرنا چاہتا تھا۔(ڈال رمپل 2006ء:43-439) انگریز

بالخصوص مسلمان باغیوں کو نشانہ بنانے لگے اور انہیں سخت سزائیں دی گئیں البتہ باغیوں میں سے اپنے ہمنواؤں کو جی بھر کر نوازا۔ اس صورتحال کو جواہر لال نہرو نے مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا..... ''انگریزوں کا کا بھاری ہاتھ ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں پر پڑا''۔

مختلف خطوں کے پس منظر کے حامل ہندوستانی فوجی بدستور انگریز فوج میں خدمات انجام دیتے رہے۔ کچھ فوجی یونٹ خالصتاً انگریزوں پر بھی مشتمل تھے جو ہندوستانی فوج نہیں بلکہ براہ راست برطانوی فوج کا حصہ تھے۔ جہاں تک انڈین آرمی کا تعلق تھا تو انگریز حکومت کی اہم پالیسی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ شمالی ہندوستان اور بنگال کی باغی ذاتوں، قبیلوں جنہوں نے بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کو بھرتی کے مواقع سے دور رکھا جائے۔ اس کی بجائے توجہ پنجاب کی طرف منتقل کر دی گئی۔ پنجاب سے پشتو بولنے والے شمال مغربی خطوں تک جو وسط ایشیا تک پھیلے تھے وہ انگریز سرگرمیوں کا مرکزی نکتہ بن گئے کہ وہ اپنا اثر ورسوخ افغانستان اور وسط ایشیا کے خوانین تک وسیع کر دیں۔ اس کے نتیجے میں زار روس اور برطانیہ کے درمیان انیسویں صدی کے اوائل سے جاری گریٹ گیم میں وسط ایشیا پر اثر و رسوخ بڑھانے کے ضمن میں پنجاب کے اہم کردار کو انگریزوں نے کافی سراہا۔ (یونگ 2005ء:69-67)۔

انڈین آرمی کا قیام

1895ء میں موجودہ عسکری ڈھانچوں کی باضابطہ انڈین آرمی کی شکل میں تنظیم نو کر دی گئی۔ اس فوج میں نہ صرف بنگال، بمبئی اور مدراس پریذیڈنسی کی فوجیں بلکہ شمال مغربی ہندوستان کے سپاہیوں کو بھی جذب کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے فوج میں پنجابی فوجیوں کو بھرتی کرنے کو ترجیح دی گئی۔ یہی انڈین فوج ایک ایسا محور بن گئی جس پر انگریزوں کی طاقت اور حاکمیت کا دارومدار تھا۔ (حق-1993ء رضا 1989ء: یونگ 2005ء)۔ اس تناظر میں نام نہاد ''جنگجو قوموں کا نظریہ'' اختیار کیا گیا۔ جس کے تحت پنجاب میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی مخصوص ذاتوں اور خطوں میں سے منتخب بھرتی کا جواز پیدا کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پنجابیوں پر انحصار کا ایک ایسا ٹھوس ڈھانچہ تیار کرنا جس پر راج کا انحصار ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پنجاب کی اشرافیہ میں انگریزوں کے وفادار حلقوں سے تعلقات گہرے کرنا تھا۔ پورے صوبے سے تینوں مذاہب سے تعلق رکھنے

والے راجپوتوں کو بھرتی کیا گیا۔ خصوصی زور تین علاقائی نسلی گروپوں کی بھرتی پر دیا گیا: جاٹ برادری کے خالصہ سکھ وسطی پنجاب سے بالخصوص امرتسر کے اردگرد ماجھے کے علاقے سے تعلق رکھنے والے سکھ۔ شمالی پنجاب کے مسلمان قبیلے اعوان، گکھڑ، جنجوعہ اور ٹوانہ (آخری دو ذاتیں راجپوتوں کی ہیں)۔ ان مسلمانوں میں سے سالٹ رینج کے اضلاع راولپنڈی، جہلم اور شاہ پور کو زیادہ ترجیح دی گئی۔ اس کے علاوہ چھوٹی تعداد میں روہتک اور حصار (آج کل ہریانہ) کے اضلاع سے تعلق والے ہندو جاٹوں اور کانگڑہ کے کچھ ڈوگروں کو بھرتی کیا گیا۔ (یونگ 2005ء:8-70)

ان تینوں بڑے گروپوں کو اپنے علاقوں میں کئی معاشی مسائل کا سامنا تھا۔ ماجھے میں آبادی کی بھرمار اور زمینوں کی تقسیم در تقسیم، سالٹ رینج کے علاقے میں بنجر یا کم آباد زرعی زمینیں جبکہ جنوب مشرقی اضلاع میں قحط سالی-- اس کے علاوہ سالٹ رینج (اسے پوٹھوہار کا علاقہ بھی کہتے ہیں) کے سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان تاریخی دشمنی بھی پائی جاتی تھی کیونکہ وسطی پنجاب میں سلطنت لاہور کے سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پوٹھوہار کے مسلمانوں کو شکست دے کر ان کے اختیارات سلب کر لئے تھے۔ ان تینوں گروپوں کے درمیان دوستانہ تعلقات نہیں تھے چنانچہ انہیں مختلف کمپنیوں اور رجمنٹوں میں بھرتی کیا گیا لیکن مجموعی کمان بہرصورت انگریز افسروں کے ہاتھ میں دی گئی۔ (ایضاً)

''طبقے'' اور ''عسکری اضلاع'' کی بنیاد پر محتاط انتخاب کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے فوج سے منسلک حلقوں کو نوازنے کا مربوط نظام بھی وضع کیا۔ فوجیوں اور ان کی بھرتی میں تعاون کرنے والوں کی معقول تنخواہ، پنشن، الاؤنس اور دیگر معاشی مراعات کا اہتمام کیا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی پنجاب میں دنیا کے بڑے آبپاشی نظام کے اجراء کے نتیجے میں نہروں، بیراجوں اور ڈیموں کا جال بچھا دیا گیا تاکہ کینال کالونیوں یا نہری رقبے کو زرعی مقاصد کیلئے پانی مہیا کیا جا سکے۔ ان علاقوں میں اراضی مشرقی پنجاب کی گنجان آبادی یا منقسم اراضی کے حامل علاقوں کے باسیوں کو یا پھر انڈین آرمی کے ملازمین کو الاٹ کی گئی۔ اس کے علاوہ بھرتی میں مددگار زیلداروں، سفید پوشوں، نمبرداروں اور قبائلی سرداروں کو بھی نوازا گیا۔ ان لوگوں کو خان بہادر، رائے بہادر، نواب حتیٰ کہ سر کے خطابات بھی دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت نے عدم تعاون کے مرتکب افراد کے خطابات اور الاٹمنٹ منسوخ کرنے کا خطرہ بھی پیدا کر دیا۔

مزید برآں لینڈ ایلی نیشن ایکٹ 1901ء کے ذریعے انگریزوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ پنجاب کے دیہات میں انکی بنیاد Base ساہوکاروں اور صنعتی ترقی کے عمل سے محفوظ رہے۔ انڈین آرمی میں پنجابیوں کے حصے کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ اگست 1914 سے نومبر 1918 کے درمیان بھرتی ہونے والے 6لاکھ 83 ہزار 149 فوجیوں میں سے 60 فیصد پنجابی سپاہی تھے۔ (یونگ 2005ء:98-70)۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ 20ویں صدی کے آغاز پر پنجاب کا صوبہ انگریز راج کا مسلح بازو ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ انڈین آرمی کو پہلی جنگ عظیم کے دوران یورپ اور مشرق وسطیٰ کے محاذ پر تعینات کیا گیا۔ شروع میں انڈین آرمی خالصتاً انگریز افسروں پر مشتمل تھی لیکن 1917ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو بھی افسر کیڈر میں شامل کیا جائے چنانچہ 1919ء میں پہلی بار ہندوستانی افراد کو فوج میں کمیشن دیا گیا۔

ہندوستانی فوج میں مسلمان

انڈین آرمی میں مسلمان فوجیوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہونے کے باوجود ملٹری اسٹیبلشمنٹ میں ان کے بارے میں شکوک وشبہات موجود رہے۔ (خان 2006ء:49)۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ تعصب کا عنصر 1857ء سے موجود تھا کیونکہ انگریزوں کو یقین تھا کہ مسلمانوں نے اس بغاوت میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے انڈین آرمی میں خالصتاً مسلمانوں کی بٹالینز تھی-- لیکن بعد ازاں اس میں تبدیلی کر دی گئی، ہندوستانی مسلمان ترکی کی طرف سے جرمنی کے ساتھ اتحاد کر کے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے کے فیصلے سے کافی تشویش میں مبتلا تھے۔ لیکن جب ایسا ہو گیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو محاذ جنگ پر اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑنا پڑے گا۔ اس وقت خلافت عثمانیہ کو پوری دنیا کے سنی مسلمانوں کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن انگریز، اکثریتی بریلوی مکتبہ فکر کے علما اور پیر صاحبان سے یہ فتویٰ حاصل کرنے میں کامیاب رہے کہ چونکہ عثمانی خلفا حضور اکرمؐ کے قبیلہ قریش سے تعلق نہیں رکھتے اس لئے وہ مسلمانوں کے خلیفہ ہو سکتے ہیں نہ سنی مسلمانوں کی بیعت کے حقدار۔ لہذا علما اور مشائخ کے مطابق ترکی کی جنگ میں شرکت جہاد نہیں۔ (علوی 2002ء: قریشی 1999ء:76)۔ ایسا فتویٰ کافی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ پنجاب اور صوبہ سرحد بریلوی مسلمانوں کے مضبوط گڑھ تھے اور

یہیں سے انڈین آرمی میں فوجیوں کی بڑی تعداد بھرتی کی جارہی تھی۔

سنی مکتبہ فکر کا ایک عمومی نظریہ یہ تھا کہ خلافت صرف قریش تک محدود ہے جبکہ شیعہ مسلمانوں نے قیادت کو مزید تنگ کرتے ہوئے امامت تک محدود کر دیا اور حضرت علیؓ پہلے امام تھے اور حضور اکرمؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے ساتھ نکاح کی وجہ سے ان کی اولاد براہ راست جانشین تھی۔ خلافت کی مرکزیت گزشتہ کئی صدیوں سے برائے نام رہ چکی تھی کیونکہ آخری کئی خلفا 632 سے 750 عیسوی کے درمیان منگولوں کی فتوحات کے باعث سلطنت پر کنٹرول کھو چکے تھے۔ 1228 میں منگولوں نے بغداد کو تاخت و تاراج کر کے خلافت کا سرے سے خاتمہ کر دیا۔ یوں قریش سے خلافت ہمیشہ کیلئے چھین لی گئی۔ 13ویں صدی میں شام کے ممتاز عالم ابن تیمیہ نے خلیفہ کو مسلمانوں کا روحانی قائد تسلیم کرنے کے خلاف دلائل کا آغاز کر دیا اور خلیفہ کی مرکزی حیثیت کو مسترد کر دیا۔ ابن خلدون نے اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا کہ قریش میں خلافت کا تاریخی پہلو ضرور ہے لیکن اس کو مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ 1774ء میں نظریہ خلافت کی جدید انداز میں احیائے نو ہوئی چنانچہ قریش تک خلافت محدود رکھنے کے فلسفے کو مسترد کر کے عثمانیوں کی خلافت کی راہ ہموار کی گئی۔ یوں عثمانی سلطان کو مذاکرات میں مسلمانوں کے رہنما کا وہ درجہ دیا گیا جو روس کی زارینہ (ملکہ) کیتھرین کو حاصل تھا۔ وہ قدامت پسند عیسائیوں کی نمائندہ ہونے کی دعویدار تھی۔ (احمد 1987 :60-56۔ فاروقی 1971ء)۔ بیسویں صدی میں عثمانی سلطان ایک ایسی دنیا میں اسلامی طاقت اور حاکمیت کی علامت بن چکا تھا جہاں مغرب کی عیسائی طاقتوں کا غلبہ آئے روز بڑھتا جارہا ہے۔

فتوؤں کے باوجود انگریز فوج میں چھوٹے پیمانے پر مسلمان سپاہیوں میں بغاوتیں ہوئیں کیونکہ یہ سپاہی اپنے ترک مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑنے سے گریزاں تھے۔ سب سے اہم واقعہ فروری 1915ء کو رونما ہوا جب سنگاپور میں مسلمان فوجیوں نے کچھ انگریز افسروں کو قتل کر ڈالا۔ (قریشی 1999ء۔79-78)۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ٹھیک اس عرصے میں عثمانیوں کے خلاف مشرق وسطی میں عربوں کی مخالفت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اس چیز کو استعمال کرتے ہوئے انگریزوں نے 1916ء میں عربوں کی بغاوت کو شہ دی۔ بہر حال پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے فتوے حاصل کر کے ترکوں کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کی لڑائی جائز قرار دینے کی راہ ہموار کر لی تھی۔

جب جنگ ختم ہوئی تو انگریزوں کی پالیسی تبدیل ہو گئی۔ انہوں نے فوج میں خالصتاً مسلمان یونٹ قائم نہ کئے کیونکہ انہیں شبہ تھا کہ یہ فوجی پان اسلام ازم کی اپیلوں پر لبیک کہہ سکتے تھے۔ مذہبی عنصر جس نے بالخصوص مسلمانوں کی وفاداریوں کو متاثر کیا تھا سے قطع نظر ہندوستانی سپاہیوں میں ایک گونہ اجنبیت کا احساس کافی غالب تھا۔ پاکستان کے مستقبل کے بانی محمد علی جناح جو پہلے ہی ہندوستانی سیاست میں متحرک ہو چکے تھے نے فوج کو مقامی رنگ Indianization دینے کی وکالت شروع کر دی۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ فوج کے آفیسر رینکوں میں بھی ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ سنڈھرسٹ کے ماڈل کی طرز پر ہندوستان میں بھی افسروں کی اکیڈمی قائم کی جائے۔ ان کا مؤقف تھا کہ اس طرح کے اقدامات سے نہ صرف شاہ برطانیہ سے وفاداری کو تقویت ملے گی بلکہ انگریز راج کے امور میں ہندوستانیوں کی شرکت کا احساس بھی بڑھے گا۔ اس مقصد کیلئے جناح نے مارچ 1924ء سے مارچ 1928ء تک چار تقریریں کیں جن میں انڈین فوج میں مقامی افسروں کی تعداد بڑھانے پر زور دیا۔ (ایضاً: 240)۔ 1931ء میں انہوں نے نشاندہی کی کہ ہندوستانی فوج کے 3 ہزار افسروں میں سے صرف 70 یا 71 ہندوستانی تھے۔ (جعفر، رحمان اور جعفر 1977ء: 240)۔ چنانچہ جناح اور انڈین قانون ساز کونسل کے دیگر ارکان کی کوششوں سے مزید ہندوستانیوں کو بطور افسر شاہ برطانیہ کا کمیشن دے دیا گیا۔ ڈیرہ ڈون Dehra Dun ملٹری اکیڈمی 1932ء میں قائم کی گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر فوج میں انگریز افسروں کی تعداد 3031 تھی جبکہ 333 ہندوستانی افسر تھے۔ (امین 1999ء: 61)۔

پنجاب یونینسٹ پارٹی اور فوج میں بھرتی

پنجاب یونینسٹ پارٹی کا قیام 1923ء میں عمل میں لایا گیا۔ اگرچہ پارٹی میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن یونینسٹ پارٹی کے پہلے سربراہ سر فضل حسین (وفات 1936) نے تمام مذاہب میں زمینداری کے مفادات کے عمل کو متحرک کیا اور مختلف قومیتوں کے درمیان سیاسی نظم مستحکم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ سر فضل حسین کے جانشین سر سکندر حیات (وفات 1942ء) اور مشرقی پنجاب کے ہندو جاٹوں کے رہنما سر چھوٹو رام (وفات 1945) نے سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور سر جوگندر سنگھ کی زیر قیادت سکھ خالصہ نیشنلسٹ پارٹی کے اتحاد کے ساتھ اسی نہج پر کام جاری رکھا۔ یونینسٹ

پارٹی کے رہنما اوران کے سکھ اتحادی انگریزوں کے وفادار تھے جنہوں نے سیاسی استحکام مہیا کیا۔ سکھوں کے بعض بنیاد پرست حلقوں سے قطع نظر پنجاب انگریزوں کا سب سے وفادار اور سب سے زیادہ مراعات یافتہ صوبہ رہا۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی تو سکندر حیات نے اعلان کیا کہ پنجاب سے 5 لاکھ فوجی انگریز فوج کیلئے بھرتی کئے جائیں گے۔ (احمد 2012ء: 61)۔ مجموعی طور پر جنگ کے دوران انڈین آرمی میں 25 لاکھ فوجیوں نے خدمات انجام دیں۔ (مرسٹن 471:209)۔ اس کے نتیجے میں مزید ہندوستانی فوجی آفیسر رینک تک پہنچے، البتہ سینئر عہدوں پر محض چند ہی مقامی فوجی پہنچ سکے۔ مثال کے طور پر 1946 تک صرف ایک ہندوستانی کے ایم کیری اپا بریگیڈئیر اور 4 دیگر عارضی بریگیڈئیر بن سکے۔ کچھ ہندوستانی کرنل بھی بنے جبکہ بیشتر میجر یا کپتان کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی فوج میں 36 فیصد سپاہی پنجاب سے بھرتی کئے گئے۔ اگر چہ فوج میں پنجاب کی مجموعی تعداد بڑھ گئی لیکن اس کی شرح میں ایک تہائی کمی آئی۔ مارشل یا جنگجو قوموں کا نظریہ عملاً متروک ہو چکا تھا اور پورے ہندوستان سے تمام اقوام کیلئے فوج میں بھرتی کے دروازے کھول دیے گئے۔ یوں ان اقوام کو بھی عسکری خدمات انجام دینے کا موقع ملا جو اب تک جنگجو قوموں میں شریک نہیں تھیں۔ (حق 1993: 80)۔ ان اہم تبدیلیوں کے باوجود پنجاب کی جنگجو ذاتوں اور قبیلوں کا مسلح افواج میں حصہ بدستور زیادہ رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انڈین فوج نہ صرف یورپ، افریقہ اور مشرق وسطی میں بلکہ جنوب مشرقی ایشیا میں بھی لڑی۔ دوسری جنگ عظیم میں اگر چہ کوئی مسلمان ملک شریک نہیں تھا لیکن انگریز پالیسی سازوں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف شکوک وشبہات بدرجہ اتم موجود رہے۔ حتیٰ کہ 1947ء کے آخر تک جہاں خالصتاً ہندو اور سکھ فوجی یونٹ تھے وہاں کوئی یونٹ مکمل طور پر مسلمان فوجیوں پر مشتمل نہیں تھا۔ (مینسرگ اینڈ مون 1981ء: 35)۔ نور الحق کے مطابق 1939 سے پہلے ہندوستانی فوج میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد 38، 38 فیصد تھی۔ 1942 کے بعد مسلمانوں کی تعداد کم ہو کر 32 فیصد ہو گئی جبکہ 1945 کے اختتام تک ہندوؤں کی تعداد بڑھ کر 47 فیصد ہو گئی۔ (حق 1993ء: 83)۔ جو اعداد وشمار نور الحق نے دیے ہیں ان کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں پنجاب کی صورتحال نہیں بتائی جہاں صورتحال بالکل الٹ تھی۔ وسطی پنجاب میں

کمیونسٹوں کے بڑھتے اثر و رسوخ کے باعث سکھوں کی بھرتی میں کمی آئی تھی جبکہ مسلمانوں کی تعداد 4 گنا زیادہ تھی۔ فوج میں مغربی اضلاع راولپنڈی، اٹک اور جہلم سے فوجیوں کی بھرتی کی شرح 15 فیصد تک پہنچ گئی۔ (یونگ 2005ء: 91-290)۔ علاقائی تخصیص کے باعث مغربی اضلاع میں بھرتی کی صورتحال کافی پیچیدہ ہو گئی۔ ''1943ء تک سالانہ بھرتی میں مسلمان پنجابیوں اور پٹھانوں کی تعداد 25 فیصد تھی جبکہ سکھوں اور ہندو جاٹوں کی تعداد بمشکل بالترتیب 7 اور 5 فیصد تھی''۔ (ایضاً: 291)۔

جہاں تک کمانڈ سٹرکچر کا تعلق تھا تو دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں ہندوستانی افسروں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ ان کو درمیانی یا نچلی سطح کے عہدے دیئے گئے۔ 47-1946 تک 80 فیصد افسر ہندوستانی اور بیشتر ہندو تھے۔ (کوہن 1998: 6)۔ جاپانیوں کی طرف سے جنگ کے دوران قیدی بنائے گئے ہندوستانی فوجیوں پر مشتمل انڈین نیشنل آرمی کو چھوڑ کر ہندوستانی فوج مجموعی طور پر تاج برطانیہ کی وفادار رہی۔ (حامد 1986 :22-15)۔ البتہ فروری 1946 میں نیوی کی ناکام شورش ضرور ہوئی۔ (نور الحق 1993)۔

مسلح افواج کی تقسیم

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ برطانوی اسٹیبلشمنٹ کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان تقسیم ہو جائے تو بھی فوری طور پر فوج کو تقسیم نہ کیا جائے۔ (ناتھ: 2009ء)۔ تاہم جونہی 24 مارچ 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بنے انہوں نے ہندوستانی فوج کی تقسیم پر غور شروع کر دیا۔ اس بارے میں انہوں نے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکن لیک سے 26 مارچ کو اعلیٰ فوجی اور سول حکام سے ملاقاتوں کے آغاز پر بات چیت کے دوران دریافت کیا۔ آکن لیک نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ انڈین آرمی کو تقسیم کرنے میں چار پانچ سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ البتہ مسلم لیگ نے اس بات کو مسترد کرتے ہوئے اصرار کیا کہ پاکستان کی الگ فوج ہونی چاہیئے۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگ کی یہ شکایت آکن لیک کے نوٹس میں لائی کہ فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی آبادی کے تناسب سے کم ہے تو فیلڈ مارشل نے اسے غلط قرار دیا اور بتایا کہ فوج میں مسلمانوں کی تعداد 29 فیصد ہے۔ اگرچہ جنگ عظیم سے پہلے یہ شرح 37 فیصد تھی۔ اس میں کمی کی وجہ یہ تھی کہ مدراسی

باشندوں کی بھرتی کی تعداد 3 فیصد سے بڑھ کر 20 فیصد ہوگئی تھی۔ انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ فوج کو تقسیم کرنا ایک مشکل کام ہے جس پر طویل عرصہ لگ سکتا ہے۔

البتہ ماؤنٹ بیٹن مسلسل اس بات کے قائل ہوتے جا رہے تھے کہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے گا کیونکہ مسلم لیگ اور کانگریس یا پنجاب کے معاملے میں مسلم لیگ اور سکھوں کے درمیان کسی اتفاق کے امکانات ہر گزرتے روز کے ساتھ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ کیونکہ فریقین غیر لچکدار موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مئی کے دوسرے نصف میں پنجاب میں فسادات دوبارہ عروج پر پہنچ گئے۔ فیلڈ مارشل آکن لیک پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان فوجوں کی تقسیم پر دوبارہ غور کریں۔ 27 مئی کو فوج کے سربراہ نے ایک تفصیلی نوٹ جاری کیا جس میں انہوں نے فوجوں کی تقسیم کے عمل میں حائل مشکلات کا ذکر کیا۔ انہوں نے لکھا کہ نیوی اور ائیر فورس میں کوئی ''مسلمان'' یا ''ہندو'' یونٹ نہیں۔ تمام یونٹوں میں بلاتخصیص مذہب فوجی ہیں۔ البتہ بری فوج میں ایسے یونٹ ہیں جن میں مکمل طور پر ایک مذہب کے پیروکار فوجی ہیں لیکن ان کے افسر ضروری نہیں کہ ان کے ہم مذہب ہوں۔ تمام آرمی میں فوجی افسر انگریز، مسلمان اور دیگر طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں مذہب یا نسل کی کوئی تفریق نہیں۔ انہوں نے سختی سے زور دیا کہ جب تک فوج کی تقسیم کا عمل مکمل نہیں ہوتا اسے ہر لحاظ سے ایک مرکزی کمانڈ سے کنٹرول کیا جانا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مسلح افواج میں ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی۔ (ایضاً)۔

3 جون 1947 کا تقسیم پلان

مسلح افواج کی پرسکون تقسیم کا دیرینہ موقف اس وقت بیکار ہو گیا جب برطانوی حکومت نے 3 جون 1947ء کو تقسیم پلان کا اعلان کیا۔ جس میں ڈرامائی انداز میں ہندوستان کی تقسیم کی تاریخ جون 1948 سے کم کر کے وسط اگست 1947 کر دی گئی۔ تقسیم منصوبے کے عوامی سطح پر اعلان سے ایک روز قبل ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت پر ''تقسیم کے انتظامی نتائج و عواقب'' کے عنوان سے ایک دستاویز تیار کی گئی جس میں نوآبادیاتی ریاست میں اثاثہ جات کی تقسیم کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا۔ وائسرائے کی سربراہی میں پارٹیشن کمیٹی جس کے ارکان میں اعلیٰ سول اور فوجی افسروں کے علاوہ سیاسی جماعتوں کے نمائندے شامل تھے وہ تقسیم کے عمل کی نگرانی کر رہی تھی۔ جہاں تک فوج

کے معاملات کا تعلق تھا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کی مسلح افواج کی تقسیم کی نگرانی ڈیفنس کمیٹی کرے گی۔ ڈیفنس کمیٹی کمانڈر انچیف تشکیل دے گا۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو سب کمیٹیاں بھی تشکیل دی جاسکیں گی۔ ڈیفنس کیٹی مرکزی پارٹیشن کمیٹی کو براہ راست جوابدہ ہوگی۔ (مینسر گ اینڈ مون 1982ء:56)۔ 12 سے 26 جون 1947ء تک اس کمیٹی میں وائسرائے کے علاوہ لیاقت علی خان، عبدالرب نشتر (مسلم لیگ) جبکہ کانگریس کی طرف سے سردار ولبھ بھائی پٹیل اور رجندر پرشاد شامل تھے۔ 27 جون کو اس کمیٹی کا نام تبدیل کر کے پارٹیشن کونسل رکھ دیا گیا۔ عبدالرب نشتر کی جگہ محمد علی جناح اس میں شامل ہوگئے۔

مسلح افواج کی تشکیل نو کے لئے کمیٹی کا قیام

15 جون کو فیلڈ مارشل آکن لیک نے بتایا کہ انہوں نے انڈین آرمی کی تشکیل نو کے لئے ایک مرکزی اور چند ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی ہیں۔ آرمڈ فورسز ری کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی ذیلی کمیٹیوں میں نیوی سب کمیٹی، آرمی سب کمیٹی اور ائیر فورس سب کمیٹی شامل ہوں گی۔ ان کمیٹیوں میں اعلیٰ فوجی اور سول افسر شامل کئے گئے۔ (ایضاً۔13-410)۔ تینوں فورسز کے فوجیوں کو آپشن دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں متعلقہ حکومت کی رضامندی کی صورت میں جاسکتے ہیں۔

16 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے وی پی مینن سمیت اپنے کچھ سینئر مشیروں سے ملاقات کی اور انہیں مطلع کیا کہ جنرل آکن لیک اب مطمئن ہیں کہ فوجوں کی کارکردگی متاثر کئے بغیر اب ان کی تقسیم کی جاسکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ خیر سگالی اور اعتماد کی فضا ہو اور تقسیم کا عمل جلدی مکمل کرنے کیلئے کوئی سیاسی دباؤ نہ ہو۔ اس تناظر میں فوج کی تقسیم کے حوالے سے کمانڈر انچیف کی سوچ میں ایک نمایاں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ اب وہ کہتے تھے کہ چند برس کی بجائے یہ عمل چند ہفتوں میں مکمل ہوسکتا ہے۔

20 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور کئی دیگر معاملات کے علاوہ مسلح افواج کے موضوع پر لیاقت علی خان نے کہا کہ ''میں اور جناح اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ فوج کی موجودگی اور کنٹرول کے بغیر اقتدار نہیں سنبھالیں گے''۔ (ایضاً)۔ لیاقت علی خان نے ان خیالات کا بھی اظہار کیا کہ ''ہندوستانی فوج کی تقسیم کے عمل کے دوران اگر انگریز

فوج یہاں موجود رہتی ہے تو اس سے معاملات بہ احسن طریقے سے انجام پانے میں مدد ملے گی''۔

مسلح افواج کی تقسیم کے معاملے میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب محمد علی جناح نے 23 جون کو ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ ''مسلمانوں کو جنرل آکن لیک پر اب مزید کوئی اعتبار نہیں اور بہتر ہے کہ اگر ان کی جگہ کسی اور کو کمانڈر انچیف لگایا جائے''۔ ماؤنٹ بیٹن نے سختی سے اس مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہا کہ ''ہندوستان میں فیلڈ مارشل آکن لیک سے بڑھ کر محترم اور قابل اعتماد کوئی فوجی افسر نہیں''۔ لگتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے یہ خیالات آگے آکن لیک تک نہیں پہنچائے کیونکہ ہم دیکھیں گے کہ آنے والے دنوں میں آکن لیک کا پاکستان کیلئے رویہ کافی ہمدردانہ تھا کیونکہ بھارت فوجی اسلحہ اور اثاثوں کی منصفانہ تقسیم نہیں ہونے دے رہا تھا۔

اس کے علاوہ 23 جون کو فیلڈ مارشل نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک رپورٹ میں کہا چونکہ پہلے تقسیم ہند کی تاریخ جون 1948ء مقرر کی گئی تھی لیکن اب وہ تاریخ اگست 1947ء کر دی گئی ہے تو اتنی کم مدت میں فوجوں کو بھارت یا پاکستان کے حوالے کرنا مشکل امر ہے لہذا اس عمل کے دوران انگریز فوجیوں کی موجودگی ضروری ہو گی۔ 24 جون کو دہلی میں فیلڈ مارشل منٹگمری نے جناح اور نہرو سے الگ الگ ملاقات کی۔ جناح 15 اگست کے بعد انگریز فوج کے انخلا کے حق میں تھے کیونکہ تقسیم کے دوران گڑ بڑ کا خدشہ تھا۔ نہرو اور جناح دونوں چاہتے تھے کہ انگریز افسران کے ملک میں خدمات انجام دیتے رہیں۔

26 جون کو پارٹیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں لیاقت علی خان، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، عبدالرب نشتر، لارڈ اسمے، سر ای میویل Sir E. Mieville، چوہدری محمد علی، اے ایچ پٹیل نے شرکت کی جبکہ سردار بلدیو سنگھ اور فیلڈ مارشل آکن لیک بھی نان ممبر کے طور پر موجود تھے۔ آکن لیک نے شرکا کو مطلع کیا کہ مسلح افواج کی تقسیم ہندوستان کی تقسیم سے پہلے عمل میں آجائے گی لیکن نیشنلائزیشن کیلئے انتظار کرنا ہو گا اور افواج کے انتقال کے عمل کے دوران انگریز فوج کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ فوج کی تقسیم کا عمل ہونے تک دونوں حصوں کی فوج ایک ہیڈ کوارٹر اور ایک ہی کمانڈر انچیف کے تحت رہے گی۔ انہوں نے بتایا کہ منطقی اصول کے مطابق مسلم اکثریت والے فوجی یونٹ پاکستان کو ملے گی جبکہ باقی مذاہب کی اکثریت والے دستے بھارت کو ملیں گے۔

آ کن لیک کو فیلڈ مارشل منٹگمری کی جناح اور نہرو سے ملاقات کی غیر رسمی طور پر اطلاع ملی تھی لیکن انہیں امید تھی کہ ملاقات سے انہیں باضابطہ طور پر بھی آگاہ کیا جائے گا۔ 26 جون کو انہوں نے ایک مختصر نوٹ کے ذریعے واضح کر دیا کہ جناح اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ فرقہ وارانہ تصادم روکنے کے لئے انگریز فوجیوں کو استعمال کیا جائے گا بلکہ انگریز فوجی سختی سے صرف برطانوی باشندوں کی جانیں بچانے تک محدود رہیں گے۔ دریں اثنا اس روز لندن میں چیفس آف سٹاف کے ایک اجلاس میں یہ تجویز دی گئی کہ پاکستان اور بھارت دونوں کو اچھی طرح سمجھایا جائے گا کہ وہ کم از کم 2 یا 3 سال کے لئے انگریز فوجی دستے اپنے ملکوں میں رہنے دیں تا کہ یہ دونوں نئی ریاستیں کسی بھی بیرونی جارحیت سے نمٹنے کے لئے منظم ہو سکیں۔

27 جون کو پارٹیشن کونسل کے لئے کانگریس کی طرف سے نامزد رکن اور بیوروکریٹ ایچ ایم پٹیل نے وائسرائے کی ہدایت پر مسلح افواج کی تقسیم سے متعلق مسائل پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا اور مسلح افواج کی تشکیل نو کے طریقہ کار پر بھی مفصل بحث کی۔ زیادہ تر توجہ رائل انڈین نیوی، رائل انڈین آرمی اور رائل انڈین ایئر فورس کے معاملات پر مرکوز کی گئی۔ اس نوٹ میں کہا گیا کہ "مسلح افواج کی کامیاب تقسیم کیلئے فوج میں موجود انگریز افسروں کی خدمات درکار ہوں گی"۔ (ایضاً:699)۔

جولائی 1947 کے آغاز پر فوجی دستوں کی اجزائے ترکیبی

یکم جولائی 1947ء کو انڈین فوج میں ہندوستانی فوجیوں کی تعداد 3 لاکھ 73 ہزار 570 تھی۔ ان میں ایک لاکھ 54 ہزار 780 یا 41.4 فیصد ہندو تھے، ایک لاکھ 35 ہزار 268 یا 36.2 فیصد مسلمان، 35 ہزار 390 یا 9.5 فیصد سکھ، 16 ہزار 382 یا 4.4 فیصد عیسائی یا دیگر اور 31 ہزار 750 فیصد گورکھا فوج تھے۔ (حسین 1999)۔ یوں دوسری جنگ عظیم میں جہاں 25 لاکھ افراد فوج میں سرگرم عمل تھے اب ان میں سے بیشتر کو غیر فعال کر کے گھروں کو واپس بھیج دیا گیا تھا جبکہ کچھ اب بھی دیگر ممالک میں تعینات تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جولائی 1947ء میں نیوی اور ایئر فورس میں بھی تھوڑی تعداد میں ہندوستانی فوجی ملازم تھے۔ اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی فوج کی کل تعداد صرف 6 بٹالین پر مشتمل تھی۔ (مینسرگ اینڈ مون 1982ء:976)۔

8 جولائی کو نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا کہ ''برطانوی کمانڈر انچیف اور دیگر سینئر انگریز کمانڈروں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ بھارت میں قیام جاری رکھیں''۔ (مینسرگ اینڈ مون 14:1983)۔ دوسری طرف پاکستان کیلئے جناح صاحب نے نئے وائسرائے کو بتایا کہ پاکستان کا کمانڈر انچیف اور کئی سینئر فوجی افسر انگریز ہی ہوں گے۔ (ایضاً: 21)۔ 9 جولائی کو ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب کے گورنر سرایوان جینکنز کو بتایا کہ:

''کمانڈر انچیف نے مجھے کہا ہے کہ میں فوری طور پر صوبائی گورنروں سے کہوں کہ وہ سول انتظامیہ کے امور میں معاونت کرنے والے فوجیوں کی خدمات جلد واپس کر دیں تا کہ فوج کی مجوزہ تشکیل کا عمل مکمل ہو سکے۔ ان فوجیوں کو ان کے معمول کے مقامات پر واپس بھجوایا جائے''۔ (ایضاً: 5-34)۔

10 جولائی کو ایک اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ 15 اگست 1947ء سے دونوں آزاد ملکوں کے فوجی ہیڈ کوارٹر اپنے علاقوں میں فوج کی نقل و حمل یا آپریشن کا کنٹرول کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ موجودہ آرمڈ فورسز ہیڈ کوارٹر برقرار رہے گا اور اسے سپریم ہیڈ کوراٹر کا درجہ مل جائے گا۔ (ایضاً: 75)۔ علاوہ ازیں 15 اگست سے ہندوستان میں تمام انگریز فوجی دستے ایک برطانوی میجر جنرل کی کمان میں آ جائیں گے۔ جو براہ راست سپریم کمانڈر کو جوابدہ ہوگا۔ (ایضاً)۔ ماؤنٹ بیٹن اور آکن لیک کی 15 جولائی کو ایک ملاقات میں فیلڈ مارشل نے شکایت کی کہ عبوری حکومت کے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ نے انگریز افسروں کے بارے میں بدزبانی کی اور وہ اپنی اس خواہش کے تابع بات کر رہے ہیں جس کے تحت وہ مسلح افواج کی تقسیم میں پاکستان کو ہر قیمت پر نقصان پہنچانا چاہتے ہیں جبکہ انگریز افسر قواعد و ضوابط سے ہٹ کر کچھ کرنے کو تیار نہیں۔

آزادی ہند ایکٹ 18 جولائی 1947 میں مسلح افواج کی تقسیم پر مختصر شقیں شامل تھیں۔ ان میں کہا گیا کہ شاہ معظم کی افواج کی 2 نئی ریاستوں میں تقسیم کا عمل مکمل ہونے تک کمانڈ اور گورننس ایک ہی رہے گی۔ جہاں ایک طرف ہندوستان میں یہ پیشرفت ہو رہی تھی وہاں لندن میں یہ رائے برقرار تھی کہ دونوں آزاد ریاستوں کو دولت مشترکہ کے رکن کے طور پر برطانیہ کے ساتھ دفاعی اور سکیورٹی انتظامات سے منسلک رہنا چاہیئے۔ 24 جولائی کو برطانیہ کے وزیر برائے ہندوستان و برما ارل آف لسٹوویل Earl of Listowel نے یہ خیالات وزیراعظم ایٹلی تک پہنچائے۔ جہاں ایک

طرف برطانیہ یہ بات یقینی بنائے گا کہ برطانوی فوجی کسی بیرونی جارحیت کو ناکام بنانے کے لئے موجود رہیں گے وہاں دیگر الفاظ میں بھارت اور پاکستان سٹریٹجک ائیر فیلڈز اور بصورت جنگ برطانوی مفادات کے تحفظ کے لئے مسلح افواج کا تعاون بھی فراہم کریں گے۔ البتہ باہمی تعاون کا فیصلہ کرنے میں دونوں ریاستیں آزاد ہوں گی۔ اگر وہ کسی ممکنہ جنگ میں شریک نہیں بھی ہوتیں تو بھی انہیں فوجی اڈے اور دیگر سہولیات مہیا کرنا پڑیں گی۔ ارل آف لسٹوویل نے ایک اور امکان کو نظرانداز کر دیا۔ وہ یہ کہ اگر بھارت اور پاکستان میں جنگ ہوگئی تو کیا ہوگا؟ ظاہر ہے چونکہ دونوں ملک دولت مشترکہ کے رکن ہوں گے تو اس صورت میں سابق آقا کے کردار کا تعین کرنا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ اس صورتحال پر انہوں نے کوئی رائے نہیں دی۔ قبل ازیں ماؤنٹ بیٹن نے دونوں آزاد ملکوں کو دولت مشترکہ میں شامل کرنے کے لئے زبردست دباؤ ڈالا تھا۔

26 جولائی کو نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کے نام ایک خط میں کمانڈر انچیف کے مشیر برائے امور مالیات کے طور پر چودھری محمد علی (بیوروکریٹ) کے تقرر کی ممانعت کی کیونکہ انہوں نے بطور سرکاری ملازم پاکستان جانے کو ترجیح دی تھی۔ نہرو چاہتے تھے کہ فنانشل ایڈوائزر کے طور پر کسی اور کا تقرر کیا جائے۔ یا اگر ہو سکے تو چودھری محمد علی یا کسی انگریز افسر کے ماتحت جوائنٹ ملٹری فنانس اور اکاؤنٹنگ آرگنائزیشن قائم کی جائے۔ نہرو نے شکایت کی کہ ''کمانڈر انچیف کا رویہ کانگریس کے مؤقف سے میل نہیں کھاتا۔ سپریم کمانڈر کے طور پر ایک مختصر دور انتقال میں وہ اپنی من مرضی سے انتظامی امور نہیں چلا سکتے''۔

نہرو جو نکتہ بتانا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ آکن لیک کو ٹرانزیشن کے عمل کے دورانیے میں بھارتی حکومت کی پالیسیوں پر چلنا ہوگا۔

ماؤنٹ بیٹن نے 28 جولائی کو 65 ویں سٹاف میٹنگ میں بتایا کہ کمانڈر انچیف کو بھارت کی اس خواہش سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ چودھری محمد علی بھارتی حکومت کیلئے قابل قبول نہیں تھے۔ اور یہ کہ آکن لیک کو سمجھ آ گئی تھی اور وہ فیصلے میں درکار تبدیلیاں کریں گے۔ اس سے بھی اہم یہ بات تھی کہ یہ واضح کر دیا گیا کہ دونوں آزاد ملکوں کے درمیان چھوٹی موٹی جھڑپوں میں تو وہاں ملازم انگریز ملازمین اپنا کردار ادا کریں گے لیکن اگر مکمل جنگ چھڑ گئی تو وہ کوئی کردار ادا نہیں کریں گے۔

بھارت میں چیف آف جنرل سٹاف آرتھر سمتھ نے 29 جون کو ایک انتہائی خفیہ رپورٹ

تیار کی جس پر لکھا تھا ''ہندوستانیوں سے خفیہ رکھا جائے''۔ یہ رپورٹ صرف ایسے سینئر انگریز حکام کو بھجوائی گئی جنہیں پاکستان اور بھارت میں خدمات انجام دینا تھیں۔ انہیں بھی سختی سے ہدایت کی گئی کہ رپورٹ کی تمام نقول پڑھنے کے بعد تلف کر دی جائیں۔ اس میں لکھا تھا کہ 14 اگست کے بعد فرقہ وارانہ تصادم کی صورت میں انگریز فوج کو ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ صرف انگریز فوجی برطانوی شہریوں کی جانیں بچانے کیلئے کام کر سکیں گی۔ (ایضاً:395)۔

یکم اگست کو وائسرائے کی ایک ذاتی رپورٹ میں دیگر امور کے علاوہ مسلح افواج کی تقسیم کے فارمولے کا بھی ذکر تھا۔ انہوں نے لکھا کہ:

''مجھے یہ وضاحت کرنی چاہیئے کہ لڑاکا فوجوں کی تقسیم کے معاملے پر ہمیں مذہبی تناسب کی بنیاد پر کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اور یقیناً ان میں چھوٹا فریق پاکستان ہے۔ بری فوج میں چونکہ ساز و سامان کی کوئی کمی نہیں اس لئے اس میں لگ بھگ 70:30 کا حصہ رکھا جا رہا ہے۔ جہاں تک نیوی کا تعلق ہے تو اس میں 60:40 کا تناسب رکھیں گے لیکن چونکہ بھارت کے پاس زیادہ طویل ساحلی پٹی ہے اور وہاں بندرگاہیں بھی زیادہ ہیں اس لئے جہازوں کی تقسیم کا تناسب 70:30 رکھنے کا فارمولا بنایا گیا ہے۔ اگر بات ائیر فورس کی کی جائے تو افرادی قوت کی تقسیم کا تناسب 80:20 رکھیں گے۔ اس وقت فضائیہ میں 10 سکواڈرن طیارے ہیں (2 ٹرانسپورٹ اور 8 لڑاکا طیارے)۔ بھارتی نمائندے نے 8 طیاروں کا دعویٰ کیا ہے۔ مسلح افواج کی تشکیل نو سے متعلق کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ فضائیہ کی تقسیم کا تناسب 70:30 رکھا جائے کیونکہ پاکستان کو شمال مغربی سرحد کی حفاظت کرنا ہو گی''۔

ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ اس فیصلے سے مسلح افواج کی تشکیل نو سے متعلق کمیٹی میں بھارت کے نمائندے خوش نہیں۔ قبل ازیں انہوں نے وائسرائے کی یہ تجویز مسترد کر دی تھی کہ اگر پاکستان کے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں کوئی شورش ہو تو بھارت اپنی فضائیہ کے طیارے وہاں بھجوائے۔ البتہ ان نمائندوں نے اتفاق کیا کہ اگر افغانستان یا کسی اور ملک کی طرف سے پاکستان کے خلاف جارحیت کی گئی تو بھارت اپنے سکواڈرن بھجوانے پر غور کرے گا۔ ''اب انہوں نے یہ نقطۂ نظر اپنایا ہے کہ پاکستان کو لڑاکا طیاروں کا سکواڈرن مہیا کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ بھارت نے قبائلیوں کے خلاف لڑائی میں اپنی عسکری تنصیبات اس کے حوالے کر دیں''۔ (ایضاً:447)۔

اس کے علاوہ سردار پٹیل نے قبائلی عوام کو ''اپنے لوگ'' کہہ کر جناح اور لیاقت کو غضبناک کر دیا ہے۔اس سے بھی اہم یہ بات ہے کہ پٹیل نے یہ قرار دیا ہے کہ جنرل آکن لیک اور دیگر سینئر انگریز کمانڈر پاکستان نواز بن رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ افسران محض دیانتداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

پاکستان آرمی کے حوالے سے ماؤنٹ بیٹن نے 8 اگست کو لکھا کہ جنرل میسروی جو پاکستان کی فوج کے کمانڈر انچیف بننے والے تھے نے مجھے بتایا ہے کہ پاکستان کی آزادی کے بعد 5 انگریز بٹالین سمیت موجود 67 میں سے صرف 35 بٹالین فوج پاکستان میں رہے گی۔اس سے شمال مغربی سرحدی صوبے کی سرحد پر خطرناک صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ 10 ہزار غیر متحرک پنجابی مسلمان اور پٹھان باقاعدہ فوج میں جلد از جلد دوبارہ شامل کئے جائیں۔جنرل میسروی نے یہ تجویز بھی دی کہ پاکستان اس بات کا اعلان کرے کہ افغانستان کے ساتھ سرحد میں اب یا مستقبل میں کوئی ردوبدل نہیں کیا جائے گا۔

باب 4

پہلی جنگ کشمیر 48-1947ء

پاکستان اور بھارت بالترتیب 14 اور 15 اگست 1947ء کو آزاد ملک بن گئے۔ البتہ دونوں ملکوں کی سرحدوں کا تعین کرنے والے ریڈکلف ایوارڈ کی رپورٹ 17 اگست 1947ء کو منظر عام پر آئی، جیسا کہ بانی پاکستان کا مشہور فقرہ ہے کہ پاکستان لولی لنگڑی حالت میں وجود میں آیا۔ انہوں نے 3 جون 1948ء کے پارٹیشن پلان کے اعلان کے بعد محسوس کیا کہ پنجاب اور بنگال مکمل طور پر پاکستان میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔ اگست کے آخری ہفتے تک یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کیا جائے گا۔ بنگال میں ریڈکلف نے مسلمانوں کی اکثریت والے بعض اضلاع یا ان کے حصے بھارت کو دے دیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بودھ اور انامی قبائل پر مشتمل غیر مسلم علاقے چٹا گانگ پہاڑی ترائیاں پاکستان میں شامل کر دیے حالانکہ وہاں کے قبائلی سردار اپنا علاقے بھارت میں شامل کرنے کے خواہاں تھے۔ (بنوں 1991: 240)۔

ریڈکلف کا اس سے بھی زیادہ متنازعہ کردار پنجاب پر تھا۔ ایوارڈ اگرچہ 13 اگست کو حتمی شکل میں تیار ہو چکا تھا لیکن اس کا اعلان پاکستان اور بھارت کی آزادی کے بعد 17 اگست کو کیا گیا۔ اس ایوارڈ سے پاکستان خوش ہوا نہ بھارت۔ البتہ فیصلے کے مطابق انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ (احمد 2012ء: 76-273)۔ پاکستان کو بے انصافی کا شدید احساس ہوا کیونکہ گورداسپور ضلع جس میں مسلمانوں کی اکثریت 51 فیصد تھی وہ تقسیم کر دیا گیا۔ گورداسپور کی تین تحصیل جو دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر واقع تھیں وہ بھارت میں شامل کر دی گئیں جبکہ ایک تحصیل شکر گڑھ پاکستان کو دے دی گئی۔ اس فیصلے کو ماؤنٹ بیٹن اور نہروں کی سوچی سمجھی سازش سے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ

تحصیل پٹھانکوٹ کے ذریعے بھارت کو کشمیر تک رسائی کیلئے زمینی راستہ فراہم کیا جا سکے۔ اس طرح سکھ اکثریت والے لاہور ضلع کے علاقے پاکستان سے لے کر مشرقی پنجاب میں شامل کر دیئے گئے تا کہ پاکستان کی طرف لاہور اور بھارت کی طرف امرتسر کے رقبے کو کم وبیش برابر بنایا جا سکے۔ یہ حتمی تقسیم تقریباً ہو بہو وائسرائے لارڈ ویول کے فروری 1946ء کے حد بندی پلان کی نقل تھی۔ وائسرائے نے یہ پلان دسمبر 1945 کے بریک ڈاؤن پلان 1945 کے تسلسل کے طور پر پیش کیا تھا۔ ویول کی دلیل تھی کہ ضلع امرتسر جو لاہور ڈویژن کا غیر مسلم اکثریت والا ضلع ہے اور سکھوں کا مقدس شہر ہے وہ بھارت میں شامل ہونا چاہیئے۔ اس تناظر میں امرتسر کے بائیں طرف مسلم اکثریت والی تحصیلیں بٹالہ اور گورداسپور بشمول تحصیل فیروز پور اور زیرہ بھی بھارت میں شامل کئے جائیں۔ اس طرح امرتسر براہ راست پاکستان کے ساتھ منسلک نہیں ہوگا اور ہمیشہ کیلئے عدم تحفظ اور توسیع پسندانہ عزائم سے محفوظ رہے گا۔ (مینسر گ اینڈ مون 1976ء:912)۔

دوسری طرف سکھوں کو سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک کی جائے پیدائش ننکانہ صاحب سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی بے انتہا جائیداد کی بنیاد پر لاہور، لائل پور، منٹگمری اور لاہور ڈویژن کے کئی اور علاقوں پر اپنا دعویٰ کیا۔ (احمد:1999:4-153) ۔علاقوں کی حد بندی پر جتنی کھینچا تانی ہوئی اس سے تقسیم کا عمل خونریزی پر منتج ہوا۔ اس کا نتیجہ جدید تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی کی صورت میں نکلا۔ کم وبیش 14 ملین (ایک کروڑ 40 لاکھ سے ایک کروڑ 80 لاکھ) افراد نے پاکستان اور بھارت کی سرحد آر پار کی۔ یہ نسلی یا پھر کسی حد تک مذہبی بنیادوں پر پنجاب میں نسلی صفائی کا بھی پہلا تجربہ تھا۔ یوں کہہ لیں کہ مغربی پنجاب میں ایک بھی ہندو یا سکھ باقی نہ رہا۔ اس طرح مشرقی پنجاب میں بھی چھوٹی سی مسلمان ریاست ملیر کوٹلہ کے سوا کہیں بھی مسلمانوں کا وجود باقی نہ رہا۔ ہندوستان کی تقسیم میں 10 لاکھ سے 20 لاکھ افراد کو تہہ تیغ کیا گیا۔ ان میں سے 5 سے 10 لاکھ صرف پنجاب کے ہندو، سکھ یا مسلمان تھے۔ کم از کم 90 ہزار خواتین کو اغواء کیا گیا۔ کئی کے ساتھ زیادتی کی گئی اور کچھ کو کبھی بازیاب نہ کرایا جا سکا۔ (ایضاً)۔

پنجاب میں بین الاقوامی سرحد خوفناک حد تک لاہور کے قریب کھینچی گئی جو پاکستانی مغربی پنجاب کا مرکزی شہر اور کسی حد تک 1947ء میں پاکستان کا سب سے اہم شہر تھا۔ اس کے علاوہ سیالکوٹ جیسے بعض دیگر شہر بھی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھے۔ بھارتی فوج کی پاکستانی پنجاب میں

کسی بھی کامیاب پیش قدمی کی صورت میں مغربی پاکستان کو باآسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ سرحد کے دوسری طرف مشرقی پنجاب میں امرتسر اور فیروز پور بھی بالکل اس طرح سرحد کے قریب تھے جبکہ جالندھر اور ہوشیار پور بھی زیادہ دور نہیں واقع تھے۔ البتہ بھارت کے پاس وسیع و عریض جگہ تھی جس سے اس کے سٹرٹیجک اہمیت کے حامل شہر دہلی، بمبئی اور مدراس سرحد سے بہت دور اور محفوظ تھے۔

اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل پر مشتمل بھارتی علاقہ تھا۔ پاکستان کی پریشانیاں صرف بھارت کے ساتھ سرحد تک محدود نہیں تھیں۔ جنوبی سرحد پر پاکستان کو ورثے میں ڈیورنڈ لائن ملی جو ہندوستان اور افغانستان کے پختون قبائل کو تقسیم کرتی تھی۔ پاکستان صورتحال جوں کی توں رکھنا چاہتا تھا جس کے افغان مخالف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اقوام متحدہ کیلئے پاکستان کی رکنیت کے معاملے میں افغانستان نے مخالفت کی۔ البتہ افغانستان کے بھارت کے ساتھ تعلقات دوستانہ تھے۔ عسکری اور دفاعی نقطہءنظر سے پاکستان اپنی پیدائش کے وقت ہی خطرناک صورتحال سے دوچار تھا۔ قبل ازیں 1946ء کے صوبائی انتخابات میں خان عبدالغفار خان کے خدائی خدمتگاروں کی حمایت یافتہ فرنٹیئر کانگریس نے 19 مسلم نشستوں سمیت 30 سیٹیں جیتیں جبکہ مسلم لیگ کو صرف 17 نشستیں ملیں (احمد 1998ء: 184)۔ اس کے بعد ایک ریفرنڈم ہوا جس میں صرف 2 آپشن دیے گئے کہ آپ بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان کا حصہ بننا پسند کریں گے۔ اس بناپر صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ فرنٹیئر کانگریس ریفرنڈم میں ایک تیسرا آپشن بھی چاہتی تھی کہ کیا صوبے کو خودمختار ملک ''پختونستان'' بنایا جائے لیکن انگریزوں نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا جس پر فرنٹیئر کانگریس نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا۔ یوں صوبے میں 2 لاکھ 92 ہزار 118 ووٹروں نے ووٹ ڈالا جبکہ ووٹروں کی کل تعداد 5 لاکھ 72 ہزار 798 تھی۔ ریفرنڈم میں 2 لاکھ 89 ہزار 244 افراد نے پاکستان جبکہ صرف 2874 نے بھارت کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ صوبے کے مجموعی ووٹوں میں سے 50.5 فیصد نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ (جانسن 1981ء: 222)۔

بلوچستان جو پاکستان کا رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا لیکن آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا صوبہ ہے وہ ذرا مختلف انداز میں پاکستان میں شامل ہوا۔ بلوچستان 1947ء میں حکومت

کے نامزد کردہ شاہی جرگے کے فیصلے سے پاکستان میں شامل ہوا۔ البتہ خان آف قلات نے 11 اگست 1947ء کو اپنی ریاست کی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا تاہم فوجی کارروائی کے خطرے کے پیش نظر خان نے مارچ 1948ء کے اختتام پر پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کرلیا۔ یکم اپریل 1948 کو پاکستان کی فوج قلات بھیجی گئی۔ خان نے پہلے ہی 27 مارچ کو الحاق بل پر دستخط کر دیے تھے لیکن اس کے چھوٹے بھائی پرنس عبدالکریم نے پاکستان کے خلاف بغاوت کر دی۔ اگرچہ کچھ جھڑپیں ہوئیں تاہم بالآخر باغیوں کو شکست دے دی گئی۔ (ہیری سن 1981:23-22)۔ جنوب مغرب میں سندھ واحد صوبہ تھا جسے سرحدوں میں کوئی ردوبدل کئے بغیر پاکستان کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

مخصوص حالت میں جنوبی ایشیا کی ریاست ہونے کے ساتھ پاکستان جنوبی ایشیا سے آگے تک جغرافیائی اور ثقافتی تعلق کا دعویٰ کرسکتا تھا۔ جغرافیائی اور ثقافتی طور پر پاکستان وسطی اور مغربی ایشیا سے منسلک تھا۔ مشرقی پاکستان جنوبی مشرقی ایشیا کی سرحد پر واقع تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے کئی حصوں میں کمیونسٹ تحریک زوروں پر تھیں۔ چین میں کمیونسٹ اپنے طاقتور حریفوں قوم پرستوں کے مقابلے میں مسلسل مستحکم ہورہے تھے۔ اسی منفرد محل وقوع کے تناظر میں پاکستان اس حالت میں تھا کہ دیگر خطوں کے خلاف عسکری کارروائیوں کیلئے بطور سرحدی چوکی (آؤٹ پوسٹ) کام کرسکے۔

کمزور اور جدید ساز وسامان سے محروم مسلح افواج

لیکن پوری دنیا میں عسکری ذمہ داریوں کیلئے درکار صلاحیت 1947ء کے حالات میں مفقود تھی۔ پاکستان کو انگریزوں کی انڈین آرمی سے 64:36 کے تناسب سے حصہ ملنا تھا جبکہ بھارت کو بالحاظ آبادی ورقبہ بڑا حصہ ملنا تھا۔ چنانچہ پاکستان کو 6 آرمرڈ رجمنٹس جبکہ بھارت کو 14 رجمنٹس ملیں۔ پاکستان کو 8 جبکہ بھارت کو 40 آرٹلری رجمنٹس دی گئیں۔ پاکستان کو 8 انفنٹری جبکہ بھارت کو 21 رجمنٹس دی گئیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کو فوجی افسروں اور ٹیکنیکل شعبے میں مہارت رکھنے والے فوجیوں کی شدید قلت کا سامنا تھا۔ (کوہن 1998)۔ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے جوائنٹ ڈیفنس کونسل تشکیل دی تھی جس میں وہ خود اور پاکستان اور بھارت کے وزرائے دفاع بطور رکن شامل تھے۔ دونوں ملکوں کی فوجوں کے سپریم کمانڈر جنرل آکن لیک بھی شامل تھے۔

اس کونسل کو مارچ 1948 کے آخر تک فوجی اثاثوں اور فوجیوں کی تقسیم کا کام مکمل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ (چیمہ 18:2003)۔ تاہم پرویز اقبال چیمہ کے مطابق یہ کونسل مناسب طرح سے کام نہ کرسکی کیونکہ بھارت نے کوئی تعاون نہ کیا اور ماؤنٹ بیٹن جو بھارت کے گورنر جنرل تھے پر شدید دباؤ ڈالا جس پر انہوں نے کونسل تحلیل کردی۔ پرویز چیمہ لکھتے ہیں کہ:

''جنرل آکن لیک نے پہلے ہی پیشنگوئی کردی تھی کہ پاکستان کو اس کے حصے کے اثاثے نہیں ملیں گے اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو مطلع کیا کہ ہندوستان اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کو اس کے حصے کے اثاثے دینے کے وعدے پورے کرنے میں ناکام رہے اور 31 مارچ 1948 تک پاکستان کو 165000 ٹن آرڈننس کی بجائے صرف 4703 ٹن آرڈننس فراہم کیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ صرف 3 فیصد حصہ دیا گیا۔ پاکستان کو 249 مختص کردہ ٹینکوں میں سے ایک بھی نہیں دیا گیا اور فوجی ساز وسامان اور اسلحے کی مد میں جو کچھ دیا گیا وہ خراب، ناقابل استعمال یا بیکار تھا۔ اس کے علاوہ تمام اسلحہ ساز فیکٹریاں بھارت کے اندر تھیں اور پاکستان کو اپنی فیکٹریاں لگانے کیلئے معاوضے سے بھی محروم کردیا گیا''۔ (ایضاً)۔

رابرٹ پی اوسبرن جنہوں نے آکن لیک کے ہندوستان کی تقسیم میں مؤقف اور فوجوں کی تقسیم میں کردار پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ انہوں نے فیلڈ مارشل کی ذہنی کیفیت کا مختصر طور پر ان الفاظ میں احاطہ کیا ہے:۔

''آکن لیک کے نزدیک ہندوستانی فوج کی تقسیم کا فیصلہ ان کا بدترین ڈراؤنا خواب تھا جو حقیقت بننے والا تھا۔ تقریباً 200 سال پرانی روایت دم توڑنے والی تھی اور وہ فوج جس میں انہوں نے اپنی جوانی صرف کردی وہ ختم ہونے والی تھی اور خود ان کے ہاتھوں سے ختم ہونے والی تھی۔ آکن لیک مسلسل وہ کام کرنے کا جواز ڈھونڈتے رہے جو ان کے ضمیر کے مطابق ایک جرم یا کم از کم ایک سانحہ ضرور تھا۔ اس تناظر میں انہوں نے اس جواز کو اس عزم کی صورت میں قبول کیا کہ اگر تقسیم کا عمل ناگزیر ہے تو جتنا ممکن ہو اسے منصفانہ ہونا چاہیئے''۔

ان کے یہ ارادے کئی وجوہات کی بنا پر عملی جامہ نہ پہن سکے۔ جب سے جناح دہلی سے کراچی چلے گئے تھے وہ بھارت میں وقوع پذیر فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے قابل نہ رہے۔ یہ مسئلہ اس حقیقت سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور بھارت دونوں کے گورنر

جنرل نہیں تھے۔اس طرح دہلی میں پاکستان کی نمائندگی مزید کمزور ہوگئی۔آ کن لیک نے محسوس کیا کہ جناح کی اچانک کراچی روانگی بالخصوص پاکستان کیلئے نقصان دہ تھی کیونکہ دہلی میں اب ان کے قد کا کوئی لیڈر نہیں تھا جو جاری مذاکرات میں ان کے جگہ لے سکے۔فیلڈ مارشل نے اپنے مافی الضمیر کوان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''پاکستان کی نمائندگی...... بلا شبہ اس حقیقت سے بری طرح متاثر ہوئی کہ اس کی حکومت دہلی میں نہیں اب کراچی میں تھی۔اس طرح مجھے ایک سے زائد مرتبہ پاکستان کے حق میں بولنے کی ضرورت پڑی۔میری ایسی دلی خواہش نہیں تھی کیونکہ اس سے بھارتی کابینہ کے ارکان اوران کے ماتحت حکام کے اس الزام کو مزید تقویت ملی کہ میں اور سپریم کمانڈرز ہیڈ کوارٹر کے دیگر افسر پاکستان کے حق میں متعصب ہیں''۔(اوبرن 1994)۔

بہرحال آ کن لیک نے نوآبادیاتی دور کی ہندوستانی فوج کے اثاثوں کی منصفانہ تقسیم پر اصرار جاری رکھا جس کا نتیجہ صرف بھارت کی طرف سے سخت رویے کے سوا کچھ نہ نکلا۔ بھارتی حکومت نے ایک منظم مہم کے تحت یہ مطالبہ بڑھانا شروع کر دیا کہ آ کن لیک کو سپریم کمانڈر کے عہدے سے ہٹایا جائے۔26 ستمبر 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن نے دباؤ کی تاب نہ لاتے ہوئے فیلڈ مارشل کولکھا کہ بھارتی حکومت انہیں ہٹانا چاہتی ہے۔انہوں نے کہا کہ ممکن ہے حکومت پاکستان اس فیصلے کی مخالفت کرے گی لیکن محض دارالحکومت کواس صورتحال سے نکالنے کیلئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے آ کن لیک کو مطلع کیا کہ'' کچھ عرصہ پہلے وہ (پاکستان والے) بھی آپ کو مسلم دشمن جذبات کی بنا پر ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے''۔(ایضاً:186)۔ ماؤنٹ بیٹن کا اشارہ جناح کے چند ماہ پہلے ریمارکس پر تھا کہ مسلم لیگ کو فیلڈ مارشل پر کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ماؤنٹ بیٹن کو فیلڈ مارشل کا دفاع کرنے میں مزید کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔خود جناح کی طرف سے ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل نہ بنانے کا انہیں سخت قلق تھا۔تمام امکانات کے مطابق اس انکار سے ماؤنٹ بیٹن پاکستان کے خلاف متعصب نظر آتے ہیں۔ اگر چہ سچائی یہ ہے کہ انہوں نے کم از کم یکم اگست تک کوشش کی کہ پاکستان کواس کا حصہ ملنے میں بے انصافی نہ ہو۔

آ کن لیک نے اکتوبر کے شروع میں ماؤنٹ بیٹن اور دیگر انگریز حکام کو آگاہ کیا کہ وہ 30 نومبر تک دہلی چھوڑ دیں گے اور 31 دسمبر 1947ء تک سپریم کمانڈر کا ہیڈ کوارٹر بند کر دیا جائے گا۔

انہوں نے فیصلے سے قائداعظم کو بھی مطلع کر دیا۔ 16 اکتوبر کو جب جوائنٹ ڈیفنس کونسل کا اجلاس ہوا تو جناح نے آکن لیک کے فیصلے کی مخالفت کی اور مؤقف اختیار کیا کہ چونکہ اثاثوں کی تقسیم کی ذمہ داری ابھی پوری نہیں ہوئی اس لئے یہ فیصلہ قابل قبول نہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کا جواب دیا کہ بیشتر اثاثوں کی تقسیم ہو چکی ہے اور جو تھوڑا بہت رہ گیا ہے وہ دونوں ملکوں کے کمانڈر انچیف بیٹھ کر تقسیم کر لیں گے۔ (دونوں کمانڈر انچیف انگریز تھے)۔

21 اکتوبر کو بھارتی حکومت نے باضابطہ طور پر سپریم کمانڈر کا دفتر قبل از وقت بند کرنے کے فیصلے کی منظوری دے دی۔ اس تناظر میں کچھ قانونی موشگافیوں نے بھی جنم لیا کہ آیا جوائنٹ ڈیفنس کونسل کو اپریل 1948ء سے قبل تحلیل کیا جا سکتا تھا۔ (ایضاً: 98-187)۔ برطانوی حکومت پہلے ہی ماؤنٹ بیٹن کو ہیڈ کوارٹر بند کرنے پر رضا مند کر چکی تھی۔ چنانچہ آنے والے مہینوں میں ڈیفنس کونسل بھی غیر فعال ہو کر رہ گئی۔ بہر حال 7 نومبر 1947 تک تمام آرمرڈ اور آرٹلری رجمنٹوں کی نقل و حرکت مکمل کی جا چکی تھی۔ اس طرح بھارت سے تمام انفنٹری یونٹ ابھی تک نہیں گیا تھا۔ جہاں تک ساز و سامان اور فوجی آلات کا تعلق ہے تو بقول چیمہ پاکستان کو اس کے حصے کا حق نہیں ملا۔

کام کا آغاز

اگر چہ بیسویں صدی کے آغاز پر انگریز حکومت کے دوران ہندوستان میں صنعتیں لگانے کا کچھ کام ہوا تھا لیکن یہ علاقے وہ تھے جو آزادی کے بعد بھارت کے حصے میں آئے۔ پاکستان میں شرح تعلیم انتہائی کم تھی جبکہ مجموعی طور پر سماجی ترقی کا شعبہ بھی کافی پسماندہ تھا۔ پاکستانی معاشرہ امیر جاگیرداروں، کم تعداد میں دانشور طبقے، کروڑوں کی تعداد میں کسانوں، ہنر مندوں اور دیگر غریب افراد پر مشتمل تھا۔ مڈل کلاس کا شاید سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ جب آزادی کے بعد پاکستان نے اپنا سفر شروع کیا تو خزانہ تقریباً خالی تھا۔ اس تناظر میں یہ بتانا اہمیت کا حامل ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھارتی حکومت پر دباؤ ڈالنے کیلئے مشہور مرن ہرت کی دھمکی دی تھی کہ وہ پاکستان کو ورثے میں ملنے والی رقم میں 550 ملین روپے کا اس کا حصہ دے۔ نہرو اور پٹیل کی طرف سے رقم کی ادائیگی روکنے کا یہ عذر تراشا گیا کہ پاکستان اس رقم کو کشمیر میں جاری شورش کو ہوا دینے

کے لئے استعمال کرے گا اور اسلحہ خریدے گا۔ تاہم بھارتی حکومت کو گاندھی کے دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔(احمد:2010)۔

بہرحال سرمائے اور انفراسٹرکچر کی کمی نے پاکستان کیلئے بیرونی امداد مانگنے کی بنیاد قائم کر دی تاکہ وہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کیلئے سرمایہ فراہم کر سکے۔(برکی 1991: 111)۔ البتہ قیام کے فوراً بعد سکیورٹی خدشات نے پاکستان کی ترقی اور جدیدیت کی طرف توجہ کو گہنا دیا۔ آزادی ہند ایکٹ 15 جون 1947 نے خودمختار ریاستوں کا وجود برقرار رکھنے کا معاملہ متنازعہ بنا دیا۔ دوسری طرف ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات کے قیام کے لئے مذاکرات کر سکتے تھے۔ بیشتر خودمختار ریاستیں جو جغرافیائی طور پر بھارت میں گھری تھیں نے بھارت کے ساتھ انضمام کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہی کچھ پاکستان میں ہوا۔ بہاولپور، خیرپور، مکران، لسبیلہ، چترال، دیر، سوات، امب اور پھلرا Phulra ریاست نے پاکستان کے ساتھ ادغام کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ریاستوں سے الحاق کے کچھ کیس متنازعہ ثابت ہوئے بلکہ بعض مقامات پر تو فوجی کارروائی سے بھی کام لیا گیا۔ مثال کے طور پر بلوچستان میں واقع ریاست قلات نے 11 اگست کو آزادی کا اعلان کیا لیکن پاکستان کے دباؤ پر مارچ 1947ء کو فیصلہ واپس لے لیا۔ ریاست حیدرآباد جس کا نواب مسلمان تھا لیکن 90 فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی وہ چاروں طرف سے بھارت میں گھری ہوئی تھی۔ حیدرآباد کے حکمران نے آزادی کا اعلان کیا لیکن ستمبر 1948ء میں بھارت نے فوجی طاقت کے بول بوتے پر اس کا اپنے ساتھ الحاق کر لیا۔ جوناگڑھ اور منادر کی 2 چھوٹی ریاستیں جو جزیرہ نما کاٹھیاواڑ پر واقع تھیں کے حکمران مسلمان تھے لیکن آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اگرچہ ان دونوں ریاستوں کی جغرافیائی طور پر بھارت سے قربت تھی لیکن ان کے مسلمان حکمرانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ پاکستان نے یہ فیصلہ قبول کر لیا جبکہ بھارت نے مسترد کر دیا۔ (فیضی 1991ء: 331)۔ جوناگڑھ اور منادر میں شورش برپا ہو گئی۔ اکتوبر، نومبر 1947ء کو بھارتی فوجی دستوں نے چڑھائی کر دی۔ جنوری 1948ء میں پاکستان نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں دونوں ریاستوں کے الحاق کا معاملہ اٹھایا۔ بھارت نے اپنے زیر انتظام عوام کے استصواب رائے کا اہتمام کیا جس کے تحت عوام نے بھارت سے الحاق کے حق میں فیصلہ دیا تاہم پاکستان نے ریفرنڈم کی حیثیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (گینکووسکی اینڈ گورڈن

پولینسکا یا 1972: 165)۔ بہر حال ان تمام مسئلوں میں سے کسی مسئلے نے پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں اتنی تلخی نہیں پیدا کی جتنی کہ خود مختار ریاست جموں وکشمیر کے مسئلے نے پیدا کی۔

آزادی کے فوراً بعد پاکستان کو جس سب سے بڑے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا وہ لاکھوں مہاجرین کا سمندر تھا۔ بالخصوص مغربی پاکستان اور خصوصاً مغربی پنجاب میں۔ بے خانماں و برباد، لٹے پٹے مہاجرین کو خوراک، گھر اور طبی امداد کی ضرورت تھی۔ جو ریلیف کیمپ قائم کئے گئے وہ خوفناک حد تک ناکافی ثابت ہوئے چنانچہ مہاجرین کی آبادی کاری پر طویل عرصہ لگا۔ ان تمام غیر معمولی مشکلات کے ہوتے ہوئے مسئلہ کشمیر اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک سال سے زائد عرصے تک دونوں ملکوں میں فوجی جارحیت کشمیر پر قبضے پر منتج ہوئی۔

پہلی جنگ کشمیر

ریاست جموں وکشمیر کو جموں کے ہندو حکمران گلاب سنگھ ڈوگرہ نے انگریزوں سے 75 لاکھ روپے میں خریدا۔ یہ علاقے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت میں شامل تھے۔ تقسیم سے قبل 1947ء میں جموں وکشمیر کا مجموعی رقبہ 85 ہزار 783 مربع میل تھا۔ ریاست میں مسلمان 75 فیصد کی آبادی کے ساتھ مطلق اکثریت میں تھے۔ تکنیکی اعتبار سے انگریزوں کی بالادستی ختم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ خود مختار ریاستیں اپنی آزادی کا اعلان کر سکتی تھیں، البتہ ان سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر لیں۔ دوسری طرف ریاست کی طرف سے الحاق کے معاہدے پر دستخط کا اختیار متعلقہ ریاست کے حکمران کو دیا گیا تھا لیکن اس سے بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ عوام کی خواہشات کا بھی احترام کرے گا۔ مہاراجہ اپنی ریاست کو خود مختار اور آزاد رکھنا چاہتا تھا اور پاکستان یا بھارت دونوں میں سے کسی کے ساتھ الحاق کرنے کا خواہاں نہیں تھا۔ بلکہ اس نے پاکستان کے ساتھ اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھنے کیلئے بات چیت بھی کی کیونکہ کشمیر کیلئے زیادہ خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت روایتی طور پر پاکستان سے حاصل کی جاتی تھیں۔ مہاراجہ نے یہی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے بھارت کو بھی پیشکش کی لیکن بھارت کی طرف سے کوئی ردعمل سامنے نہ آیا۔ (ٹینگ 1990ء: 33)۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ ریڈکلف ایوارڈ کے تحت تحصیل پٹھانکوٹ بھارت کو دینے سے بھارت کو زمینی راستے سے کشمیر تک رسائی مل

چکی تھی۔ خودمختار حکمرانوں کو یہ صوابدیدی اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلقات کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ شیخ عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس کشمیر میں کانگریس کی اتحادی تھی جبکہ چودھری غلام عباس کی قیادت میں مسلم کانفرنس پاکستان کی حامی تھی۔ لیکن ریاست پر قبائلیوں کی چڑھائی کے بعد مہاراجہ نے پاکستان کے بارے میں اپنا ذہن تبدیل کر لیا۔

میجر جنرل (ر) شاہد حامد جو فیلڈ مارشل آکن لیک کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے نے دعویٰ کیا ہے کہ کشمیر کے وزیر اعظم اور کشمیری برہمن راجہ چندر کاک نے مہاراجہ ہری سنگھ کو پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ دیا تھا اور خبردار کیا کہ بھارت کے ساتھ الحاق کی صورت میں کشمیری مسلمان بغاوت کر دیں گے۔ البتہ مہاراجہ نے خود اپنے اثاثے بیچ کر رقم بھارت اور برطانیہ منتقل کرنا شروع کر دی۔ اس نے کشمیر کے الحاق کیلئے بھارت کے ساتھ اس شرط پر خفیہ بات چیت بھی شروع کر دی کہ ریاست کی خودمختاری بحال رکھی جائے گی لیکن اس دوران پونچھ کے علاقے میں اس کی مسلمان رعایا نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ بغاوت ختم کرنے کے لئے مہاراجہ نے کشمیری فوج بھجوا دی لیکن فوج لڑنے کی بجائے باغیوں سے جا ملی۔ (حامد 1986ء:5:272)۔ شاہد حامد لکھتے ہیں کہ:۔

''جب تک عوام میں یہ امید باقی رہی کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے مشورے پر عملدرآمد کیا جائے گا تو پاکستان کے قبائلی مسلح افراد ریاست سے دور رہے لیکن جب یہ بات واضح ہو گئی کہ ہری سنگھ بھارت سے الحاق کرنے والا ہے تو قبائلیوں کو روکنا ممکن نہ رہا چنانچہ انہوں نے کشمیر میں داخل ہونا شروع کر دیا''۔ (ایضاً:275)۔

شاہد حامد نے اپنے اس دعوے کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیا کہ مہاراجہ واقعی بھارت کے ساتھ الحاق کا سوچ رہا تھا۔ ان کے ان الفاظ کہ ''جب یہ معلوم ہو گیا کہ ہری سنگھ بھارت سے الحاق کرنے والا تھا'' بذات خود شکوک و شبہات کے آئینہ دار ہیں۔ اسی دوران پنجاب بھر میں پھیلنے والے فرقہ وارانہ فسادات کشمیر بھی پہنچ گئے۔ پونچھ ریجن میں 24 اگست کو ایک سیاسی اجتماع کے شرکا پر ریاستی فورس کی فائرنگ کے بعد ہنگامے شروع ہو گئے۔ باغیوں نے کئی ہندوؤں اور سکھوں کو مار ڈالا۔ 60 ہزار غیر فعال سابق فوجیوں نے بغاوت کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں نے ریاستی فوج کو ڈرانا دھمکانا اور سڑکوں، پلوں پر ٹریفک درہم برہم کرنا شروع کر دی۔ کشمیری فوج کے بیشتر

مسلمان سپاہی فوج سے نکل کر باغیوں کا ساتھ دینے لگے۔(امین:1999ء)۔اس کے ردعمل میں جموں میں مسلم کش حملے شروع ہو گئے اور ہزاروں مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا جبکہ 5 لاکھ پاکستان کی طرف فرار ہو گئے۔

کشمیر پر حملے کی مہم کے روح رواں اکبر خان نے اپنی کتاب Raiders in Kashmir (1992) میں کشمیر کے تمام منصوبے کی مفصل تفصیل دی ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ کشمیر کے بغیر پاکستان کی سلامتی ہمیشہ خطرے میں رہتی کیونکہ بھارت کی طرف سے مغربی کشمیر پر فوجیں لگانے سے لاہور اور راولپنڈی کے درمیان پاکستان کی سکیورٹی بڑی آسانی سے خطرے میں رہتی۔اس کے علاوہ مغربی پاکستان کی زرعی معیشت کا دارومدار کشمیر سے آنے والے دریاؤں پر ہے۔ پاکستانی پنجاب کے وزیر امور بحالی مہاجرین میاں افتخار الدین کو مسلم لیگی قیادت نے یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ کشمیری رہنماؤں کے ساتھ رابطہ کریں تا کہ انہیں پاکستان کے ساتھ الحاق کیلئے قائل کیا جا سکے۔اگر چہ کشمیری رہنماؤں کو کچھ پیسے ضرور دیے گئے لیکن پاکستان کی باقاعدہ فوج یا فوجی افسروں کو کشمیر بھجوانے سے گریز کیا گیا اور غیر سرکاری سطح پر ہی رابطے رکھے گئے۔

جنرل ہیڈکوارٹر (جی ایچ کیو) میں ڈائریکٹر اسلحہ وساز وسامان کے طور پر جنرل اکبر خان جانتے تھے کہ پاکستانی فوج کو پہلے ہی اسلحے کی شدید قلت کا سامنا تھا کیونکہ پاکستان کے حصے کا بڑا اسلحہ ابھی تک بھارت کے قبضے میں تھا۔انگریز کمانڈر انچیف جنرل میسروی کی اجازت کے بغیر پاکستان کا اسلحہ استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ ماضی کی ایک مثال سامنے رکھتے ہوئے اکبر خان نے پنجاب پولیس کو 4 ہزار رائفلیں جاری کر دیں۔

جنرل اکبر خان نے کشمیر کے بارے میں مکمل منصوبہ تیار کیا جس میں کشمیر میں داخلے کے راستوں اور تمام آپریشن کی تفصیلات شامل تھیں۔انہوں نے یہ تحریری منصوبہ صوبائی وزیر میاں افتخار الدین کے سپرد کر دیا جو اسے لاہور لے گئے جہاں ایک اور وزیر سردار شوکت حیات کی سربراہی میں ایک کانفرنس ہوئی۔اکبر خان کا شکوہ ہے کہ ان کے تیار کردہ پلان پر حکومت نے غور نہیں کیا اور اس کی جگہ سردار شوکت حیات کے تیار کردہ منصوبے کو ترجیح دی گئی۔(ایضاً:18:12)۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے علاوہ کانفرنس میں وزیر خزانہ غلام محمد، میاں افتخار الدین، زمان کیانی (سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی کے سابق افسر) خورشید انور (مسلم لیگ نیشنل

گارڈز کے کمانڈر)، سردار شوکت حیات اور خود اکبر خان نے بھی شرکت کی۔ اکبر خان کا کہنا ہے کہ اجلاس میں شامل رہنماؤں کا جذبہ تو زبردست تھا لیکن اس پلان کی راہ میں حائل مشکلات سے نمٹنے کے لئے کوئی سنجیدہ بحث نہیں کی گئی۔ (ایضاً:23)۔ پورے آپریشن کشمیر میں مؤثر کنٹرول کا فقدان تھا۔

شوکت حیات اور خورشید انور کی آپس میں بداعتمادی تھی اور وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔ اس مرحلے پر اگرچہ کشمیر پلان پر اکبر خان کی کوئی باضابطہ ذمہ داری نہیں تھی لیکن انہوں نے اپنے ساتھ انٹلی جنس شعبے کے انچارج بریگیڈئر شیر خان کو اعتماد میں لیا جنہوں نے اکبر خان کو معلومات اور معاونت فراہم کی۔ فوج اور ائیر فورس کے کئی افسروں نے نہ صرف کپڑے بلکہ ایمونیشن اور اسلحہ بھی فراہم کیا۔ اس دوران بھارت نے شکایت کی کہ پاکستان کشمیر پر جوں کی توں صورتحال برقرار رکھنے کے معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور پاکستان سے الحاق کیلئے معاشی دباؤ بڑھا رہا ہے۔ اس معاشی دباؤ میں مٹی کے تیل، پٹرول، اشیائے خوردنی اور نمک کی سپلائی روکنا شامل تھا۔ بھارت نے یہ بھی شکایت کی کہ پاکستان نے جموں اور سیالکوٹ کے درمیان ریلوے سروس معطل کر دی ہے۔ اس موقع پر بھارت نواز شیخ عبداللہ تک نے مہاراجہ پر کڑی تنقید کی کہ وہ کشمیری مسلمانوں کے اس خدشے کے ازالے کے لئے کچھ نہیں کر رہا کہ پنجاب میں ہونے والے فسادات کشمیر تک پھیل سکتے تھے۔ اس کے بعد اکبر خان نے یہ چونکا دینے والی بات کی ہے:

''جیسا کہ شیخ عبداللہ تک مہاراجہ پر الزام لگا رہا تھا کہ وہ بھارت کے ساتھ الحاق سے گریزاں تھا کیونکہ اسے بھارت سے معاونت مانگنے کا کوئی جواز نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پھر اچانک 23 اکتوبر کو قبائلی مسلح افراد کے کشمیر پر حملے سے صورتحال یکسر بدل گئی۔ یہ اتنی اہم پیشرفت ثابت ہوئی کہ کشمیر ریاست کا 4 روز کے اندر بھارت کے ساتھ الحاق کر دیا گیا''۔ (ایضاً:27)۔

بظاہر لگتا ہے کہ قبائلیوں کے کشمیر پر حملے کے منصوبے پر اکبر خان کو اعتماد میں نہیں لیا گیا بلکہ لشکر جمع کرنے کا کام خورشید انور نے کیا۔ پاکستان کے جی ایچ کیو سے بھارت میں کمانڈر انچیف کو ایک ٹیلی گرام بھیجا گیا کہ 5 ہزار مسلح قبائلیوں نے حملہ کر کے مظفر آباد اور ڈومیل پر قبضہ کر لیا ہے۔ اکبر خان بتاتے ہیں کہ قبائلیوں کی لشکر کشی ایک زبردست کامیابی تھی لیکن اس کا مطلب یہ تھا

کہ اب بھارت اس کا جواب دینے کا پابند تھا۔ انہوں نے لکھا کہ ''حملے کے تیسرے روز دہلی میں مسلح افواج کے سربراہوں کو مہاراجہ کشمیر کی طرف سے مدد کی درخواست کے تناظر میں کارروائی کا حکم دیا گیا۔ اگلے روز جب قبائلیوں نے سری نگر سے 35 کلومیٹر دور بارہ مولا پر قبضہ کرلیا تو مہاراجہ سکتے کے عالم میں جموں فرار ہو گیا۔ مبینہ طور پر اس نے اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ ''اگر وزیر اعظم وی پی مینن بھارت سے امداد لے کر واپس نہیں آتا تو اس کا مطلب ہوگا کہ سب کچھ ہاتھ سے گیا۔ اس لئے اے ڈی سی مجھے سوتے میں گولی مار دے''۔ (ایضاً: 29)۔

ہری سنگھ نے 24 اکتوبر کو بھارت سے مدد کی درخواست کی۔ بھارتی حکومت نے وی پی مینن کو سری نگر یہ پیغام دے کر بھجوایا کہ بھارت صرف اسی صورت میں اپنی فوج کشمیر بھجوائے گا اگر اس کا الحاق بھارت سے کر دیا جائے۔ بھارت کے مطابق مہاراجہ نے 26 اکتوبر 1947ء کو الحاق کے بل پر دستخط کر دیے۔ 27 اکتوبر کو جنرل میسروی بطور کمانڈر انچیف رخصت پر تھے۔ گورنر جنرل محمد علی جناح نے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو حکم دیا کہ کشمیر پر حملہ کر دیا جائے۔ البتہ سپریم کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل نے یہ فیصلہ مسترد کرتے ہوئے دھمکی دی کہ تمام انگریز فوجیوں کی خدمات واپس لے لی جائیں گی چنانچہ قائد اعظم نے اپنا ذہن تبدیل کرلیا۔ (امین 1999: 91)۔ اکبر خان نے دعویٰ کیا ہے کہ کئی سال بعد مجھے پتہ چلا کہ جناح صاحب نے 27 اگست کو جنرل گریسی کو جموں پر حملے کا حکم دیا لیکن انہوں نے آکن لیک کی اجازت کے بغیر انکار کر دیا۔ (اکبر 1992: 34-33)۔ اکبر خان نے وہ دیگر وجوہات بھی بتائی ہیں جو ممکنہ طور پر جنرل گریسی نے قائد اعظم کو بتائی ہوں گی تا کہ انہیں حملے کا حکم واپس لینے پر قائل کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر یہ کہ پاکستان کی فوج ابھی تنظیم سازی کے عمل سے گزر رہی ہے۔ یہ کہ ایک اور جنرل کے ماتحت ایک غیر جانبدار باؤنڈری فورس اب بھی قائم ہے۔ یا یہ کہ دونوں ملکوں کے درمیان کسی جنگ کی صورت میں برطانوی حکومت اپنے تمام فوجی افسر واپس بلا سکتی ہے۔ (اکبر 1992ء: 34)۔

کشمیر میں فوجی دستے داخل ہونے کے وقت کے بارے میں اکبر خان نے لکھا ہے کہ:۔

''قبائلی مسلح افراد 26 کو یہاں پہنچے (مراد بارہ مولہ جہاں سے سری نگر محض 38 کلومیٹر دور تھا) اس وقت تک کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق نہیں ہوا تھا اور بھارتی فوجی بھی کشمیر میں نہیں آئے تھے۔ ریاست کے اپنے فوجی نہایت پست حوصلہ تھے اور بدنظمی میں پسپا ہو گئے۔ دارالحکومت

صرف 35 میل دور رہ گیا تھا اور مزاحمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ قبائلیوں کا صرف 2 گھنٹے کا سفر باقی رہ گیا تھا اور لرزہ براندام ہوا سری نگران کے سامنے اور ان کے رحم و کرم پر تھا لیکن اس روز قبائلیوں نے آگے کو پیش قدمی نہ کی۔ اس سے اگلے روز بھی وہ آگے نہ بڑھے۔ جب آخر کار انہوں نے 28 کو پیشقدمی کی تو ان کا سامنا بھارتی فوجیوں سے ہوا جنہیں سینکڑوں طیاروں کے ذریعے کشمیر میں اتارا گیا تھا''۔ (ایضاً:39)

قبائلی حملہ آور لوٹ مار، عصمت دری میں مصروف تھے۔ (کلف لے 2000:14)۔ تاہم اکبر خان نے ایسے کسی واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ ایک جذباتی موقع پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بھارتی فوج تعداد میں پاکستانی فوج سے دوگنا زائد تھی لیکن ماضی میں کئی مواقع پر چھوٹی فوجیں بڑی فوجوں کو شکست دیتی رہی تھیں۔ پھر انہوں نے یہ بڑھ ماری کہ: ''اگر یہ (بھارتی فوجی) پاکستان میں داخل ہوتے تو انہیں وہاں لگ پتہ جاتا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ ہم 2 لاکھ مسلح قبائلیوں کے سیلاب کے دروازے کھولے دیتے اور یہ ایک مفلوج کر دینے والی سوچ تھی''۔ (خان 1995ء:35)۔ ایسا لگتا ہے کہ جنرل اکبر خان یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قبائلیوں کی بربریت اور وحشت بھارت کو پاکستان پر بالادستی حاصل نہیں کرنے دے گی۔ وہ مغربی پاکستان میں بھارتی حملے کو سرے سے زیر بحث نہیں لائے کیونکہ ان کے نزدیک بھارتی فوج صرف قبائلیوں اور باضابطہ اور بے ضابطہ فوجیوں کے ہاتھوں کشمیر سے ہاتھ دھونے کے قریب تھی۔ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ایک لبریشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ لیاقت علی خان نے کمیٹی کو بتایا کہ لڑائی اگلے 3 ماہ تک جاری رہے گی تاکہ پاکستان کے سیاسی مقاصد مذاکرات اور دیگر طریقوں سے حاصل کئے جاسکیں۔ اکبر خان نے سیاسی مقاصد کی وضاحت نہیں کی۔ بہر حال انہوں نے 29 اکتوبر کو پہلی بار مظفر آباد میں قبائلی لشکر کو دیکھا تو شدت جذبات سے لبریز ہو گئے۔ انہوں نے لکھا کہ:

''پھر اچانک منظر نامہ ایسا بدل گیا جیسے پردہ اٹھایا گیا ہو، قبائلی اب سری نگر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمارے سامنے جو تصویر تھی وہ گویا تاریخ کا ایک صفحہ تھی، یادیں کئی صدیاں پیچھے چلی گئیں۔ یہ بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے ہمارے آباؤ اجداد پہاڑی دروں سے فرنٹیئر میں داخل ہو گئے تھے''۔ (ایضاً:37)۔ اس کے بعد مصنف نے بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل بتائی ہے۔ مزید قبائلی کشمیر میں آئے لیکن جونہی ان کا سامنا باقاعدہ بھارتی فوج سے ہوا وہ پسپا

ہونے لگے۔ قبائلیوں کی سنائپر شوٹنگ اور گوریلا حملوں کی تکنیک وادی کشمیر کے میدانوں میں کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ بقول اکبر خان کے جموں پر قبضہ نہ کر کے پاکستان نے بھی قبائلیوں کی کھل کر حمایت نہ کی۔ 5 نومبر تک قبائلی لشکر کا بڑا حصہ کشمیر سے فرار ہو چکا تھا۔ اس دوران بھارت نے مزید فوجیں کشمیر منگوانے کا سلسلہ جاری رکھا اور موسم سرما کے دوران جھڑپیں جاری رہیں۔ فروری 1948ء کے وسط میں اکبر خان کو ان کی درخواست پر اس ذمہ داری سے ہٹا دیا گیا۔ (ایضاً)۔

سر جارج کننگھم جو شمال مغربی سرحدی صوبے کے 1946ء کے شروع تک گورنر رہے وہ برطانیہ واپس چلے گئے تاہم 4 جولائی 1947ء کو انگریز حکومت نے انہیں واپس بلا کر دوبارہ گورنر تعینات کر دیا۔ گورنر جنرل پاکستان محمد علی جناح نے جارج کننگھم کی خدمات کی درخواست کی لیکن وہ یہ منصب سنبھالنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ تاہم جب ماؤنٹ بیٹن نے بھی جناح کی درخواست کی حمایت کی تو انہوں نے 15 اگست کو گورنر سرحد کا حلف اٹھا لیا۔ اس وقت کانگریس نواز ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں وہاں قائم حکومت کے بارے میں کچھ چپقلش چل رہی تھی۔ 23 اگست 1947ء کو جناح صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 میں ترمیم کی تاکہ ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت برطرف کرنے اور خان قیوم خان کی سربراہی میں مسلم لیگ کی حکومت کے قیام کو قانونی تحفظ دیا جا سکے۔ خان قیوم خان کے وزیر اعلیٰ بنانے کے لئے آئینی ترمیم پر گورنر کچھ جزبز ہوئے تاہم انہوں نے اپنی خدمات جاری رکھیں۔ (نارول 1968ء:130)۔ حکومت کی تبدیلی کے نتیجے میں سرحد میں اقلیتی ہندوؤں اور سکھوں پر حملے شروع ہو گئے چنانچہ وہ بھارت جانے پر مجبور ہو گئے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر حملوں سے پختون قبائلی مشتعل ہو گئے اور غیر مسلموں کو صوبے سے نکالنے کے درپے ہو گئے۔ گورنر کننگھم قبائلیوں کی کشمیر پر لشکر کشی کے مخالف تھے لیکن مسلح قبائلی پہلے ہی پنجاب کے راستے کشمیر پر دھاوا بول چکے تھے۔ 25 اکتوبر کو کرنل سکندر مرزا (بعد میں پاکستان کے پہلے صدر بنے) لاہور سے پشاور آئے اور کشمیر پر حملے کا درج ذیل پس منظر انہیں بتایا:

''انہوں نے مجھے کشمیر کے خلاف موجودہ جاری مہم کی پس پردہ تاریخ کی تمام تفصیل بتائی اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کی طرف سے معذرت کا پیغام پہنچایا کہ مجھے اس منصوبے سے پہلے بے خبر رکھا گیا۔ لیاقت علی گزشتہ ہفتے مجھے ملنے آنے والے تھے اور انہوں نے ذاتی طور پر مجھے اس

پروگرام سے آگاہ کیا لیکن ان کی علالت آڑے آ گئی۔ میرے خیال میں انہیں دل کی شدید تکلیف لاحق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جناح صاحب کو گزشتہ 15 روز میں ہونے والے واقعات کا پورا علم تھا لیکن انہوں نے کہا کہ مجھے کچھ نہ بتاؤ''۔ میرا ضمیر مطمئن ہونا چاہیے۔ سکندر مرزا کو اس بات کا یقین ہے کہ ہری سنگھ کو پٹھان کوٹ کے راستے سڑک مکمل ہوتے ہی بھارت سے الحاق کرے گا۔ سڑک کی تعمیر میں 3 مہینے لگنے تھے۔ مہاراجہ نے بڑی تعداد میں سکھ اور ڈوگرے جمع کر کے پونچھ اور جموں سے مسلمانوں کی بے دخلی کا منصوبہ بنا رکھا ہے جو دراصل بھارت کی مجموعی حکمت عملی ہے۔ بظاہر ایک ماہ پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پونچھ والے بغاوت کر دیں اور ان کی اس معاملے میں مدد کی جائے۔ عبدالقیوم شروع سے اس معاملے میں شامل تھے۔ انگریز افسروں کو محض کسی شرمندگی سے بچانے کے لئے الگ رکھا گیا''۔

کننگھم نے مزید کہا کہ مزید قبائلی کشمیر میں داخل ہو رہے تھے لیکن بھارتی فوجی بھی 27 اکتوبر سے سری نگر میں اترنا شروع ہو گئے تھے۔ گورنر اگلے روز بذریعہ پرواز لاہور پہنچے جہاں جنرل گریسی اور آکن لیک جیسے فوجی افسر، لیاقت علی خان، محمد علی جناح اور دیگر لیگی لیڈر بھی موجود تھے۔ جناح صاحب نے کشمیر میں مداخلت کے حق کے مؤقف پر دلائل دیے اور کہا کہ ہری سنگھ کا بھارت سے الحاق دھوکہ ہے۔ کننگھم کا کہنا ہے کہ انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ فیصلہ کس لحاظ سے دھوکہ دہی کے مترادف تھا۔ محمد علی جناح پاکستان کی باقاعدہ فوج کشمیر میں بھیجنا چاہتے تھے لیکن جنرل گریسی کے اس مشورے پر انہوں نے ارادہ تبدیل کر لیا کہ پاکستان چونکہ ایک کمزور ملک ہے اس لئے اسے بھارت کے ساتھ جنگ سے گریز کرنا چاہیے۔ اس کے بعد جناح نے جنرل گریسی اور گورنر پنجاب مسٹر موڈی سے بات کر کے کہا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کی زندگی بچانے کی جدوجہد کی حمایت کریں۔

بہرحال نومبر تک قبائلی مسلح افراد کشمیر سے واپس آنا شروع ہو گئے۔ وہ لوٹ مار کے مال غنیمت سے لدے پھندے تھے۔ دہلی کے نواحی علاقے نوئیڈا میں ایک انٹرویو کے دوران (10 نومبر 2000) لیفٹیننٹ جنرل (ر) کلدیپ سنگھ کھجوریہ نے مجھے بتایا کہ وہ ان دنوں کمسن تھے اور سری نگر میں مقیم تھے۔ نہ صرف قبائلی لشکروں نے لوٹ مار کی اور جائیدادوں کو تہس نہس کیا بلکہ وہ بڑی تعداد میں سکھ بچیوں کو ساتھ لے گئے جنہیں بعد ازاں قبائلی علاقوں میں یا قحبہ خانوں میں

فروخت کر دیا گیا۔ گورنر کننگھم نے انتہائی افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستانی حکومت ایسے اقدامات کی اجازت دے رہی تھی، وہ اس بات سے اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ انہوں نے لکھا کہ: ''گزشتہ 2 ہفتوں یا اس سے زائد عرصے میں مجھے اپنے عہدے استعفٰی دینے کی نصف درجن وجوہات ملی ہیں، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم آہستہ آہستہ حالات کو قابو میں لے آئیں گے اور میرے خیال میں حالات کا بنظر غائر جائزہ لینا چاہیئے''۔ (ایضاً)۔ گورنر کے 7 نومبر کو لگائے گئے ایک اندازے کے مطابق اس وقت کشمیر میں 7 ہزار قبائلی موجود تھے اور سری نگر سے بھی زیادہ دور نہیں تھے۔ پھر سری نگر کے مضافاتی علاقوں میں ان کی مڈبھیڑ بھارتی فوجیوں سے ہوئی اور ان کا بھاری نقصان ہوا۔ گورنر کہتے ہیں کہ ''قبائلیوں کی خونخواری دیکھتے ہوئے اگر ان حالات میں استصواب رائے کرا لیا جائے تو مسلمانوں کی اکثریت پاکستان کی بجائے بھارت کا ساتھ دیتی''۔ (ایضاً: صفحہ 148)۔ اس کے علاوہ گورنر کننگھم کا خیال تھا کہ بھارت استصواب رائے کے معاہدے سے اس وقت منحرف ہوا جب قبائلی لشکر نے کشمیر پر حملہ کیا۔ حتیٰ کہ وزیراعلیٰ سرحد (قیوم خان) نے گورنر کو بتایا کہ وہ لوگ جنہوں نے کشمیر آپریشن تیار کیا وہ بھی قبائلیوں سے عاجز آ گئے۔ (ایضاً)۔ میجر (ر) آغا ہمایوں امین نے کشمیر آپریشن میں ملوث 3 فریقوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان تینوں میں سے ایک فریق شوکت حیات (سابق فوجی میجر)، میاں افتخار الدین اور خورشید انور پر مشتمل تھے۔ انہیں جناح صاحب نے حکم دیا تھا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کی مدد کیلئے کچھ کریں...... (امین 1999ء:89)۔ ہمایوں امین مزید لکھتے ہیں کہ ''یہ بات مدنظر رہے کہ جناح نے جنرل گریسی جو قائم مقام کمانڈر انچیف تھے کو کشمیر پر حملے کا حکم دیا تھا۔ (ایضاً)۔ اس حوالے سے عائشہ جلال نے لکھا ہے کہ:

''یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ حکومت پاکستان نے صوبہ سرحد کی حکومت کے ساتھ مل کر کشمیر پر حملے کیلئے قبائلیوں کے جذبات کو ابھارا۔ یہ بات بھی ٹھیک لگتی ہے کہ سرکاری طور پر پاکستانی قیادت کو کشمیر میں مداخلت یا فوج بھیجنے سے روک دیا گیا لیکن اس فیصلے کی وجہ اسلحے اور ایمونیشن کی کمی تھی اور اس وجہ سے نہیں کہ یہ حکومت کا ترجیحی اقدام نہیں تھا۔ اگر پاکستان ایسی پوزیشن میں ہوتا تو محمد علی جناح کی مہربانی سے مسلم لیگی قیادت فوج کو قبائلیوں کی لشکر کشی کا حصہ بنا دیتی......۔ آزاد فوج کا کمانڈر انچیف پاکستانی فوج کا افسر کرنل محمد اکبر تھا جو جنرل طارق کے فرضی

نام سے آپریشن میں حصہ لے رہا تھا۔ (اسلامی تاریخ کے مشہور جرنیل طارق بن زیادہ کا نام جنہوں نے سپین فتح کیا)۔ان کے وزیر اعلیٰ قیوم خان سے قریبی تعلقات تھے اور ان کے توسط سے جناح اور دیگر لیگی قیادت سے ان کے رابطے تھے"۔(58-9:1990)۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان باقاعدہ جنگ

گورنر جنرل محمد علی جناح نے جنرل گریسی کو فوری 1948ء میں جنرل میسروی کی ریٹائرمنٹ پر کمانڈر انچیف کے عہدے پر ترقی دی۔اس وقت تک پاکستان برطانیہ سے کچھ اسلحہ خرید چکا تھا۔اس وقت قائداعظم جنرل گریسی کو کشمیر پر حملہ کرنے میں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرکاری طور پر پاکستانی فوجی دستے اپریل 1948ء کے دوسرے نصف حصے میں کشمیر میں داخل ہوئے۔ دونوں طرف کی فوجوں کی نازک حالات میں اور خطرناک پہاڑی مقامات پر جھڑپیں ہوئیں لیکن مئی سے بھارتی فوج کو پاکستان پر برتری ملنا شروع ہوگئی تھی۔ (کلف لے 20:2000)۔ بھارتی فوج نے حملوں کے دوران فضائی طاقت اور توپخانے کا استعمال کرنے میں ذرا بھر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کیا اور پاکستانی فوج کو ان علاقوں کے بڑے حصے سے نکال باہر کیا جہاں قبل ازیں قبضہ کیا گیا تھا۔ پاکستان شمالی علاقہ جات، گلگت اور ملحقہ علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہا لیکن مزید کچھ عرصے بعد بھارتی فوج نے کئی علاقے واپس لے لئے۔ پاکستانی فوج نے بھی کچھ محاذوں پر کامیابی حاصل کی۔ جہاں ایک طرف ریاست کے کئی محاذوں پر فوجی لڑائی جاری تھی وہاں سیاسی سطح پر سیز فائر کیلئے مذاکرات بھی جاری تھے۔شوکت رضا کے مطابق 30 دسمبر 1948ء کو دونوں فریقوں نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیز فائر کرلیا۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل

جہاں ایک طرف جارحانہ اقدامات جاری تھے وہاں سیاسی میدان میں بھی سرگرمیاں جاری تھیں۔ یکم جنوری 1948 کو بھارتی حکومت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ لے گئی اور اس نے الزام لگایا کہ کشمیر میں پاکستان کے باقاعدہ فوجی لڑ رہے ہیں اور عالمی برادری انہیں وہاں سے نکالے۔ یہ بات یقیناً درست تھی، اگر چہ پاکستان نے شروع میں براہ راست مداخلت کی تردید کی۔ 25 مارچ 1948ء کو شیخ عبداللہ جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بن گئے۔ان رسمی اقدامات سے قطع نظر یہ

بات واضح نہیں ہو رہی تھی کہ شیخ عبداللہ نے ریاست کشمیر میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد کشمیری مسلمانوں کی حمایت کی تھی۔ وہ بھارت سے ٹھوس ضمانت چاہتے تھے کہ بھارتی حکومت مسلمان ووٹروں کو قائل کرے کہ پاکستان کی بجائے بھارت سے الحاق مسلمانوں کے لئے زیادہ بہتر ہو گا۔ ان ضمانتوں کا اصولی مقصد یہ تھا کہ کشمیر کی خودمختاری تسلیم کر لی جائے۔ (نولکھا 2953:1991)۔

بھارت نے اقوام متحدہ کو یقین دلایا کہ کشمیر کا الحاق عارضی تھا اور مسئلے کا مستقل حل آزادانہ اور شفاف استصواب رائے کے نتیجے سے ہی نکالا جائے گا۔ البتہ پاکستان اور بھارت دونوں اس بات سے متفق تھے کہ کسی ایک ملک سے الحاق کا فیصلہ کرنا کشمیریوں کا حق ہے۔ کشمیر کو خودمختار بنانے کی بات دونوں ملکوں نے مسترد کر دی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد جس میں مسئلے کے تصفیے کی شرائط شامل تھیں 21 اپریل 1948ء کو منظور کی گئی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ امن قائم ہوتے ہی اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کشمیر میں استصواب رائے کرایا جائے گا۔ پاکستان کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ استصواب رائے سے پہلے قبائلی مسلح افراد کو کشمیر سے نکالے۔ اس کے بعد بھارت کو مرحلہ وار اپنی فوجیں نکالنا تھیں اور صرف اتنے فوجی رکھنے تھے جو امن و امان کیلئے ضروری تھے۔ (جین 2007)۔

قرارداد کی شق نمبر بی 7 کہتی ہے کہ:

''بھارتی حکومت یہ بات یقینی بنائے کہ جموں و کشمیر میں استصواب رائے کے لئے استصواب رائے کرانے والی ایک انتظامیہ قائم ہو تا کہ ریاست کے پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کا جلد از جلد فیصلہ ہو سکے''۔ اس ضمن میں چیکوسلواکیہ، ارجنٹائن، بلجیم، کولمبیا اور امریکہ پر مشتمل اقوام متحدہ کا کمیشن بنایا گیا جسے مسئلہ کشمیر کے حل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ قرارداد میں الحاق بل پر دستخط کی وجہ سے بھارت کی کشمیر میں موجودگی کو قانونی قرار دیا گیا۔ البتہ ریاست کے اندر پاکستان اور بھارت کے فوجی موجود رہے اور ان کے درمیان جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔

آخر کار اقوام متحدہ کی کوشش سے دونوں ملکوں کے درمیان یکم جنوری 1949ء کو سیز فائر عمل میں آ گیا۔ اس وقت تک ایک تہائی سے کم کشمیر کا حصہ پاکستان کے کنٹرول میں تھا۔ جولائی 1949ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان سیز فائر لائن (بعد میں اسے کنٹرول لائن قرار دے دیا

گیا) کا معاہدہ طے پا گیا اور اقوام متحدہ کے مبصرین دونوں جانب صورتحال کی نگرانی کیلئے تعینات کر دیئے گئے۔ آنے والے برسوں میں پاکستان نے بار بار کشمیر میں استصواب رائے کا مطالبہ کیا لیکن بھارت نے یہ کہہ کر مطالبہ مسترد کر دیا کہ کشمیر کے ایک بڑے حصّے میں پاکستانی فوج موجود ہے اس لئے غیر جانبدار استصواب رائے کرانا ممکن نہیں۔ (چودھری 1991ء:42-40)۔

ایسا لگتا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد کو کشمیر تک دھکیل کر لے جانے کا پاکستان کا مقصد پورا ہو گیا کیونکہ مغربی کشمیر اب پاکستان کے قبضے میں تھا۔ پاکستان یقیناً اس بات کا خواہاں تھا کہ اقوام متحدہ کی آڑ میں پورے کشمیر کو اپنے زیر نگین کر لے اس کے برعکس بھارت نے مطالبہ کیا کہ پاکستان اپنے زیر قبضہ علاقوں سے دستبردار ہو جائے۔ پاکستان نے اپنے زیر کنٹرول علاقے کو آزاد کشمیر کا نام دیا۔ اس سوچ کے باعث آنے والے برسوں میں دونوں ملکوں کے تعلقات کشیدہ رہے۔ بعدازاں بھارت نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مہاراجہ کشمیر کی طرف سے الحاق بل کی توثیق 1954ء میں کشمیر اسمبلی نے کر دی تھی اس لئے الحاق کی حیثیت مستقل اور ناقابل تبدیل ہو چکی ہے۔ بھارتی آئین میں آرٹیکل 370 شامل کر کے کشمیر کی بھارتی یونین کے اندر خصوصی حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ پاکستان نے دعویٰ کیا کہ آزاد کشمیر میں رہنے والے کشمیریوں نے چونکہ الحاق کے حق میں ووٹ نہیں دیا اس لئے اس کی کوئی حیثیت قانونی نہیں۔ (احمد 1998ء:46-144)۔

فوج کی امیج بلڈنگ

عسکری ریاست کی امیج بلڈنگ کے حوالے سے 48-1947ء کی جنگ کشمیر کا سب سے اہم پہلو بہادر پاکستانی فوج کا کردار تھا جس نے لڑائی کر کے کشمیر کا ایک تہائی پاکستان سے ملا دیا۔ جراتمند اور بہادر مسلمان مجاہدین نے اپنے سے کہیں بڑے دشمن کے ساتھ جنگ کی اور محاز جنگ پر کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔ ایسے دعوؤں کو عوام نے قبول کر لیا کیونکہ اسلام کے جنگجوؤں کی ستائش کرنے کی دیرینہ روایت پہلے ہی موجود تھی۔ شاعر علامہ اقبال نے کئی سال پہلے ایسے ہی جذبات کو شعری شکل دی اور لکھا تھا کہ:

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے

جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی
(صدیقی 1996:2)۔

یہ بات ان قبائلی عناصر کے بارے میں بالکل ٹھیک نہیں جنہوں نے وادی کشمیر کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے لوٹ مار اور خواتین کی آبروریزی کی۔ یہ بات بھی انتہائی غیر معمولی تھی کہ ایسے وقت میں جب تقسیم کے وقت پاک بھارت سرحد پر لاکھوں افراد آر پار جا رہے تھے اور جہاں ایک طرف نقل مکانی اور بحالی کے خوفناک مسائل تھے وہاں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو ایک وسیع وعریض علاقے پر اپنی اتھارٹی قائم کرنا تھی لیکن اس دوران وہ بدترین حالات میں بھارت کے ساتھ تصادم کی بھی خواہاں تھی حالانکہ اس جنگ سے مسئلہ کشمیر کے حل کے امکانات بھی روشن نہیں تھے۔ یہ ایک ایسا خطرہ تھا جو ائیر مارشل اصغر خان کے بھی ذہن میں ہوگا چنانچہ انہوں نے اس لئے اسے مس ایڈونچر قرار دیا۔ بہرحال پاکستانی فوج اور پاکستانی قوم بالخصوص پنجابیوں کے درمیان رومان ایک منصوبے کے تحت پروان چڑھا۔ ارادتاً ایک ایسے عقیدے کو فروغ دیا گیا جسے حکومت اور میڈیا کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

پورے کشمیر پر قبضہ نہ کرنے کا الزام دونوں ملکوں میں موجود انگریز فوجی افسروں کے سر ڈال دیا گیا جنہوں نے مبینہ طور پر ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ سازش کر کے پاکستان کو مسلم اکثریت کی ریاست کشمیر کے جائز حق سے محروم کر دیا۔ بالخصوص غم و غصہ آکن لیک اور جنرل گریسی کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ (امین 1991ء:91)۔ حالانکہ کشمیر پر حملے سے انکار کے ٹھیک 3 ماہ بعد گورنر جنرل جناح کی طرف سے جنرل گریسی کو کمانڈر انچیف کے عہدے پر ترقی دینے سے اس الزام کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ لگتا ہے کہ ایسی بات بعد میں سوچی گئی۔ فوج کے اندر موجود عقاب جن کے ترجمان اکبر خان تھے وزیراعظم لیاقت علی خان کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے کہ انہوں نے سیز فائر پر رضامندی ظاہر کیوں کی۔ بہرحال مسئلہ کشمیر پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ بن گیا۔ یہ کہ انتقال اقتدار کی غیر متوقع تبدیلیوں کی بنیاد پر قائم ہوا اور پاکستان اور بھارت میں جنگ کی وجہ بنا۔ مراد یہ کہ فوج کو اس مسئلے کے باعث نہ صرف بھاری بھرکم دفاعی صلاحیت حاصل کرنے میں مدد ملی

بلکہ یہ تاثر بھی پیدا کیا گیا کہ صرف فوج بھارت کو تنازعہ کشمیر حل کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ بھارت اور پاکستان دونوں کا 1500,1500 افراد کا جانی نقصان ہوا اور زخمیوں کی تعداد تو بہت زیادہ تھی۔ (یوایس لائبریری آف کانگریس)۔

امریکی اقدامات

واقعات کچھ بھی تھے بہرحال بھارت نے کشمیر کا معاملہ سلامتی کونسل میں لے جانے میں پس وپیش شروع کر دیا۔ انٹلی جنس رپورٹوں میں خبردار کیا جارہا تھا کہ شیخ عبداللہ کی عوامی مقبولیت کم ہو رہی تھی اور ان حالات میں استصواب رائے کیلئے مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت مزید حاصل کرنا مشکل تھا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے حوالے سے اقدامات تجویز کرنے کیلئے سلامتی کونسل نے متعدد ماہرین تعینات کئے۔ پہلے ماہر کینیڈا کے جنرل مک ناف ٹن General Mc Naughton تھے جنہوں نے کشمیر کے دونوں طرف فوج کے انخلا کی تجویز دی جو بھارت نے فوراً مسترد کر دی جبکہ پاکستان نے اس تجویز کو معمولی ردوبدل کے ساتھ قبول کر لیا۔ (شافر 2009ء:28)۔ ان کے بعد آسٹریلیا کے سر اوین ڈکسن آئے جنہوں نے محسوس کیا کہ بھارت کی پہلوتہی کے باعث پوری ریاست میں شفاف استصواب رائے کرانا ممکن نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک حل یہ پیش کیا کہ صرف وادی کشمیر میں استصواب رائے کرالیا جائے جبکہ باقی دونوں حصے دونوں ملکوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ مسئلہ کشمیر پر امریکی پالیسی نائب وزیر خارجہ جارج مک گی George McGhee اور جان ہکرسن John Hickerson نے تشکیل دی۔ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کیلئے مسئلہ کشمیر کا حل ناگزیر تھا۔ انہوں نے تنازعے کے حل میں کوئی پیشرفت نہ ہونے کا ذمہ دار بھارت کی پہلوتہی کو قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بھارت مجموعی استصواب رائے کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ (ایضاً)۔ 30 مارچ 1951ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر 91 منظور کی جس میں پاکستان اور بھارت دونوں سے کہا گیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ثالثی قبول کریں۔ یہ ثالث یا ثالثین عالمی عدالت انصاف کے صدر مقرر کریں گے۔

جولائی 1951 کی بھارتی فوجی مشقیں

بھارت نے 1950ء میں چھوٹے پیمانے پر فوجی مشقیں شروع کیں جسے پاکستان نے اپنے

لئے خطرہ محسوس کیا۔ لیکن بھارت نے جولائی 1951 میں پاکستان کی سرحد کے ساتھ بڑے پیمانے پر عسکری مشقیں شروع کر دیں جس پر پاکستانی قیادت نے کہا کہ یہ مشقیں پاکستان کے خلاف بھارتی عزائم کا کھلم کھلا اظہار ہیں۔ اچانک پنجاب کی سرحد پر 2 لاکھ بھارتی فوجیوں کے سامنے 70 ہزار پاکستانی فوجی آ گئے۔ خلیج 'کچھ' میں کراچی کے مغرب میں بھارتی نیوی کے 2 ڈسٹرائیر تعینات تھے۔ بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحد کے قریب بھی 3 بریگیڈ فوج لگا دی۔ دونوں ملک آہستہ آہستہ فوج کو سرحد کے قریب لے جانے لگے۔ کئی اخبارات مثلاً مانچسٹر گارڈین، ڈیلی ٹیلی گراف اور ٹائمز کے نامہ نگاروں نے اس فوجی نقل و حرکت کا مشاہدہ کر کے رپورٹنگ بھی کی۔ ان برطانوی اخبارات اور نیویارک آبزرور اور نیویارک ہیرالڈ ٹریبون جیسے امریکی اخبارات نے بھارتی اقدامات کی مذمت کی۔

اس عرصے کے دوران وزیراعظم نہرو اور وزیراعظم لیاقت کے درمیان تلخ خط و کتابت بھی چلتی رہی۔ لیاقت علی نے ایک امن منصوبہ پیش کیا جس کو نہرو نے مسترد کر دیا۔ برائن کلف لے نے ان الفاظ میں بھارت کے رویے کو پیش کیا: ''ایسا لگتا تھا کہ بھارت قطعاً فوج دستے دستبردار نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی کشمیر میں استصواب کرانے کا خواہاں تھا۔ (حالانکہ اس پر بھارت نے اتفاق کیا تھا)۔ وہ طاقت کے استعمال کو خارج از امکان قرار دے رہا ہے نہ یہ اعلان کر رہا ہے کہ وہ پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا''۔ جوں جوں بھارت نے دنیا میں ترقی پذیر ممالک کے لیڈر کی حیثیت حاصل کرنا شروع کی تو اس نے کئی بین الاقوامی رہنماؤں کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ثالثی کی پیشکشوں کو مسترد کرنا شروع کر دیا۔

اب دونوں فریقوں کا بین الاقوامی سیاست میں مختلف مؤقف ہے۔ جہاں ایک طرف پاکستان امریکہ سے فوجی اور معاشی امداد حاصل کرنے کا شائق رہا وہاں بھارت نے اپنا غیر جانبدرانہ کردار برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ 1954 کے بعد پاکستان نے فوجی معاملات پر امریکہ کے ساتھ معاہدہ کیا اور ساؤتھ ایسٹ ایشین ٹریٹی آرگنائزیشن (SEATO) اور CENTO کا رکن بن گیا۔ جبکہ بھارت نے غیر جانبدار تحریک میں ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ یہ دونوں ملک بین الاقوامی سطح پر امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جنگ میں کود کر آپس میں دشمن بن گئے۔

باب 5

امریکیوں سے قربتیں اور سول ملٹری تعلقات

ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان ہمیشہ بھارت کے معاملے میں خود کو غیر محفوظ سمجھے گا اور 14 اگست کو جو کٹا پھٹا پاکستان وجود میں آیا وہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے باعث خطرے کے احساس سے دوچار تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ مغرب کو خدمات اور سہولیات کی پیشکش پاکستان کے قیام سے پہلے ہی کر دی گئی تھیں۔ ان دنوں رونما ہونے والے معاملات سے متعلق ''لائف'' میگزین کی مارگریٹ بورک وائٹ نے تقسیم کے موضوع پر باتصویر تفصیلات شائع کیں۔ انہوں نے ستمبر 1947ء میں محمد علی جناح کا انٹرویو کیا۔ جناح نے انہیں بتایا کہ اسلام عین جمہوریت ہے اور پاکستان ایک جمہوری ملک ہوگا تاہم مارگریٹ نے پاکستان میں جاگیرداری نظام کی باقیات اور اسلامی رویہ میں انتہا پسندی کے عنصر کی موجودگی میں جناح کے اس دعوے کی معقولیت پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ (بورک وائٹ: 1949ء:92)۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ سوویت کمیونزم کا راستہ روکنے کیلئے جناح صاحب نے مغرب کو پاکستان کے فرنٹ لائن ریاست کے کردار کی بھی پیشکش کی۔ انہوں نے رپورٹر کو بتایا کہ:

''امریکہ کو پاکستان کی اس سے زیادہ ضرورت ہے جتنی پاکستان کو امریکہ کی ضرورت ہے...... پاکستان (جغرافیائی لحاظ سے) دنیا کا محور ہے۔ کیونکہ پاکستان جس جگہ واقع ہے وہ اس سرحد پر ہے جس پر دنیا کے مستقبل کی پوزیشن کا انحصار ہے۔ روس یہاں سے زیادہ دور نہیں...... اگر روس یہاں چڑھائی کرتا ہے تو پوری دنیا کو نقصان ہوگا''۔ (ایضاً:3-92)۔

بورک وائٹ نے درج ذیل ریمارکس دیئے:

''آنے والے ہفتوں میں قائداعظم کے اس فلسفے کو حکومتی حکام نے پورے پاکستان میں خوب پھیلایا۔ ان حکام نے مجھے کہا کہ ''یقیناً امریکہ ہماری فوج کی تعمیر کرے گا اور روس کو اس طرف پیشقدمی سے روکنے کیلئے ہمیں قرضے دے گا''۔ لیکن جب میں نے پوچھا کہ کیا روس کے حملے کے کوئی آثار ہیں تو انہوں نے اگر افسردہ نہیں تو کم از کم پریشان کن لہجے میں کہا کہ ''نہیں روس نے پاکستان میں دلچسپی ظاہر کرنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا''۔

امریکی انتظامیہ کو دام میں لانے کی بات اتنے تواتر سے کی گئی کہ حیرت ہونے لگی کہ کیا پاکستان بالشویزم کے خلاف دنیا کو منظم کرنا چاہتا تھا یا پاکستان کی اپنی غیر یقینی صورتحال کے تناظر میں خود کو دنیا میں ایک نئے سیاسی اثاثے کے طور پر متعارف کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں یہ دراصل ایک نئی مسلم ریاست میں نظریاتی دیوالیہ پن سے متعلق اہم نکتہ ہے۔ ایک ایسی قوم جو نادر مذہبی تعصب کے خمیر سے اپنی بقا کی گرمی حاصل کر رہی ہے اور ایک شعلہ بننے کی مشتاق ہے۔

اپنی قوم کے لئے نئے ملک کے قیام کی جدوجہد کے دوران جناح صاحب نے جو تکنیک بار بار استعمال کی وہ مخالف کو مخالف کے خلاف کھلانا تھی۔ یہی تکنیک اب خارجہ پالیسی کیلئے رائج کی جارہی ہے''۔ (ایضاً)۔ بورک ونٹر کے مشاہدات کی تصدیق 7 ستمبر 1947ء کو کابینہ کے اجلاس کے منٹس سے ہوتی ہے۔ جناح صاحب نے وزراء کو بتایا کہ ''پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اور کمیونزم ایک اسلامی سرزمین پر نہیں پنپ سکتا۔ یہ بات واضح ہے کہ ہمارے قومی مفادات روس کی بجائے 2 عظیم جمہوری ممالک برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ وابستہ ہیں''۔ (کوکس 2001ء:20)۔ جناح کی ''گریٹ گیم'' کی منطق کی طرف بھی رغبت اس وقت محسوس ہوئی جب انہوں نے کہا کہ شمال مغربی سرحد کا تحفظ صرف پاکستان کا اندرونی معاملہ نہیں بلکہ دنیا کا مسئلہ ہے۔ (ایضاً) انہوں نے دعویٰ کیا کہ افغانستان کی طرف سے پختونستان کے قیام کا مطالبہ کرنے کے پیچھے روس ملوث ہے۔ ایسے ہتھکنڈوں کا مقصد جنوبی ایشیا بلکہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں سوویت اثر و رسوخ روکنے کے لئے امریکہ کو پاکستان کی علاقائی اور جغرافیائی اہمیت باور کرانا تھا۔

اس کے باوجود امریکہ نے پاکستان میں سرمو دلچسپی ظاہر نہ کی۔ امریکہ کی اس وقت توسیع پسندی کے خلاف پالیسی کا مرکز یورپ تھا جہاں سوویت یونین نے مشرقی اور وسطی یورپ پر اثر و رسوخ بڑھانے کیلئے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ اس کا جواب امریکہ نے مارشل پلان

کے ذریعے دیا جس کا مقصد نہ صرف جنگ سے تباہ حال فرانس اور برطانیہ بلکہ جنگ عظیم کے مرکزی دشمن جرمنی کو اقتصادی امداد فراہم کرنا تھا۔ امریکی صدر ٹرومین نے ٹرومین ڈاکٹرائن کا اعلان کیا جس کے تحت مطلق العنان حکومتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔ (ہارووٹز 67:1967)۔ سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں کو مارشل پلان سے فائدہ اٹھانے سے بالکل باہر کر دیا گیا کیونکہ اس کا مقصد مشرقی یورپ کو انڈسٹریلائزیشن کے عمل سے دور رکھنا اور صرف زرعی مصنوعات کی پیداوار تک محدود رکھنا تھا۔ (ایضاً 4-70)۔ اس کے علاوہ سوویت یونین کی طرف سے امریکہ سے 6 ارب ڈالر کی ایک درخواست بھی مسترد کر دی گئی۔ جب سرد جنگ کی رفتار تیز ہوئی تو امریکہ نے 1949ء میں فوجی معاہدے نیٹو کے ذریعے اپنی اقتصادی اور سفارتی جارحیت کا گویا ''نکاح'' کر دیا۔

تاہم سرد جنگ کا مدار صرف یورپ تک محدود نہ رہا۔ مشرقی ایشیا میں میں رونما ہونے والے واقعات نے سپر پاورز کو اس خطے کی طرف کھینچ لیا۔ چین کے کمیونسٹوں اور قوم پرستوں کے درمیان خونی تصادم فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ کمیونسٹوں کو کامیابی مل رہی تھی جبکہ امریکہ سے امداد ملنے کے باوجود قوم پرست تیزی سے شکست سے دوچار تھے۔ 21 ستمبر 1949 میں ماؤزے تنگ نے چین کو عوامی جمہوریہ قرار دے دیا اور قوم پرست رہنما چیانگ کائی شیک کو فرار ہو کر تائیوان جانا پڑا۔ (یونگ 1993ء:8-107)۔ کوریا میں کمیونسٹوں کو جنوب کے جزیرہ نما علاقے میں مغربی فوجوں سے تصادم میں شریک کیا جا رہا تھا۔ امریکہ اور سوویت یونین کو یورپ سے بہت دور علاقوں میں اپنے اتحادیوں کو اسلحہ مہیا کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ (ایضاً:123)۔ اس تمام پیشرفت ہائے کے باوجود جنوبی ایشیا نسبتاً پرامن تھا اور یہاں کوئی سنگین نظریاتی تصادم نہیں تھا۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا تو 1947ء وہ میں جنوبی ایشیا میں سوویت یونین کا اثر و رسوخ روکنے سے متعلق امریکی خارجہ پالیسی کے مقاصد سے باہر تھا۔ چنانچہ جب پاکستان نے 5 سال کے عرصے میں 2 ارب امریکی ڈالر کی امداد کی درخواست کی تو امریکہ نے وہ مسترد کر دی۔ اس میں بری فوج کیلئے 17 کروڑ ڈالر، فضائیہ کیلئے ساڑھے 7 کروڑ اور بحریہ کے لئے 6 کروڑ کے عسکری ساز و سامان کی فراہمی شامل تھی۔ اس کی بجائے 17 دسمبر 1947ء کو پاکستان کو ایک کروڑ ڈالر کی ریلیف گرانٹ فراہم کی گئی جو پاکستان کی طرف سے درخواست کردہ رقم کا محض 0.1 فیصد تھا۔

امریکی رویے سے مایوس پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ نے ان الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا: ''پاکستان کی امریکہ کے ساتھ مقبول عام دوستی اور روسی نظریے کیخلاف بیزاری کے تناظر میں امریکی حکومت کو پاکستان کی دفاعی ضرورت پوری کرنی چاہیئے تھی''۔ (کوکس 2001ء:21)۔

ایسے مایوس کن رویے کا امریکی حکومت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا اور اس نے بدستور بھارت کو طویل جدوجہد آزادی کی جائز پیداوار کے طور پر دیکھنا جاری رکھا جبکہ پاکستان کو فرقہ وارانہ اختلافات اور جذبات کی بنیاد پر قائم منفی سیاست کی پیداوار سمجھا گیا۔ جب 1948ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑی تو امریکہ نے دونوں ملکوں پر اسلحہ کی غیر رسمی پابندی لگا دی۔ (جین: 2007اے 8-297) صدر ہیری ٹرومین نے دونوں حکومتوں پر زور دیا کہ وہ امن کے لئے مل کر کام کریں اور اپنے اپنے ملک کی سماجی اور سیاسی ترقی کے لئے اقدامات کریں۔ (کوکس 2001ء:30)۔ بہر حال پاکستان نے امریکیوں کا دل موہ لینے کی کوششیں جاری رکھیں اور یہاں تک کہ چھوٹے رینک کے امریکی حکام کو اہم تقریبات میں مدعو کیا جاتا رہا۔ محمد علی جناح اور ان کی بہن فاطمہ جناح نے تو امریکیوں کو کراچی میں اپنا گھر تک کرائے پر دینے کی پیشکش کی لیکن امریکیوں نے ایک چھوٹی اور سستی جگہ کرائے پر لی کیونکہ اس وقت تک پاکستان ان کے لئے اہم سٹیشن نہیں تھا۔ (ایضاً:25)۔ یوں پاکستان کے قیام کے ڈیڑھ سال بعد تک پاکستانی لیڈروں نے امریکیوں کو رام کرنے کی تابڑ توڑ کوششیں جاری رکھیں۔ دونوں ملکوں کے تعلقات کو 1949ء کے وسط میں اس وقت دھچکا لگا جب امریکی صدر ٹرومین نے بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو دورہ واشنگٹن کی دعوت دی لیکن لیاقت علی خان کو ایسی کوئی پیشکش نہ کی گئی۔

اس دوران سوویت یونین نے اگست 1949ء میں ایٹمی تجربہ کیا جس سے خود انحصاری کی منزل حاصل کرنے کی کمیونسٹ خطرے کی پیشگوئی حقیقت کے روپ میں سامنے آ گئی۔ ابھرتی ہوئی کمیونسٹ طاقت امریکہ سے مزید کوئی امداد حاصل کرنے کی خواہاں نہیں تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان نظریاتی اور سیاسی پراپیگنڈے کی کشمکش شروع ہوئی اور مشرقی ایشیا کی طرح یہ پرتشدد تصادم میں ملوث ہو گئے۔ اس طرز عمل سے پوری دنیا میں کشیدگی پھیل گئی۔ پاکستانیوں کی طرف سے امریکیوں کو لبھانے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ روس پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات چاہتا ہے۔ یہ مقصد اس وقت حاصل ہوا جب پاکستانی سفارتکار سوویت یونین

کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ پاکستانی وزیر اعظم کو دورہ ماسکو کی دعوت دے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ابھی تک پاکستان اور امریکہ نے ایک دوسرے کے ملک میں کوئی سفارتخانہ نہیں کھولا تھا۔ امریکہ میں پاکستان کے سفیر اصفہانی نے اس اقدام کو ''شاہکار حکمت عملی'' قرار دیا۔ (کوکس 2001ء:32)۔ اس سے یقیناً امریکہ پر اثر پڑنے کا آغاز ہو گیا اور اسے احساس ہو گیا کہ وہ پاکستان کو بھی نہرو کی طرح دورے کی دعوت دے کر توازن قائم کرے۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ مک گی دسمبر 1949 میں کراچی کے دورے پر آئے تا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ذاتی طور پر واشنگٹن کے دورے کی دعوت دیں۔ لیاقت علی خان نے پہلے دعوت ملنے کے باوجود سوویت یونین کا دورہ نہ کیا۔ اس کی وجوہات زیادہ واضح نہیں لیکن بظاہر لگتا ہے کہ دونوں فریقوں میں باہمی دلچسپی اس وقت ختم ہوئی جب یہ معلوم ہو گیا کہ پاکستانی وزیر اعظم امریکہ کے دورے کو ترجیح دے رہے تھے۔

لیاقت علی خان کا دورہ امریکہ مئی 1950ء میں طے پایا۔ اس دوران امریکہ اور سوویت یونین کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے اور کوریا میں ان کے دیرینہ نظریاتی بغل بچوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی۔ امریکی محکمہ خارجہ نے صدر ہیری ٹرومین کو ایک بریف ارسال کیا جس میں پاک امریکہ تعلقات اور پالیسی مضمرات کو اجاگر کیا گیا۔ اس میں یہ رائے قائم کی گئی کہ لیاقت علی خان مغرب نواز ہیں لیکن پاکستان میں مغربی استعمار کے بارے میں پائی جانے والی بدگمانیوں کے باعث وہ کھلے عام یہ تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس نوٹ میں نشاندہی کی گئی کہ پاکستان کو بہت کم فوجی یا اقتصادی امداد دی گئی تھی اور یہ کہ پاکستان میں امریکہ کی فلسطین پر پالیسی کو اسرائیل نواز سمجھا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں امریکہ مخالف مظاہرے بھی ہوئے۔ سب سے اہم بات یہ کی گئی کہ:

''امریکہ کے لئے عسکری نقطہ نظر سے جنوبی ایشیا کا پورا خطہ نسبتاً ثانوی اہمیت کا حامل ہے۔ البتہ پاکستان امریکہ کیلئے روس سے جنگ کی صورت میں اس لئے اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں سے امریکی طیارے پرواز کر سکتے ہیں۔ تاہم اس کا سر عام اظہار نہ کیا جائے کیونکہ اس سے امریکہ کے اس تاثر کی نفی ہو گی کہ وہ خطے کی مدد صرف معاشی وجوہات کی بنا پر کر رہا ہے''۔ (ایضاً:34)

لیاقت علی خان نے مئی 1950ء میں امریکہ کا دورہ کیا۔ ایک صحافی کے اس سوال پر کہ

پاکستان کتنی بڑی تعداد میں فوج تیار کرنا چاہتا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا انحصار امریکہ کے ارادوں پر ہے۔ انہوں نے کہا ''اگر آپ کا ملک (امریکہ) ہماری علاقائی سلامیت کی ضمانت دے دے تو میں سرے سے فوج رکھوں گا ہی نہیں''۔ (ایضاً:6-35)۔ اس دورے میں پاکستان نے کوریا کے معاملے پر امریکی مؤقف کی حمایت کی لیکن جب پاکستان سے اقوام متحدہ کے دستے کے طور پر فوج کوریا بھجوانے کی واضح درخواست کی گئی تو لیاقت علی نے یہ عذر پیش کیا کہ ''جب تک پاکستان کو بھارت سے خطرہ ہے۔ میں اپنے ملک کے محدود سکیورٹی وسائل کو کسی اور مقصد کے لئے وقف نہیں کرسکتا''۔ اپنے 3 ہفتے کے طویل دورے میں لیاقت علی نے امریکیوں پر مثبت اثرات مرتب کئے۔ نائب وزیر خارجہ مک گی نے وزیراعظم پاکستان کے بارے میں کہا کہ ''وہ ایک ایسے انسان ہیں جن کے ساتھ ہم معاملات آگے بڑھا سکتے ہیں''۔ اس کے برعکس انہوں نے اکتوبر 1949ء میں قبل ازیں دورہ کرنے والے بھارتی وزیراعظم نہرو کے بارے میں تبصرہ کیا کہ ''وہ غیر واضح اور بظاہر نا قابل اعتبار ہیں''۔ امریکیوں نے نہرو کی غیر جانبدار خارجہ پالیسی کو بھی نامنظور کر دیا۔ (ایضاً:36-35)۔

بہر حال ان تمام حالات اور مثبت اثرات کے باوجود لیاقت علی امریکہ کی طرف سے پاکستان کو مطلوبہ اقتصادی اور عسکری امداد کی فراہمی میں نمایاں پیشرفت میں کامیاب نہ ہو سکے۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی میں پاکستان کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے بہر حال بھارت کو عظیم تر ترجیح دی جاتی رہی۔ یوں 25 جنوری 1951ء کو صدر ٹرومین نے ایک سٹڈی کی منظوری دی جس میں زور دیا گیا کہ:

''بھارت کی کمیونسٹ مدار میں شمولیت کا مطلب ہوگا کہ عملی طور پر پورا ایشیا ہمارے ہاتھ سے چلا جائے۔ اس سے امریکہ کی سکیورٹی پوزیشن کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ چین کا ہاتھ سے نکلنا، ہند چین کو لاحق خطرے اور جنوب مشرق ایشیا کا توازن، تبت پر حملے اور کوریا میں حالات الٹ ہونے سے امریکہ کیلئے جنوبی ایشیا کی سیاسی سٹریٹجک افرادی قوت اور وسائل زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ بھارت بالخصوص اور پاکستان کے بھی لیڈر ایسے ہیں جن کا پورے ایشیا میں زبردست وقار ہے۔ مستقبل میں ان ملکوں کی سفارتی اور اقوام متحدہ میں حمایت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ بھارت کے پاس بالخصوص ایسا سٹریٹجک مواد ہے جو ہمارے قومی مفاد کے لئے اہمیت کا

حامل ہے......''۔(جین 2007ء بی:15)۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ کے سابق گورنر سر اولف کیرو جنہیں عام طور پر جدوجہد آزادی کے دوران کانگریس کے خلاف جارحانہ رویے کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی طرف سے 1951 میں ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مشرق وسطی میں مغربی مفادات کے تناظر میں مرکزی ریاست کے طور پر انہوں نے لکھا کہ ''بھارت مشرق وسطی کے دفاع کے حوالے سے اب ہمارا اڈہ نہیں رہا۔ یہ دفاعی سرحد کے کنارے پر واقع ہے۔ دوسری طرف پاکستان جنوب مغربی ایشیا کے ممالک کی گروپنگ کے عین وسط میں واقع ہے''۔ (کیرو:1951ء:180)۔ کیرو کو بالخصوص اس بات کا یقین تھا کہ مستقبل کی جنگوں میں فضائی طاقت کا استعمال اور اس تناظر میں پاکستان کے مغرب کو اڈے فراہم کرنا نہایت جاندار کردار کا حامل ہوگا۔ البتہ اولف کے یہ تاثرات برطانیہ کی سرکاری پالیسی نہیں تھے۔

بظاہر بھارت سے توجہ پاکستان کی طرف منتقل ہونے کا عمل 26 فروری سے 2 مارچ 1951 کو سری لنکا میں امریکی سفیروں کی کانفرنس میں وقوع پذیر ہوا۔ اس میں نہرو کی بین الاقوامی سیاست میں غیر جانبدارانہ سوچ کو مایوسی کے انداز میں دیکھا اور اسے متکبر اقدام سمجھا گیا۔ کانفرنس میں زور دے کر تجویز کیا گیا کہ امریکہ کو نہرو کے اقدامات کی پرزور طریقہ سے مخالفت کرنی چاہیئے اور بھارت کی خارجہ پالیسی کی گمراہ کن اساس کو بے نقاب کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں کمیونزم سے لاحق خطرات کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ کانفرنس میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ امریکہ نہرو کے ساتھ سختی سے پیش آئے جبکہ پاکستان کو ایک دوست ملک کے طور پر پروان چڑھایا جائے۔ خلیج کے آئیل فیلڈز کے قریب ہونے کی وجہ سے پاکستانی جغرافیائی محل وقوع کا ادراک اور مغربی اتحادیوں کیلئے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔ یہ بھی نوٹ کیا گیا کہ پاکستان کی مدد کے بغیر فارس۔ عراق سیکٹر کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ کانفرنس میں زور دیا گیا کہ پاکستان کو کسی غیر ملکی جارحیت کی صورت میں علاقائی سلمیت کی ضمانت دی جائے۔ چنانچہ یہ تجویز کیا گیا کہ امریکہ اور برطانیہ کو پاکستان کی مسلح افواج کی فوری طور پر تنظیم سازی کرنی چاہیئے۔ البتہ برطانیہ کے دفتر خارجہ نے اس تجویز کو زیادہ پذیرائی نہیں دی کیونکہ اسے خوف تھا کہ اس اقدام سے بھارت اور افغانستان تنہا ہو جائیں گے۔

جنرل ایوب خان نے امریکیوں کو رام کر لیا

پاکستان کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان جو کھلے امریکہ نواز تھے نے اس بات کی انتھک کوشش کی کہ امریکہ سوویت یونین کے خطرے کو روکنے کے لئے پاکستان کو ہمنوا بنالے۔ (چیمہ 1990ء:8-146)۔ 1951ء کے موسم خزاں میں پاکستان کا ایک سفارتی وفد اسلحے کے حصول کے لئے واشنگٹن گیا لیکن چونکہ پاکستان نے کوریا میں اپنی فوج بھجوانے میں تامل کیا تھا اس لئے امریکہ نے کوئی بڑا وعدہ کرنے سے گریز کیا۔ اس سے پہلے مارچ 1951 میں پاکستان میں جنرل ایوب خان کی مدد سے سوویت نواز فوجی بغاوت کی کوشش ناکام بنانے کی وجہ سے ایوب خان پہلے ہی امریکہ کی ستائش حاصل کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ذاتی وجاہت بھی امریکی انتظامیہ میں اثر ورسوخ بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔ 1951ء کے اواخر میں ہینری بائی روڈی Henry Byroade جو پاکستان کے نسبتاً زیادہ ہمدرد تھے وہ امریکہ کے جنوبی ایشیا کے خطے سے متعلق نائب وزیر خارجہ بن گئے۔ انہوں نے یہ یقین کرنا شروع کر دیا کہ ''امریکہ کی محدود عسکری معاونت سے ترکی سے پاکستان تک مسلمان لیکن غیر عرب ملکوں کی ایک محراب تک دفاعی انتظامات کو توسیع دی جانی چاہیئے۔ جس سے خطے کے استحکام میں مدد ملے گی اور سوویت خطرات کے مقابلے میں اس کی پوزیشن بھی زیادہ کمزور نہیں ہوگی''۔ (کوکس 2001ء:47)۔ امریکہ کی داخلی سیاست میں میکارتھی دور میں سیاسی آزادی کا بڑا قتل عام کیا گیا۔ ری پبلکن پارٹی کے دائیں بازو کے سینیٹر میکارتھی نے انٹیلی جنس اور سکیورٹی حلقوں کے تعاون سے ایک مہم کی داغ بیل ڈالی کہ ایسے افراد جو ''امریکہ مخالف'' سرگرمیوں میں ملوث ہیں ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اس نے زندگی کے تمام شعبوں سے لوگوں کی تصوراتی کمیونسٹ کے طور پر نشاندہی کی۔ بالخصوص ہالی ووڈ میں فلم انڈسٹری سے وابستہ افراد کو نشانہ بنایا۔ سینکڑوں سکرپٹ رائٹروں، اداکاروں، ہدایتکاروں، موسیقاروں اور دیگر کو بلیک لسٹ کر دیا گیا اور ان کی سیاسی وابستگی چاہے وہ جھوٹی تھی یا سچی کی بنیاد پر انہیں روزگار سے محروم کر دیا گیا۔ (بوہل اینڈ وینجر 2003)۔ جوں جوں سرد جنگ کی آندھی شیطانی شدت کے ساتھ تیز ہو رہی تھی، اس وقت نو آزاد ملکوں پر پر حمایت کرنے کیلئے دباؤ بڑھایا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں قطبیت Polarisation کا جو عمل وقوع پذیر ہوا اس سے مزید حکومتیں

خوف کا شکار ہو گئیں۔ اسلحہ ساز انڈسٹری اور بڑے کاروبار سے متعلق حلقوں نے امریکی خارجہ پالیسی کا ایجنڈا طے کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس کام کے لئے محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع پینٹا گون میں موجود مقتدر عناصر کا بھی تعاون حاصل کیا گیا۔ (رے 2004:34-18)۔

آئزن ہاور کا دور صدارت

دوسری جنگ عظیم کے ہیرو اور اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور ری پبلکن پارٹی کی طرف سے 1953ء میں امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ جہاں امریکہ کے اندر شخصی آزادیوں کے تحفظ میں پر عزم تھے وہاں انہوں نے سوویت بلاک کے توڑ کیلئے دنیا بھر میں سکیورٹی معاہدے بھی کئے۔ (چیمہ 1990ء:145)۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ وہ اسلحے کی صنعت کی بڑھتی طاقت پر تشویش میں مبتلا تھے اور خبر دار کیا کہ اس سے امریکی قوم کی شخصی آزادیوں پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ آئزن ہاور نے سوویت یونین کے سد باب کے لئے پوری دنیا میں فوجی اڈے قائم کرنے کی پالیسی کی حمایت کی۔ ان کے وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس بھی ''بے خدا کمیونزم'' کا پھیلاؤ روکنے کی ضرورت سے متفق تھے۔ براعظم ایشیا کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کافی پر کشش کیونکہ کشیدگی اور مستقبل کے تنازعات اب یورپ سے آگے تک پھیل چکے تھے۔ آئزن ہاور اور ڈلس دونوں نے محسوس کیا کہ ان کے عالمگیر نکتہ نظر کے حوالے سے پاکستان کو باآسانی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مئی 1953ء میں ڈلس نے پاکستان اور بھارت کا دورہ کیا۔ پاکستان میں قیادت نے ''کمیونزم کے خلاف کاز میں اپنی اطاعت کا عزم کیا اور زور دیا کہ پاکستان کو آزاد عالمگیر دفاعی ٹیم میں شامل کیا جائے''۔ (کوکس 2001:55)۔ جنرل ایوب نے قدیم گریٹ گیم ڈاکٹران کے تناظر میں امریکی وزیر خارجہ کو پاکستان کے محل وقوع کا سٹرٹیجک تخمینہ بتایا اور بحیرہ عرب کے گرم پانیوں کے راستے بڑے روسی حملے کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے تجویز دی کہ اس کا حل یہ ہے کہ سوویت یونین کا راستہ روکنے کے لئے پاکستان کے پاس پوری طرح مسلح فوج ہونی چاہیئے۔ (ایضاً:55)۔ انہوں نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ افرادی قوت اور اڈوں کی فراہمی کی حکومت پاکستان کی آمادگی پر بھی بات کی۔ بھارت پر ممکنہ اثرات کے حوالے سے امریکی تشویش کم کرنے کے لئے ایوب خان نے دلیل دی کہ ''اگر پاکستان امریکہ کی

معاشی اور فوجی امداد سے مضبوط ہو جائے تو وہ کشمیر پر بھارت کی مخالفت کرنے کا موجودہ رویہ تبدیل کر لے گا''۔ واشنگٹن واپسی پر وزیر خارجہ جان ڈلس نے پاکستان کے بارے میں انتہائی مثبت تاثرات کا اظہار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ وہ ''پاکستان قوم کے جنگجوانہ اور مذاہبی خصائل سے کافی متاثر ہوئے ہیں''۔ (ایضاً:56)۔ اس کے برعکس انہوں نے کہا کہ بھارتی وزیر اعظم نہرو ''قطعاً بے عمل سٹیس مین'' ہیں۔ اس کے بعد وہ عمل شروع کیا گیا جس کے تحت پاکستان کو ایشیا میں امریکہ کا قریب ترین اتحادی کہا جا رہا تھا۔ (ایضاً:70)۔

اپنی خود نوشت (2003) Unlikely Beginnings: A Soldier's Life میں میجر جنرل (ر) ابوبکر عثمان مٹھا نے لکھا ہے کہ فوج کے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے کے تمام افسروں اور جنرل ہیڈ کوارٹرز سے یہ رائے طلب کی گئی کہ کیا پاکستان کو فوجی امداد قبول کرنا چاہیئے؟''۔ جنرل مٹھا نے بتایا کہ انہوں نے یہ رائے دی:

> ''میں نے تجویز دی کہ پاکستان کو بیرونی امداد قبول نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس طرح پاکستان اپنی اسلحے کی صنعت کو ترقی نہیں دے سکے گا اور پھر ہم امریکیوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ایک ملک کے طور پر ہماری ذہنیت بھکاری والی ہو جائے گی۔ لیکن بہر حال پاکستانی حکام نے اس کے برعکس فیصلہ کیا جس کے بعد ایک خود سر کرنل براؤن کی قیادت میں یو ایس ملٹری سٹیٹ ایڈ اینڈ ایڈوائزری گروپ جی ایچ کیو آ کر بیٹھ گیا''۔
> (مٹھا:2003ء:165)

دفاعی سمجھوتہ اور فوجی معاہدے

ان بڑھتے ہوئے رابطوں اور کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان 19 مئی 1954ء کو ایک دفاعی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ جس کے مطابق یہ طے کیا گیا کہ امریکہ پاکستان کو اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ساز و سامان، آلات، خدمات اور دیگر معاونت فراہم کرے گا۔ اس حوالے سے معاہدے کی دفعہ ایک کی شق نمبر 2 بالخصوص دلچسپی کی حامل ہے۔ اس میں کہا گیا کہ:

''حکومت پاکستان امریکہ سے ملنے والی معاونت صرف داخلی سکیورٹی کیلئے استعمال کرے گی۔ یا اپنے دفاع کے لئے یا علاقے کے دفاع کے عمل میں شرکت کے دوران یا اقوام متحدہ کے اجتماعی دفاعی اقدامات میں استعمال کرے گی اور ساز و سامان کسی اور ملک کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان حکومت امریکہ کی اجازت کے بغیر اس اسلحے کے طے شدہ استعمال کے علاوہ استعمال نہیں کر سکے گی''۔ (جین 2007 اے:303)۔

اس دوطرفہ معاہدے میں واضح طور پر یہ نہیں بتایا گیا کہ آیا یہ معاہدہ امریکہ کی اینٹی کمیونسٹ عسکری سٹریٹیجی کا حصہ ہے یا یہ کہ پاکستان کو ملنے والا اسلحہ اور سامان بھارت کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ البتہ نائب صدر رچرڈ نکسن اس بات کے حق میں تھے کہ پاکستان کو مسلح کر کے نہرو کو قابو میں لایا جائے۔ (کوکس 2001ء:62)۔ بھارتی وزیراعظم کے غیر جانبدار ممالک کی تحریک میں متحرک کردار پر امریکہ کے قدامت پسند مقتدر حلقے کافی جز بز تھے۔ دوسری طرف امریکہ پاکستان کیلئے امداد کو کم سے کم سطح یعنی 29 ملین ڈالر سے 30 ملین ڈالر تک محدود رکھنا چاہتا تھا کیونکہ تب بھی سوویت خطرے کی روک تھام کے لئے جنوبی ایشیا کا کردار ثانوی حیثیت کا سمجھا جا رہا تھا۔ یہ طرز عمل پاکستانیوں کی توقعات سے قطعاً مختلف تھا۔ جنہوں نے اس پر مایوسی کا گہرا اظہار بھی کیا۔ پروفیسر رابرٹ مک ماہن لکھتے ہیں کہ:

''ڈالروں کے بہاؤ میں ایک واضح تسلسل موجود تھا جنہیں پاکستانی فوجی افسر اور بیوروکریٹس مغرب کے ساتھ اپنے اتحاد کا جائز انعام سمجھتے تھے''۔

بہر حال پاکستان نے اپنی انتھک لابنگ جاری رکھی کہ پاکستان نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا تک میں سوویت یونین کے سدباب کیلئے اہم کردار ادا کرنے پر تیار ہے۔ 1954 کے موسم خزاں میں وزیراعظم محمد علی بوگرہ کی سربراہی میں جنرل ایوب خان اور چودھری محمد علی پر مشتمل اعلیٰ سطحی وفد نے امریکہ کا دورہ کیا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ پاکستان کو 3 کروڑ ڈالر سے بڑھ کر امداد کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر ڈلس نے یہ کہا کہ ''وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان نے اینٹی کمیونزم مؤقف اس لئے

اختیار کیا کیونکہ وہ اسے درست سمجھتا تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود کو ڈالروں کی امداد کا اہل گردانا شروع کر دے''۔ (ایضاً: 68)۔ پاکستان پر ایسے کسی وعظ سے ذرہ برفرق نہ پڑا اور اس نے اس وقت تک اقتصادی اور عسکری امداد میں نمایاں اضافہ کرنے کا مطالبہ جاری رکھا جب تک محمد علی بوگرہ کی آئزن ہاور سے ملاقات میں آخرمراد برنہ آئی۔ پاکستان کی کامیابی وہ خفیہ یاداشت تھی جس کے تحت پاکستان کی اقتصادی اور دفاعی امداد یکلخت بڑھا کر 171 ملین ڈالر کرنے کی منظوری دے دی گئی۔ اس کے تحت امریکہ کو چار فوجی انفنٹری کو مسلح کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ آرمرڈ ڈویژن کی تنظیم نو کرنی تھی جبکہ ائیر فورس کو 6 طیارے اور نیوی کو 12 کشتیاں فراہم کی جانی تھیں۔ (ایضاً: 69)۔

پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ نے اس پیشرفت پر نہایت خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ انہوں نے ستمبر 1954ء میں سیٹو SEATO میں پاکستان کی شمولیت پر نہایت تشکر کا اظہار کیا۔ اس دفاعی معاہدے کا رکن بننے کا دعویٰ کرنے کے پیچھے یہ حقیقت کارفرما تھی کہ مشرقی پاکستان کسی حد تک جنوبی مشرقی ایشیا کے خطے سے منسلک تھا۔ حالانکہ پاکستان کے اس حصے میں پاکستانی فوج کی موجودگی انتہائی کم تھی۔ پاکستان نے امریکہ کے حمایت یافتہ فوجی معاہدوں میں شمولیت کی پالیسی کا سلسلہ جاری رکھا اور 1955 میں معاہدہ بغداد میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد سینٹو CENTO کا 1959 میں ممبر بن گیا۔ واشنگٹن سینٹو کا محض رسمی رکن بن گیا۔ پاکستان کے نقطہ نظر سے اس کی اس فوجی معاہدے میں شمولیت اس بات کا غیر متزلزل ثبوت تھا کہ پاکستان سوویت یونین کے خلاف فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار ادا کرنے کا خواہاں تھا۔ ایوب خان لکھتے ہیں کہ ایک مسلمان ملک ہونے کے ناتے پاکستان کی جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقی وسطی میں سوویت یونین کی مداخلت روکنے کے لئے شہرت ایشیا میں امریکہ کے اہم ترین اتحادی کے طور پر سامنے آئی۔ (151:2006)۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ تمام تر سرگرمیاں پاکستانی اور امریکی فوجی اور سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ کے درمیان معمول کے رابطے اور نیٹ ورک قائم کرنے کیلئے شروع کی گئیں۔ تاہم اس کے باوجود امریکہ بھارت کو بھی ساتھ چلانے کی پالیسی پر گامزن رہا۔ 1955ء تک 33 ملین ڈالر کی فوجی امداد کے پروگرام کے تحت امریکہ نے بھارت کو 17 سی 119 جی طیارے فراہم کیے۔ اس کے علاوہ برطانوی رڈار کے آلات فروخت کرنے کی بھی منظوری دی۔ امریکہ کو امید تھی کہ اس

اقدام سے وہ بھارت کو سوویت یونین سے 60 ہلکے بمبار طیارے خریدنے سے روک سکے گا۔ (نواز 2008:131)۔ جہاں پاکستان امریکہ سے اس بات پر ناخوش تھا وہاں امریکہ نے بھارت کو ایک بڑے جمہوری ملک کے طور پر روسی اور چینی کمیونزم کے متبادل کے طور پر تیار کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مغرب سے اتحاد کرنے کے حوالے سے اہم خارجہ پالیسی پر پاکستانی حکومت نے پارلیمنٹ میں مناسب بحث نہیں کی اور جب 1954 میں معاملہ پارلیمنٹ میں لایا گیا تو اپوزیشن جوزیادہ تر مشرقی پاکستان سے تھی نے حکومت کی بھرپور مخالفت کی۔ (رائے 2004:81)۔ یوں نہایت شروع سے ہی ایسے معاملات معدودے چند مقتدر اشرافیہ تک محدود رہے۔ سیاستدانوں کو ثانوی حیثیت دی گئی جبکہ سول سرونٹس اور فوج نے حمزہ علوی کے بقول ''بیوروکریٹک ملٹری گٹھ جوڑ'' بنالیا۔

انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی)

آئی ایس آئی کا قیام 1948ء میں عمل میں لایا گیا جس کا مقصد بری فوج، فضائیہ اور بحریہ تینوں سروسز سے نمائندگی ایک تنظیم میں جمع کرنا تھا۔ یہ منصوبہ میجر جنرل آر کاٹ ہوم کا تھا جو ان دنوں پاکستان آرمی میں ڈپٹی چیف آف سٹاف تھے۔ بظاہر لگتا ہے کہ کشمیر جنگ کے دوران تینوں مسلح افواج کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے مابین رابطوں کا فقدان تھا۔ آئی ایس آئی بنانے کا مقصد ایسے خلا اور خامیوں کو دور کرنا تھا۔ اس ادارے کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ بیرونی عسکری اور سول انٹیلی جنس ایجنسیوں کی سرگرمیوں کی تفصیل جمع کرکے تجزیہ کرے۔ شروع میں آئی ایس آئی کا داخلی انٹیلی جنس میں کوئی کردار نہیں تھا۔ لیکن بعد ازاں اندرونی معاملات میں اس کا عمل دخل کافی بڑھ گیا تاہم نام نہاد افغان جہاد کے دوران اس کا ڈنکا پوری دنیا میں بجنے لگا۔ یہ افغان جہاد امریکی جاسوسی ادارے سی آئی اے کے قریبی تعاون سے کیا گیا۔ (احمد 2010ء)۔

سپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی)

امریکہ نے پاکستان کی نہایت تربیت یافتہ کمانڈو فورس ایس ایس جی تیار کرنے میں معاونت کی۔ لیفٹیننٹ کرنل غلام جیلانی خان نے ''ایس ایس جی: تاریخ کے آئینے میں'' کے

عنوان سے 479 صفحات پر مشتمل کتاب میں اس ادارے کی تاریخ، ارتقا اور تشکیل کی سیر حاصل تفصیل پیش کی ہے۔ جہاں یہ کتاب نہایت جذبے کے ساتھ لکھی گئی ہے وہاں مصنف نے زیادہ تر ایس ایس جی میں کام کرنے والے افراد کے انٹرویوز پر انحصار کیا ہے کیونکہ اس ادارے کا چارٹر ابھی تک خفیہ ہے۔ امریکی فوج کے تعاون سے ایس ایس جی نے 54-1953 میں ایلیٹ گروپ کے طور پر کام شروع کیا لیکن یہ ادارہ مکمل طور پر 1956ء میں جا کر فعال ہوا۔ اس کا ہیڈکوارٹر پشاور کے قریب چراٹ میں تھا جبکہ اٹک قلعہ میں بھی ایک اڈہ بنایا گیا۔ لازمی بات ہے کہ ایس ایس جی کا قیام امریکہ کی سوویت یونین کے خلاف جنگ میں معاونت کیلئے عمل میں لایا گیا تھا۔ پاکستان یا ہمسائیہ ملک افغانستان پر حملے کی صورت میں ایس ایس جی کو گوریلا کارروائیوں میں حصہ لینا تھا۔ اس کے پہلے کمانڈنگ افسر مٹھا تھے۔ انہوں نے پاکستان اور امریکہ کے فوجی حکام کے درمیان رابطوں کی کافی مسحور کن تفصیل پیش کی ہے۔ امریکیوں کو چراٹ اور اٹک قلعے میں بھیجا گیا جبکہ پاکستان کمانڈوز کو تربیت کے لئے امریکہ بھیجا گیا۔

اس ادارے کیلئے انتخاب کا مرحلہ کافی سخت تھا اور محض چند افراد ہی ایس ایس جی میں بھرتی کے لئے منتخب ہوئے۔ ان دنوں کے دوران کوئی سختی نہیں برتی جاتی تھی اور جو افراد روزہ نہ رکھتے تو انہیں کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فوجی افسروں کی روایات ان افسروں سے کافی مختلف تھیں جنہیں انگریز دور میں سندھرسٹ اور اس جیسے دیگر اداروں میں تربیت دی جاتی تھی۔ اگرچہ پاکستانی اور امریکی فوجی حکام میں دوستانہ مراسم کافی مضبوط ہو گئے لیکن بریگیڈئیر مٹھا کو شبہ تھا کہ بیشتر امریکی فوجی سی آئی اے کے لئے کام کرتے تھے۔ (مٹھا2003:209)۔ اس کے علاوہ امریکی خود کو برتر سمجھتے تھے جبکہ پاکستانیوں کو کمتر حیثیت دیتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے اپنا استحقاق سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا جائے۔ (ایضاً:14-209)۔ بالفاظ دیگر جہاں دونوں فریق باہم مل جل کر رہتے تھے وہاں انہوں نے اپنی الگ شناخت برقرار رکھی اور ایک دوسرے کو شک و شبے کی نظر سے بھی دیکھتے تھے۔

آئزن ہاور -- ڈلس ڈاکٹرن

مشرق وسطی میں سوویت یونین کا سدباب کرنے کیلئے 1957 میں آئزن ہاور - ڈلس

ڈاکٹرن تیار کی گئی۔ یہ ڈاکٹرن 1956 کے نہر سویز بحران کے تناظر میں تیار ہوئی۔ فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کے فوجیوں پر مشتمل سہ ملکی فوج جو مصر کے خلاف جارحیت کر رہی تھی کو امریکہ نے کوئی امداد نہ دی۔ اس کے برعکس امریکہ نے اسرائیل کو سنائی سے نکلنے کو کہا لیکن اس پالیسی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ امریکہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر سے قریبی تعلقات کا خواہاں تھا کیونکہ جمال عبدالناصر کی قوم پرستی کمیونزم کے بدترین مخالف جان فوسٹر ڈولس کی آنکھ میں کھٹکتی تھی۔ اس کے برعکس امریکہ نے سعودی عرب کو خطے میں مرکزی اتحادی بنانے کو ترجیح دی۔ چونکہ وہ تیل پیدا کرنے والا بڑا ملک تھا اور فرینکلن روز ویلٹ کے دور سے ہی امریکہ نے سعودی عرب اور یوں اپنی تیل کی سپلائی کو تحفظ دینے کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ امریکیوں کا خیال تھا کہ سعودی عرب کو مسلمان ملکوں میں ممتاز مذہبی مقام حاصل ہے اور کیونکہ اسلام کا آغاز اس سرزمین سے ہوا تھا اور مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات بھی یہیں واقع ہیں۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر ایلن ڈلس اور ان کے بھائی وزیر خارجہ جان ڈلس نے جمال عبدالناصر کے خلاف سعودی وہابیوں کے ساتھ اتحاد بنانے کا ارادہ کیا۔ اس منصوبے میں مصر کے بنیاد پرست اخوان المسلمون کو جمال عبدالناصر کے خلاف مضبوط کرنا بھی شامل تھا۔ (ڈریفس 2005ء: 25-120)۔ اس کے علاوہ 1962ء میں امریکہ کی آشیر باد سے مسلم ورلڈ لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر مکہ میں قائم کیا گیا اور اس میں دائیں بازو کی تمام ممتاز سیاسی شخصیات شامل تھیں۔ اسلام پسند سوچ کے روح رواں مولانا مودودی بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھیں۔ اس تنظیم کو پوری دنیا میں اسلام پسندی پھیلانے کا ایجنڈا سونپا گیا۔ (ایضاً: 35-131)۔ البتہ 1956 میں امریکہ کی ایک تحقیق میں پاکستان کے مشرق وسطیٰ کے معاملات میں کارآمد ہونے پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا۔ 1957 تک آئزن ہاور اور جان ڈلس اس بات کے قائل ہو گئے کہ بھارت کی غیر جانبداری امریکی مفادات سے متصادم نہیں تھی۔ اس کے برعکس پاکستان سے امریکہ کے قریبی تعلقات پر شبہات سر اٹھانے لگے۔ آئزن ہاور نے پاکستان کے ساتھ فوجی معاہدے کو ''امریکہ کی تاریخ کا بدترین منصوبہ اور فیصلہ قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک خوفناک غلطی تھی لیکن اب ہم مایوسی سے اس میں شامل ہیں''۔ (کوکس 1992ء: 84)۔ امریکیوں کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ پاکستان کا کمیونزم مخالف عزم اس کے امریکہ کے ساتھ اتحاد کی اولین وجہ تھا۔ چنانچہ امریکہ کی ایک انٹیلی جنس رپورٹ میں یہ

ریمارکس دیے گئے:

''پاکستان کا اپنے بجٹ کا ایک تہائی حصہ دفاعی اخراجات کیلئے مختص کرنا اور امریکہ سے اضافی اسلحہ مانگنا روسی یا چینی کمیونزم کے حملے سے دفاع کیلئے نہیں ہے۔ اس کے لئے پاکستان کے اپنے وسائل کبھی کافی نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی اس کا مقصد اندرونی سکیورٹی برقرار رکھنا ہے کیونکہ اس کے لئے موجودہ فوج بھی زیادہ ہے۔ بلکہ پاکستان کا بڑا مقصد بھارت کے مقابلے میں فوجی لحاظ سے تیار رہنا ہے''۔ (جین 2007ء اے:33)۔

فوج اور اندرونی سیاست

پاکستان کے دو خارجی معاملات -- بھارت کے ساتھ تنازعہ اور امریکہ سے امداد کے حصول -- میں پاکستانی سیاستدانوں، سول اور فوجی بیوروکریسی کا کم یا زیادہ مگر اتفاق رائے تھا۔ پاکستان اپنی دولت مشترکہ کی رکنیت کو بھی اہمیت دیتا تھا اور اس کے ساتھ اس نے فوجی سطح پر اپنا تعاون بھی جاری رکھا۔ (سہیل:1991)۔

راولپنڈی سازش کیس 1951

انتہائی قوم پرست مسلمان افسروں نے اعلیٰ عسکری عہدوں پر انگریز افسروں کی تعیناتی پر ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا۔ اس ناراضگی میں یہ تاثر بھی شامل تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے پوری نیت کے ساتھ جنگ کشمیر کا ساتھ نہیں دیا چنانچہ یہ طے ہونے لگا کہ حکومت کا تختہ الٹ کر ایک محب وطن حکومت قائم کی جائے۔ تاہم ان سازشوں کی ہوا حکومت کو لگ گئی۔ مارچ 1951ء کے شروع میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے اعلان کیا کہ حکومت نے ایک منصوبہ بے نقاب کیا ہے جس میں فوج کے چند افسر اور کمیونسٹ پارٹی کے کچھ ارکان ملوث ہیں اور ان کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا ہے۔ اس میں الزام لگایا گیا کہ سازش کرنے والوں کا مقصد پرتشدد طریقے سے پاکستان میں افراتفری پھیلانا اور مسلح افواج کی وفاداری تبدیل کرنے کی کوشش کرنا تھا''۔ (Gankovsky and Gordon-Polonskaya 1972: 175)

اس کیس کا مرکزی کردار میجر جنرل اکبر خاں تھا جنہوں نے 1948ء کی جنگ کشمیر میں ممتاز

کردارادا کیا۔اصغر خان کے مطابق 14 اگست 1947ء کو کراچی میں گورنر جنرل ہاؤس کے سبزہ زار میں ایک بڑی استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔اس تقریب میں کچھ افسروں کو بھی مدعو کیا گیا۔کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر اکبر خان نے جناح صاحب سے شکایت کی کہ اعلیٰ عہدوں پر اب بھی انگریز افسر تعینات ہیں تو قائداعظم نے غصے سے جواب دیا کہ ''یہ کبھی مت بھولو کہ آپ ریاست کے ملازم ہیں۔پالیسی بنانا آپ کا کام نہیں، یہ ہم یعنی عوام کے نمائندوں کا کام ہے کہ ملک کو کیسے چلانا ہے۔آپ کا کام صرف سول عہدیداروں کے احکامات کی تعمیل کرنا ہے''۔(2005ء:3)۔عائشہ جلال نے لکھا ہے کہ'' تیز تر ترقی کرنے کی پاکستانی افسروں کی انتہائی زیادہ خواہش برطانیہ کے جنگ کے بعد سٹرٹیجک عزائم کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئی''۔اس کا بڑا فیکٹر یہ نہیں تھا کہ پاکستان میں موجود 400 سے 435 انگریز افسروں کو جلدی جلدی رخصت کر دیا جائے بلکہ مشرق قریب اور مشرق بعید میں برطانیہ کی گرفت برقرار رکھنے کی پالیسی کے آگے بند باندھنا بھی تھا۔(جلال 117:1990)۔ انگریزوں نے ایسا ہونے سے روکنے کی ناکام کوشش کی ۔ اس کی بجائے انہوں نے اہم عہدوں پر ایسے افسروں کی ترقیوں کی کوشش کی جو مغرب نواز اور قابل اعتماد تھے۔ جنوری 1951 میں جنرل ایوب خان کی پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف کے طور پر ترقی بھی ان کی مغرب نواز سوچ کا شاخسانہ تھی۔بظاہر ایسے افسر سیز فائر لائن کے ساتھ کشمیر کی تقسیم کے معاملے پر آسانی سے کنٹرول کئے جاسکتے تھے۔(ایضاً:19-118)۔

اس کے برعکس جنگ کشمیر کے ''ہیرو'' اکبر خان پاکستان کی طرف سے سیز فائر کا فیصلہ قبول کرنے پر مایوس تھے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے بھارت کو فائدہ ہوا تھا۔اکبر خان وزیراعظم سمیت اپنے حکومت مخالف خیالات اور سخت الفاظ کی وجہ سے مشہور تھے۔اپنے ہم خیال فوجی افسروں اور چند کمیونسٹ لیڈروں کے تعاون سے انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ مبینہ طور پر منصوبہ یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو گرفتار کیا جائے۔اس کے بعد گورنر جنرل سے زبردستی کہا جائے کہ وہ حکومت برطرف کردے۔اکبر خان حکومت بنانے اور عام انتخابات کا حکم جاری کرتے جو کہ آزادی کے بعد سے ہوئے ہی نہیں تھے۔ نئی حکومت کمیونسٹ پارٹی کو بھی سیاسی عمل میں حصہ لینے کی اجازت دیتی۔کیونکہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے کمیونسٹ پارٹی کا بری طرح ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ مرکزی حکومت گزشتہ نصف سال سے ان باغیوں کی سرگرمیوں سے آگاہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب برطانوی، امریکی اور پاکستانی انٹیلی جنس نے سوویت نواز پراپیگنڈے کے خلاف مشترکہ آپریشن شروع کر دیا تھا۔ بہر حال یہ سازش اگر سنجیدہ تھی تو بھی بے نقاب ہو گئی اور منصوبہ سازوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ عدالتوں نے سویلین افراد کو 4 سال قید اور 500 روپے جرمانے کی سزا دی جبکہ فوجیوں کو 3 سے 7 سال تک قید کی سزائیں دی گئیں۔ جنرل اکبر خان کو عوامی زندگی سے 12 سال دور رہنے کی سزا سنائی گئی۔ (Gankovsky and Gordon-Polonskaya 1972: 175–6)

وزیراعظم لیاقت علی خان کا قتل

16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کو ایک افغان سید اکبر نے راولپنڈی میں ایک جلسہ عام کے دوران گولی مار دی۔ اس قاتل کو ایک پولیس افسر نے موقع پر گولی مار کے ہلاک کر دیا۔ کیا یہ محض ایک شخص کی غلطی تھی یا سازش میں کوئی اور لوگ بھی ملوث تھے؟۔ چونکہ قاتل کو جائے واردات پر ٹھکانے لگا دیا گیا اس لئے اس کیس کی تسلی بخش تفتیش نہ ہو سکی اور تفصیلات ادھوری رہیں۔ بہر حال کسی بھی قیمت پر لیاقت علی خان چلے گئے اور اس کے بعد قوم کی رہنمائی کرنے والا کوئی قومی لیڈر باقی نہ رہا۔ اس کے بعد سینئر بیوروکریٹ سیاسی منظرنامے پر حاوی ہونا شروع ہو گئے۔ اس کا پہلا اشارہ اس وقت ملا جب خواجہ ناظم الدین جن کا تعلق بنگال سے تھا اور جو گورنر جنرل کے طور پر کام کر رہے تھے انہیں وزیراعظم بنا دیا گیا۔ جبکہ سینئر بیوروکریٹ ملک غلام احمد جو وزیر خزانہ تھے وہ گورنر جنرل بن گئے۔ چونکہ اس وقت تک پاکستان کا کوئی آئین نہیں بنا تھا اس لئے حکومتی مشینری کا زیادہ تر انحصار 1935 ایکٹ پر تھا جو گورنر جرل کو زیادہ بااختیار بناتا تھا۔ (احمد 1998ء: 172)۔

احمدیوں کے خلاف 1953 کے فسادات

جس وقت فوج کے چند افسروں کی طرف سے اقتدار پر قبضے کی راولپنڈی سازش کے تانے بانے بنے جا رہے تھے اس وقت 1953ء میں ایک بالکل مختلف صورتحال نے سر اٹھایا اور علما کرام نے ختم نبوت تحریک شروع کر دی۔ اس تناظر کی جڑیں 20 ویں صدی کے شروع کے دور تک جاتی تھیں جب پنجاب کے شہر قادیان میں پیدا ہونے والے مرزا غلام احمد (1835-1908) نے یہ

دعویٰ کرنا شروع کردیا کہ وہ (نعوذ باللہ) پیغمبر ہیں اور ان پر وحی اترتی ہے۔ مرزا غلام احمد نے خود کو مسیح موعود اور ہندو بھگوان کرشن بھی قرار دیا۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کو حرام قرار دیا۔ یہ دعوے سنی اور شیعہ مسلمانوں دونوں کیلئے نا قابل قبول تھے اور انہوں نے مرزا قادیانی کو مرتد قرار دے دیا۔ مرزا غلام احمد کے انتقال کے بعد احمدی تحریک اندرونی خلفشار کا شکار ہوگئی۔ ایک دھڑا لاہوری گروپ یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ مرزا غلام احمد پیغمبر نہیں بلکہ محض مجدد (مصلح) ہیں۔ جبکہ اکثریتی گروہ جسے ربوہ گروپ کہا گیا نے بدستور یہ کہا کہ وہ رسول تھے۔ (کورٹ آف انکوائری 1954: 187-200)۔

1912ء میں مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر الدین محمود احمد نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ وہ مسلمان جو احمدیت پر ایمان نہیں رکھتے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ (جونز 1989ء: 200)۔ اس کے ردعمل میں علما نے احمدیوں کی مرتد کے طور پر مذمت شروع کر دی۔ انگریز دور میں احمدیوں کو حکومتی سرپرستی اور تحفظ ملا۔ اگرچہ احمدی جہاد کے خلاف تھے لیکن احمدیوں کی بڑی تعداد انگریز فوج میں ملازم تھی۔ احمدیوں کی بعض تحریروں سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ہندوستان سے انگریزوں کی رخصتی کے بعد اقتدار انہیں ہی ملے گا۔ (کورٹ آف انکوائری 1954: 196)۔ اس کے علاوہ ان کا لٹریچر بھی انگریز حکمران کے بارے میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ بہر حال پنجاب میں احمدیوں کو چند مسلمانوں کو اپنے عقیدے پر ایمان لانے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر ظفر اللہ خان جیسے بعض ممتاز احمدیوں نے تحریک قیام پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خود محمد علی جناح نے بھی پنجاب کی تقسیم کا کیس لڑنے کیلئے ان پر بھرپور اعتماد کیا۔ بعدازاں انہیں انعام کے طور پر پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ بھی لگا دیا۔ ستم ظریفی دیکھیں کہ ظفر اللہ خان نے احمدی عقیدے کے مطابق محمد علی جناح کے جنازے میں بھی شرکت نہ کی۔ (ایضاً: 199)۔

ختم نبوت تحریک کا احیا علما نے کیا جنہیں خوف لاحق ہوا کہ احمدی پوری ریاست پر قبضہ کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ احمدیوں کے روحانی پیشوا مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کوئٹہ میں ایک اشتعال انگیز تقریر میں بلوچستان صوبے کی آبادی کے ارتداد اور صوبے کو مزید تبلیغ کا مرکز بنانے کی بات کی۔ اس تقریر سے سواد اعظم کے علما مشتعل ہو گئے اور انہوں نے احمدیوں کے خلاف راست اقدام کا نعرہ بلند کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ پاکستان چونکہ ایک اسلامی

ملک ہے اس لئے اعلیٰ عہدوں پر صرف مسلمانوں کو فائز کیا جائے۔ احمدیوں کو ان کے اسلام سے متصادم نظریات کی بنا پر اہم عہدوں سے ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا۔ نتیجتاً مارچ 1953 میں پنجاب میں ایک پرتشدد تحریک پھوٹ پڑی اور احمدیوں پر حملوں کے علاوہ ان کی جائیدادوں کی لوٹ مار کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا۔ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور تحریک کچل دی گئی۔ اس موقع پر فوج نے برق رفتاری اور سختی کے ساتھ ایکشن لیا۔

فسادات اور شورش کی انکوائری کیلئے لاہور ہائی کورٹ کے دو ججوں جسٹس منیر احمد اور جسٹس رستم کیانی پر مشتمل کورٹ آف انکوائری قائم کی گئی۔ تحقیقات کے بعد مکمل ہونے والی جسٹس منیر رپورٹ میں علما کی تحریک کی نظریاتی اساس کا سیر حاصل تجزیہ کیا گیا۔ سنی اور شیعہ مکتبہ فکر کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے مولوی حضرات اور ترجمانوں سے سوالات و جوابات کے بعد ججوں کا کہنا تھا کہ علما نہ صرف احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلانا اور اعلیٰ عہدوں سے ہٹانا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی مطالبہ کر رہے ہیں کہ ایسے افراد جو پیدائشی احمدی نہیں ہیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے اپنا عقیدہ تبدیل کیا ہے وہ کفر کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہیں سزائے موت دی جائے۔ (ایضاً 20-218)۔ رپورٹ میں ''گڑبڑ کی ذمہ داری'' کے عنوان سے باب میں فاضل جج صاحبان نے قرار دیا کہ نہ صرف اس کے ذمہ دار علما اور احرار جیسے احمدی مخالف عناصر تھے بلکہ خود احمدیوں کی اشتعال انگیزی کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے۔ یہ بھی نشاندہی کی گئی کہ پنجاب میں برسر اقتدار پارٹی مسلم لیگ کے کئی ممتاز عہدیداروں نے بھی فسادات میں سرگرم کردار ادا کیا۔ (ایضاً:62-237)۔

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ احمدیوں کے خلاف تنازعے کو پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ نے بھی استعمال کیا تاکہ مرکز میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت گرائی جاسکے۔ اگرچہ ان دونوں کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ (ایضاً:68-262)۔ فوج نے نہایت سختی کے ساتھ معاملے کو نمٹایا۔ ان دنوں فوجی افسروں میں احمدیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان جو پنجاب میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنائے گئے تھے نے فوج کو بلوائیوں کے خلاف سخت کارروائی کا حکم جاری کیا۔ بلوائیوں پر سیدھی گولیاں چلائیں گئی اور چند ہی روز میں امن وامان کی صورتحال بحال کر دی گئی۔ مارشل لاء کے تحت کئی منصوبہ سازوں کے خلاف فوجی عدالتوں میں مقدمات چلا کر سزائے موت دی گئی۔ سزا پانے والوں نے بعدازاں معافی کی استدعا کی جس پر انہیں رہا کر دیا گیا۔

آ ئین سازی

اندرونی جھگڑوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث مسلم لیگ کمزور ہوگئی اوراس کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچا۔وزیراعظم لیاقت علی خان نے انتخابات کرانے سے گریز کیا،بظاہراس کی وجہ یہ تھی کہ خودان کا اپنا کوئی حلقہ انتخاب نہیں تھا جہاں سے ان کی کامیابی یقینی ہوتی۔اس خوف اور بہانے کو بنیاد بنا کران کے پیشروحکمرانوں نے بھی انتخابات کرانے سے پہلوتہی کی۔آ ئین ساز اسمبلی کا انتخاب 1946 میں کیا گیا تھا لیکن متحدہ ہندوستان کیلئے آ ئین کی تیاری کے عمل میں مسلم لیگ کے ارکان نے بھی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ان میں سے کئی ارکان اب پاکستان کی آ ئین ساز اسمبلی کے رکن تھے۔جس کے ذمے پاکستان کا دستور تیار کرنے کا کام لگایا گیا تھا۔11 اگست 1947ء کو قیام پاکستان سے محض 3 روز پہلے بانی پاکستان محمد علی جناح نے آ ئین ساز اسمبلی سے خطاب میں کہا کہ:

> ''آپ اب آزاد ہیں ۔ پاکستان میں آپ مندروں میں جانے کیلئے آزاد ہیں ،مسجدوں میں یا عبادت کی کسی بھی جگہ پر جانے کیلئے آزاد ہیں۔آپ کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب یا مکتبہ فکر سے ہو۔اس کا ریاست کے امور سے کوئی تعلق نہیں۔ہم اپنا آغاز اس بنیادی اصول کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ہم سب ریاست کے ایک جیسے شہری ہیں...... میں سمجھتا ہوں کہ یہی فلسفہ ہم اپنے سامنے ایک آئیڈیل کے طور پر رکھیں اور آپ دیکھیں گے کہ ایک وقت آئے گا کہ ہندو خود کو ہندو اور مسلمان خود کو مسلمان سمجھنا ختم کر دیں گے۔ یہ میں مذہبی حوالے سے نہیں کہہ رہا بلکہ سیاسی حوالے کے طور پر کہہ رہا ہوں کیونکہ عقیدہ کسی انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔(جناح کی تقریریں 1976ء:4-403)۔

جناح کی تقریر سے ایک نہ ختم ہونے والا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اس سے اس بنیاد کی نفی ہوتی تھی جس کی بنا پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ ہر شخص کے ذہن میں سوال تھا کہ: کیا پاکستان ایک سیکولر ریاست بننے والا ہے؟ ۔تو پھر مسلمانوں کے الگ وطن کے قیام کے مطالبے کا کیا جواز تھا؟۔

سنی اکثریت والے ماحول میں مسلمانوں کے الگ ملک کے قیام کا مطالبہ آگے بڑھانے سے پہلے محمد علی جناح رسمی طور پر شیعہ مکتبہ فکر سے جڑے تھے۔ جب انہوں نے الگ ملک کے قیام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی تو انہوں نے اس مطالبے کی مذہبی بنیاد فراہم کرنے کا کام تیز کر دیا۔ 1940ء کے عشرے تک انہوں نے محسوس کر لیا کہ قیام پاکستان کا خواب صرف اس صورت میں پورا ہوسکتا ہے جب علما کو اس مقصد کیلئے متحرک کیا جائے گا تا کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کی جا سکیں۔ چنانچہ مسلم لیگ نے سنی مکتبہ فکر کے سواد اعظم یعنی بریلوی مسلمانوں سے قربتیں بڑھانا شروع کر دیں جن کے کنٹرول میں ہزاروں مسجدیں اور مزار تھے۔ 1944ء سے آگے تک پاکستان کے حق میں اسلامی نعرے اور جذباتی اپیلیں مسلم لیگ کی انتخابی مہم کا لازمی جزو بن گئے۔ اس کے نتیجے میں 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو بھاری کامیابی ملی۔

شیعہ کمیونٹی کو ایسی مسلم ریاست کے قیام پر تشویش تھی جو سنی فقہ کی بنیاد پر استوار ہونے والی تھی۔ اسی طرح احمدی فرقے جسے شیعہ اور سنی علما دونوں بدعتی سمجھتے تھے وہ بھی مسلمانوں کے الگ ملک کے قیام کی حمایت کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ ان سب گریزپا حلقوں کو محمد علی جناح نے یقین دلایا کہ پاکستان فرقہ وارانہ ریاست نہیں ہوگی۔ چنانچہ سنی اکثریت کے کئی حلقوں کے بعد بالآخر اہل تشیع اور احمدیہ کمیونٹی نے بھی پاکستان کی حمایت کر دی۔ اس کے علاوہ جب پاکستان بن گیا تو ہندو اقلیت بھی پاکستان بالخصوص مشرقی پاکستان میں مقیم تھی اور وہاں اس کی آبادی 23 فیصد تھی وہ بھی پاکستانی بن گئی۔

پاکستان کی متنوع مذہبی اور فرقہ وارانہ ہیئت کی بنا پر جناح نے یقیناً مسلم قوم پرستی کے فروغ پر دھیان دیا کیونکہ یہ قیام پاکستان کی بنیاد تھی لیکن وہ اسے پاکستان قوم پرستی میں بدلنے کے خواہاں نظر آتے تھے اور اگر ان کی تقریر کا متن نہایت غور سے پڑھیں تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ مذہب کو نجی حیثیت دینے کے متمنی تھے۔ سیکولرازم کی موجودہ تعریف کہتی ہے کہ:

ریاست فرد اور مذہب کی کارپوریٹ آزادی کی ضمانت دے اور شہریوں سے بلاتفریق مذہب سلوک کرے۔ آئینی لحاظ سے سیکولر ریاست کسی مخصوص مذہب کو مراعات دے نہ فروغ دے اور نہ ہی مذہب میں مداخلت کرے۔ (احمد: 1987ء:36)۔

جناح صاحب کے انتقال (11 ستمبر 1948ء) کے بعد جانشین حکومت نے قائداعظم کی یہ

تقریر دبا دی۔ حتیٰ کہ سرکاری سطح پر بانی پاکستان کی تقاریر کا جو مجموعہ شائع ہوا ان میں بھی اسے شامل نہ کیا گیا۔ پاکستان کے بائیں بازو کے لبرل اور مارکسسٹ عناصر پاکستان کے ایک جمہوری سیکولر ملک ہونے کے دفاع میں اس تقریر کا مسلسل استعمال کرتے رہے جبکہ دائیں بازو کے لبرل، قدامت پسند اور اسلام پسند اس تقریر کو ایک ایسی مثالی اسلامی ریاست کے حق میں بیان قرار دیتے رہے جو انگریز دور سے پہلے ہندوستان میں مذہبی رواداری کی عملی تفسیر تھی۔ جناح کے فوراً بعد آنے والے ان کے جانشین البتہ اس تقریر کو قائد کے پاکستان کے سیکولر-لبرل تصور اور مسلم قوم پرستی کے درمیان تالیف قلب کے طور پر دیکھنے کے مشتاق رہے۔ 7 مارچ 1949ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پارلیمنٹ میں قرارداد مقاصد پیش کی۔ جس میں کہا گیا کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالی کی ذات کے پاس ہے اور ارکان پارلیمنٹ صرف اللہ کے مقرر کردہ قانون کے اندر رہ کر قانون سازی کا حق استعمال کر سکتے ہیں۔ علما نے اس کی تشریح یہ کی کہ یہ شریعت کی بالادستی تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ وزیر اعظم اور ان کے جدت پسند اور تعلیم یافتہ ساتھیوں نے وضاحت کی کہ قرارداد مقاصد کا مطلب ملائیت پر مبنی حکومت کا قیام یا جمہوریت یا اقلیتی حکومت سے انکار نہیں اس کے بجائے اسلامی اصولوں کے عین مطابق جمہوریت اور اقلیتی حقوق کو زیادہ قابل قبول بنایا جائے گا۔ (آئین ساز اسمبلی میں بحث: 49-1)۔ پاکستان کی جمہوریت کے ڈرامائی اسلامی خدوخال کے ساتھ آئین ساز اسمبلی کو ایسا فارمولا بھی تیار کرنا تھا جس کے تحت پاکستان کو ایسی فیڈریشن بنانا تھا جس میں پاکستان کی متعدد قومیتوں کیلئے شراکت اقتدار قابل قبول ہو۔ نہایت شروع سے بنگالیوں جو پاکستان کی تمام آبادی سے بھی زیادہ واحد قوم تھی، اس طرح بلوچوں، پختونوں اور سندھیوں نے پنجابیوں کے غلبے پر مایوسی کا اظہار کر دیا۔

پارلیمنٹ سے باہر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں جماعت اسلامی نے اسلامی آئین تشکیل دینے کی مہم شروع کر دی۔ (احمد 2009ء: 60-159)۔ 1952ء کی بنیادی اصول کمیٹی نے ماہرین کا ایک بورڈ تیار کرنے کی سفارش کی جو اس بات کا یقین کرے کہ پارلیمنٹ نے جو قانون سازی کی ہے وہ اسلام سے ہم آہنگ ہے کہ نہیں۔ کمیٹی نے یہ بھی تجویز دی کہ پارلیمنٹ کے مسلمان ارکان کو کسی قانون سازی میں فیصلہ کن اختیار ملنا چاہیئے۔ یہ تجویز بھی دی گئی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مساوی ارکان پر مشتمل دو ایوانوں کی قومی پارلیمنٹ بنائی جائے حالانکہ

مشرقی پاکستان کی آبادی پورے پاکستان سے زیادہ تھی۔ 1955 میں مغربی پاکستان کے صوبوں این ڈبلیو ایف پی، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کو ایک صوبہ مغربی پاکستان بنادیا گیا حالانکہ بنگالی، بلوچ، پختون اور سندھی قوم پرست لیڈروں نے اس کی بھرپور مخالفت کی۔

بیوروکریٹوں نے سیاسی عمل پر گرفت مضبوط کرلی

پاکستانی سیاستدانوں کی نا اہلی اور نالائقی کے باعث سینئر بیوروکریٹوں کے لئے سیاسی نظام پر گرفت مضبوط کرنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ وزیراعظم ناظم الدین پاکستان میں خوراک اور معیشت کے بحران پر قابو پانے میں نااہل ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ تنخواہوں کے بحران اور بجٹ کے مسائل نے بھی حکومت کی مشکلات میں اضافہ کردیا۔ اس صورتحال سے پورے ملک کے عوام میں بے چینی کی لہر پھیل گئی۔ 17 اپریل 1953 کو گورنر جنرل غلام محمد نے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی حکومت برطرف کردی۔ نئے وزیراعظم کے لئے ان کا انتخاب نہایت غیر متوقع تھا۔ انہوں نے امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ (ناظم الدین کی طرح یہ بھی بنگالی تھے) کو طلب کیا اور ملک کا وزیراعظم بنادیا۔ بنگالی النسل ہونے کے علاوہ ان کی بظاہر واحد اہلیت ان کا راسخ العقیدہ امریکہ نواز ہونا تھا۔ مارچ 1954ء میں مشرقی پاکستان میں صوبائی انتخابات میں مختلف جماعتوں کا متحدہ محاذ جو مغربی پاکستان کے غلبے کا مخالف تھا جیت گیا اور اس نے مسلمانوں کے لئے مخصوص 237 میں سے 223 نشستیں حاصل کرلیں۔ مضبوط اور بالادست مرکز کی مخالفت کرنے والوں کی کامیابی سے کراچی میں سراسیمگی پھیل گئی۔

مرکزی حکومت نے یہ الزام لگا کر اپنے ردعمل کا اظہار کیا کہ ''جگتو فرنٹ'' نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر پاکستان کی وحدت کے خلاف سازش کی ہے۔ چنانچہ جگتو فرنٹ کی حکومت برخواست کردی گئی اور جولائی 1954ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگادی گئی۔ میجر جنرل سکندر مرزا جو فوجی افسر سے اپنا کیڈر تبدیل کرکے سول سرونٹ بن گئے تھے کو مشرقی پاکستان کا گورنر لگادیا گیا۔ (کیلارڈ 1957ء:24)۔ بہرحال مرکزی اشرافیہ کے مختلف دھڑوں کے درمیان کشمکش کا سلسلہ جاری رہا۔ پارلیمنٹ کے کئی ناراض ارکان کی پشت پناہی سے وزیراعظم محمد علی بوگرہ میں اتنا اعتماد آ گیا کہ وہ ناقابل شکست غلام محمد کو چیلنج کرسکیں۔ ارکان پارلیمنٹ کی مدد سے

1935ء کے ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور گورنر جنرل کو اس کا پابند بنایا گیا کہ وہ کوئی کام کرنے سے پہلے وزیراعظم کا مشورہ ضرور لیں گے۔

گورنر جنرل نے بھی تادیبی کارروائی شروع کردی۔ انہوں نے محمد علی بوگرہ، دیگر وزراء اور ایوب خان جو امریکہ گئے ہوئے تھے کو وطن واپس آنے کا حکم دیا۔ ایوب خان کے مطابق غلام محمد نے انہیں اختیارات دینے کی پیشکش کی تاکہ وہ ملک کا آئین تین ماہ کے اندر تیار کرلیں لیکن انہوں نے انکار کردیا۔ اس کے بعد کئی اتار چڑھاؤ آئے اور ریشہ دوانیوں کا بازار گرم رہا۔ بالآخر 24 اکتوبر 1954ء کو غلام محمد نے اس الزام پر آئین ساز اسمبلی برطرف کردی کہ یہ ایوان درست نمائندگی نہیں کرتا اور آئین کی تیاری میں بھی ناکام رہا ہے۔ جسٹس منیر احمد کی زیر قیادت لچکدار سپریم کورٹ نے ''نظریہ ضرورت'' کے تحت گورنر جنرل کے اقدام کو درست قرار دے دیا۔ البتہ جسٹس کارنیلئس نے ایک اختلافی نوٹ میں پارلیمنٹ کی بالادستی کو تسلیم کیا۔ (نواز 2008ء:126)۔ غلام محمد نے ایک بار پھر ایوب خان کو دعوت دی کہ وہ ''قابل ترین افراد پر مشتمل کابینہ'' کا حصہ بن جائیں، اس بار ایوب خان رضامند ہو گئے اور وزیر دفاع بن گئے۔ (خان 2006:70-68)۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بطور کمانڈر انچیف ایوب خان کی مدت 1954 میں ختم ہونے والی تھی۔ انہوں نے شرط لگائی کہ وہ صرف اس شرط پر وزارت دفاع قبول کریں گے اگر کمانڈر انچیف کا عہدہ بھی ان کے پاس رہے۔ اس طرح انہیں بطور کمانڈر انچیف توسیع بھی دے دی گئی۔ تاہم خرابی صحت کے باعث غلام محمد کو جانا پڑا اور ان کی جگہ سکندر مرزا ملک کے گورنر جنرل بن گئے۔ سکندر مرزا اور جنرل ایوب دونوں ہی امریکہ کے زبردست خیر خواہ تھے بلکہ جنرل ایوب تو پاکستان کو امریکہ کا بغل بچہ بنانے میں سکندر مرزا سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ امریکہ پاکستان میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ان دنوں پاکستان کا دورہ کرنے والے امریکہ کے ایڈمرل آرتھر ڈبلیو ریڈفورڈ اس بات پر نہایت خوش ہوئے کہ پاکستان کی فوج بہت مضبوط پوزیشن میں تھی۔ انہوں نے لکھا کہ '' پاکستان میں عظیم اہمیت والے اتحادی بننے کی زبردست صلاحیت موجود ہے اور فوجی نقطۂ نظر سے اس کے پاس ایسی تربیت یافتہ فوج ہے جو ہمارے کسی اور دوست ملک حتیٰ کہ ترکی کے پاس بھی نہیں......''۔

1956 کا دستور

بری خبروں کے باوجود پاکستان میں کچھ اچھی خبریں بھی تھیں۔ محمد علی بوگرہ کی جگہ وزیراعظم بننے والے سابق بیوروکریٹ چودھری محمد علی کی زیر قیادت نئی آئین ساز اسمبلی نے بالآخر آئین تیار کرلیا جو 23 مارچ 1956ء کو نافذ کر دیا گیا۔ ملک کو 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے ٹھیک 16 سال بعد آئین نصیب ہوا۔ اس طرح پاکستان مزید برطانوی کالونی باقی نہ رہا۔ 1956ء کے آئین میں پاکستان کو ''اسلامی جمہوریہ'' قرار دے دیا گیا۔ ملک کا نظام پارلیمانی طرز کا ہوگا جس میں سربراہ حکومت عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے والا وزیراعظم بنے گا جبکہ سربراہ مملکت صدر ہوگا جسے پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں منتخب کریں گی۔ دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ قائم کرنے کی منظوری دی گئی۔ اردو اور بنگالی دونوں قومی زبانیں قرار دی گئیں۔ پاکستان کے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی۔ کچھ اسلامی دفعات آئین میں شامل کی گئیں۔ مثال کے طور پر ملک کا آئینی سربراہ مسلمان ہوگا۔ تمام قوانین قرآن وسنت کے تابع ہوں گے اور ایسے قوانین نہیں بنائے جائیں گے جو اسلام سے متصادم ہوں گے۔ مسلمان معاشرے کو حقیقی اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کیلئے صدر مملکت ایک ایسا ادارہ قائم کریں گے جو اس حوالے سے سفارشات مرتب کرے گا۔ (آئین پاکستان 1956)۔

اسی جشن ومسرت کے ماحول میں سکندر مرزا پاکستان کے صدر بن گئے جبکہ چودھری محمد علی بدستور وزیراعظم رہے تاہم ان کی حکومت تھوڑا عرصہ ہی برقرار رہی۔ اس کے ساتھ گویا وزرائے اعظم کی لائن لگ گئی۔ چودھری محمد علی کے بعد حسین شہید سہروردی، ابراہیم اسماعیل چندریگر اور فیروز خان نون کی باری آئی۔ صوبوں میں بھی صورتحال ایسی ہی دگرگوں تھی۔ یوں کہہ لیں کہ سیاسی عدم استحکام اور پاکستان ہم مترادف بن گئے۔

صوبائی مسائل اور قلات کی پاکستان سے الگ ہونے کی کوشش

پاکستان بننے کے تقریباً فوراً بعد بنگالی، بلوچی، پختون اور سندھی سیاستدانوں کے درمیان مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا، ستم ظریفی دیکھیں کہ آزادی سے پہلے کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ مذاکرات میں مسلم لیگ نے پاکستان میں ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن قائم کرنے کی بات کی لیکن

جب پاکستان بن گیا تو اندرونی اور خارجی حالات اس نوعیت کے تھے جو مضبوط مرکز قائم کرنے کے متقاضی تھے۔ تاریخی اعتبار سے پاکستان میں اقتدار کا ڈھانچہ پنجاب پر استوار تھا جہاں سے مسلح افواج کا بڑا حصہ بھرتی ہوتا تھا۔ طاقتور سول سروسز میں البتہ اردو بولنے والے مہاجرین کا غلبہ تھا۔ اس کے بعد پنجابی اور پھر پختون بیوروکریٹ تھے۔ بہرحال مرکز میں پنجابیوں اور اردو بولنے والوں کا اتحاد محسوس کر کے تنہائی کا شکار ہونے والے صوبوں اور قوم پرستوں میں علیحدگی کے جذبات پروان چڑھنے لگے۔ اس حوالے سے خان آف قلات کی علیحدہ ہونے کی کوشش سے زیادہ ڈرامائی کوئی اور مثال نہیں۔ جس نے پاکستان کی دگرگوں صورتحال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پھر 1958ء میں دوبارہ کوشش کی۔ ایوب خان کے مطابق ایسے حالات سے مسلح افواج میں سخت مایوسی پھیلنے لگی۔ اپنی کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''فوج اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات سے لاتعلق نہیں رہ سکتی تھی نہ ہی اس بات سے دھوکہ دیا جا سکتا تھا کہ افسر اور جوان زندگی کے ہر شعبے میں سیاسی ریشہ دوانیوں، کرپشن، نااہلی اور دھوکہ دہی پر ردعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ ان کے رشتہ دار تھے، وہ اخبارات پڑھتے تھے اور کچھ کے رابطے تھے۔ ایک محبّ وطن اور قوم پرست فوج کے طور پر وہ ملک کے عوام کی سوچوں کا خیال رکھنے کے پابند تھے''۔ (ایوب خان2006:75)

باب 6

فوج کا اقتدار پر پہلا قبضہ

1951ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے قتل سے پاکستان کی سیاست روبہ زوال ہونے لگی۔ 1951ء کے بعد سے جب امریکہ کی فوجی امداد آنا شروع ہوئی تو فوجی اسٹیبلشمنٹ ملک کا سب سے طاقتور ادارہ بن گئی اور اس نے فیصلہ سازی کے عمل بالخصوص دفاع اور خارجہ پالیسی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ (عائشہ صدیقہ 2007ء:71)۔ اس تناظر میں وہ مجموعی بجٹ کا ایک چوتھائی استعمال کرنے لگی جیسا کہ امریکی انٹیلی جنس رپورٹ میں نشاندہی کی گئی۔

فوجی بغاوت کے آثار

بہرحال مشرقی پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے حکومتی اور اپوزیشن ارکان کے درمیان 21 ستمبر 1958ء کو کھینچا تانی شروع ہوگئی اور 2 روز بعد یہ ارکان گھتم گھتا بھی ہو گئے۔ ایک دوسرے پر کرسیاں، مائیکروفون، میز اور آہنی راڈ مارے گئے۔ اس جھگڑے کے دوران ڈپٹی سپیکر شاہد علی بری طرح زخمی ہو گئے اور بعد ازاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔ اس سے پہلے مئی 1958ء میں ری پبلکن پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر خان صاحب کو لاہور میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس صورتحال کو پاکستانی ماہر سیاسیات خالد بن سعید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''پاکستان کی صورتحال گویا ہوبز Hobbes کیفیت والی ہوگئی جہاں ہر سیاستدان اور صوبائی گروہ ایک دوسرے کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ یہ اقتدار کیلئے نہ ختم ہونے والی اور بے رحم کشمکش تھی۔ اکثر لیڈر اپنے، اپنے

خاندان اور مخصوص صوبائی قومیت کیلئے سوچتے تھے اور پاکستان کیلئے کبھی کچھ نہ سوچتے۔ پاکستان کو اپنے مرض کے علاج کی شدت سے ضرورت تھی''۔(18 جنوری 2009ء)۔

یہی وہ حالات تھے جن میں فوجی بغاوت کی راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔ 7 اکتوبر 1958ء کو رات 8 بجے سکندر مرزا نے پاکستان کا آئین معطل کر کے پورے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا اور مرکزی، صوبائی حکومتیں اور قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں برخواست کر دیں۔ انہوں نے جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔(ایضا: صفحہ 86)۔ چنانچہ ایوب خان نے سکندر مرزا کی منظوری سے 7 اور 8 اکتوبر کی درمیانی شب کو مارشل لا نافذ کر دیا۔

جنرل ایوب خان کا دعویٰ ہے کہ یہ بغاوت زیادہ تیاری اور منصوبہ بندی کے بغیر کی گئی۔ صرف دارالحکومت کراچی کے چند اہم مقامات پر چند فوجی دستے بھیجے گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایسی صورتحال سے نمٹنے کیلئے فوج کے پاس ہمیشہ ایک بنیادی پلان اور حکمت عملی ہوتی ہے۔ تمام فوجی کمانڈروں کو اس کارروائی کے بارے میں آگاہ کیا جا چکا تھا اور کسی بھی ناگہانی صورتحال سے نمٹنے کیلئے ڈیوٹیاں لگا دی گئیں۔ فوج کو زیادہ مزاحمت کی توقع نہیں تھی کیونکہ ''عوام ملک کی صورتحال سے قطعاً تنگ آ چکے تھے اور تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اور ان کے دل میں فوج کیلئے بھی نہایت احترام تھا''۔(ایوب خان 2006ء:90)۔ یہ بات کافی حد تک ٹھیک بھی تھی، عوام نے کسی بھی سطح پر مایوسی یا عدم اطمینان کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ پرسکون نظر آ رہے تھے۔ بظاہر کچھ فوجی جنرل سیاست میں فوج کو ملوث کرنے کے مخالف تھے لیکن انہیں بتایا گیا کہ ملک کو ''جگانے'' کی ضرورت ہے۔(نواز 2008ء:145)۔

پہلی فوجی بغاوت

حسن عسکری دعویٰ کرتے ہیں کہ جنرل ایوب خان کم از کم 1957 سے ایسی فوجی بغاوت کے امکانات سوچ رہے تھے جب انہوں نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل امراؤ خان نے ان کی ملاقات مختلف طبقوں کی سیاسی شخصیات سے کرانے کا اہتمام کیا جنہوں نے ملک کی گمبھیر سیاسی صورتحال پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے جواب

میں ایوب خان نے کہا کہ: ''اگر لوگ مجھے چاہتے ہیں تو میں اپنے فرض سے پہلو تہی نہیں کروں گا''۔(رضوی 2009ء:82)۔اس کا ایک اور اشارہ صحافیوں سے ایوب خان کی گفتگو سے ملتا ہے جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ بحثیت کمانڈر انچیف بیرونی جارحیت کا کیا مقابلہ کریں گے جبکہ اندرونی صورتحال مایوس کن ہے۔تو انہوں نے مبینہ طور پر کہا کہ: ''ملک کے دفاع کے بارے میں فکر نہ کریں، یہ میرا کام ہے۔اصل توجہ اپنے سیاسی لیڈروں پر دیں جو ملک کی سلمیت میں رخنہ ڈال رہے ہیں۔بیرونی خطرات کی بات نہ کریں۔اصل خطرہ ملک کے اندر سے ہے۔کیا آپ کو نظر نہیں آتا؟''۔(ایضاً:83-82)۔

بیرونی ہلچل

کچھ محققین اس بات سے متفق نہیں کہ فوج نے خالصتاً اندرونی وجوہات کی بنا پر اقتدار پر قبضہ کیا۔شجاع نواز نے دعویٰ کیا ہے کہ صدر سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کافی عرصے سے مارشل لا کا سوچ رہے تھے اور اپنے خیالات میں امریکیوں کو بھی شریک کر رہے تھے۔(نواز 2008 :139)۔اس کی وجہ خارجی بھی تھی۔جمال عبدالناصر نے عرب دنیا میں بائیں بازو کی حامل بنیاد پرستی متعارف کرائی، عراقی فوج میں 1958ء میں ہاشمی حکومت کے مغرب نواز رویے کے خلاف خونیں بغاوت اس رجحان کی طرف اشارہ کرتی تھی۔پاکستان میں 1958 کے دوسرے نصف میں طلبا اور ورکر سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔1959ء میں انتخابات متوقع تھے لیکن 1954 میں مشرقی پاکستان کے انتخابی نتائج کے بعد مغرب نواز اشرافیہ پریشان تھی کہ یہی صورتحال مغربی پاکستان میں بھی نہ ہو۔مسلم لیگ ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی اور علیحدگی پسند تحریکیں بھی کافی متحرک تھیں۔ان حالات کے باوجود امریکیوں کو ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ فوج کا اقتدار میں آنا امریکہ کے مفاد کیلئے بہترین ہے چنانچہ انہوں نے سویلین حکومت برقرار رکھنے کو ترجیح دی۔ (عائشہ جلال 1991:76-273)۔

ایوب خان نے 7 اکتوبر 1958ء کو فوجی بغاوت کو ان الفاظ میں جائز قرار دیا ہے:

''فوج اپنے اردگرد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور یہ

بھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ افسر اور فوجی جوان ہر قسم کی سیاسی ریشہ دوانیاں، کرپشن، دھوکہ دہی اور زندگی کے ہر شعبے میں نا اہلی پر ردعمل ظاہر نہ کریں...... ایک انتہائی منظم، تربیت یافتہ اور نظم وضبط والی فوج سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کو انتہائی برا سمجھتی لیکن جیسے حالات تھے ان میں صرف فوج ہی واحد طاقت کے طور پر حالات کو معمول پر لا سکتی تھی''۔ (خان 2006ء:75)

پاکستان ٹائمز اور امروز لاہور جیسے بائیں بازو اور مشرقی پاکستان کے چند بنگالی اخبارات کو چھوڑ کر مجموعی طور پر پاکستانی پریس نے فوج کے اقتدار سنبھالنے پر مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ امریکی اور برطانوی پریس نے بغاوت کے حق میں اداریے لکھے۔ کراچی کے مؤقر اخبار ''ڈان'' نے بغاوت کے چند روز بعد ''ایک قابل فہم انقلاب'' کے عنوان سے فوجی مداخلت کی زبردست الفاظ میں تائید کی۔

''دنیا میں کئی قسم کے انقلابات رونما ہوئے......لیکن ہمارے ہاں برپا ہونے والا انقلاب مختلف نوعیت کا ہے۔ کسی تلخی اور تردد کے بغیر نظام اور حکومت میں مکمل تبدیلی عمل میں لائی گئی اور شہریوں کی زندگی میں بھی کوئی خلل نہیں پڑا...... یہ منفرد اقدام شاید تاریخ میں عقل و دانائی، انسانیت اور حب الوطنی کی روشن دلیل کے طور پر دیکھا جائے گا''۔ (رائے 2004: 105)۔

سکندر مرزا کی اقتدار سے بے دخلی

البتہ مارشل لا لگنے کے فوراً بعد سکندر مرزا کے دل میں ایوب خان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے کیونکہ فوجی دستے ایوان صدر اور دیگر اہم سرکاری عمارتوں پر تعینات کر دیے گئے۔ ایوب خان بتاتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے دورے میں جہاں انہوں نے بڑے عوامی اجتماع سے خطاب کیا کے بعد واپسی پر افسروں نے انہیں بتایا کہ سکندر مرزا فوج کی ان سے بطور صدر وفاداری کا امتحان لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مبینہ طور پر سکندر مرزا نے ائیر کموڈور رب کو جنرل یحییٰ خان، جنرل شیر بہادر اور جنرل حمید جیسے ایوب خان کے قریبی جنرلوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم

ملنے پر ائیر کموڈور رب نے سکندر مرزا سے ملاقات کی درخواست کی تا کہ یہ حکم تحریری طور پر حاصل کیا جا سکے۔اس دوران جب جنرل ایوب مشرقی پاکستان سے واپس آئے اور انہیں سکندر مرزا کے عزائم کا علم ہوا تو انہوں نے قانونی ماہرین سے مشاورت کی جنہوں نے بتایا کہ مارشل لا کے نفاذ، اسمبلیوں کی تحلیل اور حکومت کی برطرفی کے بعد صدارت کا عہدہ بے کار ہو چکا ہے۔

چند روز بعد ایوب خان کو ان کے کمانڈروں نے بتایا کہ سکندر مرزا مزید قابل برداشت نہیں رہے کیونکہ انہوں نے فوج کے ہی چند افسروں سے ڈیل کیلئے رابطہ کیا تھا۔ایوب خان دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ عوام میں یہ تاثر جڑ پکڑ رہا تھا کہ سکندر مرزا ماضی کی باقیات تھے اور ان کے وجود سے پاکستان کے آغاز نو کے انقلاب کے اقدام پر حرف آ رہا تھا۔اس قسم کے چند مزید واقعات سامنے آنے کے بعد جنرل ایوب نے فیصلہ کیا کہ وہ جنرل برکی، جنرل اعظم اور جنرل خالد شیخ کو سکندر مرزا کے پاس بھیجیں تا کہ انہیں استعفیٰ دینے پر قائل کیا جا سکے۔سکندر مرزا نے جب محسوس کیا کہ وہ ایک ناممکن صورتحال کا شکار ہو چکے ہیں تو وہ لندن چلے گئے۔(رضوی:4-90)

ڈان نے اس نئی پیشرفت کی تعریف ان الفاظ میں کی:

''یہ اقدام ملک کے بہترین مفاد میں کیا گیا۔جس سے اعلیٰ ترین سطح پر منقسم اتھارٹی کا امکان ختم ہو گیا ہے......اس بات میں بہت کم شبہ رہ گیا ہے کہ سیاستدانوں کے غلط رویے سے پاکستان کو گھن کی طرح چاٹنے والی قوت اب دام میں لائی جا چکی ہے۔صدر ایوب خان نے خدا خوفی کی بات کی ہے اور عوام کے ذہن میں پایا جانے والا خوف نکالنے کا عزم کیا ہے...... یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ صدر ایوب ان روحانی اقدار سے بہت قریبی حد تک جڑے ہیں اور بار بار اللہ کا ذکر کرتے ہیں''۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ محمد علی جناح کی ہمشیر اور بعد ازاں 65-1964 میں صدارتی انتخابات میں اپوزیشن کی مشترکہ صدارتی امیدوار نے بھی انہی جذبات کا اظہار کیا۔

''جنرل ایوب کی قیادت میں نیا دور شروع ہو گیا ہے اور مسلح افواج نے انتظامی خرابیوں اور سماج دشمن برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔تا کہ اعتماد، تحفظ اور استحکام کی فضا پیدا ہو اور ملک بالآخر معمول کی

صورتحال کی طرف لوٹ سکے۔ مجھے امید ہے اور میں دعا گو ہوں کہ خدا
انہیں ان کے مقصد کے حصول میں کامیابی کی طاقت اور دانشمندی سے
نوازے''۔(زائرنگ کے بقول 1971ء:10)۔

اصغر خان سمجھتے ہیں کہ اس تبدیلی پر امریکہ نے بھی نہ چاہتے ہوئے مثبت ردعمل ظاہر کیا:

''سکندر مرزا اس وقت ایوب خان سے زیادہ امریکہ کے قریب تھے۔حقیقت تو یہ ہے کہ سکندر مرزا کی امریکی نوازی سے خود اکثر امریکی بھی شرمسار ہو جاتے تھے۔وہ ایوب خان سے کئی گنا زائد یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی منزل مغرب سے جڑی ہوئی ہے چنانچہ وہ خود کو امریکہ کا گہرا اتحادی محسوس کرتے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔سکندر مرزا پاکستان اور امریکہ کے مفادات میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔امریکہ کو درکار ہر قسم کی معلومات اور سہولت جو ان کے بس میں ہوتی فوراً مہیا کر دی جاتیں۔ایوب خان بھی ان کے پیروکار تھے اور جیسے ہی ان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد صورتحال واضح ہوئی تو واشنگٹن نے یقیناً ایوب خان کو ان کے پیشرو پر ترجیح دی اور ایوب خان کو جلد ہی امریکہ کا اعتماد اور بتدریج بڑھتی ہوئی حمایت ملنے لگی''۔(2005ء:18-17)۔

مارشل لا

اب بات کی تحسین کرنا مشکل نہیں کہ ایک بدعنوان، نااہل، منقسم اور غیر نمائندہ سویلین حکومت سے اقتدار فوج کو منتقل ہونے کے عمل یعنی مارشل لا کے دوران ایک بھی گولی چلائے بغیر مقصد حاصل کر لیا گیا اور اس کی معاشرے کے اکثریتی حصے نے حمایت بھی کی۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں فوج تعینات کر دی گئی لیکن ایوب خان نے امور حکومت سول انتظامیہ کے ذریعے چلانے کا ہی فیصلہ کیا۔ایک صدارتی کابینہ تشکیل دی گئی جس میں 3 جنرل اور ذوالفقار علی بھٹو سمیت کئی سویلین وزراء شامل تھے۔بھٹو بعد ازاں ان کی حکومت کے خاتمے کی بڑی وجہ ثابت ہوئے۔آرمی، نیوی اور ائیر فورس کے سربراہان ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے جبکہ ایوب خان خود چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر بن گئے۔انہوں نے خود کو فیلڈ مارشل کے عہدے پر ترقی بھی دے دی۔البتہ سول سرونٹس کو ہر سطح پر شریک کیا گیا۔اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ جب تک ملک کا نیا دستور نہیں بنتا اس وقت تک معطل ہونے والے آئین کو مارشل لا قوانین سے ہم آہنگ کر کے کام

چلایا جائے گا۔ سپریم کورٹ اور تمام صوبائی ہائی کورٹس بدستور فعال رہیں تاہم بنیادی حقوق معطل رہے۔ (رضوی2009ء:91-88)۔ ایوب خان کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ انہوں نے سیاسی، تعلیم اور قانونی معاملات پر پالیسی سازی کے لئے ماہرین کی کمیٹیاں تشکیل دیں۔ جب نئی حکومت نے محسوس کیا کہ فوج کی کمانڈ میں سول انتظامیہ احسن طریقے سے کام کر رہی ہے تو نومبر 1958 میں فوجی دستے واپس بلا لئے گئے۔

اقتدار پر گرفت مستحکم کرنے کے بعد حکومت نے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ریاست اور معاشرے کے کئی طبقات میں کرپشن کا خاتمہ کرنے کیلئے کئی ایک اقدامات کئے گئے۔ مجموعی طور پر 1962 میں حکومتی ملازمین کو برطرفی، جبری ریٹائرمنٹ، تنزلی اور کچھ اور سزائیں دی گئیں۔ سیاستدانوں میں پھیلتی کرپشن اور دھڑے بندی کے سدباب کے لئے کئی افراد پر پبلک آفس ڈس کوالیفکیشن آرڈر (PODO) اور ایبڈو (EBDO) کے تحت مقدمات چلائے گئے اور انہیں 15 سال تک عوامی عہدوں کیلئے نااہل قرار دے دیا گیا۔ یہ مقدمات 2 ججوں پر مشتمل خصوصی ٹربیونلز میں چلائے گئے جن میں سے ایک کم از کم ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا جج تھا۔ اس طرح 1600 افراد کو عوامی عہدوں کیلئے نااہل قرار دیا گیا۔ (رضوی2009:102-100)۔ بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی کرنے والوں سے سختی کے ساتھ نمٹا گیا اور کچھ کو گرفتار کر کے سزائیں دی گئیں۔

اصلاحات......ا

اپنی سیاسی خودنوشت فرینڈز ناٹ ماسٹرز (2006ء)۔ (اردو ترجمہ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی) میں ایوب خان نے انکشاف کیا کہ انہوں نے پاکستان میں اصلاح کی ضرورت اکتوبر 1954ء میں محسوس کی جب انہوں نے امریکہ جاتے ہوئے لندن میں قیام کیا وہاں ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ پاکستان صرف اس صورت میں ممتاز ملک بن سکتا ہے اگر ''شروع میں ہی ایک ایسا دستور تشکیل دیا جائے جو عوام کی امنگوں کے عین مطابق ہو اور ان کے مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہو تا کہ وہ اتحاد، ٹیم ورک اور تخلیقی ترقی کی راہ پر گامزن ہوں''۔ (2006ء:210)۔ اس کے بعد انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی نسلی، لسانی، ہیئت کا فرق جانچنا اور موازنہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بنگالی ہندوستان کی قدیم نسلوں کے

جانشین ہیں اور محکوم قوم کے طور پر ان کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس نے انہیں شکوک وشبہات سے بھرپور، لاتعلق اور جارحانہ بنا دیا۔ دوسری طرف مغربی پاکستان میں مقیم قومیں بیرونی حملوں اور فتوحات کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ یہ اگرچہ مختلف زبانیں بولنے والوں کا ملغوبہ ہیں تاہم خیالات، ثقافت اور سوچ کی ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ (ایضاً:210)۔ اگرچہ ایوب خان نے برملا یہ نہیں کہا کہ مؤخرالذکر زیادہ بہتر حکمران تھے لیکن انہوں نے جو دلیل دی ہے وہ کافی حد تک یہی لگتی ہے۔ لیکن بظاہر دونوں حصوں کے پاکستانیوں کے درمیان موازنے کا مقصد ایسا فریم ورک تیار کرنا تھا جس سے ان میں اشتراک کار کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ چنانچہ انہوں نے برابری کے اصول کی حمایت کی اور مغربی پاکستان کے صوبوں کو ملا کر ایک یونٹ بنا دیا۔

جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے تو ایوب نے یہ تاثرات بیان کئے:

> ''اس بات پر زور دینا مناسب ہو گا کہ ہمارا یقینی مقصد پاکستان میں جمہوریت کا فروغ ہونا چاہیئے لیکن یہ اس طرح کی ہو جو ہمارے عوام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہو۔ ہمارے زیادہ تر لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں اور ہمارے سیاستدان بھی زیادہ تر بددیانت ہیں۔ ہمارے عوام بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن انہیں آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ بے لگام جمہوریت گویا زیادہ مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ بالخصوص آج کے دور میں جب ہمارے ملک کے اندر اور باہر سے کمیونزم اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے درپے ہے۔ لہذا ہماری جمہوریت کنٹرولڈ ہونا چاہیئے جس پر گہری نظر ہونی چاہیئے''۔ (ایضاً:212)۔

یہ سوچ لاسویل کے مشاہدے کے عین مطابق ہے کہ تشدد کے ماہرین خود کو قومی مفادات اور سیاسی نظام کا نگہبان قرار دیں گے تاکہ عوام کو کنٹرول کر سکیں۔ ایوب خان نے بھی کمیونزم کے اندرونی اور بیرونی فرضی خطرے کا نام استعمال کیا تاکہ ایسی جمہوریت کا جواز گھڑا جا سکے جو ریاست کنٹرول کرے۔

اصلاحات......II

ایسے عزائم کی روشنی میں فوج نے ایک منظّم پروگرام کے تحت معاشی، تعلیمی اور قانونی شعبوں میں اصلاحات کا کام شروع کیا۔ 1958 سے 1962 کے درمیان مارشل لا کے تحت خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایوب خان نے متعدد اصلاحات کا آغاز کیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ پاکستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی شعبے میں پسماندگی کا ذمہ دار جاگیردار طبقہ تھا چنانچہ انہوں نے مغربی پاکستان میں ایک شخص کے لئے آباد زرعی رقبہ 500 ایکڑ اور غیر آباد رقبہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ایکڑ مقرر کرنے کی حد قائم کر دی۔ حکومت نے دعویٰ کیا کہ ان اصلاحات کے نتیجے میں جاگیر 20 لاکھ ایکڑ رقبے سے دستبردار ہو گئے اور یہ اراضی کسانوں میں تقسیم کر دی گئی۔ مشرقی پاکستان میں جہاں زرعی اصلاحات کا عمل پہلے ہی سے جاری تھا وہاں ایک آدمی کیلئے 33 سے 120 ایکڑ زرعی اراضی کی حد مقرر کی گئی۔ (خان 2006ء:110)۔ ان مختلف خیالات کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے رقبوں کے مالک بڑا کاشتکار طبقہ پیدا کرنے کی بجائے مضبوط اپر مڈل کلاس کو مستحکم کیا جائے۔ ایسے اقدامات سے سبز انقلاب کی راہ ہموار ہوئی۔ جس سے غذائی اجناس اور کپاس جیسی کمرشل فصلوں کی پیداوار بڑھی۔ (زائرنگ 1971: 87)۔ ترقیاتی منصوبوں میں فوجی افسروں کو زمینیں الاٹ کی گئیں جس سے ایک طرف نئے بیراج تعمیر کئے گئے تو دوسری طرف سندھ میں فوج مخالف اور پنجابی مخالف جذبات نے بھی جنم لیا۔ ون یونٹ سکیم جس کے تحت مختلف صوبوں کو یکجا کر کے مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بنایا گیا کا دارالحکومت لاہور مقرر کیا گیا جس سے یہ الزام سامنے آیا کہ اس اقدام سے پنجابیوں کو سندھ میں زمینوں پر قبضے کا موقع ملے گا۔

اقتصادی اور صنعتی پالیسیاں

جنرل ایوب خان نے ایک صنعتی پالیسی بھی اختیار کی جس میں صنعتکاروں اور برآمد کنندگان کو ٹیکسوں میں فراخدلانہ مراعات دی گئیں۔ صنعتی مشینری اور خام مال کی درآمد کے لئے زرمبادلہ تک رسائی کے لئے بونس واؤچر کی سہولت دی گئی۔ کم ترقی یافتہ علاقوں میں سرمایہ کاری کیلئے ٹیکسوں میں چھوٹ دی گئی۔ (نیروپ 1984ء:46)۔ ان اقدامات سے پنجاب میں انڈسٹری لانے میں نہایت مدد ملی اور صوبے میں چھوٹے صنعتکاروں کا ایک نیا طبقہ ابھر کر سامنے آیا۔ اس

سے پہلے تک صرف کراچی ہی اسماعیلیوں، میمنوں اور بوہروں جیسے غیر پنجابی سرمایہ کاروں کی سرمایہ کاری سے مستفید ہو رہا تھا۔ انڈسٹرلائزیشن کے تنوع کے عمل سے ایوب فیملی اور ان کے دیگر رشتہ داروں کو خوب فائدہ پہنچا۔ اقتصادی اصلاحات کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ سرمایہ دارانہ فریم ورک کے اندر ترقی اور جدت کا عمل آگے بڑھایا جائے...... درآمدات کی پالیسی میں تبدیلی کے طور پر ہلکی صارف صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ایسے اقدامات کافی کامیاب ثابت ہوئے اور چند ہی برسوں میں پاکستان کا نام سرمایہ دارانہ تبدیلی کے ماڈل کے طور پر لیا جانے لگا۔ (زائرنگ 1971ء:86-88)۔

ہارورڈ کے سکالر اور عالمی بنک کے مشیر گستاف پاپانک نے نشاندہی کی کہ صارفین کی اوسط حالت میں 1960ء کے عشرے میں بہتری آئی لیکن دولت بدنام زمانہ 22 خاندانوں میں مرتکز ہونے لگی۔ اس کا چرچا پاکستانی سیاسی اور دانشور طبقے میں ہونے لگا۔ اس ثمرات جلد نیچے تک منتقل ہوں گے کو عوام میں زیادہ پذیرائی نہ ملی۔ لارنس زائرنگ قرار دیتے ہیں کہ پاکستانی عوام میں بے انتہا اور غلیظ غربت کے سائے میں نئی اشرافیہ دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنے لگی۔ (1971ء:89)۔

مسلم عائلی قانون میں اصلاحات

میرج اینڈ فیملی لاز کمیشن کا قیام اصل میں 1954 میں جسٹس میاں عبدالرشید کی سربراہی میں قائم کیا گیا تھا لیکن اس کمیشن کی سفارشات کا نفاذ سویلین حکومتوں نے نہیں کیا تھا۔ مسلم فیملی لاز آرڈیننس 1961 کے تحت فوجی حکومت نے اس کمیشن کی کئی سفارشات نافذ کر دیں۔ اس آرڈیننس میں لازم قرار دیا گیا کہ شادیوں اور طلاقوں کو یونین کونسل میں رجسٹر کیا جائے گا۔ دوسری شادی اور طلاق لینے کے کیس بھی یونین کونسل بھیجے جائیں گے۔ دوسری شادی کرنے والوں کو پہلی بیوی سے اجازت لینا پڑے گی اور یونین کونسل کو مطمئن کرنا پڑے گا کہ وہ مالی طور پر دوسری شادی کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔ اسی طرح طلاق کے کیس پہلے ثالثی کونسل کے پاس جائیں گے جو پہلے مصالحت کی کوشش کرے گی۔ لڑکیوں کی شادی کیلئے کم سے کم عمر 16 سال مقرر کی گئی۔ ایک اور اہم اصلاح یہ کی گئی کہ پوتے اب دادا کی جائیداد میں وراثت کے حقدار ٹھہرائے گئے۔

چاہے والد فوت بھی ہو گیا ہو۔ اس سے پہلے سنی فقہ کے مطابق دادا کی جائیداد مرحوم بیٹے کے رشتہ داروں کو منتقل ہوتی تھی اور بیٹے کے بچوں کو اس جائیداد میں حصّہ نہیں ملتا تھا جو زندگی میں اسے ملتی تھی۔ (رضوی 2000ء: 103)۔

کچھ علما نے اس آرڈیننس کی مخالفت کی لیکن حکومت اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی۔ کئی سال بعد جب ایوب حکومت کی اقتدار پر گرفت کمزور ہونے لگی تو مسلم فیملی لا آرڈیننس کے خلاف دائیں بازو کی اسلامی جماعتوں کی مخالفت پھر سر اٹھانے لگی۔ بہرحال اس کے بعد آنے والی تمام حکومتوں بشمول ضیاالحق کی اسلام پسند حکومت نے مختلف تنازعات کے باوجود یہ آرڈیننس بحال رکھا۔ (رضوی 1977ء: 88)۔

بنیادی جمہوریتیں

دیگر تمام اصلاحات میں سب سے اہم "بنیادی جمہوریتیں" کے نام سے سیاسی نظام تھا۔ ایوب خان پارلیمانی جمہوریت کو پاکستان کیلئے موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ انکا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عوام کو اپنے نمائندے مقامی سطح پر منتخب کرنے چاہیئں۔ جو بعد میں الیکٹورل کالج بنائیں گے جو چیف ایگزیکٹو کا انتخاب کرے گا۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی پاکستان سے 40، 40 ہزار Basic Democrats منتخب کر لئے گئے جو فیصلہ سازی کیلئے نچلی سطح کی نمائندگی کرتے تھے۔ سب سے نچلا یونٹ یونین کونسل تھا۔ ہر یونین کونسل 10 براہ راست منتخب اور 5 نامزد ارکان پر مشتمل ہوتی تھی اور ان سب کو بی ڈی ممبر کہا جاتا تھا۔ یونین کونسل مقامی کمیونٹی کی ترقی اور اور امن وامان برقرار رکھنے کی ذمہ دار تھی۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ (تحصیل)، ڈسٹرکٹ اور ڈویژنل سطح پر ادارے قائم کئے گئے۔ ان سب کے پاس مختلف ترقیاتی اور تعلیمی امور کی ذمہ داری تھی۔ (خان 2006ء: 35-232)۔ گویا یہ ایک قسم کی مخروطی شکل تھی جس میں یونین کونسل سب سے نیچے اور ڈویژنل کونسل سب سے اوپر تھی۔ سب سے زیادہ اہم یونین کونسلیں تھیں جن کے 80 ہزار بی ڈی ارکان کو صدر کے انتخاب کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 1960ء میں انہی ممبروں نے ایوب خان کو صدر منتخب کر لیا۔ (نیروپ: 1984: 7-46)

1962 کا آئین

پاکستان کو دوسرا آئین ایوب خان سے ملا جوان کے سیاسی نظام کے اپنے ویژن سے ہم آہنگ اور پاکستانی عوام کی سوچ کیلئے موزوں ہو...... یہ وہ تصور تھا جس پر وہ بڑے زور شور سے زور دیتے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے اسلام اور پاکستان کی بجائے ریاست اور مذہب کی اپنی سوچ کو پروان چڑھایا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ صرف قرآن اور حضرت محمدؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ کے دور کی مثالیں آئین کی بنیاد کے طور پر کافی نہیں البتہ ان کا یقین تھا کہ ان سے ذمہ دار اور اچھی حکومت کیلئے مدد ضرور لی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ایسے علما کو شدید ہدف تنقید بنایا جنہوں نے اس بنیاد پر پاکستان کی مخالفت کی تھی کہ یہ ایک سیکولر ملک ہوگا۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ ایسے علما دراصل ریاستی امور چلانے میں اپنا مرکزی کردار چاہتے تھے۔ علما اور ان کی نظریات پرستی پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ آج کے دور کی تعلیمیافتہ اشرافیہ اپنی اسلامی جڑوں سے دور ہوگئی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلامی نظام حکومت بادشاہت اور موروثی حکمرانی کی اجازت نہیں دیتا۔ ایوب خان کے مطابق:

> ''سوسائٹی کو مجموعی طور پر اپنا حکمران چننے اور ہٹانے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ اسلامی معاشرے کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ اگر ایک بار سربراہ حکومت منتخب کرلیا جاتا ہے تو پھر اسے امور حکومت چلانے اور نگرانی کرنے کے کافی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اختیارات کی منتقلی کی اجازت ہوتی ہے لیکن مرکزی اختیار بدستور منتخب حکمران کے ہاتھ میں ہی رہنا چاہیئے۔ تا کہ وہ ملک اور انتظامیہ کی نگرانی کر سکے''۔ (2006ء:229)۔

اس کے بعد ایوب خان نے پارلیمانی نظام کو تقسیم کرنے اور ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچانے والا قرار دیا کیونکہ پارلیمنٹ میں اکثریت تبدیل ہوتی رہی اور حکومتیں گرنے کا باعث بنتی رہی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''اس نظام کی وجہ سے ہم نے ماضی میں کافی خمیازہ بھگتا اور اب دوبارہ اس غلطی کا اعادہ کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ متبادل طرز حکومت جو ہماری ضروریات پر پورا اترتا ہے وہ صدارتی نظام ہے''۔ (ایضاً:230)۔

چنانچہ 1962ء کا آئین صدارتی تھا جس میں صدر کو بالواسطہ طور پر 80 ہزار بی ڈی ممبروں کو منتخب کرنا تھا۔ شروع میں آئین میں پاکستان کو ''عوامی جمہوریہ پاکستان'' قرار دیا گیا لیکن علما اور دیگر قدامت پسند طبقوں کے احتجاج پر اسے دوبارہ ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کا نام دے دیا گیا۔ چنانچہ پہلی ترمیم میں غیر مقبول اصطلاح پھر آئین میں شامل کر لی گئی۔ آئین کے تحت صدر کا مسلمان ہونا ضروری تھا۔ قرآن اور سنت سے تصادم تمام قوانین کی نشاندہی کے لئے مشاورتی کونسل برائے اسلامی نظریہ اور اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایوب خان نے 1962ء کا آئین نافذ العمل ہونے کے بعد اپنے مطلق اختیارات ختم ہونے پر دوبارہ یہ اختیارات مانگ لئے۔ صدر کے پاس آرڈیننسوں کے اجراء، ریفرنڈم کی اپیل کرنے کا حق، مواخذے سے استثنیٰ، بجٹ پر کنٹرول اور ایمرجنسی کے ذریعے شہری حقوق معطل کرنے کے اہم اختیارات تھے۔ دوسری جانب بنیادی حقوق کو قابل انصاف قرار دیا گیا۔ عدالتوں نے انفرادی طور پر شہریوں کے حقوق کے تحفظ کا کام جاری رکھا لیکن یہ واضح کیا گیا کہ عدالتیں زمینی اصلاحات اور عائلی قوانین پر اپنے سابق فیصلوں کے خلاف کارروائی نہیں کریں گی۔ 1962ء کے آخر میں سیاسی جماعتوں کو ایک بار پھر قانونی حیثیت دی گئی۔ (نیروپ 1984ء:48)۔ ایوب خان نے پرانی مسلم لیگ کے دھڑے جمع کر کے نئی کنونشن مسلم لیگ قائم کی اور اسے سرکاری پارٹی قرار دے دیا۔

ماہر سیاسیات سیموئل پی ہنٹنگٹن نے ایوب خان کی اصلاحات پر تعریفوں کے پل باندھے ہیں۔ بالخصوص انہوں نے بنیادی جمہوریتوں اور طاقتور صدارت کو ملک میں مضبوط صدر کیلئے اہم عناصر قرار دیا ہے۔ ایوب خان نے سیاسی جماعتوں کے نظام کو بھی قبول کیا اور اپنی پارٹی کنونشن مسلم لیگ بھی بنائی۔ یوں انہوں نے سیاسی نظام میں جدت اور ادارہ سازی کیلئے درکار فریم ورک کی تکمیل کی...... جو ان کے بقول ملک کی ترقی کے لئے ضروری تھا اور عمومی مغربی قسم کی جمہوریت کی تقلید میں اب تک مناسب طرح فروغ نہیں پا سکی تھی۔ (1968ء:53-252)۔

1965 کے صدارتی انتخابات

صدر ایوب کے متعارف کردہ نظام کا پہلا تجربہ جنوری 1965ء کے الیکشن میں ہوا۔ چار بڑی جماعتوں نے متحدہ اپوزیشن جماعتیں (COP) کے نام سے اتحاد قائم کر لیا۔ کونسل مسلم

لیگ پنجاب اور کراچی میں انتہائی مضبوط تھی۔ عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں، نیشنل عوامی پارٹی شمال مغربی سرحد صوبے میں انتہائی مضبوط تھیں جبکہ چوتھی جماعت بنیاد پرست جماعت اسلامی تھی۔ سی او پی نے قائداعظم کی ہمشیر مادرملت فاطمہ جناح کو اپنا صدارتی امیدوار نامزد کیا۔ فاطمہ جناح سے کہا گیا کہ وہ ایوب خان کے پاکستان کو آمرانہ ملک بنانے کے اقدام کو چیلنج کریں۔ سی او پی کے 9 نکاتی ایجنڈے میں ایک نکتہ پارلیمانی جمہوریت بحال کرنے کا بھی تھا۔ ایک خاتون صدارتی امیدوار نامزد کرنا بھی مضحکہ خیز پہلو کا حامل تھا۔ جماعت اسلامی جو ملک میں اسلامی طرز حکومت چاہتی تھی اور اس نے ہمیشہ سیاست میں خواتین کے کردار کی مخالفت کی تھی اس نے بھی اس معاملے پر اپنا مؤقف تبدیل کر لیا۔ مجھے ذاتی طور پر ان دنوں جماعت اسلامی کے ایک لیڈر کی تقریر سننے کا موقع ملا جس میں انہوں نے کہا کہ جس طرح زندگی بچانے کیلئے خنزیر کا گوشت حلال ہوتا ہے اس طرح عام حالات میں خواتین کو سیاست میں اجازت نہیں دی جا سکتی لیکن غیر معمولی حالات میں ایسا کرنا جائز ہے۔

الیکشن کا نتیجہ ایوب خان کی جیت کی صورت میں نکلا۔ انہیں الیکٹورل کالج کے 63.3 فیصد ووٹ ملے۔ مغربی پاکستان میں انہیں بھاری اکثریت (73.6 فیصد) ملی جبکہ مشرقی پاکستان میں کامیابی کا تناسب 53.1 فیصد تھا۔ اپوزیشن نے دھاندلی کے بھی کچھ الزامات لگائے لیکن مجموعی طور پر یہ بات واضح تھی کہ الیکشن شفاف تھے۔ لگتا تھا کہ پاکستان کے عوام نے ایوب خان کی پالیسیوں کو سند قبولیت عطا کر دی تھی اگرچہ عوام کی اکثریت کو ان پالیسیوں سے کم ہی فائدہ پہنچا۔ بالخصوص معاشی طور پر۔ (نیروپ 1984ء:49)

پاک امریکہ تعلقات

قطع نظر اس بات کے کہ امریکی پاکستان میں کیا ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ امریکہ نے فوجی بغاوت ہونے کے بعد زیادہ گہرے اعتراضات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے امید ظاہر کی کہ پاکستان میں جلد جمہوریت بحال ہوگی۔ فوجی بغاوت زیادہ تر پاکستان کی اندرونی سیاست کا شاخسانہ تھی۔ جس نے فوج کے براہ راست اور جامع انداز میں اقتدار سنبھالنے کی راہ ہموار کر دی۔ لازمی بات ہے کہ اس طرح فوج کے گریژن سٹیٹ میں پریٹورین (Praetorian)

کردار کو مہمیز مل گئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان 1954 میں فوجی اتحاد کے ذریعے عسکری ریاست کی بنیاد پہلے ہی رکھی جا چکی تھی۔ اس کے بعد پاکستان نے سیٹو، بغداد پیکٹ اور پھر سینٹو میں شمولیت اختیار کی۔ جی ایچ کیو اور پینٹا گون میں باقاعدہ رابطے قائم ہو چکے تھے۔ افسروں کی سطح پر بھی اشتراک کار باقاعدہ طور پر جاری تھا۔ اس کی بڑی مثال ایس ایس جی کی تربیت اور مشترکہ فوجی مشقیں تھیں۔

5 مارچ 1959 کا پاک امریکہ معاہدہ

جیسا کہ گزشتہ باب میں بتایا گیا کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں روس مخالف حکمت عملی میں پاکستان کے مفید ہونے پر شکوک و شبہات ہونے لگے تھے۔ لیکن پاکستان کی جغرافیائی اہمیت امریکہ کے لئے بدستور کشش کا باعث تھی کہ وہ اپنا تعاون بڑھائے۔ ایسا لگتا ہے کہ پینٹا گون اور آئزن ہاور انتظامیہ اس بات کے قائل تھے کہ ان کی پاکستان پر اتنی گرفت ہے کہ اسے جب چاہے امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ اس کے نتیجے میں معاشی اور فوجی تعاون کو 5 مارچ 1959 کے معاہدے سے مزید گہرا کیا گیا۔ اس معاہدے کا آرٹیکل نمبر 1 نہایت اہم ہے:

> ''حکومت پاکستان جارحیت کی مزاحمت کیلئے پر عزم ہے۔ پاکستان کے خلاف کسی جارحیت کی صورت میں حکومت امریکہ اپنے آئین کے مطابق فوج کے استعمال سمیت دیگر مناسب ایکشن لے گی۔ جیسا کہ فریقین میں اتفاق رائے ہوتا ہے اور مشرق وسطیٰ میں امن و استحکام کے فروغ کے لئے دونوں کے مشترکہ عزم سے مطابقت رکھتا ہے۔ حکومت پاکستان کی درخواست پر اس کی مدد کی جائے گی''۔ (جین 2007ء:33)۔

معاہدے کی مرکزی حصے کی شق یا دفعہ میں بھارت کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ بلاشبہ امریکی کسی بھی حوالے سے ہزیمت اٹھانے پر تیار نہیں تھے چنانچہ چند ہفتے بعد 6 مئی کو وزیر دفاع نیل ایچ مک ایلرائے نے خارجہ تعلقات پر سینٹ کمیٹی کے سامنے بیان میں واضح کہا کہ اس معاہدے کا اطلاق پاکستان اور بھارت کی جنگ کی صورت میں نہیں ہو گا اور ایسی صورت میں فوجی امداد یا مداخلت کی توقع نہیں کی جانی چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ:

''لہذا پاکستان کیلئے فوجی معاونت کا مقصد اسے شمال کی طرف سے کسی جارحیت کے خلاف تیار کرنا ہے اور اس کا بھارت کے ساتھ کسی تصادم کی صورت میں کوئی تعلق نہیں...... یہ دفاع بھارت کے خلاف ہرگز نہیں...... یہ امداد صرف روس اور چین کے خلاف دی جارہی ہے۔(ایضاً:35)۔

اس بیان کا مقصد بھارت کو ٹھنڈا کرنا بھی تھا۔ امریکہ میں ڈیموکریٹ سے اقتدار ری پبلکن قیادت کو منتقل ہونے سے امریکی خارجہ پالیسی میں یہ بات پوری شد و مد کے ساتھ موجود رہی کہ جنوبی ایشیا میں پاکستان نہیں بلکہ بھارت انتہائی اہم ملک ہے۔ مجموعی تناظر میں سوویت یونین اور چین سے مقابلے کے حوالے سے یہ نہایت اہم تھا کہ بھارت بدستور مغربی طرز کی جمہوریت کا حامل ملک رہا۔ چنانچہ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ 13 مارچ 1959ء کو بھارتی وزیراعظم نے بھارتی پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا اور ارکان کو آگاہ کیا کہ:

''ہمیں امریکی حکام کی طرف سے یقین دلایا گیا ہے کہ امریکہ کے پاکستان کے ساتھ حالیہ دوطرفہ معاہدے کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ آئزن ہاور ڈاکٹرن کے تحت کمیونزم کے ممکنہ خطرے کے خلاف پاکستان کو بھی ساتھ ملایا جائے۔ امریکی حکام نے خصوصی طور پر ہمیں یقین دہانی کرائی ہے کہ اس معاہدے کو بھارت کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکے گا اور معاہدے میں کوئی خفیہ دفعات موجود نہیں''۔(جین 2007ء بی:26)۔

یہ بات یاد رکھی جائے کہ آئزن ہاور ڈاکٹرن کا مقصد مشرق وسطی کے ممالک کو اس ڈاکٹرن سے بہت پہلے کمیونزم اور سوویت یونین کے اثر ورسوخ کے خلاف تعاون فراہم کرنا تھا۔ پاکستان اصرار کرتا رہا کہ وہ اپنی فوج کے ذریعے مشرق وسطی میں مفید کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس دوران ایک واقعہ رونما ہوا جس سے روسی قیادت پاکستان سے سخت ناراض ہوگئی۔ سوویت یونین نے پشاور سے پرواز کرنے والے امریکی جاسوس طیارے یو2 کو مار گرایا۔ اس سے پہلے جولائی 1959 میں پاکستان نے امریکہ کو پشاور کے نواحی علاقے بڈھ بیر میں ایک ''مواصلاتی اڈہ'' فراہم کیا جہاں امریکی فضائیہ کے اہلکار تعینات تھے۔(جین 2007ء اے:309)۔

اس اڈے سے امریکی نہ صرف مشرق وسطی بلکہ روس کی بھی نگرانی کر سکتے تھے۔ حملے کے بعد سوویت یونین نے یو2 طیارے کے پائلٹ گیرے پاورز کو پکڑ لیا اور پاکستان کو سخت دھمکی دی گئی کہ اگر اس کی سرزمین سے امریکی طیاروں نے پرواز کی تو پاکستان کو اس کی کڑی سزا دی جائے گی۔ اس کے بعد اگرچہ یو2 طیاروں کی پروازیں روک دی گئیں تاہم پاکستان، امریکہ اور برطانیہ کی فضائیہ نے RB-57F طیاروں کی پروازیں جاری رکھیں جو 82 ہزار فٹ کی اونچائی پر پروازیں کر سکتے تھے۔ یہ پروازیں روس اور چین کے سرحدی علاقوں پر کئی سال تک جاری رکھی گئیں۔ (سنگلٹن 2010)۔ جنوب مشرقی ایشیا میں کسی جنگ کی صورت میں سیٹو تنظیم کی کارروائی کیلئے مشرقی پاکستان ایک اڈے کے طور پر کام آنا تھا۔

ایوب خان نے امریکہ سے مزید امداد کی اپیلیں جاری رکھیں۔ امریکہ کی خارجہ پالیسی اسٹیبلشمنٹ کے ترجمان جریدے ''فارن افیئرز'' میں جولائی 1960ء میں ایک مضمون میں ایوب خان نے امریکیوں کی ''فراخدلانہ امداد'' پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''آج کی بین الاقوامی سیاست کے تناظر میں پاکستان نے مغرب کے ساتھ اپنی کھلے عام اور غیر متزلزل حمایت کا اظہار کیا۔ اور دیگر کئی ہمسائیہ ملکوں کے برعکس ہم نے کمیونسٹ بلاک سے کسی بھی قسم کی امداد قبول نہیں کی۔ ہم دو کشتیوں پر سوار ہونے پر یقین نہیں رکھتے''۔ (جین 2007 اے :35-6)۔

اسی دوران امریکہ میں پاکستانی سفیر عزیز احمد نے ایک اور امریکی جریدے میں جولائی 1960ء میں لکھا کہ:

> ''پاکستان...... امریکہ کے ایشیا میں تمام اتحادیوں سے بڑھ کر اتحادی ہے۔ لہذا وہ کسی بھی دوسرے اتحادی ملک سے زیادہ مشترکہ معاونت کے اقدامات کا مستحق ہے۔ سٹریٹجک پہلو سے دیکھا جائے تو پاکستان ایک غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے...... مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کے درمیان پل۔ مزید برآں مغربی پاکستان ایک طرف چین کی سرحد کے ساتھ لگتا ہے تو دوسری طرف سوویت یونین کی جنوبی سرحدوں کے نہایت

قریب ہے''۔(ایضاً:36)۔

ایوب خان اور عزیز احمد کے اخباری مضامین پاکستان کی غیر جانبدار ممالک کی تنظیم NAM میں شمولیت سے انکار کے فوراً بعد شائع ہوئے۔ یہ فیصلہ بذات خود نہایت اہم تھا کیونکہ یہ خارجہ پالیسی پر نمایاں مضمرات کا حامل تھا۔اور اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ پاکستان نے برائے نام غیر جانبداری سے بھی لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ 1955ء میں پاکستان انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں افریقہ اور ایشیا کے 29 ممالک کی کانفرنس میں شامل ہونے والا ملک تھا جس کا مقصد بین الاقوامی تعلقات کار میں مشترکہ پہلوؤں کے ساتھ مشترکہ پالیسیوں کی تشکیل تھا۔ان ممالک کا مشترکہ معاملہ قومی سالمیت اور علاقائی سالمیت برقرار رکھنے کا عزم اور بڑی طاقتوں کی سامراجیت ،نو آبادیت اور کسی بھی قسم کے غلبے کی مخالفت کرنا تھا۔ بہر حال ان دنوں قاہرہ میں غیر جانبدار ممالک کی 5 تا 12 جون 1961ء کو سربراہ کانفرنس ہوئی۔ پاکستان سرد جنگ کے دوران فیصلہ کن طور پر غیر جانبداری سے دور جا چکا تھا۔''نام'' کی دانشورانہ اور نظریاتی قیادت بائیں بازو کے جواہر لال نہرو، احمد سوئیکارنو، جمال عبدالناصر اور جوزف ٹیٹو جیسے سٹیٹس مین کے پاس تھی۔ چنانچہ جب اس تنظیم کی رکنیت کی شرائط طے کرنے کا معاملہ آیا تو یہ اتفاق کیا گیا کہ رکن ملکوں کو سپر پاورز کے ساتھ کسی بھی قسم کے فوجی معاہدے میں شامل نہیں ہونا چاہیئے۔ چونکہ پاکستان 1954ء میں امریکہ کے ساتھ عسکری معاہدہ کر چکا تھا اور امریکہ کے حمایت یافتہ علاقائی عسکری اتحادوں کا بھی حصہ تھا تو ''نام'' پاکستان کی سول ملٹری اشرافیہ کے لئے کسی کشش کا باعث نہیں رہی تھی۔ حقیقت میں پاکستانی لیڈروں نے بھارت کی غیر واضح حکمت عملی کے برعکس مغرب سے مکمل وفاداری کا اعلان کیا۔ اس نکتے پر 1961 میں امریکی کانگریس سے خطاب کے دوران صدر ایوب نے خود زور دیا تھا۔ انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ ''پاکستان ایشیا کا واحد ملک ہے جہاں امریکہ کی فوجیں ''آزاد دنیا'' کے دفاع کیلئے کسی بھی وقت اتر سکتی ہیں''۔(بھٹو 1969ء:1)۔

چین بھارت جنگ اور پاکستان کی تشویش

1950ء کے عشرے کے دوران جبکہ پاکستان بجا طور پر اپنے لئے ''ایشیا کا سب سے زیادہ اتحادی'' کا اعزاز چن رہا تھا تو بھارت ''نام'' کی قیادت سنبھالے ہوئے تھا۔ البتہ اکتوبر۔

نومبر 1962ء میں دنیا کے 2 بڑے گنجان آباد ملکوں چین اور بھارت کے درمیان سرحدی جھڑپ ہوئی۔ یوں بظاہر عظیم طاقتوں کے خلاف نئے بنائے گے اتحاد کی کمزور اور دگرگوں حیثیت بے نقاب ہوگئی۔نہرو نے چین میں قوم پرستوں کے مقابلے میں کمیونسٹوں کی حمایت اور چین کی اقوام متحدہ میں رکنیت کی وکالت کی تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کے شروع کے سالوں میں ''ہندی چینی بھائی بھائی'' کے نعرے بھی گردش کرتے رہے لیکن یہ خیر سگالی کی صورتحال دونوں بڑے ملکوں کے درمیان سرحدی کشیدگی کو نہ روک سکی۔ اس تنازعے کی وجہ چین اور بھارت کے درمیان سرحدوں کی حد بندی تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان تاریخی طور پر حد بندی کے معاملے میں ابہام پایا جاتا بالخصوص تبت کے علاقے پر۔

جب اپریل 1960 میں چین کے وزیراعظم چواین لائی نے بھارت کا دورہ کیا تو انتہائی قوم پرست ہندوؤں نے چین کی مبینہ سامراجیت کے خلاف احتجاج کیا اور اسے کسی بھی قسم کی علاقائی رعایت دینے کی مخالفت کی۔ چینی وزیراعظم نے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بھارتی رہنماؤں سے ملاقاتیں بھی کیں۔لیکن ہر کسی نے انہیں بھارت کا مؤقف درست ہونے پر لیکچر دیا۔ جہاں تمام ماحول سخت گیر بھارتی قوم پرستی سے لبریز تھا وہاں یہ بھی امید پائی جاتی تھی کہ سرحدی تنازعے پر چواین لائی اور نہرو کے درمیان کوئی معاہدہ ہوسکتا ہے۔ چین نے جو تجاویز دیں ان میں اپنے سابق مؤقف کا اعادہ کیا گیا کہ اقصائے چین مشرقی علاقوں میں چین کا حصہ رہے گا اور بھارت اپنی موجودہ پوزیشن برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہ تجویز دی گئی کہ دونوں ملکوں کے درمیان مک موہن لائن کو کم وبیش بین الاقوامی سرحد تسلیم کرلیا جائے لیکن بھارت نے اس تجویز کو مسترد کردیا۔ (میکسویل 1970ء:70-158)۔

اس دورے کے بعد بھارتی لیڈروں بالخصوص دائیں بازو کی قیادت نے غیر ذمہ دارانہ انداز میں جنگ کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ بھارت فوج نے بھی چین کا منہ توڑ جواب دینے کے جارحانہ مؤقف کی وکالت شروع کردی۔ جارحانہ حب الوطنی کا بخار اس وقت بام عروج پر پہنچ گیا جب بھارت نے 1961 میں گوا کی نوآبادی پرتگیزی انتظامیہ سے چھین لی۔ اس آپریشن کو جنگ آزادی کے طور پر پیش کیا گیا حالانکہ گوا میں پرتگیزیوں کی موجودگی برائے نام تھی۔ بہرحال اس کامیابی کی بنیاد پر چین کو بھی متنازعہ علاقوں سے پیچھے دھکیلنے کی بڑھکیں ماری جانے لگیں۔

چنانچہ شمال میں سرحدی علاقوں کی طرف بھارتی فوج بھجوانے کا آغاز کر دیا گیا۔اس کے بعد کئی ماہ تک اگر چہ چین اور بھارت کی فوجوں کے درمیان اکا دکا جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن ان کی عسکری لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں۔ دونوں ملکوں نے سرحدوں پر فوج کی تعداد میں بتدریج اضافہ کر لیا۔ یوں بڑے حملے کی راہ ہموار ہوگئی اور بالآخر 20 اکتوبر کو چینی فوج نے پوری طاقت سے حملہ کر دیا۔ چونکہ بھارتی فوجیوں کو انتہائی ٹھنڈے ماحول میں لڑنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی اوران کے پاس اس موسم کے لحاظ سے کپڑے بھی نہیں تھے اس لئے انہیں حملے کے فوراً بعد ہزیمت اٹھانا پڑی۔ 29 اکتوبر کو امریکی سفیر نے وزیراعظم نہرو سے ملاقات کی اور انہیں امریکی اسلحہ دینے کی پیشکش کی جو نہرو نے فوراً قبول کر لی حالانکہ چند ہفتے قبل وہ امریکہ سے کسی قسم کی عسکری حمایت حاصل کرنے کا امکان مسترد کر چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہرو خود تھے جنہوں نے صدر کینیڈی کو فون کر کے امریکہ سے مداخلت کی درخواست کی۔ (میکس ویل 1970ء:435)۔ چند روز کے اندر امریکہ، برطانیہ اور فرانس سے فوجی امداد آنا شروع ہوگئی لیکن یہ کچھ کام نہ آسکی اور بھارت کو شکست ہوگئی۔ علاقے سے پسپا ہوتے ہوئے بھارتی فوج کو متنازعہ علاقے میں 2 ہزار مربع میل کا رقبہ چھوڑنا پڑا۔ جس سے چین کو کشمیر کے خطے میں 2 ہزار مربع میل علاقے کا بھی کنٹرول مل گیا۔ شمال مشرق میں ہونے والی ہزیمت کی نوعیت نہایت ڈرامائی تھی اور اگر چین والے چاہتے تو وہ مزید علاقوں پر بھی قبضہ کر سکتے تھے۔ تاہم 21 نومبر کو چین نے یکطرفہ فائر بندی کر دی اور مک موہن لائن کے پیچھے چلا گیا اور زیر قبضہ تمام علاقے پھر خالی کر دیے۔ (خان 2008ء:5-154)۔ چین کے اس اقدام سے امریکہ کی مداخلت غیر ضروری ہوگئی لیکن دائیں بازو کے بھارتی دھڑے نے بھارتی حکومت پر دباؤ جاری رکھا کہ مقبوضہ زمین آزاد کرانے تک جنگ جاری رکھی جائے۔ ایسی بڑھکوں کی اب کوئی حیثیت نہیں تھی کیونکہ بھارت کو بری طرح شکست دی جا چکی تھی۔

بھارت اور چین کی 1962ء کی جنگ کے موضوع کے ایک مؤرخ نوائل میکس ویل سمجھتے ہیں کہ اگر چہ ان دنوں سرد جنگ بدستور زوروں پر تھی لیکن دونوں سپر پاورز کے درمیان کسی سطح پر یہ مفاہمت پائی جاتی تھی کہ بھارت کو چین کے مقابلے پر کھڑا کیا جائے۔ بھارتی قیادت نے فیصلہ کیا کہ وہ ایشیا میں امریکہ کا ساتھ دے۔ (میکس ویل 1970ء:434) جس کے نتیجے میں بھارت کو امریکہ اور برطانیہ سے 120 ملین ڈالر کی فوجی امداد ملی۔ اس امداد کے نتیجے میں بھارت کی 6 ڈویژن

فوج کو پہاڑوں پر جنگ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔اس وقت بھارت نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی فوج کی تعداد 11 ڈویژن سے بڑھا کر 22 ڈویژن کر دے۔(خان 2006ء:155)۔بھارت نے یہ امداد تو قبول کر لی لیکن اس بات پر مصر رہا کہ وہ اپنی غیر جانبدار خارجہ پالیسی پر کاربند رہے گا۔دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ نے بھارت پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنا تنازعہ حل کرے۔ یہاں بھارت کا چین کے مقابلے میں مؤقف بالکل الٹ تھا۔وہ چاہتا تھا کہ پاکستان ''جوں کی توں'' والی حیثیت قبول کر لے۔بہر حال ان تمام حالات میں امریکہ نے بھارت کو پاکستان کے احتجاج کے باوجود فوجی اسلحے اور ساز و سامان کی فراہمی جاری رکھی۔اس کے علاوہ بھارت نے اپنی فوج کو جدید بنانے اور توسیع کیلئے فوجی اخراجات میں زبردست اضافہ کر دیا۔بھارت کی طرف سے عالمی برادری کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے اقدام پر اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے ایوب خان لکھتے ہیں کہ:

> ''بھارت نے فی الوقت دنیا کے سامنے اپنے تین چہرے بنا رکھے ہیں۔ ایک چہرہ مغرب کے لئے ہے کہ وہ مغرب سے اسلحے کی زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کرنے کیلئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ چین سے لڑنے میں پرعزم ہے۔دوسرا چہرہ روس کیلئے ہے اور اس پر زور دے رہا ہے کہ وہ ''غیر جانبدار'' رہے گا۔اور تیسرا چہرہ چین کیلئے ہے کہ وہ غیر جانبدار ثالثوں کی مدد سے تنازعے کا پرامن حل چاہتا ہے''۔(ایضاً:156)۔

عسکری معنوں میں چین کے ساتھ جنگ کے دوران بھارت کمزور ترین حیثیت میں تھا۔ پاکستان چاہتا تو اس وقت فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن ایوب خان نے ایسا نہیں کیا۔پاکستان کی مقتدر اشرافیہ کے اندر ذوالفقار علی بھٹو جیسے عقاب اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت پر حملے کے حق میں تھے۔(اعجاز الدین 2002ء:21)۔چنانچہ موقع ضائع ہونے پر اس صورتحال کو مقتدر اشرافیہ کے عقابی عناصر نے خوب خوب اچھالا۔(شوہیلڈ 2007ء:42)۔

چین اور بھارت کے درمیان سرحدی جنگ کے باعث اسلحے کی دوڑ شروع ہوگئی۔جہاں ایک طرف بھارت نے بظاہر مستقبل میں چین کی طرف سے کسی فوجی خطرے کے پیش نظر خود کو مسلح کرنا شروع کر دیا وہاں اسے پاکستان کے فوجی عزائم پر بھی تشویش تھی۔دوسری طرف پاکستان نے

محسوس کیا کہ فوجی لحاظ سے زیادہ مسلح اور طاقتور بھارت ماضی کی بہ نسبت زیادہ بڑا خطرہ ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ چین دونوں سپر پاورز کو اپنی بقا کیلئے خطرہ سمجھتا تھا۔ جنوبی ایشیا میں سرحدی تنازعے سے چین کی پاکستان میں دلچسپی بتدریج بڑھنے لگی...... یہی تعلق بعدازاں جذباتی تعاون پرمبنی تعلقات میں بدل گیا۔

امریکی صدر کینیڈی کا ایوب خان کو خط

کینیڈی نے 28 اکتوبر 1962ء کو ایوب کو اس وقت خط لکھا جب چین بھارت جنگ اپنے عروج پر تھی اور کہا کہ انہوں نے نہرو کو ایک خط میں یقین دلایا ہے کہ چین کے ساتھ لڑائی کے دوران پاکستان بھارت پر حملہ نہیں کرے گا۔ ایوب خان نے 5 نومبر کو امریکی صدر کو خط لکھا اور شکایت کی کہ بھارت پچھلے 15 سال سے پاکستان کی سلامتی کیلئے خطرہ بنا ہوا ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ پاکستان کے معاشی مفادات کشمیر سے جڑے ہوئے ہیں۔ بھارت کے خطرے کی وجہ سے پاکستان خود کو مسلسل موبلائزیشن کی حالت میں رکھنے پر مجبور ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ بھارت ایک ناقابل اعتبار اور خطرناک ہمسائیہ ہے اور بین الاقوامی سیاست میں دھوکہ دہی کرتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بھارت کی جوناگڑھ، حیدرآباد، کشمیر اور گوا میں فوجی کارروائیوں کا حوالہ دیا اور کینیڈی کو بتایا کہ میرے اندازے کے مطابق چین کی فوجی کارروائی محدود نوعیت کی ہوگی اور بڑی جنگ کا خطرہ نہیں ہے۔ (خان 2006ء:5-102)۔

برطانیہ اور امریکہ نے پاکستان اور بھارت کو مسئلہ کشمیر کا تصفیہ کرنے پر قائل کرنے کے لئے کئی اقدامات کئے لیکن ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ نہرو نے اپنے انتقال (مئی 1964) سے پہلے کشمیری لیڈر شیخ عبداللہ کو پاکستان بھیجا تاکہ تنازعہ کشمیر کا حل نکالا جا سکے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ لگتی ہے کہ نہرو نے محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل میں چین کے ساتھ کسی جنگ کی صورت میں بھارت کو اپنی مغربی سرحدیں محفوظ بنانا پڑیں گی۔ شیخ عبداللہ کا پاکستان میں گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ انہوں نے جلسوں سے خطاب بھی کیا اور کشمیری اور پاکستانی قیادت سے ملاقاتیں کیں لیکن انہیں 27 مئی 1964ء کو اس خبر پر اپنا دورہ مختصر کرنا پڑا کہ نہرو کا انتقال ہو گیا ہے۔ (گوہر 1998ء:257)۔ شیخ عبداللہ دہلی واپس چلے گئے اور کچھ عرصے بعد انہیں دوبارہ نظر بند کر دیا گیا۔ دہلی میں حکمران کی

تبدیلی سے مزید سخت گیر عناصر اقتدار میں آ گئے اور نہرو کے اس اقدام جیسا اور کوئی اقدام بعد میں نظر نہ آیا۔

پاکستان چین تعلقات میں بہتری

اس دوران پاکستان اور چین کے درمیان دوستانہ ہمسائیگی کے تعلقات سے بڑھ کر روابط کا آغاز ہونے لگا۔ اس کا آغاز 1950ء کی دہائی میں ہوا تھا جب وزیراعظم چواین لائی نے 1956ء میں پاکستان کا دورہ کیا جہاں ان کا نہایت گرمجوشی سے اور پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ امریکہ کا اتحادی رہتے ہوئے پاکستان 1950 کے عشرے سے چین کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پالیسی کو امریکہ میں زیادہ پذیرائی نہ ملی اور یہ شک پیدا ہونے لگا کہ پاکستان نے نہ صرف مغرب سے اسلحہ ہتھیانے کے لئے یہ تاثر دیا کہ وہ کمیونزم کے خلاف لڑنے کا خواہاں ہے۔ چنانچہ امریکہ نے قبل ازیں اٹھائے گئے اقدامات پر تحفظات کا اظہار کیا لیکن 1960 کے عشرے کے آغاز میں سوویت یونین اور چین کے درمیان تقسیم کے بعد امریکہ کو چین کے ساتھ پاکستان کی قربتوں پر زیادہ تشویش نہ رہی۔ 1962ء کی چین بھارت جنگ سے پاکستان اور چین مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور 1963ء میں دونوں ملکوں کے درمیان سرحدوں کی حد بندی کا معاہدہ طے پا گیا۔ پاکستان نے اپنے زیر کنٹرول کشمیر کا کچھ علاقہ چین کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ فریقین نے اتفاق کیا کہ چین کے مسلم اکثریتی صوبہ سنکیانگ سے پاکستان تک سڑک تعمیر کی جائے گی۔ تجارت کا معاہدہ بھی طے پا گیا۔ چین کے ساتھ تعلقات کے فروغ کی پالیسی کے معمار وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو تھے؛ (بھٹو 1969ء)۔

دوسری طرف بھارت میں مسلح افواج میں تیز رفتار توسیع اور جدید فوجی ساز و سامان کے حصول سے زبردست اعتماد پیدا ہوا۔ بھارت پاکستان کے مقابلے میں اپنی فوج پر بھاری اخراجات کر رہا تھا، اگرچہ شرح تناسب کے لحاظ سے پاکستان آگے تھا۔ بالخصوص سوویت یونین نے بھارت کیلئے فوجی امداد اور ساز و سامان کی فروخت میں زبردست اضافہ کر دیا۔ اپنے سپر پاور حریف امریکہ کی طرح سوویت یونین نے بھی یہ اخذ کر لیا تھا کہ بھارت کو عسکری لحاظ سے مضبوط بنایا جائے تاکہ 1962 کی ناکامی کا اعادہ نہ ہو۔

پاک بھارت تعلقات

بھارت نے 1950 میں پاکستان کو جنگ نہ کرنے کے معاہدے "No War Pact" کی پیشکش کی لیکن پاکستان نے اسے اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ بھارت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کئے گئے وعدے کے مطابق حل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کے بعد نو وار پیکٹ کی کئی بار پیشکش کی گئی لیکن پاکستان نے ہر بار اسے مسترد کر دیا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ یہ بھارت کی سیز فائر لائن کو بین الاقوامی سرحد میں بدلنے کی مکارانہ کوشش تھی جو پاکستان کے لئے ناقابل قبول تھی۔ (بھٹو 1966ء: 40)۔ اس کے بعد نومبر 1959 میں ایوب خان نے بھارت کو "مشترکہ دفاع کے معاہدے" کی پیشکش کی لیکن نہرو نے تلملا کر یہ الفاظ کہے "دفاع کس کے خلاف؟"۔ (طاہر خیلی 1997ء: 34)۔ حالات کچھ بھی تھے مسئلہ کشمیر بدستور پاک بھارت تعلقات میں ایک کانٹے کی طرح برقرار رہا اور حسب معمول اقوام متحدہ وہ جگہ تھی جہاں دونوں ملکوں میں تند و تیز جھڑپیں ہوتی رہیں۔

سندھ طاس معاہدہ

مسئلہ کشمیر کے نظریاتی اور شناختی پہلو کافی معروف ہیں۔ بھارت کے نزدیک کشمیر پر قبضہ برقرار رکھنا اس کی سیکولر شناخت کیلئے ضروری تھا جبکہ پاکستان کیلئے کشمیر کا حصول ہندوستان کی مذہبی بنیاد پر تعمیر مکمل کرنے کیلئے ناگزیر تھا۔ تاہم شناختی تصادم اور جذباتی المیوں سے ہٹ کر کشمیر پر دعوؤں کی گہری وجوہات معاشی اور عسکری تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر اصل میں پانی اور سیاسی پہلو Hydro-political مسائل کا حامل ہے جس کے زبردست معاشی اور عسکری اثرات و مضمرات ہیں۔ بھارت اور پاکستان دونوں کو بہت بڑی آبادی کو خوراک فراہم کرنا ہے اور آبادی میں تیز تر اضافے سے دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ دونوں ملکوں نے زرعی شعبے میں بھاری بھرکم سرمایہ کاری کی ہے کیونکہ زراعت پر ان کی معیشت کا بڑا دارومدار ہے۔ بھارت کے تیار کردہ زرعتی پیداوار کے خطوں (پنجاب وغیرہ) اور پاکستان کے تقریباً تمام تر زرعی علاقوں کی آبپاشی ان دریاؤں سے ہوتی ہے جن کا منبع کوہ ہمالیہ میں ہے۔ یہ دریا سانپ کی طرح بل کھاتے دونوں ملکوں کے زیر کنٹرول کشمیر میں سے گزرتے ہیں۔ لہٰذا جو ریاست ان دریاؤں کے بالائی حصوں پر کنٹرول کرے گی وہی سٹریٹیجک فائدے میں رہے گی کیونکہ اس طرح نہ صرف پانی کے بہاؤ پر کنٹرول ہوگا

بلکہ پانی روکا بھی جا سکے گا۔ چنانچہ یہ ایڈوانٹیج بھارت کو ہوا۔ (ملک 2005ء)۔

حیران کن بات یہ ہے کہ جہاں پاکستان اور بھارت میں کشمیر پر کشیدگی اور جارحیت پائی جاتی تھی وہاں دونوں فریقوں نے محسوس کیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حتمی حل تک پانی کی تقسیم کے معاہدے کو مؤخر کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ورلڈ بنک کی نگرانی میں 1960 میں ایک معاہدہ عمل میں لایا گیا جس کے تحت مشرقی دریا راوی، ستلج اور بیاس بھارت کو ملے جبکہ جہلم، چناب اور سندھ کا پانی پاکستان کے حصے میں آیا۔ نہرو اور ایوب خان نے سندھ طاس معاہدے پر کراچی میں 19 ستمبر 1960ء کو دستخط کئے۔ معاہدے کے تحت پاکستان کو یہ سہولت بھی دی گئی کہ وہ مغربی دریاؤں سے مغربی پاکستان کے زرعی رقبے کو سیراب کرنے کیلئے آبپاشی کا نظام تعمیر کر سکتا ہے۔ ان علاقوں کو قبل ازیں انحصار مشرقی دریاؤں پر تھا۔

آنے والے برسوں میں پاکستان نے بین الاقوامی ڈونرز کی فنڈنگ سے منگلا اور تربیلا ڈیم تعمیر کئے اور بیراج بنائے۔ معاہدے میں باہمی تنازعات کی صورت میں حل بھی تجویز کیا گیا ہے۔

باب 7

1965ء کی جنگ

جہاں ایک طرف پاکستان اور بھارت کی بین الاقوامی فورموں پر جموں و کشمیر کو متنازعہ بنانے کی کوششیں جاری تھیں وہاں انہوں نے جو مؤقف اختیار کیا اس سے مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل ناممکن ہو گیا۔ پاکستان کی طرف سے اپنے زیر کنٹرول علاقے میں سے کچھ حصہ چین کو دینے پر غضبناک ہو کر بھارت نے 1963 میں کشمیر کو ضم کرنے کے مزید اقدامات کئے۔ 1964ء اور 1965ء میں دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی فزوں تر ہو گئی۔ جارج سنگلٹن جو کراچی میں امریکی سفارتخانے کے کمیونیکیشن کے سینئر عہدیدار تھے اپنی یاداشتوں میں لکھتے ہیں کہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو چاہتے تھے کہ امریکی جاسوس طیارے RB-57F کشمیر اور بھارت پر پروازیں کر کے خفیہ معلومات جمع کریں۔

> ''مسٹر بھٹو نے کشمیر اور بھارت پر RB-57F طیاروں کی پروازوں اور انٹیلی جنس معلومات جمع کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن پیشہ ور اور قابل احترام ائیر چیف مارشل اصغر خان نے بھٹو کی جارحت پسند سوچ کو مسترد کر دیا اور امریکہ کے ساتھ مل کر صرف چین اور سوویت یونین سے متعلق معلومات جمع کرنے کی اپنی ذمہ داری پر توجہ مرکوز رکھی۔ ایک اور چیز جو مجھے یاد ہے کہ بھٹو نے ایک بار پھر ناکام کوشش کی کہ برطانوی ہائی کمشنر کے ائیر ایڈوائزر اور امریکی ائیر اتاشی اور میرے باس کو جاسوس پروازوں پر قائل کر سکیں۔ اس بار بھی بھٹو کو انکار کا منہ دیکھنا پڑا۔ کشمیر اور بھارت ہمارے

سرد جنگ پر توجہ مرکوز رکھنے کے انٹیلی جنس پروگرام کا حصہ نہیں تھے''۔ (2010)۔

مارچ 1965ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان سندھ اور بھارتی صوبہ گجرات کی سرحد پر واقع دور افتادہ علاقے رن آف کچھ میں جھڑپیں ہوئیں۔ شروع شروع میں دونوں ملکوں کی سرحدی پولیس کی جھڑپیں ہوئیں لیکن جلد باقاعدہ فوجیں بھی لڑائی میں کود پڑیں۔ جس وقت زمینی فوجیں دست بدست لڑ رہی تھیں اس وقت پاکستان کے ائیر چیف اصغر خان اور ان کے بھارتی ہم منصب ارجن سنگھ جو انگریز دور میں اکٹھے کام کر چکے تھے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فضائی طاقت کو اس لڑائی میں شامل نہیں کریں گے۔ (خان 2005ء:xii)۔ بادی النظر میں پاکستانی فوجوں نے دشمن فوجوں کو ہزیمت سے دوچار کر دیا۔ (خان 1993ء:6-163)۔ امریکی فوج سے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان نے امریکہ سے ملنے والے پٹن ٹینک بھی استعمال کئے جو دراصل مستقبل میں کمیونسٹ ملکوں کے خلاف استعمال ہونے تھے۔ (حسین 2010:209)۔ تاہم ایسے دشوار گزار علاقے میں کوئی بڑی کامیابی خارج از امکان تھی۔ 20 جون کو دونوں ملکوں کے درمیان سیز فائر طے پا گیا۔ اس لڑائی نے بین الاقوامی میڈیا کو متوجہ کیا اور مغرب کے کئی نامہ نگاروں نے پاکستان کی کامیابی کی خبریں ارسال کیں۔ اس بات سے عوام میں فوج کے ساکھ بہتر ہونے میں نمایاں مدد ملی۔ برائن کلف لے نے رن آف کچھ کے معرکے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''رن آف کچھ کے معرکے کی اہمیت یہ تھی کہ اس سے یہ جھوٹا تاثر پیدا ہوا کہ پاکستانی فوج بھارت کے مقابلے میں کسی بھی قسم کی لڑائی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ چھوٹی موٹی کامیابی تھی لیکن اس غلطی سے وہ شدید قسم کا جوش وخروش پیدا ہوا جس کی قیمت بعد میں ادا کرنا پڑی''۔ (کلف لے: 2000: 61)۔

معرکہ رن آف کچھ میں خود ساختہ کامیابی سے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ میں ان طاقتوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا جو تنازعہ کشمیر پر متحرک پالیسی اختیار کرنے کی خواہاں تھیں اور وہ بھارت کے کشمیر پر غیر لچکدار رویے کا توڑ چاہتی تھیں۔ یکا یک رجحان جارحانہ اور عسکریت پسند ہو گیا۔ بھارت میں بھی جنگی جنونیوں کی سنی گئی۔ بھارت نے وسط 1965ء میں مغربی محاذ پر 6 ڈویژن

فوج......سوالاکھ اہلکار......تعینات کردی۔

آپریشن جبرالٹر

1964ء میں شیخ عبداللہ کے دورہ پاکستان کے بعد ایوب خان نے دفتر خارجہ کو جی ایچ کیو کی مشاورت سے ایک منصوبہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی تاکہ کشمیر کے مسئلے کو ایک بار پھر ''زندہ'' کیا جا سکے۔ چنانچہ وزارت خارجہ، انٹیلی جنس اداروں اور جی ایچ کیو کے اعلیٰ افسروں کے کئی خفیہ اجلاس ہوئے۔ اس ضمن میں مرکزی کردار سیکرٹری خارجہ عزیز احمد تھے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر موجودہ حالات میں کشمیر میں پاکستانی فوج کے دستے اتارے جائیں تو مقامی کشمیریوں میں بغاوت کی لہر پیدا ہو جائے گی۔ یہ بھی قیافہ لگایا گیا کہ چین کے خوف سے بھارت پاکستان کے خلاف کھلے عام جنگ سے گریز کرے گا۔ (گوہر 1998ء:21-318)۔

دسمبر 1964ء میں وزارت خارجہ اور آئی ایس آئی نے کشمیر میں دراندازی بھیجنے کا ایک منصوبہ تیار کر کے ایوب خان کو بھجوا دیا۔ صدر ایوب اور ان کے مشیر اس منصوبے پر گومگو کا شکار تھے لیکن 1965ء کے انتخابات جیتنے کے بعد انہوں نے دوبارہ منصوبے پر مشاورت کی۔ انتہائی راز داری کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں ٹینکوں کی لڑائی کی مشقیں شرع کر دی گئیں۔ فروری 1965ء میں ایک اجلاس ہوا جس میں کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ اور ان کے سینئر جنرلوں، وزیر خارجہ بھٹو اور خارجہ سیکرٹری عزیز احمد نے شرکت کی۔ ائیر فورس اور نیوی کے سربراہوں کو مدعو نہ کیا گیا۔ آئی ایس آئی کے ڈپٹی ڈائریکٹر ٹی ایس جان نے منصوبے پر بریفنگ دی۔ بتایا جاتا ہے کہ جنرل ایوب خان نے اس کے ذمہ داروں کی سرزنش کی کیونکہ انہوں نے اپنی بریف سے تجاوز کیا۔ اس وقت کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر لکھتے ہیں کہ ایوب خان نے اس موقع پر کہا:

''اگر کسی اور کو کوئی تبصرہ نہیں کرنا تو مجھے کچھ پوچھنے دیں، دفتر خارجہ اور آئی ایس آئی کو یہ منصوبہ تیار کرنے کا اختیار کس نے دیا؟ یہ ان کا کام نہیں تھا۔ میں نے انہیں صرف اتنا کہا تھا کہ وہ کشمیر کی صورتحال پر بغور نظر رکھیں۔ وہ حکومت پر کسی فوجی مہم جوئی کا منصوبہ مسلط نہیں کر سکتے''۔ (ایضاً:21-320)۔

ایوب خان نے پھر ''آپریشن جبرالٹر'' کے نام سے ایک منصوبہ بتایا گیا جو جنرل اختر حسین

ملک نے تیار کیا تھا۔ اس موقع پر جنرل موسیٰ، ذوالفقار علی بھٹو اور بعض دیگر سینئر فوجی افسر بھی موجود تھے۔ ایوب خان نے مبینہ طور پر ہدایت کی کہ اس مہم کا بنیادی مقصد اکھنور کے علاقے پر قبضہ کرنا ہونا چاہیئے۔ جس کی سٹریٹیجک لحاظ سے نہایت اہمیت تھی۔ ایوب کے اس پلان کو اجلاس کے شرکا نے کافی سراہا۔ (گوہر 1998ء:322)۔

گرینڈ سلیم Grand Slam

اکھنور پر قبضہ کرنا جنرل اختر ملک کا بھی مقصد تھا لیکن یہ آپریشن جبرالٹر کے تحت بڑے منصوبے کا حصہ تھا۔ جنرل اختر اکھنور کی طرف اچانک پیشقدمی سے گریزاں تھے۔ ان کا مؤقف تھا کہ اس کیلئے مزید وسائل اور افرادی قوت کی ضرورت ہوگی۔ اس درخواست کو ایوب خان نے منظور کر لیا اور اس مقصد کیلئے اضافی فنڈز کی منظوری دے دی گئی۔ یوں ''آپریشن گرینڈ سلیم'' وجود میں آیا۔ اس بات میں نہایت ابہام پایا جاتا ہے کہ کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ آپریشن جبرالٹر کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا اور اس کی جگہ ''آپریشن گرینڈ سلیم'' نے لے لی۔ شجاع نواز نے اس بات میں تبصرہ کیا ہے کہ:

''منصوبے کے دوسرے حصے ''گرینڈ سلیم'' کا ایوب خان کے نزدیک یہ فائدہ بتایا گیا کہ اکھنور پر قبضے سے کشمیر اور بھارت کے درمیان واحد زمینی راستہ جنرل اختر ملک کے فوجی قبضے میں لے لیں گے۔ اگرچہ اختر ملک اس اجلاس میں مکمل ذمہ داری لینے سے ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ لیکن آپریشن شروع ہونے پر انہوں نے کمانڈروں کو جو ہدایات جاری کیں ان میں بھارتی دفاع ٹوٹنے کی صورت میں انہوں نے یہ آپشن کھلا رکھا''۔ (2008ء:208)۔

ائیر مارشل اصغر خان جنہوں نے رن آف کچھ کے معرکے سے ائیر فورس کو دور رکھا جولائی 1965ء کو ریٹائر ہو گئے۔ دوسری طرف بھٹو کو دوبارہ وزیر خارجہ بنا دیا گیا اور ایک روز پہلے انہوں نے صدر ایوب کو لکھا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں اور یہ کہ ''پاکستان کو اسلحے کے معیار کے حوالے سے بھارت پر فوقیت حاصل ہے''۔ (گوہر 1998: 322)۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کو یقین دلایا کہ ''انتقام کے طور پر بھارت کے پاکستان پر جنگ مسلط کرنے کے معاملے سے پاکستان سفارتی سطح پر مہارت اور فوجی فوقیت کی بنا

پر باآسانی نمٹ سکتا ہے''۔(ایضاً:323)۔تاہم اس دلیل سے جنرل موسیٰ قائل نہ ہوئے لیکن وہ اس معاملے میں اکیلے تھا کیونکہ بھٹو نے جی ایچ کیو کے جنرلوں کو اپنے مؤقف پر قائل کرلیا تھا۔ مجموعی طور پر آپریشن جبرالٹر کے 5 گروپ تشکیل دے کرانہیں اسلامی تاریخ کے ممتاز جرنیلوں سے موسوم کیا گیا۔ایک ذیلی فورس نصرت (اتفاقی طور پر بھٹو کی اہلیہ کا نام بھی نصرت تھا) بھی تشکیل دی گئی۔ چنانچہ 28 جولائی کو 400 مجاہدین بھارت کے زیرانتظام کشمیر میں داخل کئے گئے۔اگرچہ بھارت نے دعویٰ کیا کہ مجاہدین کی تعداد 30 ہزار تھی۔

کشمیر سیل کی طرف سے جی ایچ کیواور دیگر حکام کو بار بار جو بات کی گئی اس کے برعکس بھارتی حکومت نے کشمیری رہنماؤں کو خاموش کرانے کیلئے مؤثر اقدامات کئے۔وہ رہنما جنہوں نے بھارت کی طرف سے کشمیر پر قبضہ برقرار رکھنے کے اقدامات پر تنقید کی انہیں نظر بند کر دیا گیا۔

پاکستان سے جولوگ بھیجے گئے تھے ان میں سے بہت کم کشمیری زبان بول سکتے تھے۔چونکہ انہیں شرح مبادلہ کا کچھ پتہ نہیں تھا اور مختلف اوزان کو کشمیر کے میٹرک سسٹم میں تبدیل کرنے کا بھی علم نہیں تھا اس لئے جب ان کا مقامی افراد سے میل جول ہوا تو انہوں نے دراندازوں کی نقل و حرکت سے بھارتی فورسز کو مطلع کر دیا۔16 اگست تک بھارتیوں نے دراندازوں کو الگ تھلگ کر دیا اور اڑی سیکٹر کی 2 اہم چوکیوں پر قبضے کیلئے جوابی آپریشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔(گوہر 1998ء:5-323)۔صرف جموں ایسا علاقہ تھا جہاں حملہ آوروں کو کچھ پذیرائی ملی اور وہاں پاکستانی پرچم لہرادیا گیا۔(خان 2007ء:91)۔

گوہرایوب خان نے دعویٰ کیا ہے کہ جنرل اختر ملک نے آپریشن کی نہایت ناقص منصوبہ بندی کی۔ بھارتی فوج نے نہایت سرعت سے اپنے دستوں کو آگے بڑھایا اور دراندازوں کو چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا۔اس کے بعد نہایت اطمینان سے حملہ آوروں کو چن چن کر ہلاک کر دیا گیا یا گرفتار کیا گیا۔میجر جنرل اختر حسین ملک نے مجاہدین کے خارجی روٹ کا مناسب اہتمام نہیں کیا تھا۔(2007ء:91)۔بھارت نے اوڑی کو پونچھ سے کاٹنے کیلئے بڑا آپریشن شروع کر دیا۔28 اگست کو انہوں نے درہ حاجی پیر پر قبضہ کرلیا۔جس سے پاکستانیوں کو نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بتایا جاتا ہے کہ جنرل موسیٰ بھاگم بھاگ بھٹو کی رہائشگاہ پر گئے اور انہیں بتایا کہ پاکستانی فورسز اب بھارت کے رحم وکرم پر ہیں۔انہوں نے جنرل ملک سے بھی بات کی جو انتہائی

مشکل صورتحال میں پھنسے تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ اب آپریشن گرینڈ سلیم Grand Slam فوری شروع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ (گوہر 1998:326)۔ موسیٰ نے بھٹو پر زور دیا کہ وہ اس بارے میں صدر ایوب سے منظوری حاصل کریں۔ گوہر ایوب لکھتے ہیں کہ ایسے فیصلے کے کئی مضمرات سامنے آئے۔

> ''مسئلہ یہ تھا کہ پاکستانی فوج کے ایک چھوٹے سے حصے کو سیالکوٹ اور جموں میں بین الاقوامی سرحد پار کرنا پڑنی تھی...... یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ بھٹو اور عزیز احمد اب بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپریشن جبرالٹر اپنی موت آپ مر چکا ہے اور تمام منصوبہ اب ناکامی سے دوچار ہے۔ اکھنور اب عملاً جواری کی آخری بازی والی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور صورتحال سے بچنے کا کوئی اور حل بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ شاید بھارت بین الاقوامی سرحد سے فوج کی چھوٹی سرحد گزرنے کو اتنا محسوس نہ کرتا۔ بھٹو نے محسوس کیا کہ یہ جوا کھیلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں''۔ (ایضاً: 326)۔

بظاہر جس وقت ان پریشان کن آراء کا آپس میں تبادلہ کیا جا رہا تھا اس وقت چین کے سفیر کو بریفنگ کیلئے بلایا گیا۔ انہوں نے بھٹو کے گوریلا طرز کی لڑائی کے تجربے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مقامی دیہاتیوں کو گوریلا لڑائی لڑنے کی تربیت دینے اور منصوبہ بندی کی تفصیلات بھی بتائیں۔ جب بھٹو نے ان سے مشورہ لیا کہ کیا جنگ کو بین الاقوامی سرحد سے آگے بڑھایا جائے تو انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر نے اس کی پاکستانی فوج کے نقطہء نظر سے یوں وضاحت کی ہے کہ بین الاقوامی سرحد پار نہ کی گئی بلکہ محض ''ورکنگ باؤنڈری'' پار کی گئی۔ ورکنگ باؤنڈری تقسیم ہند سے پہلے پنجاب اور جموں و کشمیر ریاست کے درمیان سرحد تھی۔ اور اس کا 48-1947ء کی جنگ میں سیز فائر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پاکستانی اس راستے سے آگے بڑھے جہاں سیز فائر لائن ورکنگ باؤنڈری آپس میں ملتے تھے۔ یوں یہ تاثر دیا گیا کہ بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ البتہ بھارت ورکنگ باؤنڈری کو بین الاقوامی سرحد قرار دیتا ہے۔ اس کا مؤقف ہے کہ مہاراجہ کشمیر نے اکتوبر 1947ء میں الحاق پر دستخط کر دیئے تھے۔ سرحد کو کسی بھی مقام سے پار کرنا بھارت کے نزدیک بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی تھا۔ بھارتی فوج کے

ریٹائر مسلمان میجر جنرل افسر کریم نے ایک تفصیلی انٹرویو میں مجھے بتایا کہ پاکستانیوں نے دراندازکشمیر بھیجنے کا مجرم ہونے کے بعد خود کو بین الاقوامی قانون کے بہترین نکات میں الجھالیا۔

ایوب خان سوات چلے گئے

آپریشن جبرالٹر شروع ہونے کے فوراً بعد ایوب خاں سوات چلے گئے۔ بھٹو ان کے پاس گئے اور ان کی واپسی 29 اگست 1965 کو ایوب خان کے دستخط شدہ ڈائریکٹو ''کشمیر میں جدوجہد کیلئے سیاسی عزم'' کے ساتھ ہوئی۔ اس ڈائریکٹو میں ایوب خان نے اس بات اکا اعادہ کیا کہ ''مسئلہ کشمیر دوبارہ زندہ کرنے، بھارتی مؤقف میں کمزوری لانے اور عام جنگ شروع کئے بغیر اس کو مذاکرات کی میز پر لانے کے اقدامات کئے جائیں''۔ (گوہر 1998:328)۔ ایوب خان نے زور دیا کہ بین الاقوامی سرحد پر بھارت کی پیشقدمی کیلئے ہر لحاظ سے تیاری ہونی چاہیئے۔ انہوں نے تیز رفتار اور ٹھوس چوٹوں کی حمایت کی۔ ''صحیح وقت اور صحیح مقام پر پے در پے چوٹوں سے ہندوؤں کا حوصلہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا لہذا ایسے مواقع تلاش کر کے استعمال کئے جائیں''۔ (ایضاً)۔ الطاف گوہر نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ صدر ایوب کو اس بات کا پتہ نہیں تھا کہ جبرالٹر مکمل طور پر اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اس وقت کے سیکرٹری اطلاعات البتہ اس فیصلہ کن موقع پر صدر کی وفاقی دارالحکومت سے دوری کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں، حالانکہ بصورت دیگر وہ ان کے کافی ہمدرد تھے۔ الطاف گوہر نے لکھا کہ:

> ''جبرالٹر شروع کرانے کے بعد وہ خود سوات چلے گئے اور امید کی کہ بھارت اس طرح آپریشن کے مقصد اور امکانات سے لاعلم رہے گا۔ ان کو یہ احساس نہ ہوا کہ وہ دشمن کیلئے تیار کئے گئے پلان کا خود شکار ہو جائیں گے۔ ان کی دارالحکومت میں عدم موجودگی سے بھٹو اور عزیز احمد کو جبرالٹر کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لینے کی کھلی آزادی مل گئی۔ یہ کنٹرول صرف خارجہ امور کے حوالے سے نہیں تھا بلکہ فوجی منصوبہ بندی اور مہم جوئی کے حوالے سے بھی تھا''۔ (ایضاً:9-328)۔

حتیٰ کہ جنرل موسیٰ کو بھی حقیقی صورتحال سے لاعلم رکھا گیا۔ محاذ پر موجود فورسز کو شاندار

پیشقدمی کے فرضی اور بڑھا چڑھا کر پیغامات ارسال کئے گئے۔خود گوہر الطاف نے حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آپریشن میں آخر اکھنور پر قبضے کو ترجیح کیوں نہیں دی گئی۔اگر اس میں کامیابی مل جاتی تو کشمیر میں موجود بھارت کی 5 ڈویژن فوج کا بھارت سے رابطہ منقطع کیا جا سکتا تھا۔جبرالٹر آپریشن ناکام ہونے پر بھارتی فوج نے آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد کی طرف پیشقدمی شروع کر دی۔

بالآخر 31 اگست کو آپریشن گرینڈ سلیم شروع کر دیا گیا۔جس میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔کبھی ایک مقام پر روکا گیا کبھی دوسری جگہ پر سست روی سے آگے بڑھایا گیا۔یہ آپریشن لڑکھڑا رہا تھا کہ 2 ستمبر کی سہ پہر کو جنرل اختر ملک کو حکم دیا گیا کہ وہ کمان جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیں۔گوہر الطاف کے مطابق یہ قیافہ کہ اکھنور میں بھارت کی پوزیشن نہایت کمزور رہے اور وہاں اس کی فوجیں بھی اتنی تعداد میں نہیں بالکل غلط تھا۔بھارتی فوج وہاں اپنی طاقت مجتمع کر چکی تھی۔جنگ کی بعض تفصیل کا حوالہ دیتے ہوئے گوہر الطاف نے یہ دلیل دی کہ جنرل ملک پوری دلجمعی سے لڑائی کی قیادت نہیں کر رہے تھے اور یہ کہ محاذ جنگ میں کمانڈ ہیڈ کوارٹر تبدیل کیا جا رہا تھا جو اس بات کا نتیجہ تھا کہ آپریشن مسائل کا شکار تھا۔انہوں نے جنرل موسیٰ کے ان ریمارکس کا حوالہ دیا کہ ''لڑائی میں کمانڈ کی مناسب طریقہ سے تشکیل کی گئی نہ فورسز کی گروپنگ ہوئی''۔جب گرینڈ سلیم عملی شکل اختیار نہ کر سکا تو پاکستان کی طرف سے بھارت کی چند چوکیاں قبضے میں لانے کے باوجود تصویر بدستور دھندلی رہی۔آخر کار سچ سامنے آ گئے:

> ''ایوب نے بھٹو اور موسیٰ کو طلب کیا اور کہا کہ سچ سچ بتایا جائے۔جنرل موسیٰ نے آخر کار تسلیم کر لیا کہ جبرالٹر یکسر ناکام ہو چکا ہے اور گرینڈ سلیم بھی جمود کا شکار ہے۔کچھ بحث و مباحثے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ وقت آ گیا ہے نقصانات کو کم کیا جائے اور آپریشن روک دیا جائے۔امید ہے کہ بھارت کو مثبت پیغام جائے گا اور وہ لڑائی مزید پھیلانے سے باز آ جائے گا۔جنرل ملک اعلیٰ کمانڈ کی نظر میں اپنی ساکھ مکمل طور پر کھو چکے تھے۔انہوں نے محض جوش کی بنا پر جبرالٹر شروع کیا جو کہ ایک چھاپہ مار آپریشن تھا لیکن اس کے لئے ان کے پاس درکار افرادی قوت تھی نہ کشمیر کے دیہاتیوں کی کوئی حمایت۔آپریشن روکنے کی ذمہ داری جنرل یحییٰ

خان کے سپرد کی گئی جنہیں اس بات پر غصہ تھا کہ انہیں جبرالٹر میں برائے
نام کردار دیا گیا''۔(ایضاً:332)۔

آپریشن کی کمان میں تبدیلی کی خبر تیزی سے پوری پاکستان میں پھیل گئی۔ اخبارات فتح دیکھنے کے موڈ میں تھے اور انہوں نے عوام کو پاکستانی دستوں کی پیشقدمی اور فتوحات کی جھوٹی خبریں بڑھا چڑھا کر بتائیں۔ الطاف گوہر کے مطابق ''آزاد اخبارات کشمیر میں برسرِپیکار اپنے ہیروز کی داستان طرازی میں سرکاری میڈیا کا مکمل ساتھ دے رہے تھے۔ ریڈیو پاکستان جو بوریت پھیلاتا تھا کو اب ہر کوئی لازماً سننے لگا۔ جنرل ملک جو مسلمان فاتح طارق بن زیاد کے نقش قدم پر چل رہے تھے جنہوں نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں ان کو دشمن کو کچلنے والا جرنیل بنا کر پیش کیا گیا۔ ایسے عین فیصلہ کن موڑ پر انہیں کمان سے کیوں ہٹایا گیا؟۔ چند افراد جانتے تھے کہ پریس کو جی ایچ کیو ہی جعلی دشمنوں کے خلاف تصوراتی کامیابیوں کی خبریں مہیا کر رہا تھا۔ حکومت کے اندر ایسا کوئی انتظام نہیں تھا کے تحت ان سٹوریوں کو چیک کیا جا سکے۔ چاہے یہ انتہائی سطح کا کیموفلاج، خودفراموشی یا مشترکہ اتفاق رائے سے گمراہ کن تاثر تھا یا ایک دوسرے کے جذبے اور امکانات کو بڑھانے کی کوشش تھی بہرحال سوچے سمجھے جھوٹ کے ذریعے ضمیر کو مطمئن کیا گیا''۔(ایضاً:2-331)۔

اس کہانی کا ایک مشہور پہلو جو زیادہ تر ریٹائر فوجی افسروں میں مقبول ہے وہ یہ ہے کہ جنرل ملک اکھنور پر قبضے کے نزدیک پہنچ چکے تھے کہ جنرل موسیٰ نے انہیں کمان سے ہٹا دیا اور جنرل یحییٰ اس اہم کامیابی کو سنبھالنے میں ناکام رہے۔ ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز جنرل گل حسن خان جو کشمیر سیل کے اہم کردار تھے-- کشمیر سیل 1964ء میں قائم ہوا-- بھی جنرل ملک کو اس ذمہ داری سے ہٹانے کے فیصلے پر شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کمان میں تبدیلی اور آپریشن گرینڈ سلیم شروع کرنے میں غیر معمولی تاخیر بڑے عوامل تھے: ''اگر جنرل ملک کو 26 یا 27 اگست کو حملے کی اجازت دے دی جاتی۔ تو مجھے یقین ہے کہ ہم محض تین روز کے اندر اپنے مقاصد حاصل کر لیتے''۔(خان 1993ء:187)۔

تاریخ دان برائن کلف لے نے بھی اس سے ملتی جلتی رائے ظاہر کی ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ جنرل ملک نے اچھا منصوبہ بنایا تھا اور اس تمام مہم کے مقاصد پر کوئی ابہام نہیں تھا۔ (2000ء:75) کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ ''جنرل ملک کو اگر چھمب

جوڑیاں سیکٹر کے مقام پر روکا نہ جاتا تو کشمیر میں بھارتی فوج کو شدید ہزیمت اٹھانا پڑتی۔ لیکن ایوب خان اپنے من پسند جنرل یحییٰ کے سر پر کامیابی کا سہرا باندھنا چاہتے تھے اور انہیں ہیرو بنانا چاہتے تھے''۔(quoted in Abbas 2005: 51) بہر حال 2 ستمبر کو کمان میں تبدیلی کا مطلب یہ ہوا کہ جاری لڑائی میں 24 گھنٹے کی تاخیر ہوگئی۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی فوجی از سر نو منظم ہو گئے۔ 4 اور 5 ستمبر کو شدید جھڑپیں ہوئیں اور پاکستان نے کچھ پیش قدمی بھی کی لیکن 6 ستمبر کو بھارتی فوج نے آخر کار لاہور اور سیالکوٹ کا محاذ کھول دیا۔ اس نقطۂ نظر کو الطاف گوہر مسترد کرتے ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جبرالٹر اور گرینڈ سلیم کے اصلی پہلو ابھی تک پردہ اسرار میں ہیں۔ میں یہاں ان کی بات تفصیل سے دے رہا ہوں۔

> ''جنرل اختر حسین ملک کو آپریشن گرینڈ سلیم کی کمان سے ہٹانے کے فیصلے پر کافی لے دے ہوئی۔ جی ایچ کیو میں عام تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ ایوب خان کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ عین اس وقت جب پاکستانی فوجیں اکھنور پر قبضہ کرنے والی تھیں۔ ایوب خان نے آپریشن اس خوف سے روکنے کا فیصلہ کیا مبادا بھارت عام جنگ چھیڑ دے۔ بعد ازاں بھٹو نے بھی ایوب کو گمراہ کرنے کیلئے اپنا کردار ادا کیا۔ سچ یہ تھا کہ جنرل ملک اندر سے ٹوٹ چکے تھے کیونکہ ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کا مشن ناکام ہو چکا ہے۔ 4 ستمبر کو انہوں نے راولپنڈی میں سیکرٹری اطلاعات (جو الطاف گوہر خود تھے) سے ملاقات کی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ بمشکل یہ الفاظ کہہ سکے۔ ''میں اپنے بچوں کو کیا منہ دکھاؤں گا''۔ انہوں نے کسی کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بولا۔ کمان میں تبدیلی کو جی ایچ کیو اور دفتر خارجہ دونوں نے اپنی نا اہلی اور غفلت چھپانے کیلئے استعمال کیا۔ بھٹو اور جنرل موسیٰ دونوں فیصلے کرنے میں سنگین غلطیوں کے مرتکب ٹھہرے۔ لیکن انہوں نے نہایت اوچھے انداز اور فریب کے ساتھ اسے چھپانے کی کوشش کی۔ انہوں نے خود کو بری الذمہ قرار دینے کیلئے گرینڈ سلیم کی دیومالا کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا''۔(ایضاً:334)۔

دسمبر 2008ء کو میری ملاقات اسلام آباد میں جنرل اختر ملک کے صاحبزادے میجر (ر) سعید اختر ملک سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے مرحوم والد کے اپنے بھائی میجر جنرل (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل) عبدالعلی ملک کو لکھے گئے خط کی مطبوعہ نقل دی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے منصوبے پر تمام فریقوں کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔ 23 نومبر 1967ء کو یہ خط انقرہ سے لکھا گیا جہاں جنرل اختر ملک پاکستان کے مستقل ملٹری اتاشی کے طور پر تعینات تھے۔ اس خط میں سے چند اقتباسات میں یہاں دے رہا ہوں۔

اے: چھمب پر قبضے کے بعد فوجی آپریشن کے پہلے ہی دن ڈی فیکٹو کمانڈ تبدیل کر دی گئی...... یہ کئی پہلوؤں سے غداری تھی۔

بی: میں نے اس پر اعتراض کیا اور پھر یحییٰ خان سے التجا کی کہ اگر وہ اس آپریشن کا سہرا باندھنا چاہتے ہیں تو پوری کی پوری کمانڈ سنبھال لیں لیکن مجھے اپنے ماتحت کے طور پر اکھنور کی طرف پیشقدمی کرنے دیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

سی: مجھے کمانڈ سے ہٹانے کے لئے ایوب، موسیٰ اور یحییٰ نے کبھی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ وہ سب انتہائی شرمسار تھے۔ میرے خیال میں اصل وجہ میرے مرنے کے بعد ہی سامنے آئے گی۔

ڈی: آپریشن جبرالٹر شروع کرنے سے پہلے پاکستان نواز کشمیری عناصر کو آگاہ نہ کرنے کا فیصلہ کمانڈ کا تھا جو میرے پاس تھی۔ آپریشن کا مقصد مسئلہ کشمیر کو ایک بار پھر زندہ کرنا تھا تا کہ جمود ختم ہو اور یہ دنیا کے سامنے آ جائے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے آپریشن کا پہلا مرحلہ نہایت اہم تھا۔ وہ یہ کہ ہزاروں دراندازوں کو سیز فائر لائن کے پار بھیجا جائے۔ میں اس پر کسی بھی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں تھا اور پورے آپریشن کو صرف شک کے ایک عنصر سے گزند پہنچ سکتا تھا۔

ای: حاجی پیر کا علاقہ میرے لئے زیادہ پریشان کن نہیں تھا کیونکہ گرینڈ سلیم کو مؤخر کرنے سے بھی بھارت اکھنور کے بعد ہی حاجی پیر پر توجہ دیتا اور انہیں نئے خطرات سے نمٹنے کیلئے پہلے فوجوں کو وہاں سے نکالنا اور اپنی کامیابیوں کو سرنگوں کرنا پڑتا۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اصل میں آپریشن جبرالٹر کے مکمل فوائد صرف اکھنور کے سقوط کے بعد ہی ملنے تھے لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔

ایف: بھٹو اس بات پر مصر رہے کہ ان کے ذرائع یہ یقین دلا رہے ہیں کہ بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی نہ کرنے کی صورت میں بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا لیکن مجھے یقین

تھا کہ جبرالٹر ہمیں جنگ کی طرف لے جائے گا اور میں نے جی ایچ کیو کو یہ بتا بھی دیا۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے کیلئے کسی آپریشن انٹیلی جنس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ایک عام فہمی کی بات تھی۔ یہ بات سوچنا نہایت احمقانہ ہوگی کہ میں اگر آپ کو گلے سے پکڑوں تو آپ جواب میں مجھے چوم لیں گے۔ یہ بات اظہرمن الشمس تھی کہ جنگ ناگزیر ہے۔ گرینڈ سلیم کے اولین مقصد کے طور پر جموں میری ترجیح تھی۔ وہاں سے ہم آگے سامبا یا کشمیر کی طرف بڑھ سکتے تھے، صورتحال کے مطابق اگر ہم ایسا کر لیتے تو بھارت کیونکر یہ علاقے کلیئر کرانے سے پہلے سیالکوٹ پر حملہ کر سکتا تھا۔

جی: میں نے اپنی کتاب لکھنے پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا لیکن پھر اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔ یہ کتاب سچ پر مبنی ہوتی۔ اور سچائی اور اس کتاب پر مقبول ردعمل میری انا کیلئے بہتر ہوتا لیکن بحیثیت مجموعی یہ اقدام حب الوطنی کے منافی ہوگا۔ اس سے آرمی کا مورال تباہ ہو سکتا تھا اور عوام میں ساکھ متاثر ہو سکتی تھی۔ یہ کتاب پاکستان میں ممنوع قرار دی جا سکتی تھی اور بھارت میں بطور درسی کتاب پڑھائی جا سکتی تھی۔ مجھے اس بات میں بہت کم شائبہ تھا کہ بھارت اس اقدام پر ہمیں معاف کرے گا اور پہلی فرصت میں انتقام لے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں مشرقی پاکستان میں نشانہ بنائے گا اور ہمیں اس صورتحال سے بچنے کیلئے ہر ممکن اقدام کرنا پڑے گا...... اور ہاں ایوب خان اس پورے معاملے میں ملوث تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ آئیڈیا ہی ان کا تھا''۔

اگرچہ شجاع نواز عموماً اختر ملک کے دعوؤں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ جموں پر قبضہ کرنے کا ارادہ ان کا ''خفیہ ہتھیار'' تھا۔ لیکن اس منصوبے کی انہوں نے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ اگر جموں پر قبضہ ہو جاتا تو بھارت کا کشمیر کے ساتھ زمینی رابطہ کاٹا جا سکتا تھا۔ ایسے اقدام کو شاندار عسکری حکمت عملی سمجھا جاتا لیکن شجاع نواز نے کشمیر میں محدود جنگ کی صورت میں بھارت کی طرف سے تیار کئے گئے کئی جوابی اقدامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ میجر آغا ہمایوں امین البتہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے پاس کشمیر میں اہم کامیابیوں کا یہ سنہری موقع تھا، اگر وہ اکھنور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیتا۔

جنگ ستمبر

یہ خیال کہ بھارت جوابی کارروائی نہیں کرے گا اور پاکستان کے آسان ہدف شہروں لاہور

اور سیالکوٹ کو نشانہ نہیں بنائے گا ایک بھیانک غلط اندازہ تھا۔ بھارتی کابینہ نے 1949ء میں پہلے ہی پاکستان کے ممکنہ حملے کی صورت میں اکھنور واپس لینے اور اس کے ساتھ لاہور اور سیالکوٹ پر حملے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ:

''......ایسے کسی اقدامات کی صورت میں کشمیر میں موجود بھارتی فوجی دستے مخالف فوج کو روکیں گے جبکہ بھارت کی مرکزی فیلڈ فوج لاہور اور سیالکوٹ کی طرف تیز اور پرعزم پیشقدمی کرے گی۔ اگر ممکن ہوا تو پاکستان فوجوں کی توجہ مغربی پنجاب کے مرکزی محاذ میں مرکوز ہونے سے روکنے کیلئے راولپنڈی اور کراچی کی طرف بھی پیشقدمی کی جائے گی۔ اس حکمت عملی کا بنیادی مقصد پاکستان کی فیلڈ آرمی کو کم سے کم وقت میں فیصلہ کن شکست سے دوچار کرنا اور لاہور پر قبضہ کرنا ہے تاکہ پاکستانی حکومت کو جتنی جلد ممکن ہو سکے امن مانگنے پر مجبور کیا جا سکے''۔ (کلف لے 82:2000)۔

6 ستمبر 1965 کو صبح ساڑھے 5 بجے بھارتی فوج نے پاکستان کی طرف پیشقدمی کا آغاز کر دیا۔ پاکستانی انٹیلی جنس بشمول آئی ایس آئی...... جس نے آنے والے برسوں میں پاکستانی سیاست میں نہایت اہمیت اختیار کر لی...... افسوسناک طور پر اس پیشقدمی کا پتہ چلانے اور یہ رپورٹ دینے میں ناکام ہو گئی کہ بھارت میں دراندازی کرنے والے ایس ایس جی کمانڈوز بھارتی پیشقدمی میں مزاحمت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ حالات کیسے بھی تھے پاکستانی فوجیوں کو تیار اور چوکس رہ کر بھارتی پیشقدمی روکنی چاہیئے تھی لیکن جس وقت بھارتی فوجی لاہور پہنچے تو اس وقت سرحد پر تعینات توپخانے کے سپاہی صبح کی معمول کی مشقیں کرنے میں مصروف تھے۔ یہ دراصل پاکستانی ائیرفورس تھی جس نے سب سے پہلے لاہور کے باہر بھارتی فوجیوں کی غیر معمولی نقل و حرکت نوٹ کی اور جی ایچ کیو کو رپورٹ دی۔ ایسا لگا کہ پاکستان کی ہائی کمان کو یقین تھا کہ بھارتی فوج کسی بھی قسم کے حالات میں بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گی۔ بہرحال بالآخر جب یہ خبر نشر ہوئی تو پاکستان نے لاہور میں سخت مزاحمت شروع کر دی۔ اس وقت بھارت نے بھی لاہور پر سٹرٹیجک بالادستی کیلئے حیران کرنے والے عناصر کا بھرپور استعمال نہ کیا۔ الطاف گوہر نے پاکستانی قیادت کا ردعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

''جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تو سب سے زیادہ حیران ہونے والی شخصیت ایوب خان تھے۔ ان کے ساتھ پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف بھی حیرت زدہ تھے۔ دونوں نے یہ اندازہ لگایا کہ آپریشن گرینڈ سلیم لپیٹنے سے بھارت کو سکون ملا ہے لیکن انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ بھارت کی ملٹری انٹلی جنس سروسز بھی پاکستانی انٹیلی جنس کی طرح سست تھیں۔

''بھٹو اور عزیز احمد نے عارضی طور پر اپنی سرگرمیاں مؤخر کر دیں۔ ان کی بھارتی عزائم سے متعلق تمام پیشنگوئیاں اور یقین دہانیاں بری طرح غلط ثابت ہوئیں۔ وہ یہ بھی دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں بھارتی حملے کی کوئی وارننگ نہیں ملی تھی''۔ (گوہر 1998: 335)۔

گوہر الطاف نے اپنی کتاب میں بھارتی حکومت اور اس کی قیادت کے عوامی بیانات کی کئی مثالیں پیش کیں ہیں جس سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا تھا کہ بھارت فوجی کارروائی کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر ارشد حسین نے 4 ستمبر کو دہلی میں ترکی کے سفارتخانے کے توسط سے دفتر خارجہ کو سائفر (سفارتخانوں میں استعمال ہونے والی خصوصی مشین) پیغام ارسال کیا کہ بھارت 6 ستمبر کو پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ الطاف گوہر نے الزام لگایا کہ وزیر خارجہ بھٹو اور سیکرٹری خارجہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس پیغام کو دبا لیتے ہیں کیونکہ ارشد حسین جو اپنے نروس رویے کی وجہ سے مشہور تھے نے حسب سابق سراسیمگی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ (ایضاً: 336)۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان 17 روز تک بری، فضائی اور بحری محاذ پر شدید لڑائی ہوئی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے قوم سے پہلے انگریزی اور پھر اردو میں خطاب کیا اور کہا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ شروع ہو چکی ہے کیونکہ بھارت نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ انہوں نے مشاورت کیلئے تمام سیاسی رہنماؤں کو مدعو کیا تاہم مشرقی پاکستان سے کوئی نہ آیا کیونکہ جنگ کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پروازیں معطل تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ تمام رہنماؤں نے حکومت کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

لاہور سے کچھ فاصلے پر بھارتی گاؤں کھیم کرن پر پاکستان کی فوج نے قبضہ کر لیا تو پاکستانی

قیادت مزید کامیابیوں کیلئے پراعتماد ہوگئی۔ ریڈیو پاکستان سے پاکستانی فوج کی دلنشین کامیابیوں کی کہانیوں کی برسات ہونے لگی۔ پریس نے بھی تباہ شدہ بھارتی ٹینکوں، طیاروں اور دیگر ساز و سامان کی تصویریں شائع کر کے اس پراپیگنڈہ مہم کا بھرپور ساتھ دیا۔ سیکرٹری خارجہ عزیز احمد نے تو یہاں تک مطالبہ کیا کہ ''لاکھوں کی تعداد میں پراپیگنڈہ پرچے شائع کر کے ائیرفورس کے طیاروں سے امرتسر پر گرائے جائیں اور سکھوں کو پیغام دیا جائے کہ پاکستان انہیں ہندوؤں کے غلبے سے نجات دلانے آ گیا ہے'' ۔ (ایضاً:339)۔ ایک بار پھر صوبہ سرحد کے قبائلیوں کو بلایا گیا۔ گوہر الطاف کے مطابق جی ایچ کیو نے این ڈبلیوایف پی سے قبائلیوں کے بڑے بڑے جتھے بلائے تا کہ وہ لاہور کے محاذ پر اگلے مورچوں پر برسر پیکار فوجیوں کا ساتھ دے سکیں۔ قبائلیوں نے راستے میں آنے والی ہر دکان لوٹ لی لیکن انتظامیہ نے یہ کہہ کر صرف نظر کیا کہ یہ قبائلیوں کی دشمن کے خلاف لڑائی میں روایت کا حصہ ہے۔ یہ قبائلی جنرل حامد کیلئے بہت بڑا دردسر بن گئے کیونکہ وہ پنجاب میں انہیں کوئی ایسی پہاڑی یا گھاٹی فراہم نہیں کر سکتے تھے جہاں چھپ کر وہ اپنی روایتی صلاحیتوں کا مظاہر کر سکیں۔ انہوں نے ایسے علاقوں میں فضائی حملوں کے مقابلے میں خود کو سامنے لانے سے انکار کر دیا جہاں چھپنے کیلئے صرف گرد وغبار کے بادل واحد پناہ تھے۔ چنانچہ جنرل حامد کو زبردستی ان قبائلیوں کو ان کی قبائلی پناہ گاہوں میں واپس بھجوانا پڑا'' ۔ (ایضاً:340)۔

میں (مصنف) خود بھی لاہور کی فضاؤں میں بھارتی اور پاکستانی طیاروں کی آنکھ مچولی کا چشم دید گواہ ہوں۔ لوگ گلیوں اور چھتوں پر چڑھ کر یہ لڑائی دیکھتے تھے۔ ان میں سے ایک طیارہ مار گرایا گیا۔ دھویں کی طویل دم بناتا یہ طیارہ نیچے آ گیا۔ اگلے روز تمام اخبارات میں بھارتی گنات Gnat طیارے کے ملبے کی تصویریں شائع ہوئیں جس سے غیر معمولی جنون پیدا ہو گیا۔ مجموعی طور پر پاکستانی/مسلم بہادری اور بھارتی / ہندوؤں کی بزدلی کی دیومالا عام موضوع بن چکا تھا۔ اس منظر نامہ کے باوجود امیر لوگوں کی بڑی تعداد پرتعیش گاڑیوں میں بیٹھ کر پاک بھارت سرحد سے دور علاقوں میں جارہی تھی اور ان کی لمبی لمبی قطاریں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ افواہ پھیل گئی کہ بھارتی جاسوس اور گھس پیٹھیے ہر جگہ ہیں چنانچہ لوگ کسی کو بھی مشکوک سمجھ کر اس کی پٹائی کر دیتے۔ اس صورتحال کا ایک بدنما پہلو یہ بھی تھا کہ لوگ اقلیتی افراد کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بناتے کہ وہ بھارت کو سگنل بھیج رہے تھے۔ یہی حالت بھارت میں تھی جہاں مسلمانوں کو بالخصوص پاکستان کیلئے جاسوسی

کا موردالزام ٹھہرایا گیا۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل

بھٹو اور عزیز احمد جنگ کے نتائج اپنے سکرپٹ کے مطابق نہ نکلنے کی صورت میں اقوام متحدہ کی مداخلت کے آپشن کیلئے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ یہ سکرپٹ اس احمقانہ اندازے پر استوار تھا کہ بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل نے صورتحال پر نوٹس لیتے ہوئے متفقہ قرارداد منظور کی جس میں دونوں ملکوں سے فوری طور پر فائر بندی کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ قرارداد 4 اور 6 ستمبر کو منظوری کی گئی جس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کی طرف سے سرحد پار کرنے سے پہلے ہی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ایوب خان نے پاکستان کے دورے پر آئے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری مسٹر یوتھانت (U Thant) کو بتایا کہ اگر اقوام متحدہ نے مسئلہ کشمیر حل نہ کیا تو وہ گویا ایک اور جنگ کی بنیاد رکھے گا۔ سعودی عرب کے بادشاہ نے پاکستان کو مالی امداد کی پیشکش کی جبکہ انڈونیشیا نے آبدوزیں اور بحری جنگی جہاز بھجوائے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ فرانس نے 30 طیارے دینے کی پیشکش کی جن میں سے 10 فوری طور پر دیے جانے تھے۔ CENTO معاہدے کے برعکس ترکی نے پاکستان کو اسلحہ مہیا کیا۔ سینٹو نے تو اس جنگ پر کوئی باضابطہ مؤقف اختیار نہ کیا جبکہ سیٹو SEATO نے جنگ کے فوراً بعد اعلان کیا کہ پاکستان اور بھارت کی لڑائی اس کے دائرہ کار سے باہر تھی۔ (زائرنگ 62:1971)۔ 9 ستمبر کو ایوب خان نے اپنی کابینہ کو بتایا کہ پاکستان کی طرف سے کسی بھی قسم کی پیشقدمی پر بھارتی زبردست مزاحمت کریں گے۔ (ایضاً)۔

امریکہ اور پاکستان کے رابطے

کشمیر کی مہم جوئی سے کچھ ماہ قبل وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے 28 مارچ 1965ء کو کراچی میں پریس کانفرنس میں کہا کہ امریکہ ایک ایسے ملک بھارت کو زور و شور سے فوجی ساز و سامان مہیا کر رہا ہے جو پاکستان کیلئے مخاصمانہ رویہ رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ اور پاکستان کے اتحاد کے تصور پر مشتمل سپنوں کا محل دھڑم سے نیچے آ گرا۔ تاہم بھٹو نے پاکستان کے لئے امریکہ کی فراخدلانہ اقتصادی اور عسکری حمایت پر شکریہ ادا کرتے ہوئے واضح کیا کہ چین کے ساتھ قریبی

تعلقات امریکہ کی قیمت پر قائم نہیں کیے جا رہے۔ (جین 2007اے:51)۔

بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں مجاہدین بھیجنے سے عین پہلے صدر ایوب خان نے امریکی صدر جانسن کو خط لکھتے ہوئے کہا کہ آپ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے بھارت کو برصغیر میں جنگ شروع کرنے سے باز رکھیں۔ (ایضاً)۔ یکم اگست کو پاکستانی قوم سے خطاب میں ایوب خان نے عوام کو آگاہ کیا کہ پاکستان نے امریکہ کو قائل کرنے کی ناکام کوشش کی وہ پاکستان کو لاحق اس خطرے کا ادراک کرے جو بھارت کو امریکی اسلحہ دینے سے پیدا ہو رہا ہے۔ (ایضاً:52)۔

ایسے دلائل امریکہ کو متاثر نہ کر سکے کیونکہ امریکی جانتے تھے کہ پاکستانی دراندازبھارتی کشمیر میں گھس رہے تھے اور انہیں تصادم کی شدت بڑھنے کا بھی احساس تھا۔ 29 اگست کو ستمبر کی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہی روز پہلے صدر جانسن نے دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتی کشیدگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تبصرہ کیا کہ ''ہمارا ہمیشہ سے دیرینہ اور انتہائی ٹھوس مؤقف یہ رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر پرامن طریقوں سے حل کیا جائے''۔ (ایضاً:53)۔

8 ستمبر کو امریکی محکمہ خارجہ نے پاکستان اور بھارت کو اسلحے کی فراہمی معطل کر دی۔ پاکستان میں امریکی سفیر والٹر پی مک کنافے Walter P Mc Cnaughy نے بھٹو سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ کانگریس نے بھارت اور پاکستان دونوں کو تمام قسم کی فوجی امداد کی فراہمی معطل کر دی ہے لیکن یہ بطور سزا نہیں بلکہ اس کا مقصد قیام امن کے لئے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کی کوششوں کو تقویت پہنچانا ہے۔ بھٹو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ پاکستان امریکہ کا دوست اور اتحادی اور اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ جبکہ اقوام متحدہ ضرورت کی اس گھڑی میں جبکہ پاکستان کے شہروں کو بمباری کا نشانہ بنایا جا رہا ہے ہمیں ہزیمت پہنچا رہا ہے۔ گوہر الطاف نے امریکی سفیر اور بھٹو کے درمیان گفتگو کے اگلے مرحلے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''مک کنافے نے ان (بھٹو) سے پوچھا کہ کیا آپ نے پہلے یہ نہیں سوچا تھا؟ یہ فیصلہ بد قسمتی پر مبنی ہے کہ آپ نے منصوبہ بندی کی اور مجاہدین کے آپریشن کو منظم کیا۔ بھٹو نے صاف طور پر مکرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ایسی کسی کارروائی میں ملوث نہیں لیکن یہ اعتراف ضرور کیا کہ مجاہدین کو پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔ بھٹو نے اس موقع پر دعویٰ کیا کہ ''جارحیت کا مظاہرہ بھارت نے کیا ہے جبکہ ہم اپنی غیرت کے لئے لڑ رہے ہیں''۔

حکومت پاکستان کی بڑھتی مشکلات

چند روز کے اندر ہی جنگ کی صورتحال پاکستان کے حق میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس بارے میں گوہر الطاف نے حیران کن انکشاف کیا ہے کہ...... جنگ کے بعد 10 ستمبر تک گوہر سمیت متعلقہ وزارتوں کے حکام، جی ایچ کیو کے نمائندوں سے ملاقات ہی نہ کر سکے تاکہ بھارت کے ساتھ جنگ میں سیاسی مقاصد کے حصول پر کوئی حکمت عملی طے کی جا سکے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ اس معاملے پر اس وقت غور نہیں کیا گیا جب جبرالٹر کی منصوبہ بندی کی گئی۔ ''عزیز احمد اس بات کی مزید وضاحت نہیں کر سکے تھے کہ آخر ملک کو جنگ کی بھٹی میں کیوں دھکیلا گیا تھا''۔ وہ لکھتے ہیں کہ کسی کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی کہ اس کا جائزہ لے کہ بھارت کے ساتھ موجودہ تنازعے کا دورانیہ اور لمبائی کتنی ہوگی اور پاکستان دفاعی ضروریات کیسے پوری کرے گا۔ (ایضاً)۔

ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان جو معرکہ رن آف کچھ کے فوراً بعد ریٹائر ہو گئے تھے کو جنگ ستمبر کے آغاز کے 4 روز بعد ایوب خان نے فوجی امداد کی درخواست کے لئے بیجنگ بھیجا۔ بالخصوص طیارے بھجوانے کے استدعا کی گئی لیکن تاکید کی گئی کہ یہ طیارے انڈونیشیا کے راستے بھیجے جائیں۔ وجہ یہ تھی کہ ایوب خان امریکیوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چین کو اس درخواست پر نہایت حیرت ہوئی لیکن انہوں نے بہر حال منظوری دے دی۔ چین سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ اپنی فوجوں کو لداخ، تبت بارڈر پر لے آئے۔ چینی قیادت نے اصغر خان سے کہا کہ اگر چہ اس درخواست کے بین الاقوامی مضمرات ہو سکتے ہیں تاہم چین اس پر ضرور غور کرے گا۔ حتی کہ چواین لائی نے ایوب خان سے ملاقات کی بھی پیشکش کی لیکن انہوں نے گریز کرتے ہوئے اسے جنگ کے بعد تک ٹال دیا۔ بہر حال چین نے طیارے اور اسلحہ انڈونیشیا کے راستے بھجوا دیا۔ اصغر خان نے انڈونیشیا کا بھی دورہ کیا۔ جہاں انہوں نے صدر احمد سوئیکارنو کو اپنا مدد معاون پایا۔ (خان 235-40:2005)۔ وہ بعد ازاں ایران اور ترکی بھی فوجی امداد کی درخواست کرنے گئے۔

اس دوران پاکستان کی مشکلات بڑھتی جا رہی تھیں۔ کھیم کرن سیکٹر پر کئے جانے والا حملہ اس وقت روکنا پڑا جب بھارت نے مادھو پور نہر کا بند توڑ کر علاقے میں سیلابی کیفیت پیدا کر دی۔ ایک اور کہانی بھی سنائی جاتی ہے کہ چونکہ پاکستان کے ٹینک بہت زیادہ بھاری تھے اس لئے نہر کا

پل ان کا وزن نہ سہار سکا اور یوں کئی ٹینک پانی میں ڈوب گئے۔اس سے پاکستان کی جنگی حکمت عملی نہایت متاثر ہوئی۔: ''کھیم کرن پر حملے کے خلاف جوابی کارروائی 11 ستمبر کو کی گئی اور اس سے پاکستان کی پوری کی پوری عسکری حکمت عملی تہس نہس ہوگئی۔ پاکستان کے نزدیک جنگ ختم ہو چکی تھی''۔(گوہر 1998)۔

نومبر 2010 میں دہلی میں بھارتی فوج کے 2 سابق افسروں لیفٹیننٹ جنرل کلد یپ سنگ کھجوریہ اور بریگیڈئیر وجائی نائیر جنہوں نے 1965 کی جنگ لڑی تھی نے مجھے بتایا کہ اس محاذ پر پاکستانی ٹینک بطخ کی طرح بیٹھ گئے اور کیچڑ میں پھنس کر رہ گئے۔انہوں نے بتایا کہ پاکستانی فوجی سراسیمگی میں ٹینک چھوڑ کر بھاگ گئے۔اس کی انہوں نے اس اقدام کی ایک اور وجہ یہ بتائی کہ مسلمانوں کے نزدیک آگ میں جل کر مرنا مذہبی طور پر حرام ہوتا ہے۔بہر حال بھرپور شدت کی جنگ کے بعد پاکستان کو اسلحے، فاضل پرزہ جات اور بارود کی شدید قلت لاحق ہوگئی۔اس صورتحال کو گوہر الطاف نے ان لفاظ میں بیان کیا ہے:۔

> ''اب بری اور فضائی فوج کو فاضل پرزہ جات، ایمونیشن اور تیل کی شدید کمی کا سامنا تھا اور دوست ملکوں سے اضافی سپلائی کیلئے سرتوڑ کوششیں کی جا رہی تھیں۔ 11 ستمبر کی شام کو نذیر احمد نے بتایا کہ ترکی اور ایران دونوں بکتر بند گاڑیاں تباہ کرنے والا اسلحہ دینے کو تیار نہیں جس پر ایوب خان شرمسار ہو گئے...... چونکہ ٹینکوں کی بڑی لڑائیاں سیالکوٹ کے محاذ پر ہو رہی تھیں اس لئے فوج کو ٹینک شکن اسلحے کی شدید ضرورت تھی''۔(ایضاً:344)۔

چین کا کارڈ

اس نازک موڑ پر پاکستانی قیادت نے محسوس کیا کہ مغربی طاقتیں خصوصاً امریکہ پاکستان کی مدد کرنے کے خواہاں نہیں۔اس کے برعکس پاکستان پر بعض پابندیاں لگانے کی باتیں کی گئیں۔ الطاف گوہر نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر حل ہونے تک سیز فائر پر رضامند نہ ہوں اور بھارت کو مسئلے کے حل پر مجبور کرنے کیلئے چین کا کارڈ استعمال کرنا چاہیئے۔چین نے اپنا کردار ادا کرتے ہوئے بھارت کو تنبیہہ کی اور دھمکی

دی اور ایسے بیانات جاری کئے جن میں مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کی حمایت کی گئی۔ چین نے بھارت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ چین کے ساتھ سرحد پر اپنی عسکری سرگرمیاں بند کردے، چین کے پکڑے گئے مویشی (لائیو سٹاک) اور مغوی چینی شہریوں کو واپس کردے۔ 7 ستمبر کو چین نے بھارت کی جارحیت کی مذمت کی اور خبردار کرتے ہوئے کہا کہ یہ انڈیا کی بھول ہے کہ وہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ امریکیوں اور روسیوں کی پشت پناہی پر وہ اپنے ہمسائیہ ملکوں کے ساتھ بدمعاشی کرسکتا ہے۔ (ایضاً:347)۔

اس کے جواب میں بھارت نے چین کے خلاف مدد کیلئے امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین سے رجوع کیا۔ برطانوی وزیراعظم ہیرالڈ ولسن نے ایک بیان میں اعلان کیا کہ اگر چین نے پاک بھارت جنگ میں مداخلت کی تو برطانیہ اور امریکہ بھارت کا ساتھ دیں گے۔ (ایضاً:348)۔ البتہ پاکستان میں صورتحال ایسی تھی کہ جنگ میں طوالت ہرگز دانشمندی نہیں تھی۔ دفاعی سامان کا ذخیرہ اور سپلائی کم تھی۔ ایوب خان سے بری اور فضائی فوج کے سربراہوں نے کہا کہ وہ امداد کے لئے امریکہ سے کہیں۔ بی بی سی کے مطابق 15 ستمبر کو پریس کانفرنس میں صدر ایوب نے امریکی صدر لنڈن جانسن پر زور دیا کہ وہ اس جنگ میں براہ راست مداخلت کریں۔ اس کے جواب میں بھارتی وزیر اعظم نے ایک بیان میں پاکستان کو خبردار کیا کہ وہ جموں وکشمیر میں مداخلت سے باز رہے اور یہ کہ بھارتی فوج کی کارروائیاں بلاتوقف جاری رہیں گی۔ (ایضاً:350)۔

امریکی ردعمل واضح طور پر مختلف تھا۔ 17 ستمبر کو سلامتی کونسل میں امریکی نمائندے گولڈ برگ نے بتایا کہ:

> ''ہم نے دونوں ملکوں کو اسلحے کی سپلائی معطل کردی ہے۔ کیونکہ ہم سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کرتے ہیں جس میں سیز فائر کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ امریکہ اس تصادم میں اضافہ نہیں اس کا خاتمہ چاہتا ہے...... ہم مختلف قابل احترام معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہماری طرف سے فراہم کردہ اسلحے کے استعمال کی مذمت کرتے ہیں''۔ (جین:309)۔

اس بیان میں معاہدوں کی جس خلاف ورزی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ واضح طور پر پاکستان

کے متعلق تھا جو امریکی اسلحے پر بھاری انحصار کرتا تھا۔ پاکستان نے پہلے بھی اس معاہدے کو توڑا جب معرکہ رن آف کچھ میں امریکہ کے پٹن ٹینک استعمال کئے گئے۔(حسین 2010:209)۔

ایوب کا خفیہ دورہ چین

19 اور 20 ستمبر کی رات کو ایوب اور بھٹو نے بیجنگ کا انتہائی خفیہ دورہ کیا اور چینی وزیر اعظم چواین لائی سے ملاقات کی۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ چینی قیادت نے زور دیا کہ پاکستان لڑائی میں ڈٹا رہے اور اگر پاکستان کے چند شہر ہاتھ سے چلے بھی جائیں تو ہمت نہ ہاری جائے۔ اس موقع پر چین کے چھاپہ مار لڑائی کے تجربے کی کئی مثالیں بھی دی گئیں۔ یا چین نے یقین دلایا کہ اگر پاکستان طویل گوریلا جنگ لڑنے کا فیصلہ کرتا ہے تو چین غیر مشروط حمایت کرے گا۔ اس قسم کی لڑائی پر ایوب تیار تھے نہ بھٹو: گوہر الطاف ہمیں بتاتے ہیں کہ:

> ''ایوب نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ بھارتی چند شدید ضربوں کی تاب لا سکتے ہیں جبکہ بھٹو نے کبھی عوام کی طویل لڑائی کا نہیں سوچا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ فوج اور ائیر فورس جنگ یا تنازعہ میں مزید کسی بھی قسم کے طول کی قطعاً مخالف تھی''۔

جنرل موسیٰ کے حوصلے اسلحے اور فاضل پرزہ جات کی کمی سے پست تھے اور ائیر مارشل نور خان اس لئے متفکر تھے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کے پاس لڑاکا طیاروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔(گوہر 1998ء:353)۔

ایوب کو لاہور پر ممکنہ بھارتی قبضے پر سخت تشویش لاحق تھی۔ بھٹو نے اس دوران چین کے سفیر سے رابطہ کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ لڑائی جاری رکھیں۔ انگریزی اخبار ''ڈان'' کے ایڈیٹر الطاف حسین سمجھتے ہیں کہ 7 ستمبر کو چین کی دھمکی سے واشنگٹن کے ایوانوں میں زلزلہ طاری ہو گیا۔ لیکن یہ الطاف حسین کی محض خام خیالی تھی۔ اس وقت کے سیکرٹری اطلاعات کے مطابق ڈان کے ایڈیٹر کے خیالات پڑھ کر ائیر مارشل نور خان کے چہرے پر عدم اتفاق کے واضح آثار دیکھے جا سکتے تھے۔(ایضاً:355)۔

اگلے چند روز سیز فائر سے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد کے مسودے پر بحث و تمحیص میں

گزرے۔ 22 ستمبر کو دونوں ملکوں نے جنگ بندی کر دی۔ بظاہر امریکہ اور سوویت یونین نے فریقین کو اس بات پر رضامند کیا۔ جنگ میں بھارت کے 3 ہزار جبکہ پاکستان کے 3800 افراد مارے گئے۔ (بحوالہ لائبریری امریکی کانگریس) سوویت یونین کے وزیر اعظم کوسیجن Kosygin نے صدر ایوب اور بھارتی وزیر اعظم شاستری دونوں کو باہمی تنازعہ حل کرنے کی کوشش کے طور پر تاشقند آنے کی دعوت دی۔

سینئر سفارتکار سلطان محمد خان نے تصدیق کی ہے کہ کھیم کیرن کے محاذ پر پاکستان کا واحد آرمرڈ ڈویژن (ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر مشتمل) تباہ ہونے کے بعد پاکستان کے نزدیک جنگ منطقی انجام تک پہنچ چکی تھی۔ سلطان محمد اس وفد میں شامل تھے جس نے بھٹو کی سربراہی میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کی اور جہاں پاکستان نے سیز فائر پر آمادگی ظاہر کی۔ سلطان محمد نے ایوب خان کیلئے مشکل کی اس صورتحال کو استعمال کرنے کے حوالے سے بھٹو کی کراہت آمیز منظر کشی کی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران یہ بھڑک ماری کہ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حصول کے لئے ضرورت پڑی تو پاکستان ہزاروں سال جدوجہد کرے گا۔ (خان 1997ء: 147)۔

البتہ تند و تیز بیانات کے بعد بھٹو وہاں گئے اور بظاہر ایوب خان سے فون پر بات کی۔ واپسی پر وہ اجلاس میں آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ آئے اور اعلان کیا کہ صدر پاکستان نے ہدایت کی ہے کہ سیز فائر قبول کر لیا جائے۔ البتہ سلطان محمد خان نے دعویٰ کیا ہے کہ واپسی پر طیارے میں سفر کے وران بھٹو قہقہے مارتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ عوام جہاں میرے گلے میں ہار ڈالیں گے وہاں ایوب خان کو آڑے ہاتھوں لیں گے۔ (ایضاً: 147)۔ سلطان محمد نے لکھا کہ:

''ایسی کارکردگی کے بارے میں کوئی کیا سوچے گا؟۔ کیا یہ ایک سیاستدان کی طرف سے گھٹیا، ڈرامائی اور سوچا سمجھا ڈرامہ تھا تا کہ وطن واپسی پر عوام کو بے وقوف بنایا جا سکے۔ بھٹو کو یہ ہدایات دے کر سلامتی کونسل بھجوایا گیا تھا کہ (ان ہدایات کی خود انہوں نے وکالت کی) وہ سیز فائر کی قرارداد قبول کر لیں۔ اجلاس کے دوران ایوب خان کے فون کا ڈرامہ رچا کر وہ خود کو صدر سے دور کر رہے تھے۔ انہوں نے معاہدہ تاشقند کے بعد بھی ایسا ہی کیا اور وعدہ کیا کہ وہ ایک روز قوم کے سامنے اس راز پر پردہ اٹھائیں گے لیکن ایسا کبھی نہ ہو سکا'' (کیونکہ خفیہ بات کوئی تھی ہی

نہیں)۔(ایضاً:8-147)۔

جنگ پر میجر جنرل سید وجاہت حسین کا تبصرہ

ستمبر 12 سے 17 تک جنگ کے محاذ پر لڑنے والے میجر جنرل سید وجاہت حسین نے 26 ستمبر کو افسروں کے اجتماع سے ایوب خان کی تقریر پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ صدر نے کہا کہ:

''حضرات: اس جنگ کا پہلا سبق ہم نے یہ سیکھا ہے کہ کشمیر میں کسی بھی کارروائی کی صورت میں بھارت بین الاقوامی سرحد پار کرے گا''۔(2010:230) وجاہت حسین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''اس بات سے تو لگتا ہے کہ وہ شروع سے ہی غیر فعال تھے''۔(ایضاً)۔انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اپنے انتقال سے کئی سال پہلے ایوب خان نے اعتراف کیا کہ ان کی سب سے بڑی غلطی جنگ میں الجھنا تھی اور اس کا مشورہ بھٹو اور دیگر سخت گیر عناصر نے دیا تھا۔ وجاہت حسین نے بھٹو، جنرل اختر ملک اور گل حسن سمیت عقابوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے دعویٰ کیا کہ امریکیوں نے صاف صاف واضح کر دیا تھا کہ وہ بھارت کے خلاف جارحیت کی صورت میں اسلحے اور ساز و سامان کی سپلائی روک دیں گے۔ اس کا غیر مبہم اظہار 1954 کے معاہدے میں کیا گیا تھا۔

ائیر مارشل نور خان کے انکشافات

کئی سال بعد 1965ء کی جنگ سے متعلق فرد جرم ائیر مارشل نور خان کی طرف سے آئی جو اس وقت فضائیہ کے سربراہ تھے۔ انگریزی اخبار ڈان کراچی نے 1965 کی جنگ کے 40 سال مکمل ہونے کے موقع پر 5 ستمبر 2005ء کو نور خان کا خصوصی انٹرویو شائع کیا جس میں انہوں نے کہا کہ کشمیر کی مہم جوئی میں الجھنے سے پہلے اس مجوزہ آپریشن کے بارے میں افواہیں زوروں پر تھیں لیکن فوج نے دیگر فورسز (فضائیہ، بحریہ) کے ساتھ اس بارے میں کوئی مشاورت نہیں کی۔ میں نے اصغر خان سے 29 جولائی 1965ء کو فضائیہ کی کمان سنبھالی لیکن میرے پیشرو نے اس بابت مجھے کوئی بریفنگ نہ دی۔ محض اس لئے کہ انہیں خود بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ چنانچہ نور خان نے کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ خان سے ملاقات کی جنہوں نے اعتراف کیا کہ اس بارے میں کچھ زیر غور ہے۔ یہ سن کر نور خان نے چھوٹتے ہی کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ جنگ ہوگی تو موسیٰ خان نے

تسلی دی کہ فکر نہ کرو، آپریشن کے جواب میں بھارت کارروائی نہیں کرے گا۔ کمانڈر انچیف نے مشورہ دیا کہ نور خان مزید تفصیلات کے لئے آپریشن جبرالٹر کے انچارج جنرل اختر ملک سے رابطہ کرلیں۔ جنرل اختر ملک نے انہیں بتایا کہ منصوبہ یہ ہے کہ 80 ہزار دراندازمقبوضہ کشمیر میں بھیج کر مقامی آبادی کی مدد سے بھارتی فوجیوں کو نکال باہر کیا جائے۔ یہ سارا منصوبہ اس انداز میں بنایا گیا ہے کہ بھارت جوابی کارروائی کرنے کے قابل نہیں ہو گا۔ اختر ملک کی بات کے تناظر میں ائیر فورس کو جنگ کی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خان 2005:1)۔ نور خان کو یہ سن کر شدید دھچکا لگا جب مزید استفسار پر انہیں معلوم ہوا کہ اعلیٰ جرنیلوں کے محدود ہم خیال گروہ کے سوا مسلح افواج میں محض چند افراد کو آپریشن جبرالٹر کا پتہ تھا۔ انہیں زیادہ حیرت اس لئے ہوئی کہ جنرل موسیٰ اور جنرل اختر ملک جیسے پروفیشنل جنرل بھی ایسے غیر ذمہ دار اور اناڑی ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ لاہور کے گیریژن کمانڈر تک کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ اس طرح مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خان آف کالاباغ کو کچھ پتہ نہیں تھا چنانچہ وہ چھٹیاں گزارنے مری گئے ہوئے تھے۔

انٹرویو میں نور خان نے بتایا کہ پہلے تو انہوں نے عہدے سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا لیکن پھر محسوس کیا کہ ایسے جذباتی فیصلے سے قوم کے مفادات کو مزید گزند پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 6 ستمبر کو جنگ کے پہلے روز پاکستانی ائیر فورس نے معجزانہ طور پر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ نور خان نے اس کا سارا کریڈٹ سابق ائیر چیف اصغر خان کو دیا جنہوں نے 1957ء کو پی اے ایف کا چارج سنبھالا تا کہ وہ فضائیہ کو ایک بہترین لڑاکا مشین بنا سکیں۔ اصغر خان نے دستیاب امریکی ساختہ بمباروں اور لڑاکا طیاروں پر فضائیہ کے اہلکاروں کو زبردست انداز میں تربیت دلائی۔ طیارے اڑانے اور ان کی دیکھ بھال کرنے والوں نے ایک ٹیم کے طور پر کام کیا چنانچہ فضائیہ کے ہر رکن نے معمول کی ڈیوٹی کے تقاضوں سے ہٹ کر یہ معجزاتی کارنامہ انجام دیا۔ (ایضاً:2)۔ جہاں تک بری فوج کی کارکردگی کا تعلق ہے تو نور خان نے تبصرہ کیا کہ:

> ''آرمی کی کارکردگی کا فضائیہ سے کوئی موازنہ نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فوج کی قیادت اتنی پروفیشنل نہیں تھی۔ انہوں نے قومی مفاد کی بجائے صرف اپنی جیت کے لئے ''آپریشن جبرالٹر'' کا منصوبہ بنایا۔ یہ قطعاً غلط جنگ تھی۔ انہوں نے قوم کو یہ بڑا جھوٹ بول کر گمراہ کیا کہ پاکستان نے

نہیں بلکہ بھارت نے جنگ چھیڑی اور یہ کہ ہم تو بھارتی جارحیت کا نشانہ تھے''۔(ایضاً)۔

مزید برآں جنگ کے دوسرے روز جب ایوب خان نے یہ جاننا چاہا کہ فوج کس طرح لڑ رہی ہے تو جنرل موسیٰ نے انہیں بتایا کہ فوج کے پاس اسلحہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔اس بات سے جنرل ایوب کو اتنا صدمہ پہنچا کہ انہیں دل کی تکلیف شروع ہوگئی جو کچھ سال بعد شدت اختیار کر گئی۔نور خان نے 1965ء کی جنگ کو''غیر ضروری لڑائی'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایوب خان کو اس ناکامی پر سینئر جرنیلوں کا احتساب کرنا چاہیئے تھا اور خود بھی استعفیٰ دینا چاہیئے تھا۔انہوں نے مزید یہ مشاہدہ کیا کہ:

''اس اقدام سے جنرل ایوب کے بعد آنے والے مہم جوؤں کے ہاتھ روکے جا سکتے تھے چونکہ 1965ء کی جنگ ایک بڑے جھوٹ پر مبنی تھی اور قوم کے سامنے ایک بڑی فتح کے طور پر پیش کی گئی اس لئے فوج اپنے ہی گھڑے افسانے کے سحر میں مبتلا ہوگئی اور اس کے بعد اسے استعمال کرتی رہی۔اس نے ایوب کو اپنا رول ماڈل سمجھ کر غیر ضروری جنگیں جاری رکھیں......جیسا کہ 1971ء کی جنگ اور 1999 میں کارگل کی ناکامی...... اس کے بعد آنے والی تمام جنگوں میں وہی غلطیاں دہرائی گئیں جو 1965 میں کی گئیں''۔

فوج کی امیج بلڈنگ کا عمل

بہرحال جہاں تک پاکستان ملٹری کا تعلق ہے تو 1965ء کی جنگ -- ناکامی کے باوجود -- اس کی امیج بلڈنگ کا بڑا موقع ثابت ہوئی۔فضائی، بری اور بحری محاذوں پر پاکستان کی بھارت کو شکست دینے کی باتیں اتنی پر کشش ثابت ہوئیں کہ پاکستان کی طرف سے کشمیر کو آزاد کرانے یا بھارت کو اس مسئلے پر زیادہ سے زیادہ رعاتیں دینے کے مقاصد کے حصول میں ناکامی کے حقائق چھپ کر رہ گئے۔یہ بذات خود کوئی کامیابی نہیں تھی۔الطاف گوہر جو اس وقت وفاقی سیکرٹری اطلاعات تھے انہوں نے خود ناکامی کو کامیابی کے طور پر ظاہر کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

میں نے جولائی 2009ء میں واشنگٹن کا دورہ کیا تا کہ پاک امریکہ تعلقات پر امریکی ماہرین کا انٹرویو کرسکوں۔ مجھے یہ جان کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ان امریکیوں کی اکثریت نے یہ بتایا کہ پاکستانی فوجی افسر سوویت یونین کے خلاف امریکہ کے زیادہ مؤثر اتحادی ہونے کا دعویٰ اس دیومالا کی بنا پر کرتے تھے کہ مسلمان سپاہی ہندوؤں کی بہ نسبت بہت زیادہ برتر اور ارفع ہیں۔ اس ضمن میں تصوراتی 10 :1 کی شرح بتائی جاتی کہ ایک مسلمان فوجی 10 ہندوؤں پر بھاری ہوتا ہے۔ یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک لحاظ سے پاکستانی فوج اپنے ہی قائم کردہ غلط واہموں کا شکار ہوگئی۔

یہ بھی دلچسپ امر ہے کہ سرحد کے دونوں طرف جن ''جینٹل مین افسروں نے 1965ء کی جنگ میں حصہ لیا ان کی تربیت ایک فوجی اکیڈمیوں میں ہوئی اور طرز معاشرت بھی ایک جیسی تھی۔ اس بارے میں ایوب خان کے صاحبزادے گوہر ایوب خان نے واقعہ سنایا ہے:

> ''جنگ کے دوران بھارتی فضائیہ کا ایک ہاکن ہنٹر طیارہ زمین سے مار گرایا گیا۔ اس طیارے کا پائلٹ جنرل کریاپا کا بیٹا تھا جو میرے والد کے اچھے دوست تھے۔ چنانچہ میرے والدہ کریاپا کے بیٹے کی عیادت کرنے سی ایم ایچ راولپنڈی گئیں جہاں وہ طیارے سے کودنے کے بعد کمر درد میں بہتری کی طرف گامزن تھا۔ جنرل کریاپا کو اس کے بیٹے کے تندرست ہونے کی اطلاع دی گئی اور 22 جنوری 1966ء کو فلائٹ لیفٹیننٹ کے سی کریاپا کو واپس بھارت بھجوا دیا گیا''۔ (2007: 99-100)۔

بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی جو پاکستانی فوج کے شعبہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر میں تعینات تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ:

> ''امریکہ کی طرف سے 10 سال سے فوجی امداد ملنے کے بعد پاکستان کی مسلح افواج کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ کسی بھی مکمل لیس فوج کیلئے اس سے زیادہ نقصان دہ بات اور نہیں ہوسکتی کہ وہ اتنے برسوں تک میدان عمل سے دور رہے۔ عسکری مہم جوئی اور محدود سرحدی جھڑپوں کی

رنگین منظر کشی کر کے پاکستانی شعبہ تعلقات عامہ نے پہلے ہی فوج کو سپر فوج کا روپ دے دیا تھا"۔(1996ء:77)۔

تاشقند اور ایوب خان کا زوال

بھارت کے ساتھ جنگ بندی کو پاکستانی عوام کے کئی حلقوں نے پسند نہ کیا۔ایک عام تصور یہ پایا جاتا تھا کہ امریکہ نے عین جنگ کے وقت اسلحے پر پابندی لگا کر اپنے اتحادی ملک پاکستان کے ساتھ دھوکا کیا۔اس ضمن میں کراچی میں کچھ مظاہرے بھی ہوئے۔مشتعل طلبا نے امریکی قونصل خانے پر پتھراؤ بھی کیا۔یہ عمومی تصور بھی عوام میں قبول کر لیا گیا کہ پاکستان نے تاشقند میں بھارت کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر آمادہ ہونے پر مجبور کر دیا اور سیز فائر پر آمادگی کمزوری نہیں بلکہ طاقت کے پہلو سے ظاہر کی گئی۔امریکہ نے روس کی طرف سے ایوب اور شاستری کو مذاکرات کیلئے تاشقند بلانے کے اقدام کی حمایت کی۔امریکی وزیر خارجہ ڈین رسک نے نہایت بے لاگ انداز میں اس کی وجہ بتائی:

> "ہم نے روسیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ تاشقند میں ملاقات کا معاملہ آگے بڑھائیں کیونکہ اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہونا تھا۔اگر وہاں کوئی مثبت پیشرفت ہو جاتی تو برصغیر میں امن بڑھنے کے امکانات روشن ہو جاتے اور ہمیں اس سے فائدہ پہنچتا۔اور اگر روس کوئی سمجھوتہ کرانے میں ناکام ہو جاتا تو اسے بھی مایوسی کے اس تجربے سے گزرنا پڑتا جس سے ہم پاک بھارت تعلقات بہتر بنانے کی کوششوں میں گزشتہ 20 سال سے گزر رہے ہیں"۔(بحوالہ کوکس 2001:165)۔

تاشقند میں ملاقات کے وقت ماحول کشیدہ تھا لیکن پاکستان اور بھارت کے سربراہوں نے کسی مفاہمت پر پہنچنے میں کامیابی حاصل کر لی اور یوں دونوں طرف جنگ کا موڈ ختم ہو گیا۔ اعلان تاشقند پر 10 جنوری 1966ء کو دستخط کئے گئے۔دونوں فریقوں نے اپنی فوجیں 5 اگست 1965ء سے پہلے اور 22 فری 1966ء تک کی پوزیشن پر لانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔فریقین کو ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے روک دیا گیا۔پراپیگنڈہ چلانے پر پابندی لگائی

گئی اور سفارتی تعلقات اور تجارت معمول پر لانے پر اتفاق کیا گیا، جہاں تک کشمیر کا تعلق تھا تو معاہدے میں صرف ایک جملہ درج ہے کہ اس تنازعے پر بحث کی گئی اور دونوں فریقوں نے اپنا مؤقف بیان کیا۔ (کوکس 2006:5-73)۔ اس رات بھارتی وزیراعظم شاستری کو دل کا دورہ پڑا اور وہ تاشقند ہی میں انتقال کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بھٹو کو ان کے ایک معاون نے اطلاع دی کہ ''حرامزادہ مرگیا ہے؟'' تو وہ برجستہ بولے ''کون ساوالا؟''۔ (مراد ایوب خان)۔

تاشقند سربراہ اجلاس کے دوران بھٹو نے ہسٹریائی مہارت کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس موقع پر جو تصاویر جاری کی گئیں ان میں بھی وہ ناراض اور کبیدہ خاطر نظر آتے ہیں۔ اعلان تاشقند پر دستخط کے 48 گھنٹے کے اندر پورے ملک کے اندر مشتعل طلبا سڑکوں پر نکل آئے۔ صورتحال لاہور میں زیادہ مخدوش تھی جہاں جذبہ حب الوطنی اپنے عروج پر تھا۔ سرکاری گاڑیوں، دکانوں، نجی کاروں اور کئی دیگر املاک کو آگ لگا دی گئی۔ برقع پوش خواتین جو جنگ میں مرنے والوں کی ورثا تھیں بچوں سمیت مال روڈ پر نعرے لگاتی رہیں کہ ''ہمیں ہمارے شوہر، باپ اور بھائی واپس کرو''۔ (زائرنگ 1971ء:68)۔ یہ بھی نعرہ لگایا گیا کہ ''کشمیر ہندو کو بیچ دیا گیا''۔

چودھری محمد علی، سردار شوکت حیات اور مولانا مؤدودی پر مشتمل مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت نے کھلے عام معاہدہ تاشقند کو ہدف تنقید بنایا جبکہ مشرقی پاکستان کے رہنماؤں شیخ مجیب الرحمٰن اور مولانا بھاشانی کو تنقید سے روک دیا گیا۔ احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ اس دوران بھٹو اور ایوب خان میں تقسیم کی افواہیں گردش کرنے لگیں جو اسی سال گرمیوں میں بھٹو کے وزارت خارجہ سے استعفے کی شکل میں حقیقت بن کر سامنے آئیں۔ دیگر مشکلات نے بھی ایوب خان کی پیچیدگیوں کو سوا تر کر دیا۔ حالیہ برسوں میں ہونے والی اقتصادی ترقی کا عمل شدید متاثر ہونے لگا کیونکہ جنگ کے اخراجات کا بوجھ عوام تک منتقل کر دیا گیا۔ اشیائے ضروریہ کی قیمتیں بڑھنے لگیں جبکہ روزگار کے مواقع سکڑنے لگے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن ایسے خیالات کا اظہار کرنے لگے جو پاکستان کی وحدت کے لئے نقصان دہ تھے۔ ان پر پاکستان توڑنے کیلئے بھارت سے سازش کرنے کا بھی الزام لگایا گیا۔ البتہ ایوب خان کو ابھی تک مضمرات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے مشیروں کے مشورے سے اقتدار سنبھالنے کے 10 سال - اکتوبر 1968 - مکمل ہونے پر

پورے مہینے کے جشن کی تقریبات کا اعلان کر دیا۔ پر تعیش تقریبات کا عوام پر الٹا اثر ہوا جو اسے قومی خزانے کا ضیاع سمجھتے تھے۔ طلبا نے روزانہ کی بنیاد پر مظاہرے جاری رکھے؛ حکومت کی طرف سے مظاہرے دبانے کے اقدامات ناکام ہو گئے بلکہ پورے ملک میں پھیل گئے۔ یونیورسٹیاں بند ہو گئیں لیکن اس کے باوجود طلبا کو مظاہروں کے لئے جمع ہونے سے نہ روکا جا سکا۔ بھٹو نے طلبا کی مظاہروں کے لئے حوصلہ افزائی کی۔ ائیر مارشل (ر) اصغر خان نے بھی اعلان کیا کہ وہ بھی کرپشن، اقربا پروری، رشوت ستانی اور نا اہلی کے خلاف اس تحریک میں شامل ہو رہے ہیں۔ (ایضاً: 89-100)۔ بالخصوص عوام اور سیاسی مخالفین نے ایوب خان پر الزام لگایا کہ وہ اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کو غیر قانونی معاشی فوائد پہنچانے کے لئے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر رہے تھے۔

جنوری 1969ء کے اختتام تک فوجی دستے کراچی، لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور کھلنا میں تعینات کر دیے گئے جہاں تحریک نے پر تشدد شکل اختیار کر لی تھی۔ اس وقت تک ہزاروں افراد گرفتار کئے جا چکے تھے جبکہ تشدد اور فائرنگ جیسے پولیس کے جبر سے سینکڑوں مظاہرین مارے گئے۔ اسکے باوجود پوری شدت سے مظاہرے جاری رہے۔ 21 فروری کو ایوب خان نے اعلان کہ وہ 1970ء میں متوقع صدارتی انتخابات میں امیدوار نہیں ہوں گے۔ اس اچانک اعلان سے بھی اپوزیشن کی تشفی نہ ہوئی۔ فروری کے آخر میں کئی اپوزیشن جماعتوں کے مشترکہ محاذ ڈیموکریٹ ایکشن کمیٹی کے ارکان نے صدر ایوب سے ملاقات کی۔ چار روز تک مذاکرات کے بعد ایوب خان نے ہتھیار ڈال دیے اور بنیادی جمہوریتوں کا نظام ختم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مستقبل میں وسیع تر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر بلاواسطہ انتخابات کا نظام رائج کرنے پر بھی اتفاق ہوا۔ پارلیمانی نظام بھی بحال کیا جانا تھا۔ اگرچہ مذاکرات میں بھٹو خود شریک نہیں ہوئے لیکن انہوں نے مطالبہ کیا کہ صدر ایوب مستعفی ہو جائیں اور نگران حکومت قائم کی جائے۔ جو وفاقی آئین جو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے صوبوں پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کو خود مختاری دینے کی ضمانت دیتا ہو کی بنیاد پر تازہ انتخابات کرائے۔ ون یونٹ یعنی صوبہ مغربی پاکستان ختم کر دیا جائے۔

چونکہ مظاہرے تھم نہیں رہے تھے اور سیاستدان صدر کے خلاف متحد ہو گئے تھے تو فوج نے محسوس کیا کہ ایوب کو جانا پڑے گا۔ فوج کے بطور ادارہ مفاد میں یہ بات فائدہ مند سمجھی گئی کہ

یوب خان کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ (رپورٹ 1969ء)۔ چنانچہ یہ پیغام اعلیٰ فوجی قیادت کے توسط سے انہیں پہنچا دیا گیا۔ ایوب خان نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور آرمی چیف جنرل یحییٰ خان نے 25 مارچ 1969ء کو اقتدار سنبھال کر پورے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ 1962 کا آئین منسوخ کر کے قومی اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔

ایوب خان نے 1965ء میں امریکہ کا دورہ کیا تھا جہاں امریکیوں نے ان پر واضح کیا کہ وہ ان کے چین کے ساتھ قریبی روابط کو زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایوب خان نے انہیں یقین دلایا کہ امریکہ کے ساتھ اتحاد بدستور ان کی اولین ترجیح ہے اور اس پر کسی بھی حالات میں سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ جب ایوب خان نے بھٹو کو وزارت خارجہ سے فارغ کیا تو امریکی اس فیصلے پر کافی خوش ہوئے۔ تاہم ایوب خان کو پاکستان پر اسلحے کی فروخت پر پابندی ہٹانے میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ لیکن جانسن انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ امریکہ پہلے سے فراہم کردہ امریکی آلات کیلئے فاضل پرزہ جات دے گا لیکن کسی بھی قسم کی مالیاتی امداد یا فوجی گرانٹ نہیں دے گا۔ امریکی دروازے بدستور ٹینکوں، لڑاکا اور بمبار طیاروں اور توپوں کی پاکستان کو برآمد کے لئے بند رہے۔ (کوکس 2001ء:173)۔

دوسری طرف امریکہ کے ساتھ سٹریٹیجک اتحاد کا اعادہ کرتے ہوئے پاکستان نے فیصلہ کیا کہ وہ امریکی صدر جانسن کی درخواست کے باوجود بڈھ بیر کا فوجی اڈہ امریکہ کو دینے کے فیصلے کی تجدید نہیں کرے گا۔ 19 جولائی 1968ء کو ایوب خان نے صدر جانسن کو لکھا کہ: ''میں مانتا ہوں کہ اس ہوائی اڈے کی آپ کے ملک کے لئے نہایت اہمیت ہے لیکن یہ بات بھی فطری ہے کہ اس سے ہمارے مخالف طاقتور ہمسائے (روس) کی جارحیت اور انتقام کے راستے کھل جاتے ہیں''۔ (جین 2007ء اے :73)۔ البتہ ایوب خان نے 19 اکتوبر 1968ء کو اپنی ڈائری میں لکھا کہ پاکستان امریکہ کو مکمل طور پر چھوڑنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ چونکہ پاکستان کی معیشت کا بڑا انحصار امریکہ پر تھا اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کو کچھ لچک کا مظاہرہ کرنا چاہیئے اور امریکہ سے فوری طور پر اڈہ خالی کرنے کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ یکم جنوری 1969ء تک اڈہ خالی کرنے کا عمل شروع نہ ہوسکا اور اس عمل کو مکمل ہونے میں پورا سال لگ گیا۔

باب 8

مشرقی اور مغربی پاکستان میں دوریاں

پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی بنگالی مسلم اکثریت اور سول سرونٹس، مرکز پسند سیاستدانوں اور فوج پر مشتمل پنجابی اسٹیبلشمنٹ کے درمیان اختلافات بڑھنا شروع ہو گئے۔ اس کی وجوہات ثقافت، معیشت اور سیاست کے مسائل کا ملغوبہ تھا۔ ان میں سے کچھ ماضی سے ورثے میں ملے جبکہ دیگر مسائل پاکستان میں سیاستدانوں اور سول ملٹری اشرافیہ کی غلطیوں اور مراعات کا نتیجہ تھے۔

مشرقی پاکستان ایوب خان کی نظر میں

1948ء میں ایوب خان کو مشرقی پاکستان میں بطور جنرل آفیسر کمانڈنگ تعینات کیا گیا۔ انہوں نے برملا اس تعیناتی پر ناپسندیدگی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ:

"قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں انفنٹری کی صرف 2 بٹالین موجود تھیں"۔ (2006ء:38)۔ ان دونوں بٹالینز میں ہندو اور سکھ کمپنیاں تھیں جن کا تبادلہ بھارت کر دیا گیا۔ ایوب خان نے مزید لکھا کہ: "وہاں رہائش کا انتہائی خستہ بندوبست تھا: حتیٰ کہ ہیڈ کوارٹر میں کوئی میز، کوئی کرسی اور کوئی سٹیشنری نہیں تھی-- یوں کہہ لیں کہ کچھ بھی نہیں تھا-- مشرقی پاکستان کے نقشے تک ندارد......"۔ آزادی کے وقت اعلیٰ سول سروس میں ایک بنگالی افسر تھا۔ اس لئے مغربی پاکستان سے افسر وہاں لگائے گئے۔ اس اقدام پر بنگالیوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس صورتحال کو بنگالی رہنما حسین شہید سہروردی نے بالخصوص استعمال کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے غلبے کا شور مچایا۔ (ایضاً:41)۔

فوج میں بنگالی سپاہیوں کی بھرتی کے بارے میں ایوب خان دعویٰ کرتے ہیں کہ بنگالی مکمل طور پر غیر تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے یہ معاملہ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے علم میں لایا لیکن بنگالی قیادت ایلیٹ سکول کھولنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھی کیونکہ عام بنگالی کو تو سرکاری سکولوں تک رسائی نہیں تھی۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ بنگالیوں پر قیادت کی صلاحیت والی افرادی قوت کی بھی کمی تھی۔ (ایضاً: 42)۔ مشرقی پاکستان کے آرمی سلیکشن بورڈ کو ہر 6 ماہ بعد ایک یا 2 لڑکے بھرتی کیلئے ملتے لیکن ان کا تعلق بھی غیر بنگالی مہاجر خاندانوں سے ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کہتے ہیں کہ بنگالیوں نے مغربی پاکستان کے افسروں کی تعیناتی پر ناراضگی کا اظہار کیا اور چھوٹی چھوٹی ثقافتی حساسیت کی بنا پر مسائل پیدا کر لئے۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسروں نے نہایت محنت سے کام کیا اور وہ عام طور پر معیار پر پورا اترتے تھے لیکن وہ مشرقی پاکستان والوں کی نااہلی پر جز بز رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''یہ بات نہایت عجیب تھی کہ ڈھاکہ میں جہاں ایک اوسط مشرقی پاکستانی اپنے تئیں مغربی پاکستان کے ملازمین کو نوآبادیاتی نظام کا تسلسل سمجھتا تھا وہاں مغربی پاکستان والے تصوراتی ''غلبے'' کے الزامات پر ملول تھے''۔

فوج اور امن وامان کی صورتحال

مشرقی پاکستان کے بارے میں ایوب خان کے خیالات کا ایک اس سے بھی بڑھ کر پہلو امن وامان کی صورتحال بحال کرنے کیلئے فوج تعینات کرنے سے متعلق ہے۔ پہلا موقع 13 جولائی 1948ء کو آیا جب 60 ہزار اہلکاروں پر مشتمل مضبوط پولیس جسے ایوب خان متعصب ذہنیت کا حامل سمجھتے تھے نے بغاوت کر دی۔ بطور جی او سی انہیں اطلاع ملی کہ پولیس نے ہتھیار اٹھا کر ڈھاکہ میں گورنمنٹ ہاؤس کا محاصرہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت ایوب خان اور آئی جی پولیس ذاکر حسین دونوں میمن سنگھ کا دورہ کر رہے تھے۔ ایوب نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے آئی جی کو ٹھنڈا رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ پولیس پر قابو پانے کے اقدامات کئے جس نے پوزیشنیں سنبھالنا شروع کر دی تھیں۔ ایوب خان نے بٹالین کمانڈر کو ہدایت کی کہ وہ باغی پولیس اہلکاروں کو وارننگ دیں کہ وہ کسی بھی قسم کی نقصان دہ حرکت کرنے سے باز رہیں۔ ایوب خان بتاتے ہیں کہ جب بھی پولیس اہلکاروں کو وارننگ دی جاتی تو وہ جواب میں فوج کو برا بھلا کہنا

شروع کردیتے۔ چنانچہ ہمارے پاس ایکشن لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ میں نے بٹالین کمانڈر کو حکم دیا کہ وہ طاقت کا کم سے کم استعمال کرتے ہوئے باغیوں کے خلاف کارروائی کرے۔ اس کارروائی میں باغیوں کے سرغنہ سمیت چند اہلکار مارے گئے جبکہ 10 یا 12 زخمی ہوئے۔ بحیثیت مجموعی ایوب خان بنگالی لیڈروں کو مسائل پیدا کرنے والے جبکہ برسراقتدار بنگالیوں کو نااہل سمجھتے تھے۔

البتہ ایوب خان نے دعویٰ کیا کہ ان کی نومبر 1949 میں واپس مغربی پاکستان میں تعیناتی سے پہلے مشرقی پاکستان میں فوج کی بنیادی تنظیم سازی کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ انہوں نے لکھا کہ:

''میں نے کامیابی کے ساتھ انصار (سول مسلح گارڈز) فورس قائم کی۔ اس کیلئے مجھے صوبے کے چیف سیکرٹری عزیز احمد نے بھرپور تعاون فراہم کیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس فورس سے عوام میں ڈسپلن آتا اور میں نے صوبائی حکومت پر زور دیا کہ وہ انصار فورس کیلئے وسائل مہیا کرے۔ میری تعیناتی کے دوران ہی ایسٹ بنگال رجمنٹ قائم ہوگئی۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ کسی لڑاکا فورس میں مقامی بنگالی بھرتی کئے گئے۔ میں نے ہی نیم فوجی فورس ایسٹ پاکستان رائفلز تشکیل دی اور افسروں کو جنگ کی تربیت دلائی۔ اس عمل سے فورس کی صلاحیت میں زبردست نکھار آیا اور انہیں اعتماد اور تفاخر بڑھانے کا موقع ملا''۔ (ایضاً: 7-46)۔

سول سرونٹ حسن ظہیر جو 1956ء سے 1962ء کے دوران مشرقی پاکستان میں تعینات رہے انہوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کے بارے میں زیادہ مثبت رائے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ جہاں مشرقی اور مغربی پاکستان والوں کے درمیان تناؤ پایا جاتا تھا وہاں روز مرّہ کے معاملات میں مغربی پاکستان والوں کے ساتھ رابطوں میں پاکستانی قوم پرستی کے طاقتور جذبات بھی پائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خوشحال ہندو بنگالی بھی مرکزی دھارے کی کمیونٹی سرگرمیوں میں شریک تھے۔ وہ عام طور پر انتظامیہ سے تعاون کرتے تھے اور انہوں نے سماجی، تعلیمی اور خیراتی منصوبوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (ظہیر 1995: xiv)۔

بنگال کے مسائل

لیکن بنگال میں پایا جانے والا احساس محرومی ایوب خان کے پیش کردہ تاثر سے زیادہ متنوع تھا۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کی مشرقی پاکستان میں تعیناتی کے دوران قومی زبان کے

معاملے پر ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بنگالی نقطۂ نظر سے یہ مغربی پاکستان (پنجابی اور اردو بولنے والوں) کی ثقافتی برتری کا استعارہ تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بحیثیت مجموعی بنگالی مسلمان برصغیر میں مسلمانوں کے الگ وطن کے خیال میں مغربی پاکستان والوں سے بہت پہلے آ گے تھے۔ اگر چہ بنگالیوں کی آبادی کل آبادی کا 55.4 فیصد تھی لیکن ملک کا دارالحکومت کراچی مغربی پاکستان میں تھا اور حکمران اشرافیہ بھی پنجابی اور اردو بولنے والے مہاجروں پر مشتمل تھی۔ بنگال میں مغل اور انگریز دور کی کچھ باقیات اور بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے چند افراد ہی اردو بولتے تھے اس کے علاوہ بنگالی ایک انتہائی ترقی یافتہ زبان تھی جو طویل عرصہ سے سرکاری زبان کے طور پر رائج تھی۔

اس کے باوجود فروری 1948ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے آئین ساز اسمبلی سے خطاب میں کہا کہ اردو پاکستان کی واحد قومی زبان ہوگی۔ اس کی تائید وزیر اعلیٰ مشرقی پاکستان خواجہ ناظم الدین نے بھی کی جو اردو بولنے والے نواب آف ڈھاکہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس بات کا اعادہ گورنر جنرل محمد علی جناح نے بھی مارچ 1948ء میں ڈھاکہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کے دوران کیا۔ زبان کا مسئلہ قیام پاکستان کے مطالبے پر مسلمانوں کو اکٹھا کرنے والی کمزور اور ڈانواڈول مسلم قوم پرستی میں پہلی دراڑ ثابت ہوا۔ (احمد 1998ء: 21-220: عالم 1995ء: 3-40، چودھری 2009ء: 12)۔

23 جون 1949ء کو حسین شہید سہروردی، مولانا عبدالحمید خان بھاشانی اور شمس الحق نے ایسٹ پاکستان عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ 1955ء میں اس کے نام میں سے مسلم لفظ ہٹا دیا گیا اور یوں یہ عوامی لیگ بن گئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو بعد ازاں بنگالی قوم پرست تحریک کے روح رواں بنے جس کے نتیجے میں 1971ء میں پاکستان دولخت ہوا۔ وہ اس پارٹی کے کم عمر ترین رہنما تھے۔ اس طرح عوامی لیگ بنگالی قوم پرستی اور علاقائی خواہشات کے اظہار کا مرکزی پلیٹ فارم بن گئی۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت نے 1951 میں زمینداری نظام کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے زیادہ تر زمینیں چھوڑ کر بھارت جانے والے ہندو زمینداروں کو نقصان پہنچا۔ اراضی کی تقسیم سے کاشتکار طبقے کو فائدہ پہنچا لیکن اس اقدام سے شہری علاقوں کی بنگالی مڈل کلاس کی کچھ تشفی نہ ہوئی جو مغربی پاکستان میں طاقت کے مرکز سے خود کو الگ تھلگ سمجھتی تھی۔ 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کے قتل کے نتیجے میں خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل کے منصب سے مستعفی ہو گئے تا کہ وزارت

عظمیٰ سنبھال سکیں۔ مشرقی پاکستان سے اپنے تعلق اور سیاسی اساس ہونے کے باوجود انہوں نے 1952ء میں لیاقت علی اور محمد علی جناح کے مؤقف کی حمایت میں ایک بار پھر اس عزم کا اعادہ کیا کہ اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ چنانچہ بنگال میں فسادات کا دسرا دور شروع ہو گیا۔ (جیکسن 1975ء:16-17)۔

2 سال بعد 8 مارچ 1954ء کو مشرقی پاکستان میں صوبائی انتخابات ہوئے جن میں بنگالیوں نے مغربی پاکستان کے غلبے کے خلاف اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ عوامی لیگ، کریشک سرامک پارٹی اور نظام اسلام پارٹی جیسی جماعتوں پر مشتمل متحدہ محاذ نے مسلمانوں کی 237 میں سے 223 نشستیں جیت لیں۔ جبکہ حکمران مسلم لیگ کو صرف 10 نشستیں ملیں۔ چنانچہ یونائیٹڈ فرنٹ پر مشتمل حکومت 3 اپریل 1954ء کو وجود میں آ گئی جس سے مغربی پاکستان میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس موقع پر نقصان کے ازالے کے طور پر 19 اپریل 1954ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں اردو اور بنگالی دونوں کو ملک کی قومی زبان تسلیم کر لیا گیا لیکن شرط یہ لگائی کہ اگلے 20 سال تک انگریزی ہی دفتری زبان رہے گی۔ البتہ اس کے بعد تادیبی کارروائیاں شروع کر دی گئیں۔ 30 مئی کو مرکزی حکومت نے مشرقی پاکستان کی اسمبلی تحلیل کر دی اور علیحدگی کی حمایت کرنے کے الزام میں حکومت کو برطرف کر دیا گیا۔ اس وقت تک بنگالی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ مسلم لیگی حکومت کے اقتدار کو چیلنج کر سکیں۔

برابری

صرف مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کی آبادی اکثریت میں ہونے کا بالغ رائے دہی کی بنیاد پر استوار جمہوریت میں یہ مطلب تھا کہ بنگالیوں کو مغربی پاکستان کی اقوام پر برتری حاصل ہوگی۔ 1947ء میں مشرقی بنگال کی آبادی میں 23 فیصد ہندو تھے۔ اتنی بڑی ہندو اکثریت سمیت بنگالیوں کی مجموعی آبادی نے شروع سے ہی مغربی پاکستانی کی حکمران اشرافیہ کو تشویش اور مایوسی سے دیکھنا شروع کر دیا جو پاکستانی نظام سیاست پر اسلامی چھاپ مسلط کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ آئین سازی یا کم از کم 7 مارچ 1949 کو قرارداد مقاصد کی منظوری کے ساتھ یہ بنیادی تشویش ابھر کر سامنے آ گئی۔ بنگالی اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کا ایک طریقہ ہندوؤں کیلئے جداگانہ طرز

انتخاب اختیار کرنا تھا۔

یہ اقدام مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کیلئے پاکستان میں سیاسی پیشرفت کے اس مرحلے پر موزوں تھا لیکن مقتدر اشرافیہ پاکستان کو مکمل طور پر اسلامی ریاست بنانے کی ضرورت پر قائل نہیں تھی۔ دوسری طرف بنگالی مسلمانوں کیلئے ان کے اکثریتی تشخص کا صاف مطلب ان کی پارلیمانی برتری تھی اگر ہندوؤں کو ان سے الگ نہ کیا جائے تو...... (جیکسن 1975ء:16)۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان مفادات کے تصادم کے دوران ان کے درمیان بات چیت کا ایک اور دور ہوا۔ مشرقی بنگال والوں نے محسوس کیا کہ بطور ریاستی طاقت...... سول بیوروکریسی بالخصوص فوج...... جو کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی ہے۔ انہیں سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ قابل ذکر لین دین کے بعد مشرقی اور مغربی حصے کے درمیان برابری کے اصول پر قومی اسمبلی میں نمائندگی پر اتفاق کرلیا گیا۔ 1956ء کا آئین اسی سمجھوتے کا شاخسانہ تھا۔

معاشی ناہمواری

سیاسی نمائندگی میں برابری کا مطلب معاشی ترقی میں برابری نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ بیوروکریسی اور فوج میں تمام اعلیٰ عہدے مغربی پاکستان والوں کے ہاتھ میں رہے۔ فیروز احمد نے دعویٰ کیا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اندرونی نوآبادیاتی نظام نے جڑ پکڑ لی۔ اس بات کی دلیل میں انہوں نے بعض اعداد و شمار بھی پیش کئے ہیں کہ 1947ء میں مشرقی پاکستان کی شرح نمو مغربی پاکستان سے زیادہ تھی کیونکہ پاکستان کی سب سے بڑی برآمدی آئٹم پٹ سن مشرقی پاکستان میں تیار ہوتی تھی۔ تاہم 1969ء تک مغربی پاکستان کی جی ڈی پی مشرقی پاکستان سے کہیں بڑھ چکی تھی۔ نیچے گستاف پاپانک کی تحقیق پر مبنی ایک چارٹ میں تفصیل دی گئی ہے:

1949-1960 کے درمیان پاکستان کی جی ڈی پی
مستقل قیمتیں (ملین روپے میں)

سال	مشرقی پاکستان	مغربی پاکستان
1949-50	13,130	11,830
1954-55	14,320	14,310

1959-60	15,550	16,790
1964-65	18,014	21,788
1968-69	20,670	27,744

فیروز احمد نے دعویٰ کیا کہ اس دورانیے میں مشرقی پاکستان 31,120 ملین روپے (اس دور میں ایک ڈالر کی قیمت 4.76 روپے تھی، قارئین چاہیں تو موجودہ دور میں ڈالر کی قدر سے خود موازنہ کرلیں) کے وسائل مغربی پاکستان منتقل کئے گئے۔ پاکستان میں صنعتکاری کا عمل مغربی پاکستان میں کاٹن ٹیکسٹائل صنعتوں میں سرمایہ کاری سے ہوا جبکہ مشرقی پاکستان میں پٹ سن کی ملیں تھیں تاہم جہاں ٹیکسٹائل ملیں مغربی پاکستان والوں کی اپنی ملکیت تھیں وہاں پٹ سن کی ملیں بنگالیوں کی ملکیت نہیں تھیں۔ ابتدائی برسوں میں پاکستان کی 70 فیصد برآمدات کا دارومدار خام اور تیار شدہ پٹ سن پر تھا اور کچھ چائے بھی برآمد کی جاتی تھی۔ فیروز احمد کے مطابق اس کمائی کو مغربی پاکستان میں انڈسٹر لائزیشن کے لئے استعمال کیا گیا۔ اقتصادی ترقی کا عمل اس قیافے پر مبنی تھا کہ مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان کی مصنوعات استعمال کریں گے۔ زیادہ تر ٹیکسٹائل۔ (ایضاً: 425)۔

پاکستان کی معاشی ترقی میں سب سے بڑا ہاتھ غیر ملکی امداد کا تھا۔ 1969ء تک امریکہ نے پاکستان کو 3 ارب ڈالر تک امداد اور قرضوں کا اجراء کیا۔ (آنیوالے برسوں میں زیادہ تر امداد قرضوں کی صورت میں دی گی) جن سے چھوٹی صنعتوں کے منصوبے لگانے میں کافی مدد ملی اور جو بورژوائی طبقہ اس امداد سے مستفید ہوا وہ زیادہ تر مغربی پاکستان کا تھا۔ ایسی بے ڈھنگی حکمت عملی سے عدم مساوات نے جنم لیا:

> ''بدنام زمانہ عشرہ ترقی کے اختتام (1958-1969ء) تک مغربی پاکستان کی جی ڈی پی مشرقی پاکستان کی شرح نمو سے 34 فیصد بڑھ چکی تھی، دونوں حصوں میں فی کس آمدنی کا تفاوت 62 فیصد تھا اور اوسط معیار زندگی کا حقیقی فرق 126 فیصد تک بڑھ چکا تھا''۔ (ایضاً: 428)۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالی کسانوں، محنت کشوں اور مڈل کلاس کو اقتصادی ترقی میں ان کا حصہ نہ ملا۔ اس طرح مغربی پاکستان کے غلبے سے شاکی قوم پرست تحریک مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ یہی وہ حالات تھے جن میں شیخ مجیب الرحمٰن کی زیر قیادت عوامی لیگ بنگال کے مرکزی دھارے کی

واحد نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ یہ حقیقت کہ 1965ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان بھارتی جارحیت کے سامنے قطعاً بے دست و پا تھا اور مرکزی حکومت جس واحد مزاحمت کا دعویٰ کر سکتی تھی وہ چین کی بھارت کو دھمکی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان پر حملے سے باز رہے۔ اس نقطہء نظر کو مجیب اور دیگر برافروختہ بنگالی رہنماؤں نے سخت ہدف تنقید بنایا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کے خود انحصار ہونے کی سوچ جڑ پکڑنے لگی اور یہی علاقائیت کا نقطہء آغاز ثابت ہوا جس نے بعدازاں علیحدگی پسندی اور تقسیم کرنے کی شکل اختیار کر لی۔ کسان لیڈر مولانا بھاشانی سمیت کئی بنیاد پرست بنگالی رہنماؤں نے مشرقی پاکستان کیلئے خودمختاری کا بھی مطالبہ کر دیا۔

1966ء میں سیاسی جماعتوں کی ایک کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کو خود مختاری دینے کیلئے 6 نکاتی ایجنڈا پیش کیا۔ یہ کانفرنس ڈھاکہ میں نہیں بلکہ لاہور میں ہوئی، جس کی وجہ سے زیادہ سراسیمگی پھیل گئی۔ نیچے جو 6 نکات درج کئے گئے ہیں وہ ان تعلقات کے لحاظ سے تبدیلی سے متعلق تھے جو ابھی تک قائم تھے اور ان میں کنفیڈریشن نہیں بلکہ وہ ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کی بات کی گئی:

1: 1940ء کی قرارداد (لاہور) کی بنیاد پر پاکستان کو حقیقی معنوں میں وفاق ہونا چاہیئے۔

2: وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع اور خارجہ کے امور ہونے چاہئیں جبکہ باقی تمام معاملات وفاق کی اکائیوں کو منتقل کئے جائیں۔

3: آئین میں ترمیم کے ذریعے ملک میں دو کرنسیاں رائج کی جائیں جو باآسانی ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکیں، ہاں اگر مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو سرمائے کی منتقلی روک دی جائے تو پھر ایک کرنسی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

4: ٹیکس لگانے اور ریونیو وصولی کی ذمہ داری صوبائی یونٹوں کے پاس ہونی چاہیئے۔

5: ملک کے دونوں حصوں کے درمیان مقامی اشیا کی آزادانہ نقل و حمل یقینی بنائی جائے اور انہیں غیر ممالک کے ساتھ تجارت اور کاروباری تعلقات بنانے کی اجازت دی جائے۔

6: مشرقی پاکستان کے دفاع کے لئے ایک الگ ملیشیا یا پیراملٹری فورس قائم کی جائے۔

ان نکات پر ردعمل نہایت مختلف تھا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی مقبولیت تیزی سے بڑھنے لگی۔ زندگی کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ اس پارٹی کی طرف راغب ہونے

لگے۔ مشرقی پاکستان کی ہندو برادری جو سیاست سے الگ تھلگ ہو چکی تھی وہ بھی دوبارہ سیاسی شعبے میں متحرک ہوگئی۔ دوسری طرف مغربی پاکستان بالخصوص ایوب خان حکومت کا ردعمل ہسٹریائی تھا۔ 8 مئی 1966ء کو دفاع پاکستان قانون کے تحت شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرلیا گیا۔ جس سے پورے مشرقی پاکستان میں اشتعال پھیل گیا۔ دسمبر 1967ء اور جنوری 1968ء کو حکومت نے ایک بار پھر شیخ مجیب اور ان کے ساتھیوں پر علیحدگی پسند خیالات کو تقویت دینے کا الزام لگایا۔ 17 جون 1968ء کو شیخ مجیب کو ڈھاکہ جیل سے کُرمی ٹولا کینٹ منتقل کر کے بھارت کی مدد سے بنگلہ دیش بنانے کی ساش کرنے کا الزام لگایا گیا۔

اگرتلہ کیس

1968ء کے اوائل میں حکومت نے دعویٰ کیا کہ اس نے ایک منصوبہ بے نقاب کیا ہے جس میں مشرقی پاکستان کے 46 افراد ملوث ہیں۔ بعد میں 35 ملزموں پر کیس چلایا گیا جبکہ 11 افراد کو معاف کر دیا گیا۔ جنہوں نے سلطانی گواہ بننے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اگرتلہ سازش کیس میں جن افراد پر مقدمہ چلایا گیا ان میں شیخ مجیب، 3 بنگالی سول سرونٹ اور 24 بنگالی جونیئر افسر شامل تھے۔ حکومت نے کیس میں لکھا کہ 12 جولائی 1967ء کو منصوبہ سازوں نے بھارت بنگال کے علاقے اگرتلہ میں بھارتی حکام سے خفیہ ملاقات کی تا کہ بھارت کی مدد سے مسلح بغاوت کی جا سکے جس کے نتیجے میں آزاد مشرقی بنگال وجود میں آنا تھا۔ (زائرنگ 197:91-90)۔ یہ بھی الزام لگایا گیا کہ مجیب الرحمٰن کے ستمبر 1964ء سے بھارتی حکام کے ساتھ رابطے تھے۔ مبینہ طور پر انہوں نے اگست 1965ء میں ان سے رقوم بھی وصول کی تا کہ سازش کے تمام کرداروں میں تقسیم کی جا سکے۔ مقدمہ کئی ماہ تک چل کر 1969ء کے اوائل میں اختتام پذیر ہوا جس سے شیخ مجیب کا بطور شہید بنگال کا کردار مستحکم ہوا۔ حکومت کی طرف سے 251 گواہ پیش کرنے کے باوجود سرکاری وکلاء الزامات ثابت کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

صورتحال اس وقت پیچیدہ ہوگئی جب ایک ملزم کو یہ کہہ کر گولی ماردی گئی کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے روز مقتول کے جنازے کے موقع پر بڑے پیمانے پر فسادات پھیل گئے۔ اس دوران مشرقی اور مغربی پاکستان میں طلبا نے بھی مظاہرہ شروع کر دیے جن کی دونوں طرف

سے حکومت مخالف سیاستدانوں نے بھی حمایت کی۔ انہوں نے اگرتلہ سازش کیس واپس لینے اور تمام ملزموں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ ایوب خان جو اس وقت پوری طرح بے بس ہو چکے تھے کو ہار ماننا پڑی۔ وہ پہلے اعلان کر چکے تھے کہ وہ اگلے صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے لیکن اگرتلہ کیس نے حکومت کی کمزوریوں کو مزید عیاں کر دیا۔ یہ کمزوری اس وقت مزید نمایاں ہو گئی جب مجیب الرحمٰن کو حراست سے رہا کر دیا گیا اور ڈھاکہ میں ان کا ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا۔

یحییٰ حکومت اور 1970 کے الیکشن

مشرقی اور مغربی پاکستان کو کئی ماہ تک ہلا کر رکھ دینے والی احتجاجی تحریک کے نتیجے میں ایوب خان نے 25 مارچ کو استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھال لی۔ بظاہر لگتا ہے کہ سینئر جنرلوں نے ایوب خان پر استعفے کیلئے دباؤ ڈالا۔ پورے ملک میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ شروع میں جنرل یحییٰ نے خود کو صدر پاکستان قرار دینے سے احتراز کیا لیکن کچھ روز بعد انہوں نے یہ منصب بھی سنبھال لیا۔ ایڈمرل ایس ایم احسن کو مشرقی پاکستان کا گورنر لگا دیا گیا جبکہ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ حکومت نے با آسانی امن و امان کی صورتحال پر قابو پا لیا حالانکہ یحییٰ خان کے اقتدار سنبھالنے سے ایک ہفتے پہلے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے طلبا کا سڑکوں پر راج ہوتا تھا۔ سویلین اور فوجی بیوروکریسی کے بااعتماد افراد پر مشتمل نئی حکومت تشکیل دی گئی۔ یحییٰ خان نے اقتدار کے اگلے ہی روز قوم سے خطاب میں اپنی حکومت کے نگران کردار کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''مارشل لا نافذ کرنے کا میرا واحد مقصد عوام کے جان و مال اور آزادی کا تحفظ یقینی بنانا ہے...... میرے ہم وطنو میرے اس کے علاوہ اور کوئی عزائم نہیں کہ میں ایک آئینی حکومت کی تشکیل کے لئے سازگار ماحول پیدا کروں۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ مستحکم اور تعمیری سیاسی حیات اور غیر جانبدارانہ، شفاف اور آزادانہ طریقہ سے عوام کی منتخب کردہ حکومت کو انتقال اقتدار کیلئے ایک صاف اور متوازن انتظامیہ کا وجود از بس ضروری ہے''۔ (بحوالہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ 2001:67)۔

جولائی 1969ء کے اختتام تک حکومت یہ دعوے کر رہی تھی کہ امن وامان کی صورتحال پر قابو پا لیا گیا ہے اور اگلا مقصد جمہوریت کی بحالی ہے۔ چنانچہ صدر یحییٰ خان نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں سے مشاورت کا عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے نئے آئینی فارمولے کی تشکیل کیلئے ایک ٹیم تشکیل دے دی۔ 28 نومبر 1969ء کو قوم سے خطاب میں انہوں نے بتایا کہ پاکستان کے مستقبل کے آئین پر قومی اتفاق رائے حاصل نہیں کیا جا سکا چنانچہ وہ لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) جاری کر رہے ہیں جس کی بنیاد پر انتخابات اور پھر انتقال اقتدار کا عمل وقوع پذیر ہو سکے۔ 30 مارچ 1970ء کو ایل ایف او تیار تھا۔ اس میں 2 بنیادی تبدیلیاں کی گئیں جس کے تحت نمبر 1 مغربی پاکستان میں ون یونٹ ختم کر دیا گیا اور نمبر 2 برابری کے اصول کی بجائے ایک شخص ایک ووٹ کا طریقہ رائج کر دیا گیا۔ ان دونوں اقدامات سے مشرقی پاکستان کے جائز مؤقف کو تقویت ملی۔ چونکہ مشرقی پاکستان میں ملک کی 55 فیصد آبادی مقیم تھی اس لئے اکثریتی آبادی کی بنا پر قومی اسمبلی میں اس کی نشستیں بھی زیادہ ہونی تھیں۔ جہاں تک ایک ایوان پر مشتمل قومی اسمبلی کا تعلق تھا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایوان 313 نشستوں پر مشتمل ہونا چاہیئے جس میں 13 سیٹیں خواتین کے لئے مخصوص ہوں گی۔ خواتین عام نشستوں پر بھی الیکشن لڑ سکتی تھیں۔ نشستوں کی تقسیم اس طرح سے کی گئی:

صوبہ	عام نشستیں	مخصوص نشستیں
مشرقی پاکستان	162	7
پنجاب	82	3
سندھ	27	1
این ڈبلیو ایف پی	18	1
بلوچستان	4	1
وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات 7		-

جمہوریت کی بحالی کیلئے کچھ دیگر شرائط بھی طے کی گئیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اگر آئین ساز اسمبلی 120 یوم کے اندر دستور تیار نہ کر سکی تو خود بخود تحلیل ہو جائے گی۔ مستقبل کے آئین کیلئے ممنوعات کے طور پر متعدد ڈائریکٹو پرنسپلز آف سٹیٹ پالیسی جاری کئے گئے۔ مثلاً یہ کہ

ملک میں اسلامی طرز زندگی رائج ہوگا۔ اسلامی اخلاقی معیارات پر عملدرآمد، مسلمانوں کیلئے قرآن وسنت کی تعلیمات اور یہ کہ پاکستان ایک وفاق ہوگا جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔ ہدایت نامے میں یہ بھی کہا گیا کہ آئین میں اسلامی نظریہ برقرار رکھا جائے گا جبکہ جمہوری اقدار بھی شامل ہوں گی۔ پاکستان کے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔ عدلیہ انتظامی اثر و رسوخ سے آزاد ہوگی اور صوبائی خودمختاری کا تحفظ کیا جائے گا۔ ایل ایف او میں صدر کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ مندرجہ بالا شرائط کی خلاف ورزی پر آئین ساز اسمبلی کے تیارہ کردہ دستور کو مسترد کر دے۔ صدر کو آئین کی تشریح اور ترمیم کا اختیار بھی دیا گیا۔ صدر کا فیصلہ حتمی ہوگا اور اسے کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔ (سٹوری آف پاکستان:2010ء)۔

یوں ایل ایف او کو عملاً عبوری آئین کے طور پر نافذ کیا گیا۔ ایل ایف او کا ایک بڑا سقم یہ تھا کہ اس میں صوبائی خودمختاری کی وضاحت نہیں کی گئی جس کا قانونی طور پر دعویٰ کیا جاسکتا۔ اس اہم معاملے پر ابہام کے مسائل اس وقت سامنے آئے جب انتخابات کے نتائج کا اعلان کیا گیا۔ بہر حال ان حالات میں یکم جنوری 1970ء کو سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی تھی، اس لئے ایل ایف او سامنے آنے سے پہلے ہی انتخابی مہم کا آغاز ہو چکا تھا۔ مختلف سیاسی جماعتوں نے اپنے انتخابی منشور جاری کئے۔ عوامی لیگ نے اپنے 6 نکات کو ووٹ حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ بنالیا۔ جس کے مطابق اختیارات کی غیر معمولی تقسیم اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ فوجی حکومت کو فیڈریشن اور علاقائی خودمختاری کے اپنے نقطہء نظر اور عوامی لیگ کی مقرر کردہ تعریف میں وسیع خلیج کا اچھی طرح ادراک تھا۔ البتہ شیخ مجیب الرحمٰن نے اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے انتخابی مہم چلائی کہ 6 نکات اور ایل ایف او کو ایک ہی معیار سے ماپا نہیں جاسکتا۔

انتخابی مہم کی نگرانی کرنے کا طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا کہ تمام سیاسی لیڈر جلسوں کے لئے تقریریں لکھ کر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے صوبائی دفتر کو ارسال کریں گے جو یہ تقریریں آگے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان کو بھجوائی جائیں گی۔ کوئی بھی قابل اعتراض بات کرنے کی صورت میں ایل ایف او کے تحت کارروائی کا مستوجب ٹھہرایا جائے گا۔ حکومت نے کسی بھی مرحلے پر مجیب الرحمٰن کے 6 نکات کو ایل ایف او سے متصادم قرار نہیں دیا۔ حالانکہ شیخ مجیب الرحمٰن

ایل ایف او کو سر عام ہدف تنقید بناتے تھے۔25 اکتوبر کو نو گاؤں میں انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ اگرچہ وہ ایل ایف او کی مذمت کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ 6 نکاتی پروگرام کی بنیاد پر علاقائی خودمختاری کے ریفرنڈم کے طور پر الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں۔انہی حالات میں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے انتخابات میں عوامی لیگ کی لینڈ سلائیڈ جیت کی پیشنگوئی کی تھی اور اندازہ لگایا کہ وہ مشرقی پاکستان کی 60 فیصد نشستیں جیتے گی۔(بحوالہ حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ 2001ء:74)۔

پہلے اکتوبر 1970ء میں انتخابات کرانے کی تاریخ مقرر کی گئی لیکن ستمبر میں سیلاب سے ہونے والی تباہی کے پیش نظر حکومت انتخابات 7 اور 17 دسمبر تک ملتوی کرنے پر مجبور ہوگئی۔7 دسمبر کو قومی اور 17 دسمبر کو صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہونا تھے۔اگرچہ مجیب الرحمٰن نے انتخابات کے التوا پر اعتراض کیا لیکن حکومت اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔نومبر میں ایک بڑے سمندری طوفان نے مشرقی پاکستان میں تباہی مچادی۔5 لاکھ سے زائد افراد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔اس موقع پر مشرقی پاکستان میں تعینات سول اور فوجی بیوروکریسی جن کی اکثریت کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا پر اس سانحے میں نااہلی اور بے حسی برتنے کا الزام لگایا گیا۔شاید ہی مغربی پاکستان کے کسی لیڈر نے متاثرہ بنگالیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا ہو۔اس رویے کو عوامی لیگ نے استعمال کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے خلاف مزید نفرت پھیلائی۔(ایضاً:74)۔

اس حکمت عملی کا زبردست فائدہ پہنچا کیونکہ عوامی لیگ نے 162 عام نشستوں میں سے 160 سیٹیں جیت لیں۔یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ عوامی لیگ کو قومی اسمبلی میں واحد اکثریتی پارٹی کی حیثیت حاصل ہوگئی اور وہ تنہا حکومت بنا سکتی تھی۔عوامی لیگ نے تمام نشستیں صرف مشرقی پاکستان سے جیتی تھیں۔حیران و پریشان پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پر سکتہ طاری ہوگیا۔بالخصوص مشرقی پاکستان میں تعینات مارشل لاء انتظامیہ جس کی اکثریت مغربی پاکستان سے تھی پریشان ہوگئی۔دوسری طرف بنگالی سویلین اور فوجی افسروں کی حوصلہ افزائی ہوئی کہ وہ اپنا آپ منوا سکیں۔مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نشستوں کی جیت کے حوالے سے فاتح جماعت بن کر ابھری، اسے مغربی پاکستان میں 138 نشستوں میں سے 84 پر کامیابی حاصل ملی، سندھ اور پنجاب میں اسے واضح اکثریت حاصل ہوگئی۔اگرچہ بھٹو نے عوامی لیگ کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دی اور کہا کہ وہ اکثریت کا احترام کرتے ہیں لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ طاقت کے مراکز صرف

سندھ اور پنجاب ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم مرکز میں حکومت بنالیں یا بنانے کے قابل نہ ہوں لیکن پنجاب اسمبلی کی چابیاں ضرور ہماری جیب میں ہیں۔(کلف لے 2006ء:162)۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ میری دوسری جیب میں سندھ اسمبلی کی چابیاں ہیں اور کوئی بھی وفاقی حکومت ہمارے تعاون کے بغیر نہیں چل سکتی۔اگر پیپلز پارٹی تعاون نہیں کرتی تو کوئی بھی حکومت کام نہیں کرسکتی اور نہ ہی کوئی آئین تیار ہوسکے گا۔(ایضاً)۔ایسے بیان کو کسی پارلیمانی روایت میں کوئی پذیرائی نہیں مل سکتی اور یہ بھٹو کے اقتدار کے لالچ کا منفی انداز میں اظہار تھا۔یہی بات پیپلز پارٹی کی سیاست کا بنیادی نکتہ بن گئی اور اس نے آنے والے مہینوں میں عوامی لیگ کا مرکز میں حکومت بنانے میں راستہ روکنے کے لئے فوجی قیادت کا ساتھ دینا شروع کردیا۔

یحیٰی، مجیب اور بھٹو کے غیر رسمی رابطے

انتخابات کے نتائج سامنے آنے کے کئی ہفتے بعد بھی فوجی حکومت نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کیا۔اس طرز عمل سے عوامی لیگ کے شکوک وشبہات اور اس خوف میں نمایاں اضافہ ہوا کہ پارلیمانی جمہوریت کے تقاضوں کے عین مطابق جو اقتدار اسے ملنا چاہیئے وہ اسٹیبلشمنٹ اسے دینے سے گریزاں تھی۔3 جنوری 1971ء کو عوامی لیگ نے ڈھاکہ میں ایک بہت بڑا عوامی جلسہ کیا۔ جہاں مجیب الرحمٰن نے عوامی لیگ کے منتخب ارکان اسمبلی سے کہا کہ وہ 6 نکات سے وفاداری کا حلف لیں۔اس وقت تک ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی مغربی پاکستان کی کسی اور جماعت سے زیادہ 6 نکات کے خلاف مؤقف اختیار کرچکی تھی۔ بالآخر یحیٰی خان نے 7 جنوری کو ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی۔جسٹس حمودالرحمٰن رپورٹ میں نوٹ کیا گیا ہے کہ اس ملاقات میں مجیب الرحمٰن نے 6 نکات کے بارے میں مغربی پاکستان میں پائے جانے والے اس تاثر کو کم کرنے کی کوشش کی کہ یہ دراصل مشرقی پاکستان کو عملاً وفاق پاکستان سے الگ کرنے کا اقدام ہے۔اس کے بعد مجیب نے یحیٰی سے پوچھا کہ آپ کو 6 نکات پر کیا اعتراضات ہیں تو یحیٰی نے جواب دیا کہ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ (مجیب الرحمٰن) کو اپنے ساتھ مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈروں کو بھی چلانا چاہیئے۔(حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ 2001ء:77)۔یہ سن کر مجیب الرحمٰن نے صدر یحیٰی خان سے درخواست کہ آپ 15 فروری کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کریں

تاکہ میں ثابت کروں گا کہ مجھے نہ صرف سادہ اکثریت بلکہ دوتہائی اکثریت حاصل ہے۔اس بات سے اشارہ ملتا ہے کہ مجیب الرحمٰن کو اعتماد تھا کہ انہیں مغربی پاکستان کے رہنماؤں کی بھی حمایت حاصل ہوگی۔ یحییٰ خان کے ساتھ ملاقات میں موجود ایڈمرل احسن بتاتے ہیں کہ جب یحییٰ خان نے استفسار کیا کہ کیا عوامی لیگ اپنی اکثریت کا غلط استعمال کرے گی تو مجیب الرحمٰن نے جواب دیا کہ:

> ''نہیں ، میں ایک جمہوری سیاستدان ہوں اور پورے پاکستان کی اکثریت کا لیڈر رہوں۔ میں مغربی پاکستان کے مفادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں نہ صرف مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کو جوابدہ ہوں بلکہ عالمی رائے عامہ کے سامنے بھی ذمہ دار ہوں۔ میں سب کچھ جمہوری اصولوں کے مطابق کروں گا۔ آغاز کے طور پر میں امید کرتا ہوں کہ آپ اسمبلی کے اجلاس سے 3، 4 دن پہلے آئیں تا کہ میں آپ کو مسودہ آئین دکھاؤں۔ اگر آپ کے نئے دستور پر کوئی اعتراضات ہوں گے تو میں آپ کی خواہشات کو بھی مدنظر رکھوں گا''۔ (ایضاً78)۔

بظاہر مجیب الرحمٰن نے یہ بھی بتایا کہ ان کی جماعت نے فیصلہ کیا کہ یحییٰ خان کو نئے صدر مملکت کے طور پر منتخب کرلیا جائے کیونکہ انہوں نے جمہوریت کی بحالی کیلئے اہم کردار ادا کیا۔ تاہم یحییٰ خان نے جواب دیا کہ وہ محض ایک سپاہی ہیں اور اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کر کے بیرکوں میں واپس چلے جائیں گے۔ البتہ انہوں نے مجیب الرحمٰن کو مشورہ دیا کہ وہ پیپلز پارٹی کے ساتھ قریبی رابطے استوار رکھیں کیونکہ وہ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی ہے۔ چنانچہ شیخ مجیب نے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کریں گے اور مغربی پاکستان کے دیگر لیڈروں کی حمایت بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان دونوں لیڈروں کی ملاقات خوشگوار انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ اگلے روز یحییٰ نے مغربی پاکستان روانہ ہونے سے قبل ڈھاکہ ائیر پورٹ پر مجیب الرحمٰن کو مستقبل کے وزیراعظم کے طور پر پیش کیا۔ 17 جنوری کو یحییٰ خان نے چند دیگر جنرلوں کے ساتھ بھٹو سے لاڑکانہ میں ملاقات کی۔ ملاقات میں موجود جنرلوں نے بعدازاں حمودالرحمٰن کمیشن کے روبرو بیان حلفی میں الزام لگایا کہ 'ذوالفقار علی بھٹو اپنے سیاسی حریف مجیب الرحمٰن کو انتخابی نتائج کے ثمر سے محروم کرنے کی سازش کررہے تھے'۔ (ایضاً:79)۔ بھٹو نے اپنے بیان حلفی میں اس الزام کی تردید

کی۔ بہر حال کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے درخواست کی کہ انہیں مجیب الرحمٰن کے ساتھ بات چیت کیلئے وقت دیا جائے، بصورت دیگر مجیب الرحمٰن اپنے 6 نکات پر مصر رہے گا اور واضح اکثریت کی حمایت کے ساتھ آئین سازی میں آزاد ہوگا جس کا واضح مطلب متحدہ پاکستان کا خاتمہ ہوگا۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ انہیں رائے عامہ ہموار کرنے کا وقت دیا جائے تا کہ وہ جتنا ممکن ہو سکے 6 نکات کو قبول کر لیں۔

اس کے بعد بھٹو اور ان کی پارٹی کے بعض دیگر لیڈر ڈھاکہ گئے اور 27 جنوری 1971ء کو مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی۔ چونکہ حمود الرحمٰن کمیشن کو (بنگلہ دیش بننے کی وجہ سے) عوامی لیگ کے رہنماؤں تک رسائی نہیں تھی اس لئے اس نے اس ملاقات میں صرف پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کا بیان کردہ مؤقف دیا ہے۔ بھٹو نے دعویٰ کیا کہ مجیب الرحمٰن کا 6 نکات پر مؤقف غیر لچکدار تھا۔ اگر چہ انہوں نے بھٹو کی اس بات سے اتفاق کیا کہ مغربی پاکستان کے عوام کو قائل کرنا پڑے گا کہ 6 نکات پر عملدرآمد سے پاکستان کی وحدت کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا لیکن قومی اسمبلی کا اجلاس 15 فروری سے آگے مؤخر کرنے پر ہرگز تیار نہیں تھے۔ بھٹو مایوسی کے عالم میں مغربی پاکستان واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے 11 فروری کو یحییٰ خان سے ملاقات کر کے انہیں مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے نتائج سے آگاہ کیا۔ بھٹو نے تجویز دی کہ مارچ کے آخر سے پہلے قومی اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا جائے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یحییٰ نے میری تجویز سے اتفاق کیا لیکن مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب انہوں نے 3 مارچ کو نومنتخب اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ اس دوران حکومت سازی کے عمل میں تاخیر کے باعث مشرقی پاکستان میں احتجاجی تحریک زور پکڑنے لگی۔

15 فروری کو بھٹو نے پشاور میں پریس کانفرنس کے دوران اعلان کیا کہ عوامی لیگ کی طرف سے اگر ہمارا نقطہ نظر نہ سنا گیا تو ہمارے ارکان 3 مارچ کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کریں گے۔ (ایضاً:80)۔ بعد ازاں حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے حلفیہ بیان میں بھٹو نے یہ تردید کی کہ وہ اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اور ان کی پارٹی رہنما صرف یہ چاہتے تھے کہ عوامی لیگ 6 نکات پر سمجھوتے کے لئے کچھ لچک کا مظاہرہ کرے۔ بہر حال 21 فروری کو پیپلز پارٹی کا ایک کنونشن ہوا جس میں ''پارٹی فیصلے کے برخلاف 3 مارچ کے اسمبلی اجلاس میں ارکان اسمبلی سے شرکت نہ کرنے کا حلف لیا گیا''۔ (ایضاً)۔ آخر کار 28 فروری کو

بھٹو نے لاہور میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کے دوران دوٹوک اعلان کیا کہ وہ 3 مارچ کے اجلاس میں شرکت نہیں کریں گے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یحییٰ خان اور ان کے مشیروں نے اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ 22 فروری کو کیا لیکن اس فیصلے سے مجیب الرحمٰن کو 28 فروری سے پہلے آگاہ نہ کیا گیا۔ یعنی ٹھیک اس روز تک جب بھٹو نے جلسے سے خطاب کیا۔ جلسے میں بھٹو نے دھمکی دی کہ ''دوسری جماعتوں کے ارکان نے اگر ڈھاکہ جانے کا فیصلہ کیا تو وہ مغربی پاکستان کی واپسی کا ٹکٹ نہ لیں کیونکہ ان کو واپس نہیں آنے دیا جائے گا اور نہ صرف ان کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی بلکہ خیبر سے کراچی تک ملک کو آگ لگا دی جائے گی''۔ (ایضاً)۔

میں (مصنف) خود اس جلسے کا عینی شاہد ہوں۔ اس موقع پر بھٹو اپنی اداکاری کی صلاحیتوں کے نقطہء کمال پر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے پارٹی کے سینئر رہنما میاں محمود علی قصوری کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر کہا کہ نہ صرف ڈھاکہ جانے والے ارکان کی ٹانگیں بلکہ بازو بھی توڑ دیے جائیں گے۔ چنانچہ یہ دراصل ان کے اپنے ایسے ارکان اسمبلی کیلئے بھی وارننگ تھی جو 6 نکات سے شاید کسی حد تک ہمدردی رکھتے ہوں۔ اگلے روز بھٹو نے پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس کے آڈیٹوریم میں طلبا سے خطاب کیا۔ اس تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ 6 نکات پر عملدرآمد کے نتیجے میں پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ ان باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عوامی لیگ، یحییٰ حکومت اور بھٹو کے درمیان پائی جانے والی رنجشیں اب مغربی پاکستان میں عوام کے ذہن میں بھی ڈال دی گئی تھیں۔

حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یحییٰ خان کے قریبی ساتھی جنرل عمر جو بظاہر نیشنل سکیورٹی کونسل کے سیکرٹری بھی تھے نے یحییٰ خان کے اپنے سیاسی پلان پر عملدرآمد کے لئے انتخابی مہم کے دوران فنڈز بھی تقسیم کئے۔ انتخابات کے دوران وہ مغربی پاکستان کے بعض سیاستدانوں کے ساتھ رابطوں میں رہے تا کہ انہیں اجلاس میں شرکت نہ کرنے پر رضامند کر سکیں یا ایسے ارکان اجلاس کے التواء کا مطالبہ کریں۔ البتہ فوجی حکومت عوامی سطح پر یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ اسمبلی کے اجلاس میں التواء کا فیصلہ مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کے دباؤ کا نتیجہ تھا اور اس میں یحییٰ خان کی اپنی کوئی خواہش شامل نہیں تھی۔ دیگر لفظوں میں یحییٰ خان حکومت کا اپنا ایک خفیہ ایجنڈا تھا جو بھٹو کے مؤقف سے مطابقت رکھتا تھا۔ کمیشن نے اس بات کو مسترد کر دیا کہ بھٹو اور یحییٰ واقعی اس ڈرامے میں شامل تھے۔ دوسری طرف پیپلز پارٹی نے الزام لگایا کہ یحییٰ اور مجیب نے آپس

میں گٹھ جوڑ کرلیا۔ اس مؤقف کی تائید میں یہ دلیل دی گئی کہ یحییٰ خان نے سرعام کہا کہ انہیں 6 نکات میں کوئی قابل اعتراض چیز نظر نہیں آئی اور یہ کہ انہوں نے مجیب کو اپنا وزیراعظم قرار دیا اور عوامی لیگ کی طرف سے بطور صدر ذمہ داریاں جاری رکھنے کی پیشکش بھی قبول کر لی۔ کمیشن نے ریمارکس دیے کہ ''یحییٰ خان کسی دوسری چھوٹی پارٹی سے کہیں زیادہ بھٹو اور شیخ مجیب سے ساز باز کر رہے تھے۔ وہ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر رہے تھے''۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ شراکت اقتدار کے کسی فارمولے پر پہنچنے کی بجائے تنازعہ مزید شدت اختیار کر گیا۔ اس کا نتیجہ پاکستان ٹوٹنے کی صورت میں نکلا۔ نو منتخب اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے میں تاخیر سے مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر مظاہرے شروع ہو گئے۔ 2 مارچ کو فوج کو حکم دیا گیا کہ وہ امن وامان بحال کرے لیکن 48 گھنٹے کے اندر حکم دیا گیا کہ وہ واپس بیرکوں میں چلی جائے۔

مارچ کے اوائل سے امن وامان کی صورتحال تیزی سے بگڑنا شروع ہوگئی۔ عوامی لیگ کے ورکروں اور جرائم پیشہ انڈرورلڈ کے مسلح افراد نے غیر بنگالیوں پر حملے شروع کر دیے۔ ان لوگوں کو ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کے بعض غیر مطمئن سپاہیوں کی مدد حاصل تھی۔ محفوظ علاقوں میں مقیم مغربی پاکستان کے شہریوں کی بہ نسبت اردو بولنے والے بہاری جو اپنی الگ نسلی شناخت چاہتے تھے ان حملوں کا زیادہ آسانی سے نشانہ بنے۔ تشدد کے نتیجے میں بھاری تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں اور لوگ زخمی ہوئے۔ مغربی پاکستان کے جو باسی اپنے خاندانوں کو واپس بھجوا سکتے تھے انہوں نے واپس بھجوانا شروع کر دیا۔ یہ بات واضح تھی کہ غیر بنگالیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ مقامی آبادی سے الگ تھلک نظر آ رہے تھے۔ میجر جنرل حکیم اللہ قریشی نے الزام لگایا ہے کہ عوامی لیگ نے انتخابی مہم کے دوران اور بعد میں بدمعاشوں والے ہتھکنڈے استعمال کئے اور بعدازاں اپوزیشن کو ہراساں کرنا اس کی مستقل روش بن گئی۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح اگست 1970ء میں انتخابات سے پہلے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کا سفر کیا۔ ان کے ساتھ سکیورٹی کا دستہ بھی تھا۔ انہوں نے سید پور۔ رنگ پور۔ دیناج پور میں ایک بٹالین کی کمان سنبھالنا تھی لیکن میرا سیکنڈ اینڈ کمانڈ اس فیصلے سے خوش نہیں تھے کیونکہ یہ نہایت پُر خطر ہوتا۔ (قریشی 2002ء:5)۔

جیسے ہی 3 مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا تو مغربی پاکستان والوں پر حملوں میں

شدت آ گئی۔29 کیولری یونٹ کے لیفٹیننٹ عباس جو بنگالی سپاہیوں کے ساتھ بازار میں تازہ سبزیاں خرید نے گئے تھے کو بنگالی عسکریت پسندوں نے حملہ کر کے ہلاک کر دیا لیکن بنگالی سپاہیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ البتہ ان کے ہتھیار ''واپس'' لئے گئے۔(2002ء:17-16)۔ میں نے مارچ 1971ء کے ابتدائی ایام میں چٹا گانگ کے دورے میں واقعات کے ایک عینی شاہد کا انٹرویو کیا جنید چودھری کا آسام کے ایک ممتاز گھرانے سے تعلق ہے اور وہ نسلاً بنگالی ہیں۔ ان کے والد متین چودھری مسلم لیگ کے سرگرم رہنما اور قائداعظم کے قریبی ساتھی تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ:

> ''قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو طلب نہ کرنے کا اعلان سن کر بنگالی عسکریت پسندوں نے چٹا گانگ میں بہاریوں پر حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں میں عوامی لیگ کے کارکن اور مقامی جرائم پیشہ عناصر دونوں شریک تھے۔ ان لوگوں کو نچلے درجے کے سرکاری افسروں کی پشت پناہی حاصل تھی جو مغربی پاکستان کے غلبے کے خلاف تھے اور اردو بولنے کی وجہ سے بہاریوں کو جاسوس سمجھتے تھے۔ 25 مارچ کو فوجی آپریشن شروع ہونے سے کچھ پہلے چند بہاریوں کو بہیمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دوسری طرف بہاریوں نے اپنا وزن مغربی پاکستان کے پلڑے میں ڈالا اور جب پاکستانی فوج نے کریک ڈاؤن شروع کیا تو انہوں نے بنگالیوں کو پکڑ دھکڑ میں فوج کی حمایت کی''۔

پاکستان کی فوج 25 مارچ تک غیر فعال رہی، اس دوران مشرقی پاکستان کی صورتحال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اپنی رپورٹ میں جسٹس حمودالرحمٰن کمیشن نے حیرت کا اظہار کیا کہ آخر فوج نے تشدد کی لہر کو شروع میں ہی دبانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اس کی بجائے فوجیوں کو بیرکوں میں واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں مارشل لا حکومت کو مرکزی حکومت نے کوئی بھی ایکشن لینے سے منع کر دیا تھا۔ گورنر مشرقی پاکستان ایڈمرل احسن نے کمیشن کو بتایا کہ انہوں نے صدر یحییٰ خان کو بار بار مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہ ملی۔ ایڈمرل احسن اور جنرل یعقوب خان دونوں اس بات پر قائل تھے کہ

صرف سیاسی حل ملک کو بچا سکتا ہے۔ احسن نے کئی بار راولپنڈی ٹیلی فون کر کے یحییٰ خان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں بتایا گیا کہ صدر کراچی میں ہیں۔ ایسی مشکل صورتحال میں انہیں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے منصب سے ہٹا دیا گیا چنانچہ 4 مارچ کو وہ چارج جنرل یعقوب خان کے سپرد کر کے ڈھاکہ سے روانہ ہو گئے۔ تاہم جنرل یعقوب خان نے بھی اپنے پیشرو کی حکمت عملی جاری رکھتے ہوئے حکومت کو مسئلے کا سیاسی حل نکالنے کا مشورہ دیا۔ عملی معنوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مجیب یا اس کے نامزد کردہ کسی شخص کی سربراہی میں عبوری صوبائی حکومت تشکیل دی جائے۔ جب حکومت نے اس تجویز کو رد کر دیا تو صاحبزادہ یعقوب خان نے 4 مارچ کی شب کو بذریعہ فون استعفیٰ دے دیا جو 5 مارچ کو ایک سگنل کے ذریعے منظور کر لیا گیا۔ صاحبزادہ یعقوب نے اختیارات جنرل ٹکا خان کے سپرد کر دیے جو چارج سنبھالنے کے لئے 7 مارچ کو ڈھاکہ پہنچ گئے۔ (حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ 2001ء:3-82)۔

کمیشن کی رائے یہ تھی کہ اس بات کے کافی ٹھوس ثبوت موجود نہیں کہ مرکزی حکومت نے مشرقی پاکستان کی انتظامیہ کو سرے سے کوئی ایکشن لینے سے منع کر دیا تھا۔ ایڈمرل احسن اور جنرل یعقوب دونوں نے سخت کارروائی کی لیکن کامیابی نہ ملی۔ البتہ کمیشن نے یہ بات مسترد نہیں کی کہ:

> ''اس بے عملی میں کسی نہ کسی حد تک راولپنڈی کے حکام کا بھی ہاتھ تھا۔ کیونکہ اگرچہ جنرل یحییٰ خان نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جنرل یعقوب ایکشن لینے سے گریزاں ہیں اور انہوں نے جنرل ٹکا خان کو بھیجا لیکن انہوں نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی 25 مارچ 1971ء تک برقرار رکھی جس کے بعد بھرپور فوجی آپریشن شروع ہو گیا''۔ (ایضاً:83)۔

جنرل یعقوب خان اضافی فوجی نفری چاہتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ نفری ناکافی تھی کیونکہ سکیورٹی اہلکاروں کی نصف تعداد بنگالی تھی۔ اس دورانیے میں مشرقی پاکستان میں مزید 2 ڈویژن فوج اتار دی گئی۔ جنرل یحییٰ خان نے دعویٰ کیا کہ ان کی رائے میں پیپلز پارٹی کے بائیکاٹ کی صورت میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ کمیشن نے حالات و واقعات کا مزید تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کے اعلان کے فوراً یحییٰ خان کو ڈھاکہ جا کر مجیب الرحمٰن سے ملنا چاہیئے تھا لیکن اس کے برعکس انہوں نے شیخ مجیب کو

ملاقات کیلئے راولپنڈی آنے کی دعوت دی جو انہوں نے مسترد کر دی۔ شیخ مجیب کے انکار پر یحییٰ خان برافروختہ ہو گئے اور سخت الفاظ میں ایک ٹیلی گرام ارسال کر کے دعوت مسترد کرنے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ مشرقی پاکستان کے گورنر اور وزیر اعلیٰ نے یحییٰ خان سے بار بار کہا کہ وہ ڈھاکہ آئیں اور مجیب سے ملیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہر حال حکومت نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کی نئی تاریخ کا اعلان کر دیا لیکن شیخ مجیب نے شرکت کے لئے 4 شرائط عائد کر دیں:

1: مارشل لاء فوری طور پر ہٹا دیا جائے۔

2: فوجی اہلکاروں کو فوری طور پر واپس بیرکوں میں جانے کا حکم دیا جائے۔

3: حالیہ گڑبڑ کے دوران ہونے والے جانوں کے ضیاع کی تحقیقات کرائی جائے۔

4: اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔ (قوامی اسمبلی کے اجلاس سے قبل)۔

یحییٰ خان اور مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کا ڈھاکہ میں اکٹھ

صدر یحییٰ 15 مارچ کو ڈھاکہ آ گئے۔ ان کے بعد مغربی پاکستان کے سیاستدان بھی پہنچ گئے۔ یحییٰ نے ایک ساتھ ملنے کی بجائے سیاستدانوں سے باری باری ملاقات کی۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ بتایا ہے کہ: ''ان تمام حالات میں ایک موقع کے سوا شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو ایک دوسرے سے یا پھر صدر کے ساتھ ایک وقت میں ملاقات نہ کر سکے''۔ (ایضاً:85)۔ ڈھاکہ میں یہ مذاکرات مشرقی پاکستان کی تیزی سے بگڑتی صورتحال کے پس منظر میں کئے جا رہے تھے۔ مجیب الرحمٰن نے 7 مارچ کو ایک ہدایت نامہ جاری کیا جس میں مارشل لا کی رٹ مسترد کرنے کی اپیل کی گئی۔ جس کے تحت ہڑتالوں، سول نافرمانی، تمام تعلیمی اداروں کی بندش جیسے اقدامات کر کے حکومتی اتھارٹی کو مسترد کرنے کے لئے کہا گیا۔ یحییٰ خان اور شیخ مجیب نے ڈیڈ لاک کے خاتمے کے لئے ملاقات کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مطالبہ کیا کہ مارشل لا اٹھا کر قومی اسمبلی کو فعال کیا جائے۔ یحییٰ خان نے کہا کہ وہ مطالبے سے متفق ہیں لیکن یہ فیصلہ مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت بالخصوص بھٹو کی رضامندی سے مشروط ہے۔ بھٹو 21 مارچ کو ڈھاکہ پہنچے جہاں ائیر پورٹ پر مشتعل سیاسی کارکنوں نے ان کا استقبال کیا۔ 22 مارچ کو بھٹو اور شیخ مجیب نے پہلے مشترکہ اور پھر الگ الگ یحییٰ

خان سے ملاقات کی۔ بھٹو دعویٰ کرتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن قومی اسمبلی کے ملک کے دونوں حصوں میں الگ الگ اجلاس بلانے کا مطالبہ کرتے رہے لیکن جب اجلاس ہوئے شیخ مجیب نے اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا۔

اس مرحلے پر یحییٰ خان ان کے قانونی مشیر جسٹس اے آر کارنیلیئس، اقتصادی مشیر ایم ایم احمد، پرنسپل سٹاف آفیسر جنرل پیرزادہ اور ایک فوجی افسر کرنل حسن نے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی قیادت سے الگ الگ ملاقات کی۔ صدر یحییٰ خان نے بھٹو کی بہ نسبت عوامی لیگ کیلئے نرم گوشہ رکھنے والی مغربی پاکستان کے دیگر سیاسی رہنماؤں سے بھی رابطے کئے۔ نیشنل عوامی پارٹی (اب عوامی نیشنل پارٹی) کے رہنما ولی خان نے دعویٰ کیا ہے کہ شیخ مجیب نے انہیں ایک خط دکھایا جس میں یحییٰ خان نے پیشکش کی کہ:

> ''مجیب الرحمٰن کو ایک ایسے حل کی پیشکش کی گئی جس سے ان کی تشفی ہوتی۔ ایسا حل جو 6 نکات سے بھی ہٹ کر تھا۔ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ حل مکمل علیحدگی کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ یقیناً جنرل یحییٰ ایسا کوئی خط لکھنے کی یکسر تردید کرتے ہیں اور ہمیں بھی ایسی کوئی دستاویز کہیں نظر نہیں آئی۔ اگرچہ ہمارے پاس ولی خان کے الفاظ پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں لیکن شیخ مجیب اور اس دستاویز کی عدم موجودگی میں ہم اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے کہ ولی خان کو دکھایا گیا وہ خط صحیح تھا یا نہیں''۔ (ایضاً:88)۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں بتایا گیا کہ 23 اور 24 مارچ کو عوامی لیگ کی قیادت کا مؤقف سخت اور غیر لچکدار ہو گیا۔ پہلی بار یہ لوگ سرعام پاکستان کو کنفیڈریشن بنانے کی باتیں کر رہے تھے۔ عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری تاج الدین احمد نے کہا کہ اب مذاکرات کرنے کو کچھ باقی نہیں رہ گیا، اور یہ کہ عوامی لیگ نے اپنا مؤقف کھل کر واضح کر دیا ہے۔ 23 مارچ کو یوم پاکستان پر پاکستان کے قومی پرچم کی بجائے پورے مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرا دیے گئے۔ صرف بہاریوں کی اکثریت والے علاقوں سید پور اور پاربتی پور میں ایسا نہیں ہوا۔ (قریشی 2002ء:29)۔

یہ بات واضح ہے کہ سیاسی جمود کے خاتمے کیلئے تینوں فریقوں کے درمیان بات چیت

نہایت ضروری تھی۔ یہ کوئی آئینی ڈیڈلاک نہیں تھا کیونکہ پارلیمانی آئینی نظریے اور روایت کے مطابق عوامی لیگ قومی اسمبلی میں واضح اکثریت کی بنا پر حکومت بنانے کا حق رکھتی تھی۔ لیکن یہ فوجی اسٹیبلشمنٹ اور مغربی پاکستان کی سب سے بڑی جماعت پیپلز پارٹی کیلئے قابل قبول نہیں تھا۔ عوامی لیگ کے آخر تک غیر لچکدار مؤقف سے صورتحال مزید بگڑ گئی۔ بہرحال بھٹو اور یحییٰ خان نے 24 اور 25 مارچ کو ملاقات کی تاکہ عوامی لیگ کے مؤقف پر تبادلہ خیال کیا جاسکے۔ ملاقات میں کیا طے پایا اس کی تفصیل کبھی منظر عام پر نہیں آسکی۔

سیاسی رابطوں کی ناکامی کی وجوہات

حمودالرحمٰن کمیشن نے سازش سے بھرپور ایک انکشاف بھی کیا ہے: اقتدار منتقل نہ کرنے اور فوجی کریک ڈاؤن کے آپریشن ''بلٹز Blitz'' کا فیصلہ خاموشی سے کیا گیا جبکہ وسط مارچ تک جاری رہنے والے مذاکرات کیموفلاج سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ جنرل یحییٰ خان اور ان کے فوجی مشیروں کے عزائم یہ تھے کہ عوامی لیگ کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے۔ (کمیشن رپورٹ)۔ اس دوران فوجی دستوں نے پوزیشن مستحکم کرلی۔

کمیشن نے آپریشن بلٹز کے پس منظر کی تاریخ بیان نہیں کی لیکن اس کے بعد کی گئی ریسرچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ 1970ء کے انتخابات سے کہیں پہلے تیار کیا گیا اور قومی اسمبلی کے انتخابات کے 4 روز کے اندر 11 دسمبر 1970ء کو یعقوب خان نے آپریشن کے حکمنامے پر دستخط کر کے اسے جاری کیا۔ (نواز 2008ء: 284)۔ اوائل مارچ تک جنرل یعقوب نے محسوس کرلیا کہ ایسا آپریشن غیر مفید ہوگا چنانچہ انہوں نے مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنے کی سفارش کی لیکن یہ تجویز فوج کی اعلیٰ کمان کیلئے ناقابل قبول تھی۔ یحییٰ اور ان کے مشیروں کے ٹولے نے اصل پلان پر عملدرآمد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا جس کی اساس یہ تھی کہ عوامی لیگ کو مرکز میں حکومت سازی کے حق سے انکار کر دیا جائے۔

بحران پیدا ہونے کے بارے میں عوامی لیگ کی ذمہ داری کے حوالے سے کمیشن نے نوٹ کیا کہ ہمارے پاس یہ یقین رکھنے کی وجہ موجود ہے کہ خود عوامی لیگ 26 مارچ 1971ء کی صبح 3 بجے ایکشن لینے کا منصوبہ رکھتی تھی۔ (صفحہ 89) اس کے علاوہ اس وقت تک دارالحکومت ڈھاکہ ایسا

شہر بن چکا تھا جہاں پاکستانی شناخت والے افراد بالخصوص حکومت سے متعلق لوگوں کی مسلح سکیوٹی کے بغیر نقل وحرکت ناممکن بن چکی تھی۔ فوجی حکومت مؤثر انٹیلی جنس جمع کرنے میں ناکام رہی کیونکہ مقامی سطح پر کافی تعداد میں ایجنٹ دستیاب نہیں تھے جن سے خفیہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہوں۔ بالالفاظ دیگر اس وقت تک مغربی پاکستان والوں کی مقامی آبادی سے اجنبیت اور دوری کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔

جہاں تک بھٹو کے کردار کا معاملہ ہے تو اس سے متعلق کمیشن کا خیال ہے کہ اس کا 3 بڑے تناظر میں جائزہ لینا چاہیئے: انہوں نے مطالبہ کیا کہ 3 مارچ کو طلب کیا گیا قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا جائے: انہوں نے اصرار کیا کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی پر مشتمل مخلوط حکومت تشکیل دی جائے: اور انتخابی نتائج کے بعد انہوں نے دو اکثریتی نظریے Two-Majority کی باتیں کرنا شروع کردیا تھا۔ حمود الرحمٰن کمیشن کے ارکان کی رائے یہ تھی کہ پیپلز پارٹی نے انتخابی مہم کے دوران عوامی لیگ کے 6 نکات کو کوئی خاص ایشو نہیں بنایا تھا۔ لہذا جب انتخابات کا عمل مکمل ہوا اور عوامی لیگ نے دو تہائی اکثریت حاصل کر لی تو بھٹو کا یہ ضد کرنا کہ عوامی لیگ سمجھوتہ کرے یا 6 نکات پر لچک دکھائے۔ جمہوری یا پارلیمانی روایات سے متصادم تھا۔ اسی طرح پیپلز پارٹی کا یہ مؤقف کہ کوئی آئین اس کی شرکت کے بغیر نہ بنایا جائے وہ آئینی اصولوں کے منافی تھا۔

پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان کے صرف 2 صوبوں پنجاب اور سندھ میں اکثریت ملی تھی جبکہ عوامی لیگ کو ایوان میں مجموعی طور پر اکثریت حاصل تھی اور امکان تھا کہ وہ مغربی پاکستان کی بعض جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کر لیتی۔ اس لئے بھٹو کا آئین پر اتفاق رائے کرنے پر اصرار جائز نہیں تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی نام نہاد 2 اکثریتی نظریہ کی بنیاد پر عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں اتفاق رائے چاہتے تھے۔ کمیشن سمجھتا ہے کہ ان کا نقطہء نظر پارلیمانی جمہوریت کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسکے علاوہ انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد بھی بھٹو مشرقی پاکستان میں پنپنے والے غم وغصے اور ان کے مطالبات کی شدت کا اندازہ نہ لگا سکے۔ (ایضاً: 96-94)۔ کمیشن نے خلاصہ یہ نکالا کہ یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن، بھٹو اور ان کے مشیر یہ تمام مختلف انداز سے مشرقی پاکستان کی صورتحال خراب کرنے کے ذمہ دار تھے۔ البتہ یہ نہیں بتایا کہ اصل ذمہ دار کون تھا۔

ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان بھی جاری مذاکرات کے دوران ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب سے بات کی۔ شیخ مجیب کو یقین تھا کہ یحییٰ خان ڈھاکہ میں ان سے ملاقات سے پہلے فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اقتدار عوامی لیگ کو نہیں سونپیں گے۔ انہوں نے نہایت دُکھ اور افسوس کے ساتھ کہا کہ مغربی پاکستان کے رہنماؤں نے بنگالیوں کی حب الوطنی اور وفاداری کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اصغر خان نے اپنی کتاب میں بھٹو کے اس ناجائز رویے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو بحران کو گمبھیر کرنے اور پاکستان کو توڑنے کا باعث بنا۔ (خان 2005ء:42-31)۔

یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ یحییٰ خان نے عنان اقتدار اپنے پاس رکھی اور یوں فیصلہ سازی کا مطلق اختیار انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس لئے ان کا کردار ہی فیصلہ کن ہونا چاہیئے تھا۔ اگر یہ درست ہے کہ 15 مارچ کے بعد ہونے والے مذاکرات محض کیموفلاج تھے اور فوج پہلے ہی آپریشن کا فیصلہ کر چکی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سازش کا وجود پہلے سے موجود تھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ بھٹو نے مسئلے کے پر امن حل کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ یہ بات اب بھی واضح نہیں کہ کیا بھٹو عوامی لیگ یا مکتی باہنی کے خلاف کریک ڈاؤن کے منصوبے سے آگاہ تھے یا نہیں لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ منصوبے سے آگاہ تھے کیونکہ جس طرح فوج نے اقتدار عوامی لیگ کو نہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح بھٹو بھی اپوزیشن میں نہ بیٹھنے پر بضدر رہے۔ 24 اور 25 مارچ کو عوامی لیگ نے جو اشتعال انگیزیاں کیں اس سے فوج کو بہانہ مل گیا کہ مذاکرات سے پہلے کریک ڈاؤن کی ضرورت ہے۔

باب 9

خانہ جنگی اور 1971ء کی پاک بھارت جنگ

جس وقت تک فوجی کریک ڈاؤن نے زور پکڑا اس وقت تک مغربی پاکستان سے 45 ہزار لڑاکا فوجی مشرقی پاکستان میں جمع کئے جا چکے تھے۔ ان میں ڈھاکہ میں تعینات ایک بریگیڈ اور ایس ایس جی کے کمانڈوز کا جتھہ شامل تھا۔ (نواز 2008ء:267)۔ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو 10 اپریل 1971ء تک مؤثر ایک ڈائریکٹو جاری کیا گیا جس میں درج ذیل اہداف حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی۔

1: ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کو غیر مسلح کیا جائے۔

2: چھاؤنیوں کی سکیورٹی یقینی بنائی جائے۔

3: چٹاگانگ کے بحری اڈے کی سکیورٹی۔

4: لال منیر ہاٹ اور اشوردی کے ائیر فیلڈز کا کنٹرول۔

5: شہروں کی سکیورٹی۔ (خان 1973ء:71)

آپریشن سرچ لائٹ

اوپر جو اہداف متعین کئے گئے تھے ان میں حیرت والی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ مقاصد خالصتاً عسکری انداز میں مقرر کئے گئے تھے۔ ان میں عوامی لیگ کے لیڈروں یا باغیوں کی گرفتاری کا کوئی ذکر نہیں لیکن سب سے پہلا ایکشن یہ کیا گیا کہ شیخ مجیب کو رات ساڑھے 10 بجے ان کی رہائشگاہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت شیخ مجیب کے حامیوں نے کچھ مزاحمت کی کوشش کی جو با آسانی کچل

دی گئی۔عوامی لیگ کے دیگر رہنما یا تو روپوش ہو گئے یا فرار ہو کر مغربی بنگال (بھارت) چلے گئے۔ جس وقت 25 ، 26 مارچ کو آپریشن کوڈ نام 'سرچ لائٹ' شروع کیا گیا تو بھٹو ڈھاکہ میں موجود تھے۔ یقیناً جس ہوٹل میں وہ قیام پذیر تھے وہاں سے انہوں نے دھماکوں، ٹینکوں کے گولوں اور گولیوں کی آوازیں سُنی ہوں گی۔ اگلے روز انہوں نے مشہور تبصرہ کیا کہ '' اللہ کا شُکر ہے کہ پاکستان کو بچا لیا گیا ہے''۔ یہ بیان مختلف کتابوں میں معمولی ردوبدل کے ساتھ شائع ہوا۔(خان 2005ء:42، نواز 2008ء:288۔ قریشی 2002ء:23)۔ بہر حال ان الفاظ کی کوئی اور تشریح نہیں کی جا سکتی ماسوائے اس کے کہ بھٹو آپریشن کی توثیق کر رہے تھے۔ کیا انہوں نے حُب الوطنی کے جذبے سے متاثر ہو کر یہ کہا یا پھر یہ میکاولی جیسا خبث باطن تھا یہ قابل بحث پہلو ہے۔ کئی ماہ بعد بھٹو آپریشن کا یہ کہہ کر دفاع کر رہے تھے کہ کیونکہ انکا دعویٰ تھا کہ یہ عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان کا اگلے روز اعلان آزادی کرنے سے روکنے کا پیشگی اقدام تھا۔ انہوں نے ستمبر 1971ء میں لکھا کہ:

> ''کئی جگہوں کو نذر آتش کر دیا گیا اور ہم نے دیکھا کہ اخبار'' دی پیپل'' کے دفتر کو منہدم کر دیا گیا۔ یہ مقامی انگریزی اخبار فوج اور مغربی پاکستان کے خلاف بلا اشتعال اور سخت جارحیت کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اُفق پر پھیلتے شُعلوں میں میں کبھی ماضی اور کبھی مستقبل کے بارے میں سوچتا ۔ میں حیران تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہاں آنکھوں کے سامنے میں نے اپنے لوگوں کی ہلاکت اور تباہی دیکھی''۔ (بحوالہ نواز 2008ء: 268)۔

فوجی اقدام کی نہ صرف پیپلز پارٹی بلکہ مغربی پاکستان کی مقتدر اشرافیہ نے بھی حمایت کی۔ سرمایہ دار طبقہ، دائیں بازو کا اخبار نوائے وقت جبکہ جنگ اور انگریزی اخبار ڈان بھی آپریشن کا حامی تھا۔ بالخصوص نوائے وقت جو ہندو اثر و رسوخ، اسلام مخالف قوتوں اور بنگالی زبان کی ترویج کا مخالف تھا نے ان سب مسائل سے سختی سے نمٹنے پر زور دیا۔ (عالم 1995ء:326)۔ اس دوران بھارت کی مداخلت میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ بہر حال جیسے ہی شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا گیا اس وقت فوجی ٹینک اور انفنٹری کے یونٹ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تعینات کر دیئے گئے۔ جگن ناتھ ہال، جگن ناتھ ہاسٹل، اقبال ہال، اقبال ہوسٹل، رمنا گراؤنڈ کے ہندو مندروں اور دیگر ہندو اکثریت

والی آبادیوں میں فائرنگ اور شیلنگ کی گئی۔(علی 2007ء:48-247)۔کچھ مقامات پر مزاحمت بھی ہوئی لیکن فوج کی کارروائی نہایت سخت تھی اور 500 سے 700 افراد مارے گئے۔عوامی لیگ کے حامی اخبارات پر چھاپے مارے گئے۔کئی مقامات پر مزید ہلاکتیں بھی ہوئیں۔اگلے روز شیخ مجیب کو بذریعہ طیارہ بطور قیدی مغربی پاکستان منتقل کردیا گیا۔

اسی روز بنگالی افسر-- میجر ضیا الرحمٰن-- نے بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ آج کے بعد مشرقی پاکستان کا کوئی وجود نہیں۔انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن سے وفاداری کا حلف لیا اور دیگر بنگالیوں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دی۔چنانچہ بنگالی مسلح افواج کے اہلکار نہ صرف بغاوت کرنے لگے بلکہ فوجی قبضے کے خلاف ہتھیار بند بھی ہوگئے۔17 اپریل کو ایک جلاوطن حکومت تشکیل دی گئی جو بنگلہ دیشی ذرائع کے دعوے کے مطابق کشتیہ کے علاقے میں مقیم تھی۔اس کی شاخیں دہلی اور کلکتہ میں بھی قائم تھیں۔بنگلہ دیش کے بیشتر سول اور فوجی ملازمین نے اپنی وفاداری بنگلہ دیش سے ظاہر کی۔چنانچہ ان کے نقطہ نظر سے آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ ایک ریٹائرکرنل عثمانی اس فوج کا انچارج مقرر ہوا۔فوج 2 حصوں پر مشتمل تھی۔ایک حصہ نیامتا باہنی تھا جو مسلح افواج کے اہلکاروں پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے حصے مکتی باہنی میں سویلین مسلح افراد شامل تھے۔اسکے بعد دونوں حصے یکجا کر کے مکتی باہنی بنادی گئی۔(انٹرویو افتخار احمد چودھری)۔ہزاروں بنگالی جان بچانے کیلئے سرحد پار مغربی بنگال چلے گئے۔وہاں جو پناہ گزین کیمپ قائم تھے ان میں کئی افراد کو مکتی باہنی کے لئے بھرتی کیا گیا۔انہیں تربیت اور اسلحہ دے کر واپس بھیجا گیا تاکہ وہ پاکستانی فوجوں سے لڑائی کریں۔اس کے بعد جو خون خرابہ اور ہلاکتیں ہوئیں ان کے اعداد وشمار میں ڈرامائی فرق نظر آتا ہے۔میجر جنرل حکیم ارشد قریشی نے الزام لگایا کہ تصادم کے ابتدائی مراحل میں ہی مکتی باہنی نے ہزاروں پاکستان نواز بنگالیوں، بہاریوں اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والوں کو ہلاک کردیا۔(قریشی 2002ء:33)۔میجر جنرل اے او مٹھا جنہوں نے 9 اپریل تک فوجی آپریشن میں حصہ لیا۔انہوں نے بتایا کہ کس طرح چٹا گانگ سیکٹر کے دورے میں ایک زخمی بنگالی افسر نے کسی شرم کے بغیر اپنی غلطی تسلیم کی:

''جب میں وارڈ کی طرف جارہا تھا تو ایک زخمی بنگال افسر جو فوجی پہرے میں تھا نے مجھے آواز دے کر بلایا۔میں رُکا اور اس کی طرف بڑھا۔اس

نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے مسلح ساتھیوں سمیت مغربی پاکستان کی ایک خاتون کو باندھ کر اجتماعی زیادتی کی اور پھر برہنہ ناچنے پر مجبور کیا۔ یہ کہہ کر وہ بنگالی چاہتا تھا کہ اسے موت آ جائے''۔(مٹھا2003ء:341)۔

اس دوران یحییٰ خان نے ٹکا خان کو ایسٹرن کمانڈ سے ہٹا دیا لیکن وہ بدستور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور گورنر مشرقی پاکستان رہے۔ان کی جگہ میجر جنرل اے اے کے نیازی کو کئی دیگر جنرلوں پر ترقی دیتے ہوئے مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا۔انہوں نے 10 اپریل کو جنرل ٹکا سے چارج لیا۔جنرل نیازی نے لکھا کہ:

''25/26 مارچ 1971ء کی درمیانی شب جنرل ٹکا خان نے حملے کا آغاز کیا۔پُرسکون رات چیخوں،آہ و بکا اور آگ کے شعلوں سے لبریز ہوگئی۔ جنرل ٹکا نے اپنے زیر کنٹرول ہر چیز ایسے استعمال کی جیسے اپنے گمراہ عوام نہیں بلکہ دشمن کے خلاف کرتے ہیں۔فوجی ایکشن اس سے کہیں زیادہ بے رحم اور ظالمانہ تھا جتنا چنگیز خان یا ہلاکو خان نے بخارا اور بغداد میں قہرمانی سے کام لیا یا جس طرح جلیانوالہ باغ میں انگریز جنرل ڈائر نے مظالم ڈھائے تھے۔

جنرل ٹکا خان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ......ایک تو مسلح بنگالی فوجی یونٹوں کو غیر مسلح کریں اور دوم بنگالی لیڈروں کو حراست میں لیں لیکن اس کی بجائے انہوں نے ایک سخت پالیسی اختیار کرنے کو ترجیح دی۔انکا فوج کیلئے حکم تھا: مجھے لوگ نہیں بلکہ زمین چاہیئے ......میجر جنرل راؤ فرمان (علی) نے اپنی ٹیبل ڈائری میں لکھا تھا کہ:مشرقی پاکستان کی سبز زمین کو لہو رنگ کر دیا جائے گا''۔(نیازی 1999ء:6-45)۔

بعض دیگر کمانڈر بھی تبدیل کر دیے گئے۔ بعدازاں جنرل نیازی نے ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر کے طور پر سفارش کی کہ بریگیڈیئر ارباب کو لوٹ مار اور چوری کے الزامات پر ہٹا دیا جائے۔ بریگیڈیئر ارباب پر کورٹ آف انکوائری میں الزامات ثابت ہو گئے چنانچہ انہیں بطور سزا کورٹ مارشل کیلئے مغربی پاکستان بھجوا دیا گیا۔(ایضاً:50)۔بحیثیت مجموعی جنرل نیازی نے یہ ٹسوے بہائے کہ ان کے پاس چھوٹی اور ناکافی فورس تھی۔ بنگال کا مرطوب موسم اور نمی مغربی

پاکستان کے اہلکاروں کیلئے ناموزوں تھی اور وہ بیمار ہونے لگے۔ اس کے باوجود مئی 1971ء تک باغیوں کی مزاحمت توڑی جا چکی تھی اور ان کا جانی اور مالی دونوں طرح بھاری نقصان ہوا۔ باغیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ وہ یا تو ناقابل رسائی مقامات پر روپوش ہو چکے تھے یا بھارتیوں کی فراہم کردہ پناہ گاہوں میں چھپے زخم چاٹ رہے تھے۔ (ایضاً:62)۔

جنرل نیازی نے دعویٰ کیا کہ پاکستان آرمی نے باغیوں کی چھوڑی ہزاروں رائفلیں اور دیگر اسلحہ قبضے میں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے باغیوں کا تعاقب کرنے کیلئے بھارتی حدود میں داخل ہونے کی اجازت مانگی جو انہیں نہ دی گئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جون تک ناموزوں حالات اور مختصر وقت میں ہم زبردست اخلاقی، سیاسی اور عسکری حمایت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے کتاب میں بھارتی میجر جنرل خشونت سنگھ کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے بظاہر پاکستانی حکمت عملی کی تصدیق کی:

> ''بنگالی چھاپہ ماروں کے تعاقب میں مشرقی پاکستان کے ساتھ بھارتی سرحد پار کرنے کیلئے یحییٰ خان کے پاس ٹھوس وجوہات موجود تھیں۔ اس کے علاوہ چھاپہ ماروں کے بھارت میں اڈے تباہ کرنے اور مغربی پاکستان میں بھارت کے ساتھ مکمل جنگ کی بھی ٹھوس توجیہات موجود تھیں۔ یہ بھارت کا بدترین دور تھا۔ اس کے ریزرو فوجی ساحل کے دوسری طرف تھے۔ اس کے پاس جنگی ساز و سامان کی شدید قلت تھی جبکہ بھارتی فوجی اور سویلین دونوں فوری جنگ کے لئے تیار نہیں تھے۔ اگر یحییٰ اس وقت حملہ کر دیتے تو انہیں مون سون سے پہلے مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں پر خاطر خواہ کامیابی مل سکتی تھی''۔

پاکستان اور چین کی مشاورت

یحییٰ خان نے فوجی ایکشن کی حمایت حاصل کرنے کیلئے سینئر سفارتکار سلطان محمد خان کو بیجنگ بھیجا۔ چینی وزیراعظم چو این لائی نے سلطان محمد کو بتایا کہ یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان کے بحران کا سیاسی حل تلاش کرنا چاہیئے۔ اگرچہ چین نے پاکستان کی وحدت کی حمایت کی اور پاکستان کو مزید

2 ڈویژن فوج تیار کرنے میں مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ فوجی حکومت کے ایما پر مشرقی پاکستان میں براہ راست مداخلت کرنے پر تیار تھا۔ سلطان محمد بتاتے ہیں کہ ''یہ بات بتانا بھی مناسب ہوگا کہ اس ملاقات اور بعد میں ہونے والے رابطوں میں کبھی یہ وعدہ نہ کیا کہ چین اپنی فوج کے ساتھ پاکستان کی مدد کیلئے آئے گا''۔ (خان 2006ء: 308)۔

یہ نقطہ نظر نہایت اہم ہے۔ جہاں چینی قیادت نے پاکستان کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا وہاں وہ اس بات پر تیار نہیں تھی کہ مشرقی پاکستان میں ایک ایسی جماعت کے خلاف فوجی لحاظ سے صف آرا ہو جسے عوام نے بھاری اکثریت سے منتخب کیا تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں چینی فوج داخل کرنے سے سوویت یونین سخت ردعمل ظاہر کرسکتا تھا۔ امریکہ سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں وہ چین کی گوشمالی نہ کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسی جمع تفریق پاکستان کی دفاعی حکمت عملی میں کبھی شامل نہیں ہوئی بلکہ پاکستانی حکومت بھارت کے مقابلے میں چین کی حمایت کی مسلسل خواہاں رہی۔ اس کے برعکس سرکاری سطح پر چین کی طرف سے بھارت مخالف کارروائی کی توقع جاری رہی۔

پاک امریکہ رابطے

1970ء میں ری پبلکن پارٹی کے صدر رچرڈ نکسن وائٹ ہاؤس میں متمکن تھے۔ امریکیوں نے چین سے قربتوں کا سوچنا شروع کر دیا تھا اور وزیرخارجہ ہنری کسنجر کو مذاکرات میں مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ البتہ امریکہ چاہتا تھا کہ اس بابت تمام پیشرفت خفیہ رہے اور چین سے ابتدائی رابطوں کیلئے پاکستان کو بطور سہولت کار منتخب کیا گیا۔ رومانیہ جیسے بعض دیگر ممالک کی بھی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس خدمت کے صلے میں امریکہ نے اسلحے کی فروخت پر پابندی ایک بار کیلئے ختم کرنے کی پیشکش کی لیکن اس میں ٹینکوں کی فروخت شامل نہیں تھی کیونکہ اس سے بھارت ناراض ہو جاتا۔ خوراک اور اقتصادی امداد کی بھی پیشکش کی گئی۔ (اعجاز الدین 2002: 104-91)۔ رچرڈ نکسن نے یحییٰ خان کو بتایا کہ ''پاکستان میں یہ تاثر عام ہے کہ امریکہ بھارت کی حمایت کر رہا ہے لیکن ہماری حکومت پاکستان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کرے گی''۔ (ایضاً: 109)۔ جواب میں یحییٰ خان نے بھی امریکیوں کو یقین دلایا کہ پاکستان کبھی امریکہ کو شرمسار نہیں ہونے دے گا۔

انہوں نے پاکستان کے لئے مزید اقتصادی امداد کی بھی درخواست دی۔ نکسن انتظامیہ کو شرمندگی سے بچانے کی بات کا مطلب یہ تھا کہ یحییٰ خان اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ پاکستان نے معرکہ رن آف کچھ اور 1965ء کی جنگ دونوں میں امریکی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکی اسلحہ بھارت کے خلاف استعمال کیا۔ اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ بھارت کے ساتھ کسی تصادم بالخصوص وہ تصادم جو پاکستان نے پہلے شروع کیا ہو میں امریکی ہتھیار استعمال نہیں کئے جائیں گے۔ بہر حال بھارت نے اس خبر پر سخت ردعمل کا اظہار کیا کہ امریکہ پاکستان کو اسلحہ فروخت کرنے والا تھا۔ ان دنوں یحییٰ خان اور اندرا گاندھی دونوں اقوام متحدہ کے قیام کی 25 ویں سالگرہ کے سلسلے میں امریکہ میں تھے۔ امریکی صدر رچرڈ نکسن نے دونوں لیڈروں سمیت دیگر عالمی رہنماؤں کو وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا لیکن اندرا گاندھی نے دعوت مسترد کر دی۔ (ایضاً: 111)۔ 25 اکتوبر 1970ء کو امریکہ کے چین سے خفیہ رابطے پر بات چیت کیلئے نکسن، کسنجر اور یحییٰ خان میں ملاقات ہوئی۔ یحییٰ خان نے وعدہ کیا کہ وہ چینی قیادت تک پیغام پہنچا دیں گے۔ چنانچہ یحییٰ خان نے چواین لائی سے بات کی جنہوں نے مثبت جواب دیا جس کے بعد سلسلہ جنبانی آگے بڑھنے لگا۔

مارچ 1971ء کے آخر سے آگے تک پاکستان میں صورتحال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ امریکہ نے پاکستان کی سکیورٹی صورتحال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ یحییٰ خان حالات جلد معمول پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چین نے بھی ایسے ہی بیانات جاری کئے لیکن یہ الزام بھی لگایا کہ بھارت پاکستان کے خلاف گھناؤنے عزائم رکھتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان نے چین اور امریکہ کے درمیان پیغام رسانی کا کردار ادا کیا تاکہ برف جلد پگھل جائے۔ امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے اپنے چین کے دورے کو یہ کہہ کر خفیہ رکھنے کی کوشش کی کہ یہ دراصل جنوبی ایشیا کا عمومی دورہ تھا۔ انہوں نے پہلے بھارت کا دورہ کیا اور 7 جولائی 1971ء کو اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان میں چین کے اثر ورسوخ پر تشویش کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ مشرقی پاکستان میں جاری خانہ جنگی کے تناظر میں طاقت استعمال کرنے کے حق میں نہیں جبکہ کسنجر نے مشرقی پاکستان سے آنے والے پناہ گزینوں کی بڑی تعداد سے پیدا ہونے والے مسائل پر ہمدردی کا اظہار کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ اور بھارت کے تعلقات

مزید مستحکم ہوں گے اوران پر علاقائی تنازعے سے کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ایک مضبوط بھارت امریکہ کے مفاد میں ہے۔(ایضاً:8-157)۔

9 جولائی کو ہنری کسنجر پاکستان آئے اور پاکستانیوں سے کہا کہ پاکستان کی بھارت کے ساتھ جنگ کے امکانات 3 میں سے 2 ہیں۔لیکن انہیں محسوس ہوا کہ یحیٰی خان اوران کے مشیر اس بات پر قائل ہیں کہ بھارت جنگ کی منصوبہ بندی نہیں کررہا۔لیکن اگر جنگ شروع ہوگئی تو جیت یقیناً ہماری ہوگی۔(کوکس 2001ء:191)۔پتہ نہیں فضائی طاقت کے بغیر یہ کیسا ممکن ہوتا اس کے علاوہ مقامی آبادی کی جارحیت بھی شاید فوجی قیادت کو نظر نہ آئی جس کی بنا پر انہوں نے غیر حقیقت پسندانہ اندازہ لگایا۔ جب کسنجر واپس امریکہ چلے گئے اور نیشنل سکیورٹی کونسل کو اپنے دورے پر بریفنگ دی اور کہا کہ بھارت جنگ کیلئے پر تول رہا ہے لیکن یحیٰی خان کے پاس بھارتی حملے سے پہلوتہی اور مسئلے کے سیاسی حل کی بصیرت کا فقدان ہے۔(ایضاً:193)۔انہوں نے تجویز پیش کی کہ امریکہ کو اس نہج پر سوچنا چاہیئے جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان آزاد ہو جائے۔(ایضاً)۔ انتہائی دلچسپ امر یہ ہے کہ اسکے بعد امریکہ میں ہونے والی بحث میں صدر نکسن نے اس رائے کا اظہار کیا کہ بھارت کی حوصلہ شکنی کی جائے کہ وہ بنگالی پناہ گزینوں کو پاکستان توڑنے کیلئے استعمال کرے لیکن پاکستان توڑنے سے ان کی مراد ایسی تھی جیسے وہ نئی دہلی میں ہوں۔(ایضاً:196)۔تاہم جب فوجی حکومت نے مجیب الرحمٰن کے ساتھ مذاکرات کی بجائے ان کے خلاف غداری کا مقدمہ چلایا تو امریکیوں نے شدید تلملاہٹ کا اظہار کیا۔

بھارت روس امن معاہدہ

عوامی لیگ، مکتی باہنی اور دیگر طاقتیں بھارت میں قائم اپنے اڈوں سے تحریک مزاحمت جاری رکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔اس کے باوجود بھارت نے اپنی تمام چالیں نہایت احتیاط سے تیار کیں۔اگرچہ بنگالی حریت پسندوں کو تربیت دینے کیلئے تربیتی کیمپ قائم کئے گئے تھے لیکن ان کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ بھی رکھی جاتی تھی۔اہم عہدے عوامی لیگ کے اعتدال پسند افراد کو دیے گئے جبکہ انتہا پسند سوچ رکھنے والوں کو محدود رکھا گیا۔جولائی سے آگے نئی دہلی نے ان افراد کی تربیت کا کام براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لیا کیونکہ مشرقی پاکستان سے آئے روز پناہ گزین

بھارتی علاقے میں منتقل ہو رہے تھے جن میں سے نوجوانوں کو مکتی باہنی میں بھرتی کر دیا جاتا۔ (سیسن اینڈ روز 1991ء:143)۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارتی قیادت پاکستان کے ساتھ جنگ کی تیاری کر رہی تھی۔ جب یحییٰ خان نے یہ دھمکی دی کہ اگر بھارت نے مشرقی پاکستان کے کسی حصے پر قبضے کی کوشش کی تو میں اعلان جنگ کر دوں گا تو بھارتی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے 21 جولائی کو ایوان بالا راجیہ سبھا میں تقریر کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ:

> ''پاکستان دنیا کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہا ہے کہ بنگلہ دیش کی صورتحال پاکستان اور بھارت کا معاملہ ہے حالانکہ حقیقت میں یہ مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں اور بنگلہ دیش کے عوام کا معاملہ ہے۔ یہ پاکستان کی حکومت کے اپنے اقدامات اور بنگلہ دیش میں پاکستانی فوج کے ڈھائے مظالم ہیں جن سے پاکستان بنگلہ دیش کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔اس دلدل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ پاکستان کے فوجی حکمران بنگلہ دیش کے عوام کے منتخب نمائندوں سے تصفیہ کریں''۔(دیورا 1995ء:102)۔

اس دوران بھارتی قیادت یہ یقینی بنانے میں لگی رہی کہ پاکستان سے جنگ کی صورت میں چین اس کی گوشمالی کیلئے مداخلت نہ کرے۔ چنانچہ 9 اگست 1971 کو روس اور بھارت کے درمیان دوستی اور تعاون کے معاہدے پر دستخط کئے گئے جس کی شق نمبر ix کہتی تھی کہ:

> ''معاہدے کے دونوں فریق کسی ایسے تیسرے ملک کو کسی قسم کی امداد فراہم نہیں کریں گے جوان دونوں میں سے کسی کے ساتھ مسلح تصادم میں ملوث ہو، اگر کوئی ملک ان دونوں میں سے کسی پر حملہ کرتا ہے تو بھارت اور روس فوراً مشاورت کر کے اس خطرے کے تدارک اور امن وسلامتی کے قیام کے لئے مؤثر اقدامات کریں گے''۔

یہ معاہدہ 20 سال کے لئے کیا گیا۔چین کی ممکنہ مداخلت کا توڑ کرنے کے بعد بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان پر بھارتی مؤقف کی سفارتی حمایت میں اضافے کے لئے سرگرمیاں تیز کر دیں۔ دنیا کو بھارت کی مداخلت کا جواز فراہم کرنے کیلئے مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی مبینہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو مرکزی نقطہ بنایا گیا۔اسی تناظر میں اندرا

گاندھی نے 25 اکتوبر کو کئی ممالک کے دوروں کا آغاز کر دیا تا کہ بین الاقوامی رہنماؤں کو ذاتی طور پر بتا سکیں کہ مشرقی پاکستان میں صورتحال بہت خراب ہے اور یہ کہ خانہ جنگی کا سیاسی حل تلاش کرنے کے لئے پاکستان کچھ نہیں کر رہا ہے۔ نومبر میں ذوالفقار علی بھٹو کو چین بھجوایا گیا تا کہ وہ جنگ کی صورت میں چین کی حمایت حاصل کر سکیں لیکن انہیں زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔ (خان 2006ء:7-346)۔ پاکستان کی طرف سے خارجہ سیکرٹری سلطان محمد خان کو چند مغربی ممالک میں بھیجا گیا تا کہ وہ پاکستان کا یہ نقطہء نظر پیش کر سکیں کہ مشرقی پاکستان کا تنازعہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور بھارت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ باغی بنگالیوں کو تربیت دے اور مسلح کرے تا کہ وہ مشرقی پاکستان میں دہشت گردی کی سرگرمیاں انجام دے سکیں اور یہ کہ بھارت کی مداخلت سے بھرپور جنگ شروع ہو سکتی ہے۔ (ایضاً)۔

بھارت کے ساتھ جنگ

آنے والے مہینوں میں مشرقی پاکستان میں صورتحال بتدریج قابو سے باہر ہوتی چلی گئی۔ یحییٰ خان پر بین الاقوامی برادری کا زبردست دباؤ تھا کہ وہ مشرقی پاکستان والوں کو ٹھنڈا کرنے کیلئے ضروری اقدامات کریں۔ 31 اگست کو یحییٰ خان نے ایک بنگالی عبدالمطلب ملک کو مشرقی پاکستان کا گورنر لگا دیا جبکہ جنرل ٹکا خان بدستور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہے۔ جنرل نیازی کے مطابق بھارتی فوج نے اگست سے نومبر کے درمیان بٹالین اور بریگیڈ سطح کے مشرقی پاکستان پر کئی حملے کئے جبکہ 20 اور 21 نومبر کی شب ہر سمت سے بھرپور حملہ کر دیا گیا۔ (علی 2007ء:271- نیازی 1999ء: 119)۔ یحییٰ حکومت نے یہ خبر مغربی پاکستان کے عوام تک نہ پہنچنے دی۔ نیازی نے دعویٰ کیا ہے کہ پاکستانی فوج نے بھارتی فوج سے تعداد 10 گنا کم ہونے کے باوجود حملہ پسپا کر دیا۔ 3 دسمبر کو پاکستان نے مغربی پاکستان میں اپنے مضبوط گڑھ سے بھارت پر حملہ کر دیا۔ یوں ہر محاذ پر دونوں ملکوں کے درمیان تیسری جنگ چھڑ چکی تھی۔ نیازی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس وقت مشرقی پاکستان میں 4 ہزار افراد ہلاک ہوئے اور اتنے ہی زخمی بھی ہوئے اور یہ کہ انہوں نے جنگ کی صورتحال پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے راولپنڈی میں چیف آف جنرل سٹاف جنرل گل حسن کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ عید منانے لاہور گئے تھے۔ اس طرح چیف آرمی سٹاف جنرل حامد بھی

دستیاب نہیں تھے۔ نیازی نے تبصرہ کیا کہ:

> ''مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ اور صدر یحییٰ خان دونوں سیالکوٹ گئے تھے، جس کا بظاہر مقصد محاذ جنگ کا دورہ کرنا تھا لیکن حقیقت میں وہ تیتر کا شکار کرنے گئے تھے۔ عید کے روز کسی کمانڈر انچیف نے محاذ جنگ پر فوجیوں سے ملنے کی زحمت نہ کی۔ فوج کے 3 انتہائی سینئر افسروں کی سرد مہری اور بے حسی ظاہر کرتی تھی کہ انہیں مشرقی پاکستان کے معاملات یا پاکستان کی سالمیت سے سرمو دلچسپی نہیں تھی۔ جب ڈھاکہ جل رہا تھا تو یہ سب نیرو کی طرح کھیل رہے تھے''۔ (1999ء:123)۔

میجر جنرل نیازی نے بتایا کہ ان کے فوجیوں نے مشرقی پاکستان میں تمام قسم کے ناموافق حالات کے باوجود بہادری سے لڑائی کی۔ بھارتی حملے کا منہ توڑ جواب دیا گیا اور انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ (ایضاً:126)۔ نیازی نے اس موقع پر جنرل ہیڈکوارٹر کی طرف سے کئی سگنلز کا حوالہ دیا ہے جن میں جنرل نیازی کی زیر کمان سپاہیوں کی بہادری اور درپیش مشکلات کا اعتراف کیا گیا تھا۔ غالباً یہ بتانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اور ان کے سپاہی اپنے فرائض کامیابی کے ساتھ اور مناسب طریقے سے انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے 21 نومبر کے بھارتی حملے کا بھی ذکر کیا کہ حکومت یہ معاملہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں نہیں لے گئی ورنہ بھارت کے ہاتھوں شکست سے پہلے سیز فائر ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بتایا کہ وہ اور ان کے سپاہی مزید وقت چاہتے تھے اور مغربی پاکستان کی طرف سے بھارت سے چھیڑ خانی نہ کرنے کے حق میں تھے۔ مشرقی پاکستان میں موجود فوج چاہتی تھی کہ مغربی پاکستان کا محاذ اکتوبر سے مارچ کے بعد کھولا جائے۔ (ایضاً:131)۔

جنرل نیازی اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے پر مصر ہیں کہ ہائی کمان مشرقی پاکستان کے تحفظ میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی حالانکہ پاکستانی فوجی نہایت بے خوفی سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ 5 دسمبر کو انہیں جی ایچ کیو سے ایک پیغام ملا کہ مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھا جائے اور یہ کہ چین کی طرف سے بھی سرگرمیاں بہت جلد متوقع تھیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر ایسی اطلاعات کی مذمت کی یہ سب امیدیں گمراہ کن تھیں کیونکہ

چین کے ساتھ اس حوالے سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ 6 دسمبر کو انہوں نے جی ایچ کیو کو ایک پیغام ارسال کیا جس میں آخری آدمی تک لڑائی کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ (ایضاً 135)۔ مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں ہونے والی لڑائی کی تفصیل دیتے ہوئے جنرل نیازی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے سپاہی نہایت دلیری سے لڑ رہے تھے لیکن دشمن مسلسل پیشقدمی کر رہا تھا جبکہ پاکستان کا دفاع ہزیمت کا شکار تھا۔ (ایضاً: 176)۔

البتہ جنرل نیازی کے دعوؤں پر پاکستان کے دیگر فوجی افسروں نے کئی سوالات اٹھائے ہیں۔ بریگیڈیئر (ر) اے آر صدیقی جو آئی ایس پی آر کے سربراہ اور یحییٰ خان کے مشیر رہے ان کو جنرل یحییٰ خان سمیت یقیناً فوج کے اعلیٰ افسروں تک رسائی حاصل تھی۔ بریگیڈیئر صدیقی نے نہایت تند و تیز لہجے میں جنرل نیازی کو مشرقی پاکستان والوں کے خلاف انتہا پسندانہ اقدامات کی حمایت کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بالخصوص بنگالی خواتین کی آبروریزی کے واقعات...... جیسور کے جی او سی میجر جنرل محمد حسین انصاری نے جنرل نیازی کے ان اقدامات کی مخالفت کی تھی۔ صدیقی نے لکھا کہ:

> ''نیازی نے اپنے فوجیوں کے غیر عسکری، غیر انسانی اور ظالمانہ اقدامات کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ اکثر سپاہیوں سے پوچھتے ''میرے شیر تمہارا کیا سکور ہے......؟ ایسے کہتے ہوئے جنرل نیازی کی آنکھوں میں شیطانی چمک ہوتی۔ سکور سے مراد خواتین کی آبروریزی کی تعداد ہوتی تھی۔ نیازی نے نہایت ڈھٹائی سے زیادتی کے واقعات کی حمایت کی اور کہا کہ'' آپ کسی مرد سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ مشرقی پاکستان میں رہے، لڑے اور مرے لیکن جنسی خواہش پوری کرنے کیلئے جہلم جائے...... بولیں؟۔ جہاں تک ہلاکتوں کا تعلق ہے تو ان کا دعویٰ تھا کہ صرف شر پسندوں کو ہلاک کیا گیا۔ فوجیوں کو حکم تھا کہ بنگالی یا غیر بنگالی ریاست دشمن اور باغی عناصر کے ساتھ کسی تفریق کے بغیر کوئی نرمی نہ برتی جائے''۔ (2009ء: 167)۔

کشیدہ صورتحال کے دوران بریگیڈیئر صدیقی نے کئی بار مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور

محسوس کیا کہ بنگالیوں کے خلاف مسلح کارروائیوں میں بہاریوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے علاوہ چند بنگالی اسلام پسندوں نے بھی فوج کی طرفداری کی۔ اس فوجی کارروائی کے دوران فوج کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق 26 ہزار افراد مارے گئے۔ (حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ 513:2001)۔ جبکہ بنگلہ دیشی ذرائع یہ تعداد 30 لاکھ بتاتے ہیں۔ ہلاکتوں کی دونوں طرح کی تعداد کمی اور بیشی کے لحاظ سے اصل تعداد سے زیادہ ہے۔ یہ بات تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ ایک ایسی فوج جو بتدریج چھاؤنیوں تک محدود ہورہی تھی صرف 9 ماہ کے عرصے میں 30 لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ میں نے (مصنف) کئی ایسے اعلیٰ بنگالی سول بیوروکریٹس اور عوامی شخصیات کے انٹرویو کئے جو غیر جانبدار سوچ رکھتے تھے اور ان سے اس موضوع پر بات کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ 30 لاکھ افراد کی ہلاکت کی کہانی کا پس منظر شیخ مجیب کا وہ بیان ہے جس میں انہوں نے ملین کو لاکھ سے گڈمڈ کر دیا جس سے ابہام پیدا ہوا۔ یہ بات حیران کن نہیں کیونکہ شیخ مجیب کو انگریزی پر زیادہ عبور نہیں تھا۔ موجودہ دور کی اہم جماعت بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کے مطابق ہلاکتوں کی تعداد 3 لاکھ ہے۔

مغربی پاکستان سے آپریشن چنگیز خان کا آغاز

3 دسمبر 1971ء کو یحییٰ خان حکومت نے فیصلہ کیا کہ مغربی پاکستان کے محاذ سے بھارت کے خلاف آپریشن چنگیز خان کے نام سے جنگ کا آغاز کر دیا جائے۔ یہ نام ایک اسلامی ملک کی فوج کی طرف سے استعمال کرنا عجیب ہے کیونکہ منگول جنگجو چنگیز خان نے 1227–1162 کے دوران وسطی اور جنوبی ایشیا میں حملے کر کے تباہی پھیلا دی۔ اس کارروائی کا آغاز پاکستان فضائیہ نے مشرقی پنجاب اور بھارتی کشمیر کے فوجی اڈوں اور اہم مقامات پر حملے سے کیا۔ اس دوران زمینی کارروائی شروع کر دی گئی لیکن وہ بے سود رہی۔ بھارتی فوج تیزی سے پیشقدمی کرتے ڈھاکہ کی طرف بڑھنے لگی۔ ایسا لگتا ہے کہ یحییٰ خان کا مغربی پاکستان میں جنگی محاذ کھولنے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ملکوں میں سیز فائر جلد ہو سکے۔ ڈھاکہ میں پاکستانی فوج نے 16 دسمبر کو ہتھیار ڈالے۔ ہتھیار ڈالنے کی تقریب بھارتی اور بین الاقوامی ٹی وی چینلوں پر دکھائی گئی۔ 93 ہزار کے لگ بھگ پاکستانی فوجی اور سویلین جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ پاکستان کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کا

مشرقی حصہ الگ ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔

یحییٰ خان کو غصہ تھا کہ امریکہ اور چین ان کی مدد کیلئے نہیں آئے۔ برائن کلف لے نے لکھا ہے کہ چین اگر کوئی ایکشن لیتا تو بھارت کی توجہ شمالی سرحدوں کی طرف مرتکز ہو جاتی جس سے پاکستان کو زبردست فائدہ ہوتا لیکن چین تند و تیز بیانات جاری کرنے کے باوجود سرحد پر خاموش بیٹھا رہا۔ (کلف لے 2000ء:237)۔ امریکی صدر نکسن نے خلیج بنگال میں طیارہ بردار بحری بیڑا بھیج کر کچھ سرگرمی دکھائی جو بقول ہنری کسنجر مغربی پاکستان پر کسی حملے کے سدباب کیلئے بھیجا گیا۔ چین کو اکتوبر 1971ء کو اقوام متحدہ کی رکنیت مل چکی تھی اور اس کے نمائندے نے 23 نومبر 1971 کو سلامتی کونسل کی میٹنگ سمیت اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت بھی کی۔ ایسا ممکن تھا کیونکہ امریکہ اور چین کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو چکے تھے اور اول الذکر کو چین کی اقوام متحدہ میں اپنے عوام کی نمائندگی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہنری کسنجر نے چین کو یہ تسلی دینے کی کوشش کی کہ بھارت کی مغربی پاکستان پر جوابی حملہ کرنے کے عزائم کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ (اعجاز الدین 2007ء 367-86:)۔ امریکہ نے 4 دسمبر 1971ء کو ایک اور اقدام بھی کیا تاکہ سلامتی کونسل میں قرارداد پیش کرنے کا عمل شروع کیا جائے جس کا مقصد بھارت اور پاکستان سے سیز فائر پر رضامندی کا مطالبہ کرنا تھا۔ اس موقع پر امریکہ نے پھر چین سے تعاون مانگا جو اسے مل گیا۔ اگرچہ چین نے اوپر اوپر سے پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کی حمایت کی لیکن وہ مشرقی پاکستان میں مسئلے کا سیاسی حل نہ نکلنے پر نالاں تھا۔ بالالفاظ دیگر پاکستان توڑنے کا فیصلہ تمام بڑی طاقتوں نے قبول کرلیا تھا۔ اگرچہ بھارت اور پاکستان دونوں کی طرف سے جنگ میں ہونے والے جانی نقصان کا واضح تعین نہیں کیا گیا لیکن گمان ہے کہ یہ ضیاع پہلی دونوں جنگوں سے زیادہ تھا۔ شکست اور پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے کے سانحے نے پاکستانی فوج کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا جس کا شعبہ تعلقات عامہ محاذ جنگ میں بھارت کی شکست کی من گھڑت خبریں تواتر سے چلاتا رہا...... 1965ء کے پراپیگنڈے کی طرز پر۔

بہرحال 16 دسمبر کو ڈھاکہ میں سرنڈر کے بعد نکسن کے مشورے پر یحییٰ اور ہائی کمان کو اندرا گاندھی کی طرف سے یکطرفہ سیز فائر کی پیشکش قبول کرنے میں 2 روز لگے۔ (صدیقی 212:2009)۔ اس کے بعد حکومت پر 2 قسم کے دباؤ سامنے تھے۔ ایک تو افسروں میں فوج کی

بدترین شکست پر بتدریج بڑھتا غم وغصہ تھا۔ کھاریاں چھاؤنی میں افسروں نے ہتھیار اٹھا لئے، کئی دیگر مقامات پر بھی غم وغصے کا اظہار نظر آیا۔ یحییٰ خان کے بااعتماد ساتھی جنرل حامد نے 20 دسمبر کو راولپنڈی کے ایوب ہال میں فوجی افسروں سے خطاب میں یہ دلیل دی کہ حکومت نے مسئلے کا سیاسی حل ڈھونڈنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن مجمعے نے یہ منطق قبول کرنے سے انکار کرکے ''شیم شیم'' کے نعرے لگائے اور سرعام دشنام طرازی کی۔ چنانچہ جنرل حامد نے بظاہر معافی مانگ کر وہاں سے نکلنے میں عافیت سمجھی۔ بریگیڈئیر صدیقی کے مطابق یہ سب مصنوعی تھا۔ وہ یہ جانچ رہے تھے کہ کیا جنرل یحییٰ اور فوجی جنتا حکومت جاری رکھ سکتی تھی۔ جیسے ہی فوجی نکلے ریڈیو پاکستان نے اعلان کیا کہ یحییٰ خان نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کے جانشین کیلئے کئی نام زیرغور تھے۔ جنرل گل حسن خان اور ائیر مارشل رحیم خان نے ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کی حمایت کی۔ (ایضاً: 4-213)۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید اشرف قاضی سے انٹرویو

پاکستان میں عمومی تاثر یہ ہے کہ 1970ء کے انتخابات صاف اور شفاف تھے۔ سچائی کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ میں ان مشکل دنوں میں مشرقی پاکستان میں نوجوان میجر کے طور پر تعینات تھا۔ انتخابی مہم کے دوران عوامی لیگ کے غنڈوں نے ایسے تمام ووٹروں کو دہشت زدہ کیا جو ان کی پارٹی کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مخالفین کو تشدد کا نشانہ بنایا اور دھمکی دی کہ شیخ مجیب اور ان کے ساتھیوں کی مخالفت کرنے والوں کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے شیخ مجیب کا ایک جلسے سے خطاب سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھا جو جانتا تھا کہ عوام کے جذبات کو کس طرح آگ لگانی ہے۔ انہوں نے لاکھوں کے مجمع میں کہا کہ وہ ابھی ابھی اسلام آباد سے آئے ہیں۔ وہاں کی ہر سڑک اور عمارت سے پٹ سن کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ بات کہنے کا مقصد مشرقی پاکستان میں یہ غلط تاثر پیدا کرنا تھا کہ پاکستان کے دارالحکومت میں عالی شان اور پرتعیش عمارتیں بنانے کیلئے مشرقی پاکستان کا پیسہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مشرقی پاکستان کبھی مغربی پاکستان کی کالونی نہیں بنے گا۔ عوامی لیگ کے غنڈوں نے مغربی پاکستان والوں پر حملے کئے اور کئی معصوم شہریوں کو مار ڈالا۔ ہم نے عوامی لیگ کے کارکنوں کی پھیلائی دہشت گردی کے خلاف

ردعمل ظاہر کیا۔

بریگیڈئیر (ر) یعسوب علی ڈوگر سے انٹرویو

بریگیڈئیر (ر) یعسوب علی ڈوگر 1971ء میں بطور کیپٹن مشرقی پاکستان میں تعینات تھے اور 16 دسمبر کو سقوط ڈھاکہ کے بعد انہیں جنگی قیدی بنالیا گیا۔ میں نے انہیں مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات سے متعلق ایک سوالنامہ بھیج کر جوابات دینے کی درخواست کی۔ انہوں نے مجھے بذریعہ ای میل 27 اپریل 2010ء کو جو جواب ارسال کیا اس کی تفصیل نیچے دی جارہی ہے۔:

''میں یہ بتانا چاہوں گا کہ مشرقی پاکستان میں میرے خاندان کا قیام 1962ء سے 1968ء کے درمیان طویل عرصے تک رہا۔ میرے والد مرحوم محبوب علی ڈھاکہ کینٹ میں آدم جی پبلک سکول کے پہلے پرنسپل تھے۔ یہ اس وقت ایچی سن کے مقابلے کا مشرقی پاکستان کا انتہائی مشہور سکول تھا۔ میں خود بھی نومبر 1962ء سے اپریل 1964ء کے درمیان ڈھاکہ کالج کا طالب علم رہا۔ پھر میں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور اس کے بعد پی ایم اے کاکول کیلئے نومبر 1964ء میں منتخب کرلیا گیا۔ بنگلہ دیش کے سابق صدر اعجاز احمد ان دنوں یونیورسٹی کے شعبہ سوئل سائنس Soil Science (علم ارضیات) کے سربراہ تھے اور مجھے ان سے کچھ عرصہ پڑھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

2 دسمبر 1971ء کو میں پاکستان۔ بھارت۔ برما سرحد پر واقع چٹاگانگ کی پہاڑی ترائیوں پر ایس ایس جی کی چوکیوں پر تعینات تھا۔ 2 دسمبر کو میری کمپنی ''جنگجو'' کو طیاروں کے ذریعے اٹھا کر ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا جہاں ہمیں شمالی سیکٹر میں تعینات ہونا تھا۔ وہاں تیسرے دن دوپہر کو ہمیں پی آئی اے کے طیارے سے سید پور کے ٹھاکر گاؤں۔ رنگ پور سیکٹر میں آپریشن کے لئے اتار دیا گیا۔ یہ شاید مشرقی پاکستان میں پی آئی اے کی آخری پرواز تھی کیونکہ اسی روز مشرقی پاکستان میں پی آئی اے کی تمام پروازیں روک دی گئیں۔ میں اس سیکٹر میں 16 دسمبر 1971ء تک پرتشدد کارروائیاں رکنے تک تعینات رہا۔

دسمبر 1970ء میں بدترین سمندری طوفان میں ایک لاکھ بنگالیوں کی ہلاکت کے بعد سے مشرقی پاکستان میں مجموعی ماحول بدتر ہورہا تھا۔ مشرقی پاکستان میں یہ احساس عام تھا کہ یحییٰ خان کی زیر قیادت مغربی پاکستان کی قیادت نے سمندری طوفان سے متاثر ہونے والوں کی امداد کیلئے

کافی اقدامات نہیں کیئے۔ سیاسی ماحول تمام غیر بنگالیوں کے خلاف بالعموم اور فوج کے خلاف بالخصوص تھا۔ یہ صورتحال اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب مارچ میں یہ افواہیں سرگرم ہوگئیں کہ آزاد بنگلہ دیش کا اعلان حقیقت بننے والا ہے۔ اس دورانیے میں زیادہ سے زیادہ غیر بنگالیوں اور بہاریوں کی ہلاکتیں واقع ہوئیں۔

میں کمانڈو بٹالین ٹو کی جنگجو کمپنی کا پلٹن کمانڈر تھا۔ میرے فرائض میں شامل تھا کہ میں چٹا گانگ کی پہاڑی ترائیوں میں بھارتی یا مکتی باہنی کی کسی قسم کی جارحیت یا دراندازی روکوں۔ جب مکمل جنگ چھڑ گئی تو میں شمالی علاقے رنگ پور میں 34 بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں تعینات تھا۔ یہ ہیڈ کوارٹر 3 دسمبر 1971ء کو یہاں منتقل ہوا تھا اور کئی قسم کی ذمہ داریاں ادا کر رہا تھا۔

میرے علاقے میں بھارتی فوجی پوری قوت کے ساتھ 11 اور 12 نومبر کے درمیان پہنچے۔ 22 نومبر کو بھارتی بٹالین نے بھرپور حملہ کر دیا لیکن ہم نے پسپا کر دیا۔ جہاں تک بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی کا تعلق ہے تو میں بالکل صاف صاف کہتا ہوں کہ بھارتی فوج نے اس میں پہل کی۔ پاکستانی صرف جواب دے رہے تھے۔ 3 دسمبر 1971ء کو جنگ سے پہلے نومبر میں پاکستان کے F862 سیبر جیٹ طیارے جیسور میں بھارت نے مار گرائے۔

اگرتلہ سازش کیس کا انکشاف 67-1966ء میں ہوا۔ مارچ 1971ء تک بھارت مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، طلباء، افسروں اور سپاہیوں کو گمراہ کر رہا تھا۔ مارچ 1971 سے بھارت نے مکتی باہنی کو بھرپور مدد دینا شروع کر دی اور تاج الدین احمد کی سربراہی میں جلاوطن حکومت کو بھی تسلیم کر لیا۔ آخرکار انہوں نے نومبر 1971ء کو سرحد پار کر لی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ بھارت نے محسوس کر لیا تھا کہ پاکستان آرمی نے مشرقی پاکستان کے اندر اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تھی اور اس حالت میں مسئلے کا اپنی مرضی کا سیاسی حل حاصل کرنے کیلئے پاکستان کے ساتھ طویل گوریلا جنگ لڑنا پڑنی تھی۔ اس کے علاوہ پناہ گزینوں کی بڑھتی تعداد سے بھارت پر زبردست معاشی بوجھ پڑ رہا تھا۔ اس تناظر میں بھارت یہ صورتحال زیادہ لمبے عرصے تک برقرار رکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے فوری حل نکالنے کے درپے ہوگیا۔

انصار دراصل مغربی پاکستان کے ''قومی رضا کار'' کی طرز پر نیم فوجی فورس تھی۔ کچھ کو مکتی باہنی نے اپنا آلہ کار بنا لیا جبکہ بعض کو پاکستانی فوج نے استعمال کیا لیکن دونوں طرف یہ بہت کم

مفید ثابت ہوئے۔ چونکہ مجھے ذاتی طور پر ''البدر'' فورس کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ نہیں اس لئے میں سنی سنائی باتیں کروں گا۔ یہ لوگ انتہائی راسخ العزم تھے اور فوج کے لئے اچھی اضافی سہولت ثابت ہوئے۔ ایسا لگتا ہے کہ فوج کی مدد کے ساتھ ''البدر'' والوں کا اپنا ہی سیاسی ایجنڈا تھا لیکن مجھے ایسا تاثر نہیں ملا کہ انہوں نے بڑے پیمانے پر قتل عام کیا ہو۔ بنگالی ہونے کے ناتے ان کے لئے ایسا کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ (مراد ہم نسل افراد کے خلاف حد سے زیادہ سفاکی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔ مترجم)۔ دوسری طرف مکتی باہنی کی اثر پذیری کا زیادہ تر انحصار ان کی پس منظر تربیت اور ذہنی طور پر تیاری پر تھا۔ پرانی ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کی زیادہ تر قیادت ریٹائر پاکستانی فوجیوں کے ہاتھ میں تھی۔ باغی جنگجوؤں کی اکثریت پناہ گزین کیمپوں سے بھرتی کی گئی۔ ان لوگوں کو چند روز کی تربیت دے کر پاکستان کی سرحد کے اندر دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان کی عمومی کارکردگی متاثر کن نہیں تھی۔ البتہ ٹائیگر صدیقی اور مجیب باہنی جیسے چند باہنی گروہ کچھ بہتر تھے۔ 11 نومبر سے 3 دسمبر تک پاکستان کی ہائی کمان کے لئے یہ گومگو کا معاملہ تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بھارت ایک خاص رقبہ حاصل کرنا چاہتا تھا تا کہ وہاں جلاوطن حکومت کا اقتدار قائم کیا جا سکے۔ جبکہ بعض دیگر سمجھتے تھے کہ بھارت بنگلہ دیش میں جتنا ممکن ہو آگے پیشقدمی کرے گا تا آنکہ ہلاکتوں کی تعداد ان کے اندازوں تک نہ پہنچ جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر 3 دسمبر کو بھارت کے خلاف مکمل جنگ کا اعلان نہ کیا جاتا تو بھارتی فوج شاید اتنی دیدہ دلیری سے کام نہ لیتی اور مشرقی پاکستان میں زیادہ آگے نہ جاتی۔ اگر فوج اور سویلین قیادت مخلص ہوتی تو اس دوران سیاسی حل بھی نکالا جا سکتا تھا۔

اصل میں باقی ماندہ پاکستان سے رابطے منقطع ہونے، مقامی آبادی سے کوئی تعاون نہ ملنے اور اسلحے میں کمی جیسی مشکلات میں مسلسل اضافے جیسے عوامل میں اس کے علاوہ کوئی اور آپشن نہیں رہ جاتا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ جنگ کو مزید چند روز طول دے دیا جاتا لیکن اس کا نتیجہ بھی چند ہلاکتوں کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ فوج کی سخت کارروائی سے بنگالیوں کے غم و غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جنرل نیازی نے جسٹس حمود الرحمٰن کمیشن کے روبرو مبینہ طور پر اس نظریے کو سخت ہدف تنقید بنایا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں مضمر ہے۔ اس پوری جنگ کے دوران ہم انتظار کرتے رہے کہ آخر پاکستان مغربی پاکستان سے پوری قوت کے ساتھ بھارت پر حملہ کر کے اسے مشرقی

پاکستان سے پسپا ہونے پر مجبور کردے۔ جہاں تک انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا تعلق ہے تو... ہاں! میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستانی فوج کی کارکردگی کے باعث ایسا ہوا ہو۔

بھارتی فوج کا سلوک مختلف علاقوں میں مختلف تھا۔ میں اور میرے ساتھی قیدیوں نے کیمپ سے سرنگ کھود کر فرار ہونے کی کوشش کی جو ناکام بنادی گئی۔ اس کے بعد ہمیں قید تنہائی میں ڈال دیا گیا جہاں صفائی کی صورتحال نہایت مخدوش تھی۔ جیل میں بھیجنے کے بعد پہلے 30 یوم تک ہمیں نصف راشن دیا جاتا اور کھانے پینے کی چیزیں انتہائی غیر معیاری تھیں چنانچہ ہم نے احتجاجاً بھوک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے ان کے رویے میں تبدیلی آئی اور ہم پر سختی نرم کردی گئی۔ میرے پورے جسم پر مچھروں نے کاٹ کاٹ کر برا حال کر دیا۔ میں نے ایک بھارتی ڈاکٹر میجر بینرجی سے شکایت کی تو اس نے حکم دیا کہ مجھے سونے کیلئے مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں۔ مجموعی طور پر بھارتی صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کا رویہ پاکستانی جنگی قیدیوں سے نہایت سخت تھا۔ گوا کے عیسائی اور سکھ فوجی دوستانہ انداز میں رہتے تھے تاہم مجھے اذیت سے نجات دلانے پر میں میجر بینرجی کا نہایت ممنون ہوں"۔

کرنل (ر) ریاض جعفری سے انٹرویو

کرنل ریاض جعفری بھارت کی قید میں ان 195 جنگی قیدیوں میں شامل تھے جن پر بنگلہ دیش حکومت جنگی جرائم کا مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ ان دنوں سے متعلق انہوں نے اپنی زبانی یہ تفصیل بتائی:

"میں ان دنوں لیفٹیننٹ کرنل تھا اور مارشل لا ہیڈ کوارٹرز ون بی ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں بطور جنرل سٹاف آفیسر، سول افیئرز ونگ میں تعینات تھا۔ میں مرحوم مارشل لا ایڈمنسٹریٹر (شہری امور) جنرل راؤ فرمان کا سب سے سینئر پرنسپل سٹاف آفیسر تھا۔ میں وہاں 30 جون 1971ء کو پہنچا۔ فوج کا بنگالی ہندوؤں کو نشانہ بنانے کا کوئی خصوصی پلان نہیں تھا۔ البتہ بعض مقامات پر ہندوؤں، مسلمانوں یا بنگالیوں کے پورے کے پورے خاندان کو جبری طور پر بھارت منتقل کرکے نوجوانوں کو تربیت دے کر واپس تخریب کاری کے لئے مشرقی پاکستان بھجوا دیا گیا۔ ہم نے شرپسندوں کیخلاف طاقت کا بے دریغ استعمال نہیں کیا۔ یہ محض بھارت اور عوامی لیگ کا پراپیگنڈہ

تھا۔ دفتر میں ابتدائی ایام کے دوران مجھے کنڈر گارٹن کلاس کی ایک انگریزی درسی کتاب پڑھ کر شدید حیرت ہوئی۔ اس میں لکھا تھا کہ رام ایک اچھا لڑکا ہے۔ (رام سے سے مراد ہندوؤں کے دیوتا رام) جبکہ رحیم (مسلمانوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا توصیفی نام) ایک برا لڑکا ہے۔ اس کتاب کا طائرانہ جائزہ لینے سے فوراً اندازہ لگ جاتا تا کہ اس کا مقصد ہندوؤں کے بارے میں اچھا جبکہ مسلمانوں کے خلاف بُرا تاثر پیدا کرنا تھا۔ یہ کتاب کلکتہ کے ایک پبلشر نے شائع کی تھی۔ آدم جی پبلک سکول ڈھاکہ کینٹ کے پرنسپل نے ہمارے استفسار پر بتایا کہ اس درسی کتاب کی منظوری صوبائی ٹیکسٹ بورڈ نے دی اور پچھلے 10 سال سے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جا رہی تھی۔ پاکستان کے خلاف دوسرا بڑا طبقہ بنگالی سرکاری ملازمین کا تھا جو چاہتا تھا کہ نیا ملک بنے جہاں ان کو مغربی پاکستان کے افسروں کی جگہ فوراً ترقیاں ملیں۔ تیسرا دھڑا دانشوروں، پروفیسروں اور وکلا...... بیشتر ہندو تھے...... کا تھا۔

مکتی باہنی سے تعلق رکھنے والا ایک بنگالی ہندو گوپال شرما (برہمن) تھا جس کو دوران حراست بازو کے زخم میں گینگرین (زخم خراب ہونے کا مسئلہ جس میں عضو کاٹنا پڑ جاتا ہے) کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کرائی اور اس کی سخت سرزنش کی کہ وہ بھارتیوں کے ہاتھوں میں کیوں کھیل رہا ہے۔ میرے ماتحت عملے کو ایک طے شدہ دشمن سے میری بے تکلفی بُری محسوس ہو رہی تھی لیکن ایک ہفتے بعد یہ گوپال شرما واپس آیا اور کہا کہ اسے ایک بندوق دی جائے۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے پوچھا کہ رائفل کیوں چاہیئے؟ اس نے بتایا کہ آج رات چند مکتی افراد مانک گنج گاؤں پر گندم کے گودام پر حملہ کرنے والے ہیں اور میں اس عمارت کا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہم نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ اس کے بعد گوپال شرما ہمارے اس صوبیدار کا کافی اچھا دوست بن گیا جو اسے رہا کرنے پر جز بز تھا۔

میری مشرقی پاکستان آمد سے بہت پہلے 25 مارچ 1971 کے فوراً بعد بھارت کی وہاں مداخلت شروع ہو چکی تھی۔ البتہ 21 نومبر 1971ء کو بھارت نے ٹینکوں اور توپخانے کے ساتھ بھرپور حملہ شروع کر دیا۔ 3 دسمبر کو مغربی محاذ پر اعلان جنگ کے بعد بھارتی فضائیہ نے بھی مشرقی پاکستان میں فوجی تنصیبات پر بمباری شروع کر دی۔

مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں 16 دسمبر کو پلٹن میدان جا کر ہتھیار ڈالنے کا منظر دیکھ سکوں

تاہم میں نے ٹی وی پر یہ منظر ضرور دیکھا۔ بھارت نے ہمیں سقوط ڈھاکہ کے بعد 3 روز تک ہتھیار پاس رکھنے کی اجازت دی کیونکہ بھارت کے پاس ابھی اتنی نفری نہیں تھی کہ وہ جشن کے نشے میں چور مکتی باہنی کے حملوں سے ہمارا تحفظ کر سکے۔

بد قسمتی سے میں بھی جنگی قیدیوں میں شامل تھا اور مجھے کیمپ نمبر 61 گوالیار، بھارت میں رکھا گیا۔ وہاں 3 لیفٹیننٹ کرنلوں سمیت 63 پاکستانی افسر قید تھے۔ بھارت نے ہمارے ساتھ جنیوا کنونشن کے مطابق مناسب سلوک کیا۔ دیگر افسروں کو آفیسر میس میں جبکہ کرنلوں کو اٹیچ باتھ والے آراستہ کمروں میں رکھا گیا۔ ہم کرنلوں نے ایک باتھ روم میں سرنگ کھودنا شروع کی لیکن جب یہ سرنگ تقریباً تکمیل کے قریب تھی کہ منصوبہ پکڑا گیا۔ اس کے بعد ہمیں فوجی بیرکوں میں منتقل کر دیا گیا جہاں 6،6 انچ کے فاصلے پر رکھی چارپائیوں پر رہتے تھے اور 83 افسروں اور دیگر سپاہیوں سمیت تمام قیدیوں کے لئے کھلی فضا میں خندق والی لیٹرین دستیاب تھی۔

جب دسمبر 1973ء کے قریب قیدی فوجیوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھے دیگر افسروں سمیت آگرہ کے کیمپ منتقل کر دیا گیا۔ جہاں 195 جنگی قیدیوں کو جمع کیا جا رہا تھا تاکہ مشرقی پاکستان میں کئے گئے مبینہ جنگی جرائم پر مقدمہ چلایا جا سکے۔ میرا نام بھی ان میں شامل تھا اور مجھے حیرت تھی کہ آخر مجھے ملزموں میں کیوں شامل کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چن چن کر منتخب کیا گیا تھا کیونکہ ہمارے پاس اہم ذمہ داریاں تھیں اور اہم پاکستانی شخصیات سے ہمارے رابطے تھے۔ آخر شملہ کانفرنس میں ''جنگی مجرموں'' کے ٹرائل کا مطالبہ واپس لے لیا گیا۔ چنانچہ ہم 195 قیدیوں کو بھی اپریل 1974ء کو واپس پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ میں ان میں آخری قیدی تھا اور 28 اپریل 1974ء ہماری ٹرین واہگہ بارڈر پر پہنچی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے صورتحال سے بہت غلط انداز میں نمٹا۔ ہم بنگالیوں کو عزت اور پاکستان کے معاملات میں مناسب حصہ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے''۔

کرنل (ر) نادر علی

مشرقی پاکستان میں تعینات کرنل (ر) نادر علی کا انٹرویو آن لائن میگزین ویو پوائنٹ میں 2010 میں شائع ہوا۔ ان کی باتوں سے مشرقی پاکستان میں مارشل لاء حکام کی ہندو مخالف پالیسی کا

واضح اشارہ ملتا ہے۔انٹرویو میں سے درج ذیل اقتباسات یہاں پیش کر رہا ہوں:

''پاکستان کو تقسیم کے المیے سے دوچار کر دینے والے ان افسوسناک ایام کے دوران میں نے کپتان کے طور پر کام کیا پھر مجھے میجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ میں پہلے ڈھاکہ اور پھر چٹاگانگ میں تعینات رہا۔ میں نے 3 کمانڈو بٹالین میں پہلے 2 آئی سی (سیکنڈ ان کمانڈ) اور پھر کمانڈر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

میری نگرانی میں پہلی کارروائی وسط اپریل 1971ء میں ہوئی۔ مجھے حکم دیا گیا کہ ''یہ مجیب الرحمٰن کا آبائی علاقہ ہے۔ یہ بہت مشکل علاقہ ہے۔ جتنا ممکن ہے حرامزادوں کو مار ڈالو۔ یہ بات یقینی بناؤ کہ کوئی ہندو زندہ نہ بچے''۔ میں نے جواب دیا کہ ''سر! میں ایسے غیر مسلح سویلین افراد کو نہیں مار سکتا جو مجھ پر گولی نہیں چلاتے''۔ آگے سے کہا گیا...... ہندوؤں کو مار ڈالو۔ یہ سب فوجیوں کے لئے حکم ہے۔ کمانڈو کی اپنی روایتی مہارت مت دکھاؤ......۔

ہزاروں افراد ہلاک اور لاکھوں بے گھر کر دیے گئے۔ 90 لاکھ سے زائد بنگالی تو بھارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حکم ملا کہ ہندوؤں کو مار ڈالو۔ مجھے یہ حکم بار بار دیا گیا۔ مغربی پاکستان کی سپاہ گری میں یہ عمل جائز تھا۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں بھی ایسے حکم کا ذکر ملتا ہے۔ بھارت میں پناہ لینے والے 93 لاکھ بنگالیوں میں سے 90 لاکھ ہندو تھے۔ اس بات سے پوری دنیا میں ہماری بدنامی ہوئی اور اخلاقی طور پر ہم تباہ ہو گئے۔ مشرقی پاکستان میں شکست کی وجہ ہماری غیر ذمہ دار فوجی قیادت تھی۔ صرف شمالی حصوں میں تعینات کچھ یونٹوں نے بھارتی فوج کی مزاحمت کی۔ مثال کے طور پر میجر اکرم شہید جنہیں پاکستان کا سب سے بڑا عسکری ایوارڈ نشان حیدر دیا گیا کی یونٹ......۔

دارالحکومت اسلام آباد میں سول بیوروکریسی اور فوج میں مغربی پاکستان جسے بنگالی 'پنجابی فوج' کہتے تھے کے غلبے کے باعث مشرقی پاکستان والے خود کو کسی کالونی کی رعایا سمجھتے تھے۔ انہیں یہ صورتحال 1947 سے ناپسند تھی۔ 1960ء کے عشرے کے اوائل میں میرے بنگالی فوجی افسر ایک دوسرے کو جنرل کہہ کر پکارتے تھے۔ غالباً وہ مشرقی پاکستان کی ممکنہ آزادی کے بعد ملنے والے رینک کا ذکر کرتے تھے۔ ہم اسے صرف مذاق سمجھتے تھے لیکن 1971ء میں یہ محض مذاق نہیں تھا۔ ہر بنگالی خود کو محکوم سمجھتا تھا......۔

''جنرل ٹکا خان کو''بنگال کا قصاب'' کا خطاب دیا گیا۔انہوں نے بمشکل 2 ہفتے مشرقی پاکستان میں کمان سنبھالی۔ان دونوں ہفتوں کے دوران فوج کی قیادت عملاً جنرل مٹھا کے پاس رہی جوان کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے۔جنرل مٹھا نے جنرل نیازی کے آنے سے پہلے ہر آپریشن کی نگرانی خود کی کیونکہ وہ بنگال کے چپے چپے سے واقف تھے۔جنرل نیازی کی آمد پر وہ واپس جی ایچ کیو چلے گئے۔جنرل ٹکا بطور گورنر اچھے منتظم تھے اور انہوں نے مشکل وقت میں بھی یقینی بنایا کہ تمام حکومتی امور چلتے رہیں۔ٹرینیں، کشتیاں، ڈاک، ٹیلی فون، دیگر عوامی خدمت کے ادارے کھلے رہے اور چلتے رہے''۔(علی 2010ء)۔

باب10

ذوالفقار علی بھٹو کا عروج وزوال

ذوالفقار علی بھٹو نے پرانا نظام بُری طرح زخمی ہونے کے بعد اقتدار سنبھال لیا۔ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے کے نتیجے میں بھٹو کے تیزی کے ساتھ اقتدار کے سنگھاسن پر متمکن ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ اسلامی سوشلزم کے نعرے سے محکوم طبقے پر کافی اثر ہوا اور بدلے میں انہوں نے بھٹو کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا۔ سندھ کے ایک بڑے جاگیردار ہونے، اپنی کرشماتی شخصیت اور مقبولیت کی صلاحیتوں اور ذہانت کا ان کی انتقام پسند اور جنگجو شخصیت سے سمجھوتہ ہوگیا۔ ان کے سندھی النسل ہونے نے بھی پاکستان میں اقتدار میں توازن میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت پاکستان کے ریاستی ڈھانچے بالخصوص فوج میں سندھ کا کوئی قدآور رہنما موجود نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے نقصان کے بعد مغربی پاکستان میں پنجاب کی برتر حیثیت فزوں تر ہوگئی کیونکہ اب یہ آبادی کے لحاظ سے نسلی طور پر اکثریتی صوبہ بن گیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد آبادی کا تناسب یوں تھا۔

پنجاب 58 فیصد اس میں 9.83 فیصد سرائیکی آبادی شامل تھی

سندھ 21.6 فیصد

شمال مغربی سرحد صوبہ 16.7 فیصد

بلوچستان 2.4 فیصد

قبائلی علاقہ جات 1.3 فیصد

فوج کی نسلی ترکیب

پنجابی	70 فیصد
پشتون	20 فیصد
مہاجر، سندھی، بلوچی، کشمیری	10 فیصد

(ذریعہ: شفقت 1997:171)

فوجی افسروں کی نسلی ترکیب: انٹرویوز کی بنا پر قائم کئے گئے 2 تخمینوں کے مطابق:

نسل	پہلا اندازہ	دوسرا تخمینہ
پنجابی	70 فیصد	68 فیصد
پختون	15 فیصد	15 فیصد
مہاجر	10 فیصد	10 فیصد
بلوچی اور سندھی	5 فیصد	7 فیصد

(ذریعہ: شفقت 1997:173)

بھٹو نے اپنے اقتدار کا آغاز روایتی انداز سے ہٹ کر کیا۔ وہ نہ صرف ملک کے صدر بلکہ سپریم کمانڈر، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، وزیر خارجہ، وزیر داخلہ بلکہ وزیر صوبائی رابطہ بھی تھے۔ (تاثیر 1979ء:132)۔ 90 ہزار پاکستانی بھارت میں جنگی قیدی تھے جن میں 20 ہزار خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ بھارت نے مغربی محاذ پر پاکستان کے 5795.64 مربع میل پر قبضہ کیا جبکہ پاکستان کے قبضے میں بمشکل 110.35 مربع میل کا بھارتی رقبہ تھا۔ (نواز 2008ء:329)۔

بڑی صنعتوں کی نیشنلائزیشن

2 جنوری 1972ء کو بھٹو حکومت نے لوہے اور فولاد، انجینئرنگ، پیٹروکیمیکل، سیمنٹ سمیت ملک کی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ وہ عوامی سطح پر جو تقریریں اور ٹی وی پر قوم سے جو خطاب کرتے تھے ان میں سرمایہ داروں اور صنعتکاروں کو مطعون کرنے، استحصالی اور ٹیکس چور قرار دینے کے مقبول عوامی لہجے کو استعمال کیا گیا۔ صنعتکار دشمن مہم کے تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھونکی گئی جب 10 فروری 1972 کوئی لیبر پالیسی کا اعلان کیا گیا:

1: فیکٹری کی انتظامیہ میں محنت کشوں کو 20 فیصد نمائندگی دی جائے گی۔

2 : پیداواری یونٹ کے سالانہ منافع میں ورکر کا حصہ 2.5 فیصد سے بڑھا کر 4 فیصد اور پھر 5 فیصد کر دیا گیا۔

3: محنت کشوں سے متعلق تنازعہ لیبر کورٹ بھجوایا جائے گا۔

4: لیبر کورٹ 30 روز کے اندر کیس کا فیصلہ دینے کی پابند ہوگی۔ پہلے یہ دورانیہ 60 روز تھا۔

5: کسی ورکر کو ملازمت سے نکالنے سے پہلے اس کی تحریری وجوہات بتانا ضروری ہونگی۔

6: اولڈ ایج پنشن متعارف کرائی گئی۔ فیکٹری مالکان کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ ہر ورکر کے کم از کم ایک بچے کی میٹرک تک تعلیم کا ذمہ اٹھائے۔

7: علاج معالجے کیلئے ورکر کی تنخواہ میں سے 2 فیصد کٹوتی روک دی گئی۔ اس کی جگہ مل مالکان کا حصہ 4 فیصد سے بڑھا کر 6 فیصد کر دیا گیا۔

8: ٹریڈ یونین کی رجسٹریشن کا عمل آسان بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں مزدور تنظیموں کی تعداد میں ڈرامائی اضافہ ہوا۔ (احمد اور امجد 1984ء:93-92)۔

بھٹو حکومت کے ایسے اقدامات سے بنیاد پرست دائیں بازو کے انقلابی جذبے میں نمایاں طور پر اضافہ ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں پورے پاکستان میں فطری اور کسی منصوبہ بندی کے بغیر صنعتی ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے ہمسایہ ملک بھارت میں محنت کشوں کی طرف سے مطالبات کی منظوری کے لئے مالکان کا گھیراؤ اور فیکٹری پر قبضے کی روایات عام تھیں۔ لگتا ہے کہ پاکستان کے بائیں بازو کے لیڈروں نے بھی اپنے بھارتی ساتھیوں سے ایسے ہتھکنڈے سیکھے۔ اس موقع پر حکومت نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے تنبیہ کی کہ ایسے تخریبی اقدامات کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ حکومت نے یہ بھی واضح کیا کہ مستقبل میں سڑکوں پر طاقت کا مظاہرہ کرنے سے ریاستی طاقت کے ساتھ نمٹا جائے گا۔ (محمود 1987ء:22-19)۔ اس دھمکی کا اس وقت عملاً نفاذ بھی کیا گیا جب پورے ملک میں گھیراؤ اور قبضے کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ بھٹو نے بڑھتی ہوئی تحریک کے خلاف سخت ایکشن کا حکم دیا۔ ایسی مزاحمت کو کچلنے کے لئے پولیس اور نیم فوجی دستوں کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ حالانکہ قبل ازیں جب فوج کو مظاہرین کے خلاف کارروائی کا حکم دیا گیا تو جنرل گل حسن نے انکار کر دیا۔ (خان 1993ء:362)۔ بہرحال 1972 کے اختتام تک ورکروں کی اس تحریک کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا

اور اگلے سال تک سے بالکل دبا دیا گیا۔

زرعی اصلاحات

یکم مارچ 1972ء کو بھٹو حکومت نے زرعی اصلاحات کا عمل مارشل لاء ضابطہ نمبر 115 کے تحت متعارف کرایا جس کا طویل عرصے سے انتظار تھا۔ اس مقصد کیلئے بھٹو نے جو تقریر کی اس میں الزام لگایا گیا کہ ایوب خان نے اراضی کی جو اصلاحات نافذ کی تھیں اس سے جاگیرداری نظام کو کئی رعایتوں اور استثنٰی سے فائدہ پہنچا۔ بھٹو کے منصوبے کے تحت نہری علاقوں میں زیادہ سے زیادہ رقبے کی حد 150 ایکڑ اور بارانی علاقوں میں 300 ایکڑ مقرر کی گئی۔ البتہ یہ حد خاندان کی بجائے فرد کیلئے مقرر کی گئی اور اس کے لئے بھٹو نے شریعت کے نکتے کا سہارا لیا کہ ملکیت کی بنیاد خاندان نہیں بلکہ فرد پر ہوتی ہے۔ اس بات سے بھٹو کے سوشلسٹ حمایتیوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس کے علاوہ سیاست کا توازن برقرار رکھنے اور بظاہر جاگیردار طبقے کو بالکل تنہا نہ کرنے کے نقطۂ نظر سے بھٹو نے اپنی پارٹی میں بڑے زمینداروں کی شمولیت کا خیر مقدم کیا۔ ایسے اقدامات سے پیپلز پارٹی میں آنے والے بائیں بازوں کے حلقے شدید مایوسی کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے کچھ کو کھڈے لائن لگا دیا گیا جبکہ بعض پیپلز پارٹی کو خیر باد کہہ گئے۔

1977ء میں اراضی کی اصلاحات کا دوسرا مرحلہ متعارف کرایا گیا۔ اس بار نہری رقبے کی زیادہ سے زیادہ حد 100 ایکڑ اور بارانی علاقے کی زمینی حد 200 ایکڑ مقرر کی گئی۔ البتہ حکومت کی طرف سے ضبط کی گئی زمین کی قیمت 30 روپے فی پیداواری انڈیکس یونٹ مقرر کی گئی۔ (سعید 2010: 4-3)۔ بحیثیت مجموعی کاشتکاروں سے متعلق حکومتی اقدامات سے اگرچہ قانونی طور پر صورتحال بہتر ہو گئی لیکن ان قوانین کے مؤثر نفاذ کا میکانزم نہ ہونے سے عملاً زیادہ فرق نہ پڑا۔ یہ اصلاحات دیہات میں طاقت کا ڈھانچہ تبدیل کرنے میں ناکام رہیں کیونکہ زمین کی حد ملکیت انفرادی رکھی گئی جبکہ خاندانوں کو اس سے باہر رکھا گیا۔ اس کے علاوہ رشتہ داروں اور اپنے ملازمین کے نام زمینیں منتقل کر کے جاگیرداروں نے اپنی گرفت بدستور مضبوط رکھی۔ بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے بعد 1977ء میں اصلاحات کا عمل ترک کر دیا گیا۔

فوج کے پر کاٹنے کی کوشش

بھارت کے ہاتھوں فوج کی شکست سے فوجی جنرل گویا منظر سے پیچھے چلے گئے۔ نئی حکومت نے پاکستان کے سرکاری ٹی وی کو 16 دسمبر 1971ء کے فوج نے ہتھیار ڈالنے کی تقریب نشر کرنے کی اجازت دی۔ اس کا فوج کی طرف سے سخت ردعمل سامنے آیا۔ حتیٰ کہ عام لوگوں نے بھی سقوط ڈھاکہ کے منظر دکھانے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ بھٹو اور آرمی چیف جنرل گل حسن کے درمیان اختلافات فوراً پروان چڑھے۔ گل حسن نے شکوہ کیا کہ بھٹو اوران کے قریبی ساتھی ان کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتے ہیں بلکہ سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ جنرل گل حسن نے فیکٹری ورکروں کے خلاف فوج استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ اختلافات اس وقت مزید ابھر کر سامنے آئے جب بھٹو کے فوجی مشیر جنرل (ر) اکبر خان... کشمیر جنگ کے ہیرو اور بعد میں راولپنڈی سازش کیس کے ماسٹر مائنڈ جنہیں فوج سے برخواست کر دیا گیا تھا... نے فوج کو حکم دیا کہ وہ نوشہرہ میں پولیس کی بغاوت ختم کرنے کیلئے انفنٹری کا استعمال کرے۔ جنرل گل حسن نے یہ حکم ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ اس طرح لاہور میں پولیس کی بغاوت کے موقع پر بھی آرمی چیف اور بھٹو کی طرف سے متضاد احکامات دیکھنے میں آئے۔ (خان 1993ء:64-350)۔ گل حسن نے دعویٰ کیا ہے کہ چونکہ انہوں نے بھٹو کے خلاف ضابطہ احکامات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے انہیں 3 مارچ کو ریٹائر کر دیا گیا۔ یکے بعد دیگرے بھٹو نے ائیر مارشل رحیم خان کو بھی فارغ کر دیا حالانکہ یہ دونوں بھٹو کو چند ماہ پہلے اقتدار میں لانے کا موجب بنے تھے۔ حیرت انگیز فیصلہ یہ دیکھنے میں آیا کہ بھٹو نے جنرل گل حسن کی جگہ مشرقی پاکستان فیم جنرل ٹکا خان کو فوج کا سربراہ مقرر کر دیا۔ جب اطالوی صحافی اوریانا فلاچی نے بھٹو سے اس انتخاب سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے مبینہ طور پر یہ کہا کہ:

''جنرل ٹکا خان ایک سپاہی ہیں جو مشرقی پاکستان میں اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ انہیں ایک مختصر حکم کے ساتھ مشرقی پاکستان بھیجا گیا اور اسی طرح مختصر حکم کے ساتھ انہیں واپس بلوا لیا گیا۔ آنے اور جانے کے دونوں حکمناموں میں جنرل ٹکا کی مرضی شامل نہیں تھی۔ میں نے ان کا انتخاب اس لئے کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے احکامات پر اسی ڈسپلن کے تحت عملدرآمد

کریں گے''۔(بحوالہ نواز 2009ء:325)۔

بھٹو نے فوج میں کمانڈر انچیف کا عہدہ ختم کر کے، تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کو ایک جیسا رینک اور سنیارٹی دی۔ اس کے بعد بری فوج کے سربراہ کا نام چیف آف آرمی سٹاف رکھا گیا۔ اس کے عہدے کی میعاد 4 سال مقرر کی گئی جو بعد ازاں 3 سال کر دی گئی۔ نیول ہیڈ کوارٹر کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھٹو نے فوجی افسروں کی ترقی کے عمل کی خود نگرانی شروع کر دی۔ ایسے افسر جن کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ اپوزیشن کے لئے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے کو ترقیاں دینے سے گریز کیا گیا۔ فوج کے معاملات میں اس طرح کی مداخلت سے سینئر فوجی افسروں میں سخت ناراضگی پائی جاتی تھی۔(شفقت 1997ء:175)۔

سویلین اقتدار

انہی حالات میں حکومت نے 14 اپریل 1972ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ اجلاس میں ملک میں نافذ مارشل لاء اٹھانے پر اتفاق کیا گیا۔ وفاقی وزیر میاں محمود علی قصوری کے تحریر کردہ عبوری آئین کی منظوری دی گئی جو 21 اپریل سے نافذ العمل ہو گیا۔ اس آئین کے تحت ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کے صدر کا حلف اٹھایا جبکہ ایک بنگالی رہنما جو پاکستان کے انتہائی وفادار تھے نے وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا تاہم وزیر اعظم کا منصب برائے نام تھا اور اصل طاقت بطور صدر بھٹو کے پاس تھی۔ قومی اسمبلی نے محمود علی قصوری کی سربراہی میں 25 رکنی کمیٹی تشکیل دی جسے پارلیمانی نظام حکومت کی بنیاد پر نیا آئین تشکیل دینے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔

جنگی مجرموں اور جنگی قیدیوں کا مسئلہ

مشرقی پاکستان میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے مبینہ جنگی جرائم کے خلاف بنگالیوں میں شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ بنگلہ دیش کے مختلف حصوں میں ان قیدیوں پر پے در پے حملے کئے گئے۔ اسی بنا پر بھارت نے ان قیدیوں کو اپنی سرزمین پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ 24 دسمبر 1971 کو بنگلہ دیش کے وزیر داخلہ اے ایچ ایم قمر الزمان نے اعلان کیا کہ بنگالی حکام نے پاکستان کے 30 اعلیٰ سول افسروں کو گرفتار کیا ہے جن کے خلاف نسل کشی کا مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس کیس کی پیروی 7 بنگالی افسروں کی بیواؤں نے کی جنہیں پاکستانیوں نے ہلاک کیا تھا۔ بنگلہ دیش نے

بھارت سے بھی بعض قیدیوں کے خلاف جنگی جرائم پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا۔ وطن واپسی پر شیخ مجیب الرحمٰن نے جنگی جرائم کے ٹرائل کا باضابطہ آغاز کیا۔ 29 مارچ 1972ء کو بنگلہ دیشی حکومت نے جنرل نیازی اور جنرل راؤ فرمان علی سمیت پاکستانی فوج کے 1100 قیدیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کیا۔ شروع میں بھارت نے ایسے تمام قیدی بنگلہ دیش کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی جو بادی النظر میں جنگی مجرم تھے لیکن بعدازاں 14 جون 1972ء کو اس نے جنرل نیازی سمیت 150 اور پھر 195 قیدی بنگلہ دیش کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایسے دباؤ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ 19 جون کو شملہ سربراہ کانفرنس سے صرف 10 روز قبل مجیب الرحمٰن نے پاکستانیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کے اپنے عزم کا اعادہ کیا۔ (احمد: 2010ء)۔

پاکستان نے اس فیصلے کے ردعمل میں مغربی پاکستان میں مقیم کئی بنگالیوں کو نظر بند کر دیا۔ اندازے کے مطابق 4 لاکھ بنگالی سقوط ڈھاکہ کے وقت پاکستان میں تھے۔ اس کے علاوہ ذوالفقار علی بھٹو نے چین کو قائل کر لیا کہ وہ اقوام متحدہ میں نئے ملک بنگلہ دیش کی رکنیت کا فیصلہ ویٹو کر دے۔ چنانچہ 25 اگست 1972ء کو جب بنگلہ دیش نے رکنیت کی درخواست کی تو چین نے اسے ویٹو کر دیا۔ اس دوران بھارتی قید میں پاکستانی قیدیوں کا معاملہ پاکستان کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں نمایاں تر ہو گیا۔ بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی مختلف سیاسی اور سفارتی وجوہات کی بنا پر 90 ہزار قیدی زیادہ لمبے عرصے کے لئے نہیں بھارت میں رکھنا چاہتی تھیں۔ اس کے باوجود کہ انسانیت کے خلاف جرائم پر بعض قیدیوں کے ٹرائل کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ یقیناً اندرا گاندھی نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ بھارت کی مضبوط پوزیشن کے مدنظر وہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر بھی ڈیل کر سکتی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک شائستہ سفارتکار ڈی پی دھر کو پاکستان بھیجا تاکہ وہ بھٹو کو پرفضا مقام شملہ میں ملاقات کی دعوت دے سکیں۔ بھٹو نے دعوت کا جواب گرمجوشی سے دیا جس کے بعد معاملات آگے بڑھنے لگے۔ (تاثیر 1979ء:135)۔ بھٹو نے اس دوران پاکستانی سیاستدانوں کے وسیع حلقوں سے مشاورت کی جس میں مؤثر مفادات سے متعلق آراء جمع کرنے پر بھرپور توجہ مرکوز کی گئی۔ پاکستانی عوام کے لئے جنگی قیدیوں کی رہائی اولین ترجیح تھی۔

فوج کی بریف

بھارت کے ساتھ شملہ میں مذاکرات کے حوالے سے فوج کے نقطۂ نظر پر شجاع نواز نے

کافی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جنگی قیدیوں کا معاملہ فوج کے لئے اہم ترین مسئلہ تھا۔ اس نے جو بریف تیار کیا اس میں زور دیا گیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے بنگلہ دیش اور بھارت کے سامنے کئی شرائط رکھی جائیں۔ بھارت کے بارے میں پاکستانی فوج نے اصرار کیا کہ بھارتی فوجیں بین الاقوامی سرحد اور سیز فائر لائن سے پیچھے بھیجی جائیں۔ جنگی قیدی رہا کئے جائیں اور کسی فوجی پر جنگی جرائم کا مقدمہ نہ چلایا جائے۔ اس کے علاوہ پاکستانی قیدیوں کا پاکستان میں زیر حراست بنگالی فوجی اور سویلین افسروں سے تبادلہ کیا جائے۔ جہاں تک بنگلہ دیش کا تعلق تھا تو وہاں پاکستان نواز افراد بالخصوص بہاریوں سے اچھا سلوک یقینی بنایا جائے۔ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ جہاں فوج نے بہاریوں کے ساتھ اچھے سلوک کا مطالبہ کیا وہاں ان کی پاکستان منتقلی کی سخت مخالفت کی اور قرار دیا کہ بنگلہ دیش ہی ان کا ملک ہے۔ (نواز 2009: 328)۔ کشمیر کے معاملے پر بھٹو کو مشورہ دیا گیا کہ وہ سخت مؤقف اختیار کریں۔: ''ہمیں مقبوضہ کشمیر کو بھارت کا حصہ تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنا یہ مؤقف جاری رکھنا چاہیئے کہ بھارت کشمیریوں کو حق خودارادیت لازمی طور پر دے۔ البتہ پاکستان کشمیر کے مسئلے پر ثالثی پر رضامند ہو سکتا ہے۔ (ایضاً: 330)۔ فوج یہ بھی چاہتی تھی کہ بھٹو بھارت سے اس کی فوجوں کی تعداد میں کمی کا مطالبہ کریں تاکہ پاکستان میں بھارتی جارحیت کا خوف کم ہو سکے۔ (ایضاً)۔ شجاع نواز نے یہ دلچسپ تاثرات بھی بیان کئے:

''یہ وہ فوج نہیں تھی جو حال ہی میں ایک جنگ ہار چکی تھی۔ اس نے جو شرائط پیش کیں وہ ہتھیار ڈالنے والی فوج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ فوج کے اس بریف میں یہ پیغام دیا جا رہا تھا کہ اگر بھارتی ''خطرہ'' اونچی ترین سطح پر برقرار رہتا ہے تو پاکستان کو بھی اس تناسب سے اپنی مسلح افواج کو تیار رکھنا ہوگا۔ البتہ یہ بات تسلیم کی گئی کہ اگر بھارت اپنی مسلح افواج کی تعداد گھٹاتا ہے تو پاکستانی فوج بھی تعداد کم کرنے پر تیار ہے''۔ (ایضاً)۔

شملہ معاہدہ

جون 1972ء کے آخر میں بھٹو شملہ پہنچے۔ ممتاز صحافیوں سمیت ایک بڑا وفد ان کے ساتھ تھا۔ پاک بھارت سربراہ کانفرنس کا باضابطہ آغاز 28 جون 1972ء کو ہوا۔ دونوں فریقوں نے

تنازعہ ختم کرنے کے لئے مخلصانہ خواہش کا اظہار کیا تا کہ پائیدار اور دیرپا امن بحال ہو سکے۔ اندرا گاندھی کی حکمت عملی کا لُب لباب اس بات پر زور دینا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں جنم لینے والے حالات میں تمام ایشوز کا جامع تصفیہ تلاش کیا جائے۔ بھارتی نقطہء نظر سے اس کا مرکزی مؤقف کشمیر کے مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ پاکستان نے اس موقع پر انتہائی مختلف نقطہء نظر کا اظہار کیا: پاکستان کے (جنگ کے دوران) زیر قبضہ علاقے خالی کرنے اور جنگی قیدیوں کی رہائی کو مسئلہ کشمیر کے حل کی اولین شرط کے طور پر پیش کیا گیا۔

بھٹو نے زور دیا کہ جنگی جرائم میں ملوث پاکستانی فوجی افسروں کے ٹرائل سے مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے سازگار ماحول پیدا نہیں ہوسکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دلیل سے بھارتی وزیراعظم اور ان کے مشیر متفق ہو گئے۔ 2 جولائی 1972ء کو دونوں وزرائے اعظم نے شملہ معاہدے پر دستخط کر دیے اور اس بات پر اتفاق کیا کہ دیرپا امن و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے دونوں لیڈر مل کر کام کریں گے جبکہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ پراپیگنڈے سے گریز کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ثقافت اور سائنس کے شعبوں میں وفود کا تبادلہ کیا جائے گا۔

معاہدے میں کہا گیا کہ دونوں ملک بات چیت یا دیگر پرامن ذرائع کے ذریعے اپنے اختلافات دور کریں گے۔ اگر کسی معاملے پر اختلافات پیدا ہوتے ہیں تو مسئلے کے حل تک کوئی فریق صورتحال تبدیل نہیں کرے گا اور ایسے تمام اقدامات کی حوصلہ شکنی کی جائے گی جن سے امن اور ہم آہنگی کی فضا متاثر ہوتی ہو۔ یہ بھی کہا گیا کہ جموں وکشمیر میں دونوں فریق 17 دسمبر 1971ء کی سیز فائر کے نتیجے میں وجود میں آنے والی کنٹرول لائن کا احترام کریں گے۔ کوئی فریق یکطرفہ طور پر صورتحال کو تبدیل نہیں کرے گا۔ قطع نظر باہمی اختلافات اور قانونی تشریحات کے۔ دونوں فریق کنٹرول لائن پر طاقت کے استعمال اور دوسرے فریق کیلئے خطرہ بننے سے گریز کریں گے۔ شملہ معاہدے میں قرار دیا گیا کہ دونوں ملکوں کے نمائندے دوطرفہ تعلقات معمول پر لانے اور دیرپا امن یقینی بنانے کے انتظامات اور طریقہ کار طے کرنے اور مسئلہ کشمیر کے حتمی حل کے لئے مزید مذاکرات کریں گے۔ (شملہ معاہدہ 1972ء)۔

معاہدے کی قابل توجہ بات یہ ہے کہ شملہ معاہدے میں کشمیر میں استصواب رائے کرانے کا کوئی ذکر نہیں اور یہ اقوام متحدہ کی قراردادوں سے واضح مفر تھا۔

معاہدے کی تشریح

مجموعی طور پر شملہ معاہدہ بھٹو کی بہت بڑی کامیابی تھی۔انہوں نے کمزور پوزیشن کے باوجود پاکستان کا مقدمہ لڑا جبکہ اندرا گاندھی جو بہت مضبوط پوزیشن میں تھیں وہ تمام مسائل بالخصوص مسئلہ کشمیر پر کوئی فائدہ اٹھانے میں ناکام رہیں۔ایک طرح سے شملہ معاہدے کی فاتح پاکستانی فوج ٹھہری جس کا بریف بھٹو کی چابکدستی کے باعث مذاکرات میں حاوی رہا۔آخر اندرا گاندھی الجھن کا شکار کیوں ہوئیں؟۔کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے انہیں قائل کرلیا تھا کہ جنگی قیدیوں کی رہائی تک مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کا آغاز نہیں ہوسکتا۔بھٹو کی واپسی پر نہایت محتاط انداز میں تیار کردہ پبلک ریلیشنز کی مہم میں انہیں ایک سٹیٹس مین اور محبّ وطن قرار دیا گیا۔اگر چہ شملہ معاہدے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کا ذکر نہیں تھا پھر بھی بھارت کو کشمیر پر کوئی رعایت نہیں دی گئی۔واحد اہم تبدیلی یہ تھی کہ سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن میں تبدیل کردیا گیا۔شملہ معاہدے کے فوراًبعد دونوں فریقوں نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تشریح شروع کردی کہ اس سے ان کو فلاں فلاں فائدہ ہے۔بھارت نے اصرار کیا کہ دوطرفہ تعلقات کے اصول Bilateralism کا مطلب یہ ہے کہ کشمیر اب بین الاقوامی معاملہ نہیں رہا اور کنٹرول لائن عملاً بین الاقوامی سرحد بن چکی ہے۔دوسری طرف پاکستان اس بات پر مصر رہا کہ شملہ معاہدے کے تحت تسلیم کرلیا گیا ہے کہ کشمیر ایک حل طلب مسئلہ ہے۔(تاثیر 1979:3-141)۔

جنگی قیدیوں کی واپسی

شملہ معاہدے سے کچھ پہلے بھارت نے جنرل نیازی سمیت 150 مبینہ جنگی مجرم بنگلہ دیش کے حوالے کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔شیخ مجیب نے بھی اعلان کیا کہ بنگلہ دیش ان کے خلاف مقدمہ چلائے گا۔تاہم شملہ معاہدے میں پاکستان اور بھارت نے اس بات پر اتفاق کہ اس مسئلے پر زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں۔(احمد 2010ء)۔

وطن واپسی پر بھٹو نے دوٹوک مؤقف اختیار کیا کہ بنگلہ دیش کو آزاد ملک تسلیم کرنے کا معاملہ جنگی قیدیوں کی رہائی سے مشروط ہوگا۔انہوں نے بھارت کی طرف سے جنگی مجرم بنگلہ دیش کے حوالے کرنے کے فیصلے پر سخت اعتراض کیا۔یہ مؤقف اختیار کرنے کے پیچھے یہ حقیقت بھی

کارفرما تھی کہ پاکستان میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں بنگالی موجود تھے جو بنگلہ دیش اس صورت میں بھیجے جا سکتے تھے اگر بھارت اور بنگلہ دیش 195 جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلانے سے گریز کرتے۔ اس امر سے دونوں ملکوں پر زبردست دباؤ آ گیا۔ اسی پس منظر میں قیدیوں کی واپسی کا عمل آہستہ آہستہ چل نکلا (ایضاً)۔ نومبر 1972ء میں بنگلہ دیش اور بھارت نے فیصلہ کیا کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کے 6 ہزار خاندانوں کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں پاکستان 10 ہزار محصور بنگالی خواتین اور بچوں کو واپس کرنے پر مان گیا۔ اس کے بعد مزید کئی تبادلے کئے گئے۔ البتہ بنگلہ دیش اپنے اس مؤقف پر اڑا رہا کہ 195 جنگی مجرموں اور ان کے ہمنواؤں کے خلاف مقدمہ چلانے کیلئے انہیں قید رکھا جائے۔ بھٹو نے دھمکی دی کہ اگر بنگلہ دیش باز نہ آیا تو پاکستان بھی ایسا کرے گا۔ 27 مئی 1973ء کو ایک انٹرویو میں بھٹو نے کہا کہ: ''عوام یہاں موجودہ بنگالیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا مطالبہ کریں گے...... ہم جانتے ہیں کہ جنگ کے دوران بنگالیوں نے جاسوسی کی۔ اس کے علاوہ بھی مخصوص الزامات ہوں گے۔ کتنے لوگوں پر مقدمہ چلے گا، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا''۔ (بحوالہ احمد)۔ اس کے بعد پاکستان میں محصور 203 بنگالیوں کو عملاً حراست میں لے لیا گیا۔

28 اگست 1973 کو بھارت اور پاکستان نے دہلی معاہدے پر دستخط کئے جس کے تحت پاکستان اور بھارت میں محصور بیشتر پاکستانیوں اور بنگالیوں کو رہا کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔ پاکستان اور بھارت نے یہ بھی اتفاق کیا کہ 195 پاکستانی جنگی مجرموں کا مسئلہ بنگلہ دیش اور پاکستان آپس میں مل کر طے کریں۔ پاکستان نے 203 زیر حراست بنگالیوں کو بھی شہری واپس کرنے کے عمل سے باہر کر دیا۔ بعد ازاں پاکستان نے تجویز دی کہ اگر بنگلہ دیش رضا مند ہوا تو 195 ملزموں پر پاکستان میں خصوصی ٹربیونل میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ بالآخر بنگلہ دیش مان گیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ مقدمے پر اصرار کرنے سے بنگالی شہری پاکستان میں ہی زیر حراست رہیں گے۔ یوں بھارت سے پاکستان کے تمام جنگی قیدیوں کی 15 اپریل 1974ء تک واپسی کی راہ مکمل ہموار ہو گئی۔ (احمد 2010ء)۔

1973ء کا آئین

اس دوران ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے بھٹو نے زور شور سے کوششیں شروع کر

دیں۔اپریل 1973ء میں کل جماعتی آئینی کمیٹی نے قومی اسمبلی میں اپنی سفارشات پیش کر دیں۔ آئین کے مسودے میں ملک کو بدستور ''اسلامی جمہوریہ'' برقرار رکھا گیا۔صدر کا عہدہ محض نمائشی رکھا گیا جبکہ اصل اختیارات وزیراعظم کو حاصل تھے۔10 اپریل 1973ء کو قومی اسمبلی کے 133 میں 125 ارکان نے قصوری کمیٹی کی سفارشات کی منظوری دے دی۔حتیٰ کہ نیشنل عوامی پارٹی NAP نے بھی حمایت کی حالانکہ بلوچستان میں نیپ کی حکومت برطرف کرنے کے بعد سے بھٹو اور این اے پی کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے۔آئین میں پارلیمانی نظام حکومت کی تجویز دی گئی جس میں اختیارات مرکز اور صوبوں میں تقسیم کیے گئے۔البتہ وفاق کو بدستور صوبوں پر بالادستی حاصل تھی۔

نظریاتی حوالوں سے 1973ء کے آئین نے طرزِ حکمرانی کو مزید اسلامائز کرنے کے اقدامات کئے۔ماضی کے دساتیر کی طرح نہ صرف تمام قوانین کو قرآن وسنت کے تابع بنایا گیا بلکہ 1956ء اور 1962ء کی طرح جہاں صدر کے مسلمان ہونے کی لازمی شرط لگائی تھی وہاں 1973ء کے آئین میں وزیراعظم کا بھی مسلمان ہونا لازم قرار دیا گیا۔اس کے علاوہ ختم نبوت پر ایمان کا حلف بھی اٹھانا لازم قرار دیا گیا۔(احمد 2010ء:198)۔اس بنا پر قومی اسمبلی میں احمدیوں کے ایشو پر بحث شروع ہوگئی۔ربوہ گروپ کے سربراہ مرزا ناصر احمد اور ان کے رفقا نے پارلیمنٹ میں اپنا نقطہء نظر پیش کیا۔یہ پارلیمانی کارروائی آج تک خفیہ رکھی گئی ہے۔7 ستمبر 1974 کو قومی اسمبلی نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔

اگرچہ بلوچ رہنماؤں خیر بخش مری اور میر علی احمد تالپور نے آئین پر دستخط نہیں کئے تھے لیکن بہر حال ذوالفقار علی بھٹو نے 14 اگست 1973ء کو وزیراعظم کے طور پر حلف اٹھا لیا۔146 ارکان میں سے 108 نے انہیں وزیراعظم منتخب کر لیا۔نئے آئین کے تحت فضل الٰہی چودھری جن کا تعلق پنجاب سے تھا کو صدر منتخب کیا گیا۔لیکن نئے آئین پر دستخط کے چند گھنٹے بعد ہی بنیادی حقوق کو ایمرجنسی آرڈر کے تحت معطل کر دیا گیا۔معروف کالم نگار اردشیر کاؤس جی لکھتے ہیں کہ ایمرجنسی کے اختیار کو انہوں نے خیر بخش مری، غوث بخش بزنجو، عطاءاللہ مینگل اور ولی خان جیسے مخالفین کو دبانے کے لئے استعمال کیا۔یہاں تک کہ وہ بے ضرر ہو جائیں۔(ڈان:10 جنوری 2010)۔

فیڈرل سکیورٹی فورس

جہاں ایک طرف بھٹو پارلیمانی جمہوریت کا راگ الاپ رہے تھے وہاں انہوں نے وفاق

کے زیر انتظام فیڈرل سکیورٹی فورس قائم کی جو سویلین کنٹرول میں تھی۔ بظاہر اس فورس کا مقصد سمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور دیگر جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کارروائی میں حکومت کی معاونت کرنا تھا لیکن عملی طور پر یہ بھٹو کی نجی فوج کا کام کر رہی تھی۔ معروف ماہر سیاسیات خالد بن سعید نے قرار دیا ہے کہ بھٹو کی ریاست پر ذاتی گرفت مضبوط کرنے کی خواہش ''بونا پارٹ ازم'' تھی۔ بونا پارٹ ازم ریاست وہ ریاست ہوتی ہے جس میں ایسی سیاسی تحریک چلائی جاتی ہے جس کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ملک میں ایک مرد آہن میں مرتکز اختیارات نہایت ضروری ہیں۔ خالد بن سعید نے تبصرہ کیا ہے کہ یہی خواہش ایوب خان کے اندر پروان چڑھی اور اسے بھٹو نے بھی اپنی شخصیت کا جزو بنایا۔ ''بھٹو کی سوچ اس نظریے کی تابع تھی کہ ان کا مطلق العنان ہونا بہت ضروری ہے۔ وہ ہر شعبے کی اساس کمزور اور اسے اپنی خواہش اور طاقت کا تابع کر کے سارے اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کرنے کے خواہاں تھے''۔ (سعید 1980ء:91)۔

بہرحال ایف ایس ایف کی تنظیم کیلئے چند ریٹائر اعلیٰ پولیس افسروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ 15 ہزار اہلکاروں پر مشتمل فورس نیم خودکار ہتھیاروں سے لیس تھی۔ ایف ایس ایف کا ایک نمایاں ''کارنامہ'' یہ تھا کہ اس کے اہلکار دست درازی اور قانون شکنی کے ماہر تھے۔ (احسن 2010ء:90-189)۔ اس فورس کا بدنام زمانہ واقعہ یہ ہے کہ ایف ایس ایف کے غنڈوں نے پیپلز پارٹی کے بانی رکن اے جے رحیم اور ان کے بیٹے کو سخت تشدد کا نشانہ بنایا۔ انہیں اس بری طرح مارا پیٹا گیا کہ ان کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بھٹو خوشامدیوں کے نرغے میں آ گئے جبکہ بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے اور جمہوریت پسند رہنما یا تو کابینہ سے نکل گئے یا انہیں کھڈے لائن لگا دیا گیا۔

بلوچستان میں کارروائی

اگرچہ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل تھی لیکن چاروں صوبوں میں سے صرف 2 یعنی سندھ اور پنجاب میں اس کی اکثریت تھی۔ مارچ 1977ء میں نیشنل عوامی پارٹی (بعدازاں یہ عوامی نیشنل پارٹی بن گئی) اور دیوبند مکتبہ فکر کی جماعت جمعیت علما اسلام (جے یو آئی) کے درمیان معاہدہ طے پا گیا جس کے تحت دونوں جماعتوں نے صوبہ سرحد میں حکومت بنالی جبکہ بلوچستان

میں صرف نیپ کی حکومت وجود میں آ گئی۔ جنرل گل حسن کے مطابق بھٹو نے ان دونوں جماعتوں کے درمیان مفاہمت کو قبول نہ کیا اور مختلف ریشہ دوانیوں اور ہتھکنڈوں سے بلوچستان اور سرحد میں حکومتوں کو تبدیل کر کے اپنی حکومتیں بنانے کی کوشش کی۔ (خان1993: 377)۔ بہرحال فروری 1973ء کو حکومت پاکستان نے دعویٰ کیا کہ اس نے عراقی سفارتخانے کیلئے بھجوائے جانے والے ایک سامان میں اسلحے کی کھیپ کا سراغ لگایا ہے۔ ان دنوں بلوچ چھاپہ مار مسلح افراد پٹ فیڈر کے سنگلاخ علاقے میں حکومت مخالف کارروائیوں میں مصروف تھے۔ بھٹو نے پکڑے گئے اسلحے اور بلوچستان میں مسلح کارروائیوں کو پاکستان کے خلاف ایک اور سازش قرار دیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ بلوچ سردار صوبے میں بڑے پیمانے پر ہونے والی شورش پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں جس سے صوبے کے عوام میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا ہے اور امن عامہ کو نقصان پہنچا ہے۔ (نواز2008: 333)۔ بلوچستان حکومت کو 12 فروری 1973ء کو برطرف کیا گیا۔ اس کیلئے یہ الزام گھڑا گیا کہ صوبائی حکومت نے نہ صرف اپنے اختیارات سے تجاوز کیا بلکہ وہ صوبے میں ہونے والی بغاوت کی سازش میں بھی ملوث تھی۔ چنانچہ فوج کو حکم دیا گیا وہ صوبے میں امن وامان بحال کرے اور بجلی اور سڑکوں جیسی سہولتوں کی فراہمی کے اقدامات کرے۔

بلوچستان میں نیپ کی حکومت میں شامل یا ان کے ہمدرد سرداروں کو گرفتار کر لیا گیا اور غداری اور بغاوت کے الزامات لگا کر مقدمہ چلایا گیا۔ سندھ کے گورنر میر رسول بخش تالپور جو بھٹو کی طرح سندھی تھے اور ان کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے تھے نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ حکومت نے ان کے بھائی میر علی احمد تالپور کو بلوچستان کی مزاحمتی تحریک میں ملوث قرار دیا تھا۔ پہلی جھڑپ 18 مئی 1973ء کو سبی کے قریبی علاقے تندوری میں ہوئی۔ جس میں سبی سکاؤٹس کے 8 اہلکار مارے گئے۔ جس پر فوج نے 21 مئی کو مری کے علاقے میں چڑھائی کر دی۔ بعدازاں اس تنازعے میں شدت آ گئی کیونکہ عسکریت پسندوں کے خاندان افغانستان منتقل ہو گئے جبکہ مرد بلوچستان میں مسلح مزاحمت کیلئے پیچھے رہ گئے۔ (انٹرویو: میر محمد علی تالپور)۔ اس جدوجہد میں پنجاب کے بعض کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اور مارکسسٹ نظریات کے حامل نوجوان بھی شریک ہو گئے۔ فوج نے انتہائی سخت اور بے رحم انداز میں جواب دیا۔ اس نے باغی مسلح افراد کے خلاف بڑا آپریشن شروع کر دیا۔ ایران نے اس موقع پر ہنگامی عسکری امداد کے طور پر پاکستان کو 20 کروڑ ڈالر کی

فراخدالانہ امداد دینے کے علاوہ کو برا ہیلی کاپٹر بھی بھجوائے۔(ہیریسن 1981ء:36)۔

دوسری جانب بلوچ عسکریت پسندوں نے افغانستان میں محفوظ ٹھکانے بنا لئے اور پاکستانی فوج پر اچانک حملے شروع کر دیے۔اس لڑائی کے نقطہ عروج پر 80 ہزار فوجی اور 35 ہزار بلوچ چھاپہ مار کارروائی میں شامل تھے۔ایک اندازے کے مطابق لڑائی میں 5300 بلوچ ہلاک یا زخمی ہوئے جبکہ فوج کے 3300 افراد ہلاک یا زخمی ہوئے۔(خان 1983ء:71)۔بعض فوجی ذرائع اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ فوجی آپریشن اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا یا اتنی بڑی تعداد میں بلوچ عسکریت پسندوں نے مزاحمت کی۔بہرحال بھٹو کے پورے دور حکومت میں یہ لڑائی چلتی رہی۔اس آپریشن کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ فوج ایک بار پھر سیاست میں داخل ہوگئی۔اس نے پاکستان کی علاقائی سالمیت یقینی بنانے کی ذمہ داری بھی لے لی۔

نیپ پر پابندی اور پختون رہنماؤں کی گرفتاری

اگرچہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت برطرف کی جا چکی تھی۔وہاں کے رہنما بھی گرفتار کئے جا چکے تھے اور بلوچ عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن کا حکم بھی جاری ہو چکا تھا لیکن شمال مغربی سرحدی صوبے میں نیپ اور جے یو آئی کی حکومت کشیدگی میں اضافے کے باوجود برقرار رہی۔اس کشیدگی کی ایک جزوی وجہ 1973ء میں افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کا ان کے کزن سردار داؤد خان کے ہاتھوں تختہ الٹنا بھی تھی۔داؤد شاہ سوویت یونین کے حامی کے طور پر مشہور تھے چنانچہ انہوں نے پختون قوم پرستی کے ایشو کو ہوا دی اور پاکستان اور افغانستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کی قانونی حیثیت کو چیلنج کر دیا۔پاکستان کے انٹیلی جنس ذرائع نے شبہ ظاہر کیا کہ داؤد خان کے اس مؤقف سے سرحد کے اس طرف عدم استحکام پیدا ہوگا اور مضر اثرات مرتب ہوں گے۔چنانچہ بھٹو نے حکم دیا کہ فوج جارحانہ افغان پراپیگنڈے کے سدباب کے لئے مناسب اقدامات کرے۔

ان اقدامات میں کابل کی نئی حکومت کی مخالف قدامت پسند قوتوں کی حمایت کرنا بھی شامل تھا۔طویل المدت حکمت عملی کے تحت مستقبل کے مشہور ایس ایس جی افسر سلطان امیر عرف کرنل امام کو تربیت کے لئے 1973 میں امریکہ بھجوایا گیا۔کرنل امام نے بعدازاں افغان جہاد کے

دوران زبردست شہرت پائی۔ انہوں نے مجھے خود بتایا کہ بھٹو حکومت نے افغانستان میں عدم استحکام پیدا کرنے کا فیصلہ اس لئے کیا کیونکہ داؤد شاہ پختونستان کا شوشہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ (انٹرویو: کرنل امام)۔ اس کے علاوہ بھٹو کو یقین تھا کہ ولی خان اور دیگر پختون قوم پرستوں کے داؤد شاہ کے ساتھ خفیہ رابطے تھے۔ میجر جنرل نصیر اللہ بابر نے لکھا ہے کہ بھٹو نے 1973ء میں داؤد شاہ کے مخالف افغان رہنماؤں کی حمایت شروع کی۔ ان لوگوں کو انفنٹری کے بنیادی ہتھیار اور تربیت دی گئی تاکہ وہ ایس ایس جی کی ایک ٹیم کے ماتحت چھاپہ مار سرگرمیاں شروع کرسکیں۔ یہ سب کام انتہائی خفیہ طریقے سے کیا گیا۔ صرف بھٹو، عزیز احمد، آرمی چیف جنرل ٹکا خان اور میجر جنرل نصیر اللہ بابر کو اس کے بارے میں علم تھا۔ (امین 2001ء)۔

دوسری جانب ولی خان نے اپنے والد عبدالغفار خان کی پالیسی سے بتدریج دوری اختیار کرنا شروع کردی۔ جو کانگریس نواز اور تقسیم ہند کے مخالف ہونے کے حوالے سے مشہور تھے۔ اس طرح وہ پاکستان کے مرکزی دھارے کے قوم پرست لیڈر بننے سے محروم تھے۔ ایک حیران کن اقدام کے طور پر صوبہ سرحد کی نیپ جے یو آئی حکومت نے فیصلہ کیا کہ صوبے کے تعلیمی اداروں میں پشتو کی جگہ اردو ذریعہ تعلیم ہوگی۔ اس کے علاوہ ولی خان نے پنجاب میں اپنا اثر ونفوذ بڑھانا شروع کردیا۔ بھٹو کو ولی خان کی یہ حکمت عملی پریشان کن لگی۔ 23 مارچ 1973ء کو جب ولی خان نے راولپنڈی کے تاریخی لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کیا تو نامعلوم مسلح افراد نے جلسے میں فائرنگ کردی جس سے ایک درجن افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے۔ عام تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ یہ کارروائی فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) نے کی تھی۔ ولی خان حملے میں بال بال بچ گئے۔ (مزاری 2001ء: 7-296۔ ولی 2:2003)۔ اس حملے سے پختونوں میں سخت اشتعال پھیل گیا جو پشاور میں بڑا احتجاج کرنا چاہتے تھے تاہم ولی خان نے مرکزی حکومت سے براہ راست تصادم سے گریز کرتے ہوئے احتجاج سے منع کردیا۔ اس کے علاوہ 21 اپریل 1973 کو جب نئے آئین کی منظوری کا مرحلہ آیا تو ولی خان اور ان کے ساتھیوں نے صوبائی خودمختاری اور تمام اختیارات وزیراعظم کے عہدے میں مرتکز کرنے پر تحفظات کے باوجود آئین کے حق میں ووٹ دیا۔ اپوزیشن کی تمام جماعتوں کی حمایت سے ولی خان قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوگئے۔ ایسی مثبت سیاسی پیشرفت سے سیاسی جماعتوں کے درمیان تصادم وقتی طور پر ٹل گیا۔ جب صوبہ

سرحد کے گورنر حیات محمد خان شیر پاؤ کو بم دھماکے میں 8 فروری 1975ء کو قتل کر دیا گیا تو وزیر اعظم بھٹو نے واقعے کی ذمہ داری ولی خان اور نیپ پر لگائی۔ چنانچہ ولی خان سمیت نیپ کی بیشتر قیادت کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر بھی اسی ٹریبونل میں مقدمہ شروع ہوا جہاں بلوچ لیڈروں کے خلاف کارروائی جاری تھی۔ یہ مقدمہ 4 سال تک جاری رہا اور اسے مضحکہ خیز سمجھا گیا۔ (نیو برگ 2002ء: 146-50)۔ جب تک بھٹو اقتدار میں رہے بلوچ اور پختون لیڈرز زیر عتاب رہے۔

بغاوت کی ناکام کوشش

جب سے ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تھے ان کے خلاف فوج اور ائیر فورس کے جونیئر اور درمیانے درجے کے بعض افسروں میں مخالفت پائی جاتی تھی۔ اس بات پر غم و غصے کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ یحییٰ خان اور ان کے چند ساتھیوں کو تو فوج سے ریٹائر کر دیا گیا لیکن جنرل ٹکا خان سمیت سانحہ مشرقی پاکستان میں ملوث دیگر افسروں کو بچا لیا گیا۔ یہ سوچ اصلاحات کی پالیسیاں نافذ ہونے کے ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ 1972ء میں بھٹو نے بریگیڈئیر ایف بی علی کو ریٹائر کر دیا جنہوں نے یحییٰ خان کے خلاف فوجی افسروں کی تحریک کی قیادت کی تھی۔ اس اقدام سے بریگیڈئیر ایف بی علی کے مداح فوجیوں میں مایوسی پھیل گئی۔ ایف ایس ایف کی تشکیل کے بعد ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بھٹو تمام اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر کے آمر بننے کے درپے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں ملاقاتیں کر کے صلاح مشورے شروع کر دیے لیکن ملٹری انٹیلی جنس نے بروقت پتہ چلا کر سازش ناکام بنا دی اور 30 مارچ 1973ء کو کئی افسروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ (نواز 2008ء: 336)۔

گرفتار افراد پر اٹک قلعے میں مقدمہ چلایا گیا۔ بھٹو نے فوجیوں کا کورٹ مارشل کرنے کیلئے میجر جنرل ضیاء الحق کو ملٹری ٹریبونل کا سربراہ مقرر کیا۔ جنرل ضیاء الحق بھٹو کی نظروں میں اس وقت آئے جب وہ ملتان کے دورے پر گئے۔ بظاہر وہ جنرل ضیا کے شرمیلے پن اور آگے بڑھنے کے عزائم نہ رکھنے کی عادت سے متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ جب وہ اردن رائل آرمی میں تھے تو انہوں نے 1970ء کی بلیک ستمبر کی شورش کچلنے میں شہرت حاصل کی۔ بہر حال اوپر جس سازش کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ملوث فوجیوں کے خلاف سخت تفتیش کی گئی۔ مجموعی طور پر مقدمے کی سماعت

شفاف انداز میں ہوئی۔ ملزموں کو سزا سنانے کے بعد مختلف جیلوں میں بھجوا دیا گیا۔ حکومت سزا یافتہ فوجیوں کو منتشر رکھنے اور ان سے ملاقاتوں پر پابندی میں دلچسپی رکھتی تھی۔ فوج کے خلاف کارروائی کے بعد بھٹو نے اشک شوئی کے طور پر بھی کچھ اقدامات کئے۔ مثال کے طور پر فوجیوں کی تنخواہ بڑھا دی گئی اور مزید بھرتیوں کی بھی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ دفاعی بجٹ میں بھی برائے نام اضافہ کیا گیا۔ 72-1971ء میں دفاعی بجٹ 3725 ملین روپے تھا جو 77-1976ء میں بڑھا کر 8210 ملین روپے کر دیا گیا۔ (نواز 2008ء:44-339)۔

اقتدار پر گرفت کی مضبوطی

سول اور فوجی اشرافیہ پر کنٹرول بڑھانے کیلئے بھٹو نے کئی قسم کے اقدامات کئے۔ مثال کے طور پر سول سرونٹس کو ملازمت سے برخواست نہ کرنے کی ضمانت ختم کر دی گئی۔ چنانچہ یہ کلہاڑا تقریباً 1300 بیوروکریٹس پر چلا۔ جنہیں کرپشن کے الزام میں جبری ریٹائر یا برطرف کر دیا گیا۔ (یوسف 1999ء:146)۔ دوسری طرف حکومت نے ''چور دروازے'' سے سی ایس ایس جیسے مشکل امتحان کی بجائے آسان طریقے سے افسر بھرتی کرنے کا آغاز کیا۔ اس کیلئے بھٹو کے انتہائی وفادار سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی سربراہی میں کمیٹی کے ذریعے بھرتیوں کی کوشش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں 1973ء سے 1977ء کے دوران 1374 سول افسروں کی بھرتی کی گئی۔ (برکی 1980ء: 102)۔ جہاں تک فوج کے شعبے کا تعلق تھا تو نئے آئین کے مطابق تینوں مسلح افواج کے سربراہوں کی نامزدگی کا خصوصی اختیار وزیراعظم کو حاصل تھا۔ آئین میں کسی بھی قسم کی فوجی بغاوت کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اسے غداری کے زمرے میں کارروائی قرار دیا گیا تھا اور اس کی سزا موت مقرر کی گئی۔ تاہم بھٹو فوج کے معاملے میں کافی محتاط واقع ہوئے اور صرف 43 سینئر افسروں کو ریٹائر کیا گیا۔ (یوسف 1999ء : 144)۔ ان میں سے 6 افسروں کا تعلق ایئر فورس سے تھا۔ (شفقت 1997ء:175)۔

پاکستان کی بیرونی حمایت کی متنوع اساس

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زیڈ اے بھٹو 1960ء کی دہائی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کے معمار تھے جس کے تحت امریکہ پر مکمل انحصار کرنے کی بجائے دنیا کے دیگر اہم ممالک سے

تعلقات استوار کرنے پر توجہ دی گئی۔ ان ملکوں میں چین سب سے اہم تھا۔ انہوں نے اپنے ان خیالات کا ذکر اپنی اہم تصنیف The Myth of Independence (1969) میں کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ترقی پذیر ممالک کے اس حق کو منصفانہ قرار دیا کہ وہ اپنے قومی مفادات کے مقاصد کے حصول کیلئے اپنی خودمختاری کا اظہار کریں اور خارجہ پالیسی کا تعین کریں۔ بھٹو نے اس حوالے سے بڑی حد تک متفقہ نقطہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اگرچہ بھارت نے مغربی کیمپ میں شامل ہونے کی امریکی تجویز مسترد کر دی تھی اس کے باوجود امریکہ نے ہمیشہ بھارت کے ہی نازنخرے اٹھانے کو ترجیح دی۔ ایسی پالیسی سے پاکستان کی قومی سلامتی کو سخت نقصان پہنچا۔ 1965 میں امریکہ کی طرف سے بھارت اور پاکستان پر اسلحے کی پابندی سے پاکستان زیادہ متاثرہ ہوا کیونکہ صرف پاکستان کا زیادہ تر انحصار امریکی اسلحے پر تھا۔ (بھٹو 1969ء: 3-2)۔ انہوں نے کتاب میں دعویٰ کیا کہ اس امریکی فیصلے سے پاک امریکہ عسکری معاہدہ بھی بے معنی ہو کر رہ گیا۔

انہوں نے پاک چین اتحاد پر ایک ٹھوس بریف تیار کر کے دلیل دی کہ مستقبل میں سوویت یونین نہیں بلکہ چین امریکہ کا حریف بن کر اُبھرے گا کیونکہ ایشیا کی بین الاقوامی سیاست میں اہمیت بتدریج بڑھ رہی ہے۔ ایک مضبوط پاک چین اتحاد بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم کا بھی مؤثر توڑ ہوگا۔ جو نہ صرف پاکستان کو تنہا اور کمزور کرنے کے درپے ہے بلکہ جموں وکشمیر پر پاکستان کا حق دینے سے بھی گریزاں ہے۔ چنانچہ بھٹو نے زور دیا کہ مسئلہ کشمیر کے حل تک پاکستان بھارت کی طرف سے تجارت اور تعاون کی ترغیبات کے لالچ میں نہ آئے۔ (ایضاً: 84-176)۔

بھٹو کے پاکستان میں طاقتور ترین سیاسی شخصیت بننے پر وائٹ ہاؤس میں کچھ پریشانی کی لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن 1971ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے بعد امریکہ سے رخصتی سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو نے صدر نکسن سمیت اعلیٰ امریکی عہدیداروں سے ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے امریکی صدر سے کہا کہ ''پاکستان امتحان کے حالیہ مہینوں میں مکمل طور پر امریکہ کے زیر بار رہا''۔ (کوکس 2001: 204)۔ مزید یہ کہ انہوں نے امریکیوں کو یقین دلایا کہ اگرچہ مجھے ''امریکیوں سے نفرت کرنے والا'' (Yankee Hater) سمجھا جاتا ہے لیکن میں امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہوں۔ صدر نکسن کا ردعمل بھی کافی گرمجوش تھا۔ انہوں نے بھٹو کو یقین دلایا کہ وہ اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے پاکستان کی ہر ممکن مدد کریں گے لیکن

کانگریس کی مخالفت کی وجہ سے وہ فوجی امداد نہیں کر سکتے صرف معاشی اور ترقیاتی تعاون کریں گے ۔(ایضاً)۔ایک امریکی سفارتکار جنہوں نے 7 جنوری 1972ء کو بھٹو سے ملاقات کی تھی، اس وقت پاکستان میں بھاری صنعتوں اور بڑے اداروں کو قومیانے کے بعد ملک میں انقلابی جذبہ پوری شدت سے برقرار تھا۔اس موقع پر بھٹو نے یقین دلایا کہ وہ امریکہ دشمن نہیں۔اور یہ کہ امریکہ بہت عظیم طاقت ہے اور خود میری بیٹی (غالباً اشارہ بےنظیر بھٹو کی طرف تھا: مترجم) بھی امریکہ میں زیر تعلیم ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں سوویت یونین کا مخالف ہوں نہ بھارت کا۔امریکیوں نے محسوس کیا کہ بھٹو نے چندروز پہلے کینیڈا کے ہائی کمشنر سے ملاقات میں کہا کہ مجھے پاکستان کے عوام نے ''بھارت دشمن'' رویے کی بنیاد پر منتخب کیا ہے اور میں اسی بنیاد پر آگے بڑھوں گا۔(اعجازالدین 2002ء :125)۔نتیجتاً بھٹو نے اپنے بنیاد پرست رویے کو کچھ نرم کر دیا۔اس کے بعد سامراج مخالف نعروں اور امریکہ کے خلاف تنقید بتدریج دوستانہ رویے میں بدل گئی۔امریکیوں سے ملاقاتوں میں اکثر بھٹو امریکہ کے اس بات پر ممنون نظر آتے کہ امریکہ نے 1971ء کی جنگ میں بھارت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ مغربی پاکستان پر حملے سے گریز کرے۔(جین 2007ءاے :90)۔ امریکیوں نے محسوس کیا کہ بھٹو نے یہ بات کہنا بند کر دی تھی کہ بھارت پاکستان کی کمزوریاں تلاش کرر ہا تھا۔امریکہ نے بھی اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ پاکستان کی خودمختاری اور سالمیت کا تحفظ یقینی بنائے گا۔مارچ 1973 میں صدر نکسن نے 24 ملین ڈالر کے اسلحے کی وہ کھیپ جاری کر دی جو 1971 میں روک دی گئی تھی اور 1967ء کی اسلحے کی سپلائی کی پالیسی بھی بحال کر دی جس کے تحت پاکستان کو قبل ازیں فروخت کئے گئے اسلحے کے فاضل پرزہ جات اور غیر مہلک آلات حاصل کرنے کی اجازت مل گئی۔(کوکس 2001ء :209)۔بھٹو نے امریکہ سے بلوچستان میں بحیرہ عرب میں گوادر کے مقام پر نئی بندرگاہ تعمیر کرنے میں تعاون کرنے کی بھی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ امریکی بحریہ بھی اس بندرگار کو استعمال کر سکے گی۔اس درخواست پر امریکہ نے زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی کیونکہ امریکیہ سوویت یونین اور بھارت کو پریشان کرنے کا خواہاں نہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ چین نے اس بندرگاہ کی تجویز کی جب ہنری کسنجر نے نومبر 1973ء کو چین کا دورہ کیا حمایت کی۔ (ایضاً :211)۔

لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد اور بھارت کا ایٹمی دھماکہ

فروری 1974 میں ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی ممالک کے سربراہان حکومت، سربراہان مملکت اور آزادی کی تحریکوں کے رہنماؤں کو لاہور کے تاریخی شہر میں اسلامی سربراہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کے روح رواں یاسر عرفات سمیت تقریباً تمام شرکاء کانفرنس میں آئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن بھی اندرا گاندھی کی ناراضگی مول لیتے ہوئے لاہور آئے، جس سے یہ پیغام ملا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا عمل مکمل ہو چکا ہے اور بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات اب معمول پر آ سکیں گے۔ معزز شرکاء سے خطاب میں بھٹو نے جوش خطابت میں کہا کہ پاکستان کی فوج دراصل اسلام کی فوج ہے۔ (ہلیلی 26 مارچ 2011ء)۔ اس موقع پر فلسطینیوں سے اظہار یکجہتی اور بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کا خاتمہ بھٹو حکومت کی واضح پالیسی قرار دی گئی۔ (بیگ: 1974ء)۔ ایسے نقطہء نظر کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان امت مسلمہ کی طرف سے ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ پاکستان کا بین الاقوامی تاثر اجاگر کرنے کے حوالے سے لاہور کی اسلامی سربراہ کانفرنس ایک اہم مشق ثابت ہوئی۔ اس سے پاکستانی فوج کی صلاحیتوں کو کافی بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا لیکن یہ دراصل ماضی میں بیرونی طاقتوں کو ریاستی یا قومی سطح پر فوج کی خدمات پیش کرنے کی پالیسی کا تسلسل تھا جس کے صلے میں معاشی اور فوجی امداد کی توقع رکھی جاتی تھی۔

پاکستان کا عدم تحفظ کا احساس اس وقت فزوں تر ہو گیا جب مئی 1974ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ 14 جنوری 1972ء کی امریکی محکمہ خارجہ کی ایک خفیہ رپورٹ جس کا حوالہ بھارتی اخبار ایشین ایج نے دیا کے مطابق صدر نکسن کے پاکستان کی طرف جھکاؤ اور امریکہ اور چین کی نگرانی کی سرگرمیوں کو پاکستان کی طرف سے سہولیات مہیا کرنے سے بظاہر نئی دہلی میں تشویش پھیل گئی اور اس نے ایٹمی دھماکہ کرنے کا فیصلہ عدم تحفظ کے احساس کے پیش نظر کیا۔ (ایشین ایج، 6 دسمبر 2011)۔

پاکستان 1956ء سے پرامن ایٹمی پروگرام آگے بڑھا رہا تھا اور اس ضمن میں کئی ایٹمی مراکز بھی قائم کئے گئے۔ جنوبی پنجاب کے علاقے سے یورینیم کے ذخائر بھی دریافت ہو چکے تھے۔ مارچ 1965ء میں مبینہ طور پر بھٹو نے برطانوی اخبار مانچسٹر گارڈین کے نمائندے سے گفتگو

میں کہا کہ اگر بھارت ایٹمی طاقت حاصل کر لے تو چاہے ہمیں گھاس کھانا پڑے ہم بھی یہ صلاحیت حاصل کریں گے۔(نواز2008ء:340)۔

واٹر گیٹ سکینڈل میں صدر نکسن کے استعفے کے بعد اقتدار میں آنے والے صدر جیرالڈ فورڈ نے پاکستان کے بارے میں اپنے پیشرو کی پالیسی جاری رکھی اور پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کا یقین دلایا تاہم انہوں نے پاکستان پر اسلحے کی پابندی اٹھانے کا کوئی ٹھوس اقدام نہ کیا اور یہ بات پاکستان کیلئے بالخصوص بھارت کے ایٹمی تجربے کے بعد قابل قبول نہیں تھی۔ نتیجتاً امریکہ نے اسلحے کی پابندی اٹھانے کا عندیہ دیا لیکن یہ پاکستان اور بھارت دونوں کیلئے تھا۔ اسلحے پر پابندی کا اعلان 24 فروری 1975ء کو ہوا جب بھٹو واشنگٹن کے دورے پر تھے۔ صدر فورڈ نے واضح کہا کہ اسلحے کی فروخت کیس ٹو کیس کی بنیاد پر ہو گی کیونکہ امریکہ نہیں چاہتا کہ خطے میں دو حریفوں کے درمیان ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہو جائے۔ البتہ یہ بات محسوس کی گئی کہ بھارت سوویت یونین سے بڑے پیمانے پر اسلحہ خرید رہا تھا جبکہ پاکستان صرف چین سے چھوٹے پیمانے پر ہتھیار لے رہا تھا۔ (جین 2007ء اے:2-321)۔ 10 مارچ کو ایک پریس کانفرنس کے دوران بھٹو نے یاد دلایا کہ پاکستان کے امریکہ کے ساتھ 2 معاہدے 1954ء اور 1959ء موجود ہیں۔ جن کے تحت امریکہ پاکستان کو اسلحے کی فروخت کا پابند ہے۔ بہر حال اسلحے پر پابندی اٹھنے سے پاکستان کیس ٹو کیس بنیاد پر اسلحہ خرید سکتا تھا تاہم طے شدہ معاہدوں کے برعکس اسے امداد کی شکل میں کچھ نہ دیا گیا۔ (ایضاً:322)۔

کہوٹہ ایٹمی تنصیب

جوہری بم بنانے کی طرف پہلی بڑی پیشرفت کے طور پر حکومت نے جنوری 1972ء کو ملتان میں ایک کانفرنس طلب کی جس میں مستقبل کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام سمیت ممتاز سائنسدانوں کو مدعو کیا گیا۔ شرکا سے انتہائی جذباتی خطاب میں بھٹو نے کہا کہ آپ ایٹم بم تیار کریں۔ اس کے بعد آنکھ مچولی کا ایک لمبا عمل شروع ہو گیا۔ پاکستان نے لیبیا اور سعودی عرب اور ممکنہ طور پر ایران سے مالی امداد مانگی۔ (نواز2008ء:41-340)۔ امریکی عہدیداروں کو پاکستان کے ایٹمی عزائم سے تشویش شروع ہو گئی۔ جسے ''اسلامی بم'' قرار دیا جانے لگا تھا۔ 31 جنوری 1975

کی امریکی محکمہ خارجہ کے ایک بریفنگ پیپر میں بتایا گیا کہ پاکستان نیوکلیئر فیول سائیکل اور ایسی تکنیکی مہارت حاصل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا جس سے ایٹمی دھماکہ کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ (کوکس 219:2001)۔ البتہ پاکستان نے پیشقدمی کرتے ہوئے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کے تحت اسے فرانس کا جدید نیوکلیئر پراسیسنگ پلانٹ ملنا تھا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان جو ایک میٹالرجسٹ ہیں اور انہیں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے، ان کا بھٹو کے ساتھ کافی عرصے سے رابطہ تھا اور وہ ہالینڈ سے 1975ء میں واپس پاکستان آئے اور اس ٹیم کا حصہ بن گئے جسے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ شروع میں فوج ایٹم بم بنانے کے پروگرام میں شامل نہیں تھی لیکن جنرل ضیاء الحق جنہیں مارچ 1976ء میں آرمی چیف کے عہدے پر ترقی دی جا چکی تھی سے بھٹو نے کہا کہ فوج کو بھی کہوٹہ پلانٹ میں یورینیم کی افزودگی کے عمل میں معاونت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے اس سلسلے میں بریگیڈیئر زاہد علی اکبر کو ذمہ داری سونپ دی۔ ڈاکٹر قدیر ہالینڈ کی لیبارٹری سے کامیابی کے ساتھ افزودگی والے سنٹری فیوج لائے جو ایٹم بم بنانے کی بنیادی ضرورت ہوتے ہیں۔ بادی النظر میں ڈاکٹر قدیر اور پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سائنسدانوں کے درمیان کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ بریگیڈیئر زاہد علی اکبر کے پرزور اصرار پر یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ کہوٹہ لیبارٹریز کو خود مختار بنا دیا گیا جبکہ ڈاکٹر قدیر اس کے انچارج بن گئے۔ بہر حال حالات کچھ تھے اس کے بعد فوج اس پراجیکٹ کی سکیورٹی اور نگرانی کے امور میں کافی شامل ہو گئی۔ (نواز 2008:2-340)۔

جوہری محاذ پر کسی چیز کا احساس ہوتے ہی امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے پاکستان کے پے در پے دورے کئے تا کہ پاکستان کو ایٹم بم بنانے کے ارادے سے باز رکھا جا سکے۔ ان دوروں میں جہاں جدید طیاروں اور ساز و سامان سمیت عسکری امداد کی پیشکش کی گئی وہاں یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر پاکستان اپنے ایٹمی عزائم پر مصر رہا تو اقتصادی امداد روکی جا سکتی ہے۔ ان دھمکیوں کو ڈیموکریٹ سینیٹر جان گلین اور سٹوارٹ سمنگٹن کی امریکی بیرونی امداد بل میں ترامیم سے مزید ٹھوس شکل دی گئی کہ ایسے ممالک کو امریکی امداد روک دی جائے جو افزودہ یورینیم اور ایٹمی ایندھن ری پراسیسنگ ٹیکنالوجی درآمد کرتے ہیں۔ کسنجر نے خبردار کیا کہ اس ترمیم کی روشنی میں پاکستان کی اقتصادی امداد بند کی جا سکتی ہے لیکن بھٹو اور ان کے سینئر مشیر ان دھمکیوں کے باوجود اس بات پر

ڈٹے رہے کہ ان دھمکیوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لایا جائے گا۔ (کوکس 2001ء:6-226)۔

بھٹو کا زوال

1976ء میں بھٹو نے اگلے سال یعنی 1977ء میں عام انتخابات کرانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ 1973 کے آئین کے تحت اگلے عام انتخابات 1978 میں ہونا تھے لیکن ذوالفقار علی بھٹو اتنے پُراعتماد اور خود کو محفوظ سمجھتے تھے کہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کا سوچنے لگے۔ اسی دوران حکومتی جبر سے متاثر اپوزیشن جماعتوں نے بھی صف بندی شروع کر دی۔ 7 جنوری 1977 کو حکومت نے اعلان کیا کہ 2 ماہ بعد یعنی 7 مارچ کو الیکشن ہوں گے۔ حکمران پیپلز پارٹی نے اپنے انتخابی منشور میں دیگر باتوں کے علاوہ تعلیمی اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم بھی لازمی قرار دینے کا اعلان کیا۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ان کی حکومت بننے کی صورت میں ہر سال محنت کشوں کو سالانہ 16 ہزار رہائشی پلاٹ فراہم کئے جائیں گے اور ملکی شرح نمو میں 50 فیصد اضافہ کیا جائے گا۔ (چشتی 1996ء:79)۔ اعلان کے فوراً بعد اگلے روز اپوزیشن جماعتوں نے مل کر پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) قائم کر لیا۔ اگر چہ اس انتخابی اتحاد میں ہر قسم کی اپوزیشن جماعتیں شریک تھیں لیکن زیادہ بڑا حصہ جماعت اسلامی، دیو بند مکتبہ فکر کی جے یو آئی اور بریلوی مسلمانوں کی جماعت جے یو پی سمیت دائیں بازو کے دھڑے پر مشتمل تھا۔ انہوں نے نظام مصطفیٰؐ کا نعرہ بلند کیا۔ سابق نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) جس پر بھٹو نے پابندی لگا دی تھی نئے نام عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) سے سامنے آ گئی۔ اس کھیل کی ایک اور اہم کھلاڑی ریٹائیر ائیر مارشل اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال تھی، حالیہ برسوں کے دوران بھٹو اور اصغر خان کے درمیان تعلقات نہایت کشیدہ رہے۔ اگر چہ اس دوران یہ دونوں ایوب مخالف تحریک میں مختصر عرصے کیلئے اکٹھے بھی رہے لیکن اس کے بعد یہ بدترین دشمن بن گئے۔ اصغر خان نے ہمیشہ یہ الزام لگایا کہ مشرقی پاکستان الگ ہونے کے بھٹو بھی بہت بڑے ذمہ دار تھے۔ 23 جنوری 1971ء کو اصغر خان نے کہا کہ برسر اقتدار آ کر پی این اے پاکستان توڑنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچائے گی۔ (چشتی 1996ء:79)۔ ظاہر ہے کہ اس دھمکی کا اشارہ نہ صرف جنرل یحییٰ خان بلکہ بھٹو کی طرف تھا۔

دوسری جانب بھٹو انتخابی جلسوں میں اصغر خان سمیت اپنے سیاسی مخالفین کا نہ صرف مذاق اڑاتے بلکہ دشنام طرازی پر بھی اتر آتے۔ سابق آئی جی پولیس پنجاب اور بھٹو کے خصوصی انٹیلی جنس ایڈوائزر راؤ عبدالرشید نے الزام لگایا کہ اصغر خان بھی اپنی تقریروں میں کم سخت زبان استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ سب سے پہلے انہوں نے ہی بھٹو کو پھانسی دینے کی بات کی تھی۔ (رشید 2010: 177)۔ بہرحال انتخابی مہم بتدریج تلخ اور متشدد تصادم میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ پی این اے نے انتخابی مہم میں تحریک پاکستان کا مشہور نعرہ ''اسلام خطرے میں ہے'' پھر سے زندہ کر دیا۔ اس کے جواب میں پیپلز پارٹی نے اپوزیشن کو بے کار اور ذاتی مفادات کے لئے کام کرنے والے افراد کا ٹولہ قرار دیا۔

انتخابات کے نتائج سے انکشاف ہوا کہ پیپلز پارٹی کو تمام 200 نشستوں میں سے 154 نشستیں حاصل ہو گئیں جبکہ پی این اے کو صرف 36 سیٹیں مل سکیں۔ شروع میں پی این اے نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے 15 نشستوں پر دھاندلی کرائی لیکن پھر بعد میں 20 اور آخر میں 40 نشستوں پر دھاندلی کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ پیپلز پارٹی کی نئی حکومت قطعی غیر قانونی ہے۔ چنانچہ پی این اے نے دوسرے مرحلے میں 10 مارچ کو متوقع صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ پیپلز پارٹی نے دوسرے مرحلے میں بھی بڑے پیمانے پر دھاندلی کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ (چشتی 1996ء: 88)۔ جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی نے بھٹو کو اقتدار سے نکال باہر کرنے کی کال دی جس کے نتیجے میں ملک کے کئی حصوں میں پی این اے اور پی پی پی کے حمایتیوں اور پولیس میں تصادم شروع ہو گیا۔ اسلام پسندوں نے بالخصوص حملے کر کے کئی سینما گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ آہستہ آہستہ نظام مصطفیٰ کا مطالبہ تند و تیز ہوتا چلا گیا۔ لگتا تھا کہ پی این اے ہر صورت میں حکومت ہٹانے کے درپے تھی۔

بڑے پیمانے پر تحریک نے ضرورت سے زیادہ پر اعتماد اور فتح کے نشے میں چور بھٹو کے پیروں تلے سے زمین سرکا دی۔ 21 اپریل کو حکومت نے کراچی، لاہور اور حیدر آباد میں مارشل لاء لگا دیا جس کے بعد وہاں پریس پر سنسر شپ بھی لگا دی گئی۔ بظاہر فوجی قیادت نے باہمی مشاورت کے بعد بھٹو کی پشت پناہی کا فیصلہ کیا۔ اس صورتحال میں عارضی طور پر پی این اے کا تحریک اور ہڑتالوں سے حکومت گرانے کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ البتہ اصغر خان نے اپوزیشن کو مشورہ دیا کہ وہ

حاضر سروس جنرلوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے اور لابنگ کیلئے جنرل (ر) گل حسن اور جنرل (ر) رحیم خان جیسے ریٹائیر جنرلوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ (تاثیر 1979 :3-172)۔ چنانچہ اپوزیشن نے آرمی چیف جنرل ضیاء الحق سے مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ ان کے مسائل کی آگے نمائندگی کریں۔ اس مرحلے پر بھٹو نے یہ الزام بھی لگانا شروع کر دیا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کی مہم میں امریکہ بھی شریک تھا۔ ڈینس کوکس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

> 28 اپریل 1977ء کو قومی اسمبلی میں جذباتی تقریر کے دوران وزیراعظم نے الزام لگایا کہ امریکہ مجھے اقتدار سے نکال باہر کرنے کیلئے ایک بڑی بین الاقوامی سازش کو مالی امداد فراہم کر رہا ہے۔ امریکہ مجھے امریکہ کی ویتنام پالیسی کی مخالفت، اسرائیل کے خلاف عرب کاز کی حمایت کرنے اور ایٹمی پروگرام پر امریکی دباؤ مسترد کرنے کی سزا دینا چاہتا ہے۔ (کوکس 2001:230)۔

بہر حال حالات حکومت کے قابو سے باہر ہونا شروع ہو گئے۔ جب ایک موقع پر مظاہرین نے لاہور کی سڑک پر مظاہرہ کیا تو مارشل لاء کی نفی کرتے ہوئے فوج نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد پولیس نے مظاہرین کو منتشر کرنے کیلئے آنسو گیس چلائی۔ ملک کے بعض دیگر حصوں میں بھی مقامی فوجی کمانڈروں نے ایکشن لینے سے انکار کر دیا۔ (خان 2008ء:93)۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں بھٹو نے نفاذ اسلام کے حوالے سے بعض دیگر اقدامات کئے۔ اتوار کی جگہ جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل قرار دے دیا گیا۔ شراب کی فروخت اور استعمال جبکہ جوا کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔

وزیراعظم بھٹو نے پی این اے کے رہنماؤں کو مذاکرات کی دعوت دی بلکہ مولانا مودودی سے ملاقات کیلئے خود ان کے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی دیگر اپوزیشن لیڈروں سے بھی ملاقاتیں کیں لیکن 4 جولائی تک واضح ہو چکا تھا کہ سیاسی قیادت بند گلی میں پہنچ چکی ہے۔ (مزاری 2001ء:476)۔ بالآخر 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق کے حکم پر فوج نے بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کے ایک اہم کردار کور کمانڈر راولپنڈی لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی نے اس بات کی تردید کی ہے کہ حکومت اور اپوزیشن کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ملک کو خانہ

جنگی سے بچانے کیلئے فوج کا اقتدار میں آنا درست فیصلہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر مسٹر بھٹو پی این اے کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کر دیتے تو کوئی بغاوت نہیں ہونی تھی......ہمیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ہم متحارب فریقوں کو الگ کریں اور سیاسی قیادت کو حفاظتی تحویل میں لے لیں۔ جنرل ضیاء کسی سازش کے تحت اقتدار میں نہیں آئے۔ انہیں حالات نے اس معاملے میں گھسیٹ لیا اور سچ پوچھیں تو خود مسٹر بھٹو جنرل ضیاء الحق کو اقتدار میں لانے کے ذمہ دار تھے''۔ (چشتی 1996ء:134)۔

مارشل لاء لگنے کے بعد وزیر اعظم بھٹو اور ان کی کابینہ کے ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔ پیپلز پارٹی اور پی این اے کے سینئر رہنماؤں کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ آئین معطل کر دیا گیا ہے۔ تمام اسمبلیاں تحلیل کر دی گئی ہیں اور عام انتخابات 90 روز کے اندر کرائے جائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے بھٹو اور دیگر رہنماؤں کی رہائی کا حکم دیا۔ 29 جولائی کو بھٹو کو رہا کر کے ان کے آبائی شہر لاڑکانہ کی طرف بھجوا دیا گیا جہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ غیر موافق حالات میں خاموشی سے بیٹھنے کی بجائے بھٹو نے پورے ملک کے دورے کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے جلسوں میں لوگوں نے جوق در جوق شرکت کی۔ عوام ریلوے لائن کے دونوں طرف کھڑے ہو کر بھٹو کا خیر مقدم کرتے۔ پنجاب کے مرکزی شہر لاہور میں تو عوام کا ردعمل انتہائی زیادہ رہا۔ اس موقع کے عینی شاہد احمد فقیہہ بتاتے ہیں کہ بھٹو نے لوگوں سے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر اگست اور ستمبر کے مہینے فوجی حکومت اور اس کی ہمنوا پی این اے کے تھے تو اکتوبر پیپلز پارٹی کا ہوگا جو الیکشن میں عوام کے زیادہ اعتماد کے ساتھ اقتدار میں واپس آئے گی۔ حالات میں مزید تلخی اس وقت آئی جب بھٹو نے ملتان کا دورہ کیا۔ وہاں کی انتظامیہ نے بڑا اجتماع ہونے سے روکنے کی ناکام کوشش کی جس کے بعد ہنگامہ آرائی اور بدامنی پھیل گئی۔ اس کے علاوہ بھٹو نے فوجی بغاوت کے بعد ضیاء الحق سے ملاقات کے موقع پر ان سے سخت ترش روی کا بھی مظاہرہ کیا۔ بھٹو کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو نے بھی ایسی ہی بدتمیزی کا اظہار کیا۔ (تاثیر 1979:5-173)۔ بھٹو کو دوبارہ 3 ستمبر کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مارچ 1974ء میں اپنے ایک سیاسی مخالف نواب محمد قصوری کو قتل کرانے کا الزام لگایا گیا۔ بھٹو کے حکم پر ہونے والے واقعے میں

پیپلز پارٹی کے سابق سرگرم رہنما احمد رضا قصوری کی جگہ ان کے والد نواب محمد خان قصوری قتل کر دیئے گئے۔(خان 2008ء:119)۔اس مقدمے کے بعد ضیاء الحق نے بھی بھٹو کو قاتل اور بدعنوان ولن کہنا شروع کر دیا۔(ایضاً)۔

البتہ صورتحال میں اس وقت ڈرامائی موڑ آ گیا جب 10 روز بعد لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج جسٹس صمدانی نے مبہم اور نامکمل شواہد کی بنا پر بھٹو کے خلاف مقدمہ خارج کرنے کا حکم دیا۔ 3 روز بعد جنرل ضیاء نے ایک بار بھٹو کو انہی الزامات کے تحت گرفتار کر لیا لیکن اس بار مارشل لاء کے تحت گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ جب پیپلز پارٹی نے ملک گیر مظاہرے شروع کر دیے تو ضیا نے خراب صورتحال کی بنا پر مجوزہ انتخابات ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔اس کے بعد جو''عدالتی عمل'' شروع کیا گیا وہ بھٹو کو قصوروار قرار دینے کا درپے نظر آیا۔ستم ظریفی دیکھیں کہ بھٹو کی بنائی فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود نے عدالت میں گواہی دی کہ بھٹو نے قصوری کے قتل کا حکم دیا تھا اور حکم کی تعمیل کے لئے ایف ایس ایف کے 4 اہلکاروں کو ذمہ داری سونپی گئی۔ان چاروں اہلکاروں نے اقبال جرم کر لیا تاہم ایک اہلکار بعدازاں منحرف ہو گیا اور کہا کہ اس نے پہلے تشدد کی وجہ سے اقبال کیا تھا۔ وکلاء دفاع نے جو جوابی شواہد اور دلائل دیے وہ عدالت نے نظرانداز کر دیے حتیٰ کہ جس فیصلے میں بھٹو کو ماسٹر مائنڈ قرار دیا گیا اس میں بھی یہ دلائل شامل نہ کئے گئے۔

لاہور ہائی کورٹ کے 5 رکنی فل بنچ نے ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کے جرم میں سزائے موت کا حکم سنایا۔اس کے بعد سپریم کورٹ میں اپیل کی گئی تو 7 رکنی لارجر بنچ میں سے 4 ججوں نے سزائے موت کا فیصلہ برقرار رکھا جبکہ 3 ججوں نے اختلاف کیا۔ان چاروں جج صاحبان کا تعلق پنجاب سے تھا جبکہ باقی تینوں جج غیر پنجابی تھے۔ چنانچہ بھٹو کو 4 اپریل 1979ء کو سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔اس اقدام پر ملک میں بڑے پیمانے پر کوئی ردعمل یا احتجاج نظر نہیں آیا۔ پاکستان کے جمہوری طور پر منتخب پہلے وزیراعظم کو پھانسی دینے پر ردعمل سامنے نہ آنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مارشل لاحکومت نے پیپلز پارٹی کو کامیابی کے ساتھ دبا دیا جبکہ ضمنی وجہ یہ تھی کہ بھٹو کے قریبی ساتھی پارٹی چھوڑ گئے تھے یا مایوس تھے یا انہیں نکال باہر کر دیا گیا تھا۔

بھٹو کا زوال آخر کیونکر ہوا؟۔اس بارے میں مختلف سازشی نظریات گردش کرتے رہے

ہیں۔ بھٹو نے 1979ء میں جیل میں قید کے دوران ایک کتاب ''اگر میں قتل کر دیا گیا'' (If I am Assassinated) لکھی جو چھپا کر باہر لائی گئی اور ان کی پھانسی کے بعد بھارت سے شائع کی گئی۔ اس کتاب میں دعویٰ کیا گیا کہ جنرل ضیاءالحق نے شروع شروع میں نیوز ویک، بی بی سی اور بھارتی ایجنسی یو پی آئی سے انٹرویو میں تسلیم کیا کہ وزیر اعظم نے اپوزیشن رہنماؤں کے ساتھ کسی معاہدے پر پہنچنے کی مخلصانہ کوششیں نہیں کیں: حقیقت یہ ہے کہ مسٹر بھٹو نے جو بات مانی کوئی بھی سیاستدان اس سے زیادہ نہیں مان سکتا تھا۔ (بھٹو 1979ء:4)۔ بھٹو نے مارشل لاء حکومت کی طرف سے 25 جولائی 1978ء کو شائع شدہ وائٹ پیپر میں اس الزام کو مسترد کر دیا کہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرات میں ڈیڈ لاک کے باعث ملک میں امن وامان کی سنگین صورتحال پیدا ہوگئی جس سے پاکستان کی سلامتی اور یکجہتی کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس بھٹو نے دعویٰ کیا کہ حکومت اور پی این اے کے درمیان 4 جولائی کو معاہدہ طے پا گیا تھا اور صرف چند معمولی نکات اگلے روز طے ہونا باقی تھے جب فوج نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ (ایضاً)۔ کتاب میں انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ فوج کچھ عرصے سے بغاوت کی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ نہ صرف پاکستان بلکہ غیر ملکی سرمایہ دار طبقہ بھی پی این اے کی تحریک میں پیسہ لگا رہا تھا۔ اور بیرونی ذرائع سے آنے والا فنڈ حجم میں بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے امریکہ کے بھی ملوث ہونے کا بالواسطہ ذکر کیا کیونکہ انہوں نے ایٹمی پراسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے میں امریکی مخالفت کو مسترد کر دیا تھا۔

درحقیقت پی این اے کی تحریک کے عروج کے دوران پیپلز پارٹی نے یہ واویلا شروع کر دیا تھا کہ امریکہ اپوزیشن کی پشت پناہی کر رہا ہے اور ڈالروں سے بھری بوریاں شرپسندوں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ (راشد 2010ء:7-176)۔ جس نے امریکی وزیر خارجہ سائرس وینس کو تردیدی خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ 29 اپریل 1977ء کو تحریر کردہ خط میں انہوں نے الزام یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ '' ہم نے پاکستان میں کسی تحریک، جماعت یا افراد کو کسی بھی قسم کی مالی امداد فراہم نہیں کی''۔ (جین 2007ء اے:97)۔ بہرحال بھٹو کے مطابق ان کے خلاف سازش کرنے میں سب سے بڑا کردار جماعت اسلامی کے لیڈر میاں طفیل محمد (بعد میں امیر بھی بنے) کا تھا جن کے جنرل ضیاء سے قریبی تعلقات تھے۔ (بھٹو 1979:72-169)۔ بھٹو کی کتاب کے باقی ماندہ حصے میں ان کی پاکستان کو خود

کفیل اور عسکری لحاظ سے طاقتور بنانے کی کوششوں اور عزم کی تفصیل دی گئی ہے۔

جو دلائل دیے جاتے ہیں ان میں یہ سقم پایا جاتا ہے کہ بھٹو یہ وضاحت نہیں کرتے کہ اگر کچھ عرصے کیلئے ان سے چھٹکارا پانے کی سازش موجود تھی تو فوج نے پہلے انہیں رہا کیوں کیا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی وضاحت نہیں کرتے کہ آخر فوج بیرونی ہاتھوں کی آلہ کار کیوں ہو گئی تا کہ انہیں ایٹمی پلانٹ حاصل کرنے کی کوششوں کی سزا دی جا سکے۔ اس بات کے غالب امکانات موجود ہیں کہ بھٹو سے نجات پانے کی سازش اس وقت کی گئی جب انہوں نے ملک گیر دورے شروع کر کے بڑی تعداد میں عوام کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

باب 11

جنرل ضیاء کی اسلام کا قلعہ بنانے کی کوشش

پاکستانی فوج ساڑھے 6 سال کے جان گسل سویلین اقتدار کے بعد سیاسی میدان میں داخل ہوئی۔ یہ سویلین اقتدار جمہوری، مقبول، مطلق العنان اور سیاسی انتقام سے بھرپور تھا۔ جب بھٹو اقتدار میں تھے تو صرف ان کی اپنی ذات پورے سیاسی منظرنامے پر حاوی تھی۔ لیکن پاکستان میں بھارت سے متعلق سیاست کو مرکزی حیثیت بدستور حاصل رہی۔ اصل میں بھٹو نے اس نظریے کو تقویت دینے کیلئے کئی اقدامات کئے کہ مشرقی سرحدوں پر کئی گنا بڑے دشمن کے خلاف مضبوط دفاع پاکستان کی بقا کیلئے ضروری ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سوچ مشرقی پاکستان الگ ہونے کے تناظر میں پروان چڑھی تھی۔ چنانچہ اسٹیبلشمنٹ کو بھارت کے مکروہ عزائم اجاگر کرنے میں نہایت آسانی پیش آئی۔ بہر حال بھٹو جب تک حکومت میں رہے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی فوجی تصادم نہ ہوا۔ اس کے برعکس شملہ معاہدے اور جنگی قیدیوں کی واپسی سے کشیدگی میں کمی میں مدد ملی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی دونوں داخلی ملکی حالات کی وجہ سے اندرونی محاذ پر توجہ دینے پر مجبور تھے۔

جنرل ضیاء کو ورثے میں انتہائی آتش فشاں پاکستان ملا اور ان کا فوری مقصد سیاسی عمل پر گرفت قائم کرنا تھا۔ انہوں نے ایک منتخب وزیراعظم کا تختہ الٹا جو اگرچہ مارچ 1977ء کے بعد پی این اے کی تحریک سے لرزہ براندام تھا لیکن اس کی مقبولیت میں اس وقت ڈرامائی انداز میں اضافہ ہو گیا جب اسے رہا کیا گیا اور اس نے ملک گیر جلسے شروع کر دیے۔ ان حالات میں پاکستان ایک انتہائی یک قطبی معاشرہ بن گیا اور جنرل ضیاء کو ایسے ہتھکنڈے اور حکمت عملی اپنانا تھی جس سے فوجی

حکومت کا تسلسل جاری رہتا۔اس کے بعد پاکستان کے کسی بھی حکمران سے زیادہ انہوں نے دو قومی نظریے کو اجاگر کرنے کی مہم شروع کی جس کا مطلب صرف پاکستان کی بھارت سے شناخت الگ ہونا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے دائیں بازو کے دھڑے میں پرعزم نظریاتی مجاہد بھی نظر آنا چاہتے تھے۔ان مقاصد کے حصول کے لئے ضیاء نے فوج کی ایک ایسی فوج کے طور پر نظریاتی اور ثقافتی تربیت کا آغاز کیا جو ایک اسلامی فوج ہو اور ایسے ہتھیاروں سے لیس ہو جو اسے بھارت پر حملہ کرنے اور اس کے خلاف دفاع کے قابل بنا دے۔ یہ اقدامات اسی دوران کئے گئے جبکہ جنرل ضیاء قوم میں تبدیلی اور ریاست کی تعمیر کے خواہاں تھے۔

فوری سیاسی چیلنج

اپنے کام کا آغاز جنرل ضیاء نے آئین کو ختم کرنے کی بجائے اسے معطل کرنے سے کیا۔ انہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد 90 روز کے اندر صاف اور شفاف انتخابات کرانے اور حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کا اعلان کیا۔ پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ چونکہ سیاسی جماعتوں پر پابندی نہیں لگائی گئی تھی اس لئے انہوں نے الیکشن میں حصہ لینے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن ضیاء الحق نے ارادہ بدلتے ہوئے یہ بہانہ شروع کر دیا کہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں ہونے والے بے شمار بے ضابطگیاں سامنے آئی ہیں۔اس مؤقف سے پی این اے بالخصوص اصغر خان نے اتفاق کیا۔ بھٹو کی عوامی حمایت میں ڈرامائی اضافے کے بعد پی این اے کی قیادت کو یقین ہو گیا کہ صاف اور شفاف انتخابات سے ان کی دال نہیں گلے گی چنانچہ انہوں نے یک زبان ہو کر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ نئے انتخابات سے قبل ایسے عناصر کا راستہ روکا جائے جو اختیارات کے غلط استعمال میں ملوث تھے اور ان کا احتساب کیا جائے۔ (باکسٹر 31:1991)۔

یکم مارچ 1978ء کو حکومت نے ایک قدم اور اٹھاتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔البتہ سیاسی پارٹیوں پر پابندی نہ لگائی گئی۔پیپلز پارٹی کے حامی کئی اخبارات بند کر دیے گئے۔ ایسے صحافی جنہوں نے فوج حکومت پر کڑی تنقید کی انہیں سخت سزائیں دی گئیں اور کوڑے بھی لگائے گئے۔ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے خلاف ظالمانہ انداز میں کارروائیاں کی گئی۔

(بھٹو2010ء:2-200)۔ انہی حالات میں حکومت نے اعلان کر دیا کہ عام انتخابات 1979ء میں ہوں گے۔ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سمیت پی این اے کی متعدد جماعتوں کو کابینہ میں شمولیت کی اجازت دے دی گئی۔

جس روز ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ اس روز ان کے صاحبزادے میر مرتضٰی بھٹو نے بی بی سی سے انٹرویو میں اپنے والد کی موت کا انتقام لینے کا عہد کیا۔ انہوں نے ''الذوالفقار'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس کے ہمسائیہ ملک افغانستان میں اڈے قائم کیے گئے۔ 1981ء میں الذوالفقار کے عسکریت پسندوں نے پی آئی اے کا ایک طیارہ اغواء کرلیا اور طیارہ کابل پہنچنے سے پہلے اس میں سوار فوجی افسر میجر شاہد رحیم کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد طیارے کو شام جانے کی اجازت دی گئی جہاں اس نے حکام کی منظوری سے دبئی ایئر پورٹ پر لینڈنگ کر لی۔ یہ ڈرامہ اس وقت اختتام کو پہنچا جب 15 مارچ کو جنرل ضیاء نے جیلوں میں قید پیپلز پارٹی کے 54 کارکن رہا کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی جس کے بعد مغوی طیارہ پاکستان واپس آ گیا۔

اس تنظیم کی طرف سے ضیاء الحق کے قریبی معتمدین اور مارشل لاء لگانے کے منصوبے میں ملوث افراد پر حملے سمیت دہشت گردی کی کئی سرگرمیاں کی گئیں۔ جنرل ضیا پر بھی حملے کی کوششیں کی گئیں اور فروری 1982ء کو روسی ساختہ طیارے SAM7 پر بھی فائرنگ کی گئی جس میں جنرل ضیاء الحق سوار تھے۔ بھارتی خفیہ ادارے ''را'' پر بھی جنرل ضیاء کو ہٹانے کے ایک منصوبے (جولندن میں بنا) میں ملوث ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ رنگ لیڈر سمیت دیگر ایجنٹوں کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ ''را'' کا بھجوایا اسلحہ وصول کرنے لاہور آئے تھے۔ پاکستان نے الزام لگایا کہ ''الذوالفقار'' نے بھارت، لیبیا اور افغانستان میں تربیتی کیمپ قائم کر رکھے تھے اور مبینہ طور پر سوویت یونین اور شام ''الذوالفقار'' کی معاونت بھی کر رہے تھے۔

البتہ ''الذوالفقار'' پاکستانی معاشرے میں مقبول بنیاد حاصل کرنے میں ناکام رہی اور ایسی مقبول مزاحمتی تحریک بھی شروع نہ کرسکی جس سے معاشرے میں بڑے پیمانے پر اتھل پتھل ہو سکے۔ اس کے علاوہ 2 صوبوں سرحد اور بلوچستان جن کے مرکز سے ہمیشہ تعلقات خراب رہے وہاں کی قیادت نے ضیاء الحق کا خیر مقدم کیا۔ کیونکہ بھٹو نے جہاں صوبائی قوم پرستوں کو جیل میں ڈالا وہاں ضیاء الحق نے انہیں رہا کر دیا۔ ستمبر 1979ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر مقامی حکومتوں کے

انتخابات کرائے گئے۔ یہ ضیاء الحق کے لئے ایک اصول کا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا جو سمجھتے تھے کہ سیاسی جماعتیں اسلام کے متفقہ سیاسی نظام کے برعکس قوم کو تقسیم کرتی ہیں۔ (ایضاً:273)۔ بہر حال اس کے باوجود پیپلز پارٹی کے حمایت یافتہ کئی امیدوار کامیاب ہو گئے۔ اس کے ردعمل میں حکومت نے 17 اور 20 نومبر 1979ء کو طے پانے والے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس بار بھی امن وامان کی صورتحال کو جواز بنایا گیا۔ علاوہ ازیں سیاسی جماعتوں پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

بیگم نصرت بھٹو نے مارشل لاء کے نفاذ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔ عدالتی بنچ نے فیصلہ دیا کہ مارشل لاء حکومت ایسے تمام اقدامات کرے جو نظریہ ضرورت کے قانون کی حدود میں آتے ہوں، حتیٰ کہ آئین میں ترمیم بھی کی جا سکتی ہے۔ جہاں ضیاالحق کے مخالفین نے عدالتی فیصلے کو مارشل لاء حکومت کی حمایت کے مترادف سمجھا وہاں خود حکومت اس بات پر یہ جز بز تھی کہ کون سا اقدام نظریہ ضروت کے قانون کے اندر آتا ہے اور کون سا متصادم ہے۔ اس تناظر میں جنرل ضیاالحق نے عبوری آئینی حکمنامہ (پی سی او) 1980ء جاری کر دیا۔ جس کے تحت مارشل لاء حکومت کے تمام اقدامات عدالتی دائرہ اختیار سے باہر ہوں گے۔ مستقبل میں جو قوانین اور آرڈیننس مارشل لاء حکومت نے تیار کئے ان پر عدالتوں نے نظر ثانی نہیں کی۔ یہ اقدام بلوچستان ہائیکورٹ نے غیر آئینی قرار دے دیا لیکن حکومت نے 1981ء میں ایک اور عبوری حکمنامہ جاری کر دیا جس کے تحت سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان کا پی سی او کے تحت حلف اُٹھانا ضروری قرار دے دیا گیا۔ اس پر چند ججوں نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا لیکن دیگر نے نئے قانون کو قبول کر لیا۔ اس حکومتی اقدام کا مجموعی حاصل یہ رہا کہ عدالتی نظام مکمل طور پر مارشل لا نظام کے تابع ہو گیا۔

اگرچہ سیاسی جماعتوں پر پہلے ہی پابندی لگائی جا چکی تھی لیکن پیپلز پارٹی اور کئی چھوٹی جماعتوں نے تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کے نام سے فروری 1981ء میں ایک محاذ قائم کر لیا۔ اس تحریک کا بڑا مقصد ملک سے مارشل لا کا خاتمہ کرنا اور معطل شدہ 1973 کے آئین کے تحت عام انتخابات کا انعقاد کرانا تھا۔ ان دنوں ایم آر ڈی کا زیادہ تر زور سندھ میں تھا لیکن پنجاب میں بھی کسی حد تک سرگرمیاں پائی گئیں۔ حکومت نے بھی پوری طاقت سے جواب دیا۔ مزدور یونین پر پابندی لگا کر محنت کش رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا، بالخصوص ''الذوالفقار'' کے مشتبہ کارکنوں

اور ہمدردوں کو پورے ملک میں نشانہ بنایا گیا۔ تشدد کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ چنانچہ ریاستی جبر کے باعث سندھ سمیت ہر جگہ پر اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ اس دوران پولیس اور فوج کے چھاپوں میں 300 سندھی ہلاک ہو گئے۔ (کاردار 1992ء: 313۔ خان 1983ء: 70-168)۔ سندھ کے جو علاقے نسبتاً پرسکون رہے وہ مہاجروں کے مضبوط مراکز کراچی اور حیدرآباد تھے۔ ایم آر ڈی کو کچلنے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے 1984ء میں پاکستان کے اسلامی تشخص پر ایک ریفرنڈم کا اہتمام کیا۔ عوام سے ریفرنڈم میں یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا آپ قوانین کو اسلامی بنانے کے لئے حکومتی اقدامات کی حمایت کرتے ہیں۔ حکومت نے دعویٰ کیا کہ ریفرنڈم میں ٹرن آؤٹ 64 فیصد رہا جس میں 96 فیصد افراد نے جنرل ضیاء کی اصلاحات کے حق میں ووٹ دیا۔ البتہ برطانوی نیوز ایجنسی اور اخبار مانچسٹر گارڈین جیسے میڈیا اداروں نے ٹرن آؤٹ کی شرح صرف 10 فیصد بتائی۔ (بھٹو 2008ء اے: 270)۔ اس کے بعد جنوری 1985ء میں ضیاء الحق نے غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی میں انتخابی اجتماعات کیلئے برادری، نسلی اور لسانی اختلافات بنیاد بن گئے۔ (مہدی 1988ء: 31)۔ مجلس شوریٰ کیلئے جو ارکان منتخب ہوئے ان میں سے ایک سندھی لیڈر محمد خان جونیجو کو جنرل ضیاء نے وزیر اعظم نامزد کر دیا۔

جونیجو کو اقتدار سونپنے کے بعد جنرل ضیاء نے مارشل لاء اٹھا لیا اور پارلیمنٹ سے کہا کہ وہ 1977ء کی بغاوت سمیت ان کے گزشتہ 8 برسوں کے اقدامات کی توثیق کرے۔ اس سے بڑھ کر اہم یہ تھا کہ انہوں نے آٹھویں ترمیم سمیت کئی ترامیم کے ذریعے خود کو سیاسی نظام پر بالا دست بنا لیا۔ آئین کے آرٹیکل 58(2)B کے تحت وہ قومی اسمبلی کو برخواست کر سکتے تھے تاہم سینٹ تحلیل کرنے کا انہیں اختیار نہیں تھا۔ ''ان کے بقول اگر ایسی صورتحال پیدا ہو جائے جس میں حکومت آئین کے مطابق کام نہ کر سکے تو نئے انتخابات کیلئے رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے''۔

ایم کیو ایم اور آئی ایس آئی

ایسی سیاسی پیشرفت کے باوجود جنرل ضیاء کو سندھ کی آتش فشاں صورتحال پر تشویش بدستور جاری رہی۔ اس صوبے میں مقامی سندھیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں کے درمیان 1970 کے عشرے سے اختلافات اُبھرنا شروع ہو گئے اور دونوں طرف سے مسلح افراد کی متعدد

جھڑپیں بھی ہوئی تھیں۔ پاکستان کی آزادی کے فوراً بعد اگر چہ سندھ میں علیحدگی پسندی کے جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن ان کی شدت محدود تھی۔ سندھی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی زیر قیادت پیپلز پارٹی کے عروج سے اس شدت میں مزید کمی آ گئی لیکن اس سوچ نے اس وقت پھر سر اٹھایا جب بھٹو کا تختہ الٹ کر انہیں پھانسی چڑھا دیا گیا۔ سندھیوں میں بنیاد پرستی جڑ پکڑنے پر خدشات کا شکار مہاجروں نے بھی خود کو نسلی بنیاد پر منظم کرنا شروع کر دیا۔ یوں 18 مارچ 1984ء کو الطاف حسین نے مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کی بنیاد رکھی۔ وہ کوئی عہدہ رکھے بغیر پارٹی کے سپریم لیڈر ہیں۔ اب یہ بات کھلا راز ہے کہ ایم کیو ایم دراصل آئی ایس آئی کی تخلیق تھی اور جنرل ضیاء اس کے ماسٹر مائنڈ تھے۔ اس بات کی تصدیق سابق آرمی چیف اور جنرل ضیاء کی طیارے کے حادثے میں اچانک موت پر فوج کے سربراہ بننے والے جنرل اسلم بیگ نے کی۔ (حسن: 2007: 7) مہاجروں کو شہ دی گئی کہ وہ اپنی الگ قومیت کا اعلان کریں۔ اس طرح سندھ کی لسانی بنیادوں پر تقسیم کے امکانات واضح ہو گئے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ جنرل ضیاء نے سندھی علیحدگی پسندوں کے سرخیل جی ایم سید کی اشک شوئی کی تھی جن سے پیپلز پارٹی نے 1972 میں قوم پرستی کا علم چھین لیا۔ یوں ایم کیو ایم کی حمایت اور سندھی سیاسی دھڑوں میں تقسیم سے سندھی علیحدگی پسند سوچ کو دھچکا لگا اور اس کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی سے متعلقہ عسکریت پسندی (مرادالذوالفقار وغیرہ) بھی کمزور ہو گئی۔ بالخصوص مہاجروں کے اکثریتی آبادی والے شہروں کراچی اور حیدرآباد میں۔ بہر حال ضیاء دور کی سیاسی میدان میں ایسی حکمت عملی فوجی اقتدار کو دوام بخشنے کے مجموعی ایجنڈے کا محض ایک حصہ تھی۔

عسکری ریاست کی اسلامائزیشن

ضیاء الحق تبدیلی کا ایک ایسا وسیع النظر پروگرام نافذ کرنے میں بھی پرعزم تھے جس سے معاشرے کا ہر طبقہ متاثر ہو۔ ان کی سرپرستی میں ایک عسکری ریاست...... ایسا طرز حکومت جس میں فرضی بیرونی اور اندرونی خطرات کے تناظر میں شناخت متعارف کرائی جاتی ہے...... نے نا قابل تغیر اسلامی خدوخال اختیار کر لئے۔ سٹیفن کوہن نے دعویٰ کیا ہے کہ پاکستانی فوج شروع سے ہی خود کو اسلامی فوج سمجھتی تھی۔ فوج کے زیر اہتمام شائع ہونے والے پیشہ ورانہ جرائد فوج کی

اسلامائزیشن کے سوال سے متعلق مواد سے بھرے ہیں اور ان سب میں یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی روایتی فوج کی جگہ اسلامی اصولوں پر مبنی انداز متعارف کرایا جائے۔ (کوہن 1992ء:37)۔ضیاء دور میں فوجی یونٹوں میں تعینات مولویوں کو ترقی دیتے ہوئے جونیئر کمیشنڈ آفیسر کا رینک دے دیا گیا۔(نائب خطیب، خطیب) جیسا کہ امریکی فوج میں فوجی مذہبی ٹیچر ہوتے ہیں، کوہن یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلح افواج کو اسلام پسندی کی طرف راغب کرنے کے نظریے کی اتنی شد و مد سے ترویج غیر ضروری تھی کیونکہ ''اسلام فطری طور پر عسکری پیشے کے تصور کی حمایت کرتا ہے''۔ (ایضاً: 139)۔کوہن کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ذاتی تشخص Self Image اعتدال پسندی سے انتہا پسندی تک متغیر امر ہے لیکن فوج نے ایک مجموعی تنظیمی ڈھانچہ اور روایات کو برقرار رکھا جو اسے نو آبادیاتی دور سے ورثے میں ملا۔کوہن نے یہ بات واضح نہیں کی کہ اسلام پسند فوج کی نشو ونما کو امریکی رضامندی حاصل تھی کیونکہ اس نے افغان جہاد کے دوران پاکستان کا بطور فرنٹ لائن سٹیٹ کردار تسلیم کیا تھا۔

بہر حال ضیاء الحق دور میں اس کی ترویج اس سے زیادہ جوش و جذبے سے کی گئی جتنا کہ سٹیفن کوہن نے دعویٰ کیا ہے۔اس عمل کا ان بدلتے تناظر کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیئے جن میں جنرل ضیاء اقتدار میں آئے تھے۔انگریز دور کی سینڈھرسٹ اکیڈمی کے تربیت یافتہ افسروں کی پرانی کھیپ کی جگہ بتدریج مقامی پاکستانی افسروں کی کلاس لے رہی تھی۔یہ عمل اگرچہ کچھ عرصہ قبل دھیرے دھیرے شرع ہو چکا تھا لیکن 48-1947، 1965 اور 1971 کی بھارت کے ساتھ جنگوں کے بعد کے حالات میں اس میں توسیع پسندانہ تیزی واقع ہوگئی۔نئے افسرں کا تعلق مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس سے تھا اور اب ان کا تعلق خالصتاً شمالی پنجاب اور صوبہ سرحد سے باقی نہیں رہا تھا۔ آفیسر میسوں میں پر تعیش طرز زندگی جس میں موسیقی، رقص و سرود اور الکوحل جیسا سماجی ماحول شامل تھا کو پہلے ہی بھٹو دور میں جھٹکا لگ چکا تھا جب انہوں نے فوجی میسوں میں شراب کا استعمال ممنوع قرار دیا تھا۔فوج کو اسلام پسند سمت پر گامزن کرنے کیلئے ایک مہمیز کی ضرورت تھی۔یہ کام بھلا جنرل ضیاء سے بہتر اور کون کرسکتا تھا۔

ضیاء الحق کی طرف سے پاکستانی ریاست اور معاشرے کو اسلام پسند خطوط پر استوار کرنے کا مجموعی عمل ایک ایسی عسکری ریاست کے قیام کا شاخسانہ تھا جس میں بجا طور پر فوج کو ایک

نظریاتی ادارے کا مقام حاصل ہو۔ ایسے مخصوص نظریے کو سماجی تشکیل کے بڑے پیمانے پر عمل کے بغیر تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم جیسا کہ کچھ مصنفین نے کہا ہے کہ ضیاء کے معاملے میں یہ الزام اس دانشمندانہ تخمینے سے مسخ کیا گیا کہ دراصل مثالی طور پر کیا واقع ہونا چاہیئے کی جگہ کیا ممکن ہے۔ اپنے بنیاد پرستانہ رجحان کے برعکس ضیاء الحق ایک عملی اور ماڈرن انسان تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ثقافتی، لسانی اور فرقہ وارانہ طور پر متنوع اور پیچیدہ ملک ہے۔ اس لئے بڑے پیمانے پر ایرانی یا سعودی ماڈل کا پاکستان میں نفاذ ممکن نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسی عسکری ریاست کے قیام کی ٹھان لی جو اسلام کے پھیلاؤ کے سنہری دور کی تصویر ہو اور جس میں اسلام کے ابتدائی دور کا منصفانہ سماجی نظام رائج ہو۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں تمام حکومتوں نے ایک ایسے مثالی طرز حکومت کا عزم کیا جو انصاف، ترقی کے اسلامی نظریات یا زیادہ بنیاد پرست اقسام پر مبنی ہو۔ یہ نعرہ تمام حکومتوں کا سرکاری نعرہ رہا۔ البتہ ماضی کی کسی حکومت نے ایسی قومی شناخت کے احیا کے ضروری اور کافی اقدامات نہیں کئے جو اسلامی عسکری ریاست کے تصور کی جامع عکاسی کرتی ہو۔ اس کی بجائے ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے سے پہلے مضحکہ خیز اور ایڈہاک اقدامات کئے گئے۔

اب تک جدت پسند اشرافیہ جمہوریت اور سیاسی اسلام میں کسی ایک کا انتخاب کرنے میں گو مگو کا شکار رہی تھی۔ یہ تضاد اب ضیاء الحق کے یکسو ذہن سے بالکل غائب تھا جو اینٹی لبرل، جمہوریت مخالف، اقلیت مخالف اور خواتین مخالف ایجنڈے پر کاربند تھا۔ وہ ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں انتظامیہ، عدلیہ، بینکاری، تجارت، تعلیم، زراعت، صنعت اور خارجہ امور سمیت زندگی کے تمام شعبے اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ (نعمان 1988: 141)۔ اسی تناظر میں پاکستان میں ایک اسلام پسند عسکری ریاست کی بالادستی یقینی بنانے کے لئے متعدد ''اصلاحات'' کا عمل شروع کیا گیا۔

جنرل یحییٰ خان نے بطور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جو لیگل فریم ورک آرڈر جاری کیا تھا اس میں انہوں نے ''نظریہ پاکستان'' کا ذکر کیا۔ بھٹو دور میں اسلام پسندی کا پھیلاؤ شروع ہوا لیکن یہ صرف ضیا الحق تھے جنہوں نے مناسب طریقے سے یہ عمل مکمل کیا۔ انہوں نے اگرچہ کئی علما سے مشاورت کی لیکن جماعت اسلامی کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی کا نظریہ اس کامل اور بے داغ

اسلامی طرز حکومت پر استوار تھا جس کی بنیاد حضور اکرمؐ نے رکھی اور ان کے خلفائے راشدین بالخصوص پہلے 2 خلفاء حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے اسے آگے بڑھایا۔ اس دور کے قوانین اور ثقافتی روایات میں مردوں اور خواتین میں واضح تفریق کی گئی اور جزیہ ادا کرنے والے غیر مسلموں کو نسل در نسل جزیہ کی ادائیگی کا پابند بنایا گیا۔ (مودودی 1979ء اے: 1979ء بی: 1980ء)، اس کے علاوہ مولانا مودودی نے بنیاد پرست کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' بھی لکھی جس میں انہوں نے اسلام کے ابتدائی دور کے ماہرین فقہ کے بیان کردہ نظریات کی روشنی میں دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں تقسیم کیا۔ اس نظریے کے مطابق اسلامی ممالک اور غیر مسلموں میں امن صرف عارضی طور پر قائم ہو سکتا ہے کیونکہ غیر مسلم دنیا مسلسل حالت جنگ میں ہے۔ اسلام اور اسلامی کمیونٹی کو لاحق خطرات میں جہاد کو جائز قرار دینے کی پر پیچ دلیلیں دینے کے ساتھ انہوں نے ایسی صورت میں جہاد کو جائز قرار دیا ہے جب غیر مسلم اسلام قبول نہ کریں۔ وہ غلاموں اور کنیزوں کے نظام میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ (موَدودی 1981)۔

مولانا مودودی کے نظریات مصر کی اخوان المسلمون کے رہنما سید قطب کے خیالات سے انتہائی ملتے جلتے ہیں جبکہ شیعہ مکتبہ فکر کے رہنما امام خمینی کی طے کردہ تفصیل سے محض دیکھنے کی حد تک مختلف ہیں۔ موَدودی، سید قطب اور خمینی کے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں خیالات میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ فقہی شریعت میں امن کی تعریف اقوام متحدہ کے چارٹر میں ممالک کی علاقائی سالمیت اور خود مختاری کے احترام پر مبنی تعریف سے مختلف ہے۔ (1945ء)۔

جہاں تک جنرل ضیاء کے ذاتی عقیدے اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کا تعلق تھا تو ان کے بارے میں خیال ہے کہ وہ بنیاد پرست دیو بند مکتبہ فکر کے پیروکار تھے۔ جو لوگ انہیں نجی طور پر جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ جنرل ضیاء مختلف مزاروں بالخصوص داتا گنج بخشؒ (لاہور) کے مزار پر گھنٹوں قیام کرتے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب ہے بظاہر وہ وسیع الذہن انسان تھے جنہوں نے بنیاد پرست اسلام کو تصوف والے بریلوی مکتبہ فکر سے باہم ملا دیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ کریں کہ جنرل ضیاء الحق کو بھارتی سپر سٹار شترو گھن سنہا کو اپنے گھر مدعو کرنے اور اپنی ذہنی طور پر معذور بیٹی زین ضیاء سے ملاقات کرانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ جو بھارتی فلمسٹارز بالخصوص شترو گھن سنہار کی زبردست مداح تھی۔ شترو گھن ضیاء خاندان کے فیملی دوست بن گئے اور

بار بار پاکستان آتے جاتے۔ یہ تعلق جنرل ضیاء کی موت کے بعد بھی جاری رہا۔ (دی ٹریبون: 4 اگست 2005)۔

قانونی اصلاحات

اس سے پہلے ضیاء الحق کئی جرائم کی قرآن میں دی گئی سزاؤں کے نفاذ کا اعلان کر چکے تھے۔ طویل تیاریوں اور اسلامی سکالروں سے مشاورت کے بعد بالآخر حکومت نے 1979ء میں حدود آرڈیننس کا اجراء کر دیا۔ جس میں زنا کی سزا سنگسار کرنا، ایک سو کوڑے، زنا کے جھوٹے الزام کی سزا 80 کوڑے، شراب نوشی کی سزا 80 کوڑے، چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا، راہزنی کی سزا ہاتھ اور پاؤں کاٹنا، ڈکیتی قتل کی سزا پھانسی یا سر قلم کرنا مقرر کی گئی۔ (منیر 1980ء: 32-124)۔

1980ء میں حدود مقدمات کی سماعت کے لئے وفاقی شریعت کورٹ قائم کی گئی۔ اس عدالت کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ کے 3 مسلمان ججوں پر مشتمل شریعت اپیلٹ بنچ بھی تشکیل دیا گیا۔ (عثمانی 1990ء: 71-68)۔ اگرچہ کافی لوگوں کے خلاف حدود آرڈیننس کے تحت مقدمات چلا کر ہاتھ کاٹنے اور سنگسار کرنے کی سزائیں سنائیں گئیں تاہم اپیلٹ بنچ میں سزاؤں کو قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ بین الاقوامی برادری کے دباؤ اور تعلیم یافتہ طبقوں پر مشتمل این جی اوز کے احتجاج نے اعلیٰ عدلیہ کا ذہن تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری طرف شروع شروع میں کئی مجرموں کو ہجوم کے سامنے سر عام کوڑے مارے گئے۔ تاہم بعد ازاں یہ کام عوامی مقامات کی بجائے جیلوں کے اندر کیا گیا۔ البتہ فوجی حکومت خواتین اور غیر مسلموں سے امتیازی سلوک کو ادارہ جاتی شکل دینے پر ڈٹی رہی تاکہ ایک خالص اسلامی قوم وجود میں آ سکے۔

خواتین

1980ء میں حکومت کی طرف سے تمام سرکاری دفاتر کو ایک سرکلر جاری کیا گیا جن میں خواتین ملازمین کیلئے اسلامی طرز لباس پر عملدرآمد یقینی بنانے کی ہدایت کی گئی۔ خواتین کیلئے چادر اوڑھنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ فحاشی اور عریانی کی روک تھام کی مہم چلانے کا بھی اعلان کیا گیا۔ تاہم یہ دراصل خواتین کی کھلی آزادی اور ان کے مساوی حقوق کے خلاف مہم بن گئی۔ خواتین پر پابندیوں کو جائز قرار دینے کیلئے سرکاری ٹی وی پر ممتاز شعلہ بیان خواتین سکالروں کو بلایا گیا۔ اس

کے علاوہ حدود آرڈیننس اور شرعی عدالتوں سے اس کی تشریحات کے باعث خواتین کے حقوق اور ان کی قانونی حیثیت پر زبردست زد پڑی۔ مثال کے طور پر خاتون سے زبردستی زیادتی کا قرآن میں ذکر نہیں لیکن مسلمان فقہا نے اسے زنا بالجبر قرار دیا۔ نوآبادیاتی دور کے اینگلو محمڈن کوڈز جو پاکستان کو ورثے میں ملے۔ میں بھی زیادتی کے مقدمات میں متاثرہ خاتون کے ثبوت کو تسلیم کیا گیا تھا جبکہ ضیاالحق کے آرڈیننس کے تحت متاثرہ خاتون سمیت کسی عورت کی گواہی قابل قبول نہیں۔ زیادتی کا شکار یا زنا کی مرتکب خواتین کو الزام ثابت کرنے کیلئے 4 مرد گواہ پیش کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ قبل ازیں رائج پاکستان پینل کوڈ (ضابطہ فوجداری) کی دفعہ 375 کے تحت 14 سال سے کم بچیوں کو یہ تحفظ دیا گیا تھا کہ ان کی مرضی کے ساتھ جنسی فعل ہونے کے باوجود اسے زیادتی قرار دیا جائے گا۔ تاہم یہ تحفظ آرڈیننس میں شامل نہیں۔ (مہدی 1994ء:123)۔ 1984 میں ایک نیا قانون شہادت منظور کیا گیا جس کے تحت عدالت میں مالیاتی لین دین کے مقدمات میں خاتون کی گواہی نصف قرار دی گئی۔ (ایضاً 2-231: وائس 1986ء)۔ ایسے اقدامات کے مضر اثرات یہ مرتب ہوئے کہ خواتین کی قانونی اور سماجی حیثیت انتہائی کمزور ہوگئی۔

حقوق نسواں کی ممتاز علمبردار عاصمہ جہانگیر اور حنا جیلانی بتاتی ہیں کہ ضیاء دور کی ایسی قانونی سازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ الٹا ان خواتین کو سخت سزائیں دی گئیں جو یہ ثابت کرنے کیلئے مرد گواہ نہ پیش کر سکیں کہ ان کے سامنے دخول کیا گیا تھا۔ (عاصمہ اور حنا جیلانی 2003ء)۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کہتی ہیں کہ ضیاء دور کے اسی قانون اور سماجی جبر کے نتیجے میں خواتین کی ان کے رشتہ داروں یا کرائے کے قاتلوں کے ذریعے ہلاکتوں کے واقعات میں زبردست اضافہ ہوا۔ (انسانی حقوق کی صورتحال 2006-1991ء)۔ جس وقت خواتین کی عمومی حالت بدترین کیفیت میں تھی اس وقت لاہور، کراچی اور اسلام آباد جیسے بڑے شہروں سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ خواتین نے مظاہرے کئے اور خواتین کے خلاف مہم بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ خواتین کی ان کوششوں کا کم ہی اثر پڑا۔ (ممتاز اینڈ شہید 1987ء)۔

غیر مسلم

1982ء میں ضیاءالحق کی طرف سے توہین مذہب قانون نافذ کرنے کے بعد پاکستان میں

غیر مسلموں کے خلاف ماحول ڈرامائی انداز میں جارحانہ ہو گیا۔ اس قانون کے تحت رسول اکرم حضرت محمدؐ یا اسلام کے خلاف توہین آمیز اقدام کو بڑا جرم قرار دیا گیا۔ اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا عمر قید مقرر ہوئی۔ 1986ء میں سزا کو مزید سخت کرتے ہوئے سزائے موت میں تبدیل کر دیا گیا۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 295 سی میں قرار دیا گیا کہ:

''حضور اکرمؐ کی شان اقدس میں زبانی، تحریری، اشاروں کنایوں، بالواسطہ یا بلا واسطہ گستاخی اور حضرت محمدؐ کے مقدس نام کی بے حرمتی کی سزا موت، عمر قید ہو گی اور جرمانہ بھی ہو گا''۔ (احمد 2005:203)۔

اس کے بعد آنے والے برسوں میں مبینہ ملزموں جن کی اکثریت عیسائیوں کی تھی کے خلاف اس قانون کا کئی بار استعمال کیا گیا۔ اس کیس کی سماعت کا طریقہ کار نہایت غیر محفوظ اور خامیوں سے بھرپور تھا۔ تقریباً ہر کیس میں ماتحت عدلیہ نے ملزموں کو سخت سزائیں سنائیں۔ البتہ پاکستان کی انسانی حقوق کی تنظیموں، دیگر این جی اوز، مغربی ممالک، اقوام متحدہ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کے احتجاج کے باعث اعلیٰ عدالتوں نے یا تو تکنیکی سقم کی بنیاد پر ملزموں کو بری کر دیا یا انہیں مغربی ملکوں میں پناہ لینے کا موقع فراہم کیا۔ بعض واقعات میں توہین مذہب یا توہین رسالت کے ملزموں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ماورائے عدالت ایسی ہلاکتوں کے مقدمات میں صرف 2 ملزموں کو سزائیں ملیں۔ چرچوں کو نذر آتش کرنے یا بموں کا نشانہ بنانے کے کئی واقعات ہو چکے ہیں اور عیسائیوں (بالخصوص خواتین) کو جبراً تبدیلی مذہب پر مجبور بھی کیا گیا۔

1974ء میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے سے پاکستان کے مذہبی تعصب کا کردار مزید نمایاں ہو گیا۔ 84-1983ء میں احمدی کمیونٹی پر مزید پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ان کو عبادتگاہوں کے لئے اسلامی نام استعمال کرنے سے روک دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں احمدیوں کی عبادتگاہوں پر حملوں میں تیزی آ گئی۔ اس کے بعد آنے والے برسوں میں احمدیوں کے خلاف قانون سازی کے نتیجے میں مہلک حملے تیز ہوئے جن میں سینکڑوں اموات واقع ہوئیں۔

1985ء میں اقلیتوں کیلئے جدا گانہ طرز انتخاب متعارف کرایا گیا۔ غیر مسلموں کیلئے عام نشستوں پر کھڑے مسلمان امیدواروں کو ووٹ ڈالنے سے روک دیا گیا۔ وہ صرف غیر مسلم امیدواروں کو منتخب کر سکتے تھے۔ اس بارے میں جنرل ضیاء نے یہ عذر تراشا کہ اس طرز انتخاب

سے غیر مسلموں کا انتخاب زیادہ بہتر طریقہ سے ہوگا اور وہ زیادہ مؤثر انداز میں قانون سازی کے عمل میں حصہ لے سکیں گے۔ کیونکہ عام نشستوں سے الیکشن لڑنے کی صورت میں ان کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ سماجی طور پر اس فیصلے کے نتیجے میں پہلے ہی تنہائی کا شکار اقلیتیں مرکزی دھارے کی مسلم قوم سے سیاسی طور پر مزید الگ ہوگئیں۔ ایک مسیحی رہنما اور 1965ء کی جنگ کے ہیرو، ائیر فورس کے گروپ کیپٹن سیسل چودھری نے اقلیت مخالف کھلے عام قانون پر ڈیفنس جرنل کے جون 2001ء کے شمارے میں '' اپنے ہیروز کی یاد'' کے عنوان سے مایوسی کا اظہار کیا۔ انہوں نے لکھا کہ!

پاکستان میں ہمارا سیاسی نظام جداگانہ طرز انتخاب کے مذہبی تقسیم کی بنیاد پر استوار ہے ...... یہ نظام ضیاء الحق نے 1985ء میں قوم پر مسلط کیا اور پورے ملک کو 5 مذاہب میں تقسیم کر دیا اور ان میں سے کسی 2 مذہبی دھڑوں میں سیاسی تعلقات کار کی اجازت نہیں دی گئی۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کی تقسیم اس طرح سے کی گئی کہ مسلمان، مسیحی، ہندو، احمدی اور دیگر مذہبی اقلیتیں صرف اپنے ہم مذہب امیدوار کو ووٹ دے سکتی تھیں یا خود الیکشن لڑ سکتی تھیں۔ اس طرز انتخاب سے معاشرتی ہم آہنگی مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ گئی اور یوں فرقہ واریت کی راہ ہموار ہو گئی...... ایسا سیاسی نظام جس کی جڑیں گہرائی تک مذہب میں پیوست ہوں اسے پنپنے کی اجازت دی جائے گی تو لازمی بات ہے کہ اس سے ہر گروپ کے درمیان تقسیم بڑھے گی اور مذہبی انتہا پسندی کو تقویت ملے گی، بلکہ مذہب کے نام پر دہشت گردی کو بھی ہوا ملے گی۔ غیر مسلم شہریوں نے جاری لوکل گورنمنٹ کے الیکشن کے پہلے 2 مرحلوں کا بائیکاٹ کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ جداگانہ طرز انتخاب نہیں چاہتے...... مجھے یہ کہنے دیں کہ بھارت میں انتہا پسند ہندو زیادہ تر عیسائی کمیونٹی کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ صورتحال زیادہ دیر نہیں چلے گی اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بھارت میں بھی معاملات میں بہتری آتی جا رہی ہے...... نہایت افسوس کے ساتھ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہاں کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت نے خود کو سیکولر ملک ثابت کیا ہے اور وہاں پاکستان کے مقابلے میں مذہبی برداشت اور مساوات کی صورتحال کہیں بہتر ہے...... اگر موجودہ حکومت نچلی سطح پر فرقہ واریت کی موجودہ صورتحال برقرار رکھتی ہے تو ہم بطور قوم تباہ ہو جائیں گے'' (امین 2001)۔

سیسل چودھری ذاتی طور پر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انہیں ائیرفورس میں ضیاء دور میں گروپ کیپٹن سے آگے محض اس لئے ترقی نہ دی گئی کیونکہ وہ عیسائی تھے۔ بحثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضیاء الحق نے اسلامائزیشن کا ایک جامع عمل متعارف کرایا۔ یہ تمام نظریاتی سوچ اور ثقافتی ماحول بنیادی طور پر مذہبی اقلیتوں کے خلاف متعصبانہ ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسلامائزیشن کے جو اقدامات متعارف کرائے ان سے ادارہ جاتی امتیازی سلوک کی اساس فراہم ہوئی۔ یہ رجحان آج تک برقرار ہے کیونکہ آنے والی کسی حکومت نے ضیاء کے بنائے قوانین تبدیل کرنے کی جرات نہیں کی۔

فرقہ وارانہ قطبیت

اس وقت تک نہ صرف تمام فرقوں کے سنی بلکہ اثنا عشری شیعہ مکتبہ فکر کے افراد کو بھی بلا تفریق مسلمان سمجھا جاتا تھا لیکن ضیاء دور میں کیئے گئے اقدامات کے نتیجے میں اس گروہ بندی کی شکستہ صورتحال ابھر کر سامنے آ گئی کیونکہ نظریاتی اعتبار سے ضیاء الحق نے دیوبندی فرقے جبکہ سیاسی طور پر جماعت اسلامی کی سرپرستی کی۔ اس سے دیگر سنی فرقوں اور اہل تشیع میں یہ تشویش پھیل گئی کہ انہیں محروم رکھا جائے گا نہ صرف شیعوں نے اعتراض کیا بلکہ دیوبندی سکالروں کی حیثیت میں اضافے پر سنی فرقوں نے بھی تحفظات کا اظہار کیا۔ معاشی میدان میں بنکاری کے شعبے میں اصلاحات متعارف کرائی گئیں چنانچہ ''سود'' کی جگہ ''منافع'' نے لے لی۔ (احمد 1999ء:231)۔ مسلمان بنک کھاتہ داروں سے لازمی زکوۃ کی کٹوتی شروع کر دی گئی۔ البتہ اہل تشیع نے ضیاء الحق کی حکومت کی سنی نواز ہیئت کے باعث زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ شروع میں حکومت نے مطالبہ مسترد کر دیا لیکن اہل تشیع نے ملک گیر احتجاجی مظاہرے شروع کر دیے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں اسلام آباد پہنچ گئے اور وفاقی دارالحکومت کو مفلوج کرنے کی دھمکی دی۔ مظاہرین اور پولیس کے درمیان کئی مقامات پر جھڑپیں ہوئیں جس سے امن وامان کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ ہمسائیہ ملک ایران میں آیت اللہ صاحبان کی زیر قیادت ملائیت پر مبنی حکومت کی موجودگی میں انہیں سنی جبر کے خلاف مزاحمت کرنے کا حوصلہ ملا۔ مظاہرین نے پولیس کا سامنا کرنا شروع کر دیا۔ مزاحمت کی اس تحریک سے حکومت اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئی اور اہل تشیع کو زکوۃ کٹوتی سے مستثنیٰ

قرار دے دیا گیا۔ ایک لحاظ سے شیعوں کے باغیانہ رویے سے حادثاتی طور پر پاکستانی ریاست میں سنی شناخت اجاگر کرنے میں مدد کی۔ پاکستان کے آئین میں شیعہ اور سنی کی کوئی تفریق نہیں اور دونوں کو سکہ بند مسلمان قرار دیا گیا ہے لیکن شیعہ مسلمانوں کی طرف سے زکوۃ کٹوتی جو دراصل غریبوں کی مدد کیلئے ہوتی ہے کے معاملے کو سیاسی رنگ دینے سے شیعہ سنی خلیج مزید وسیع ہوگئی۔

ایسی سوچ کو ایران اور سعودی عرب کی طرف سے اسلامی دنیا کی قیادت سنبھالنے کی دوڑ سے مزید تقویت ملی۔ دونوں کے پاس تیل کے باعث دولت کی ریل پیل تھی چنانچہ انہوں نے اپنے اپنے نظریے کی ترویج کیلئے پوری دنیا میں کوششیں شروع کر دیں۔ پاکستان میں ایسے مقابلے کے نتیجے میں 1990ء کے عشرے میں ملیشیا گروپوں کے درمیان درپردہ جنگ شروع ہوگئی۔ ان گروپوں کو اسلامی بنیاد پرستی کے دونوں بڑے مراکز سے نہ صرف فنڈ بلکہ پراپیگنڈے کا مواد بھی ملا۔ (احمد 1998ء:8-176)۔

تعلیمی اصلاحات

پاکستان میں تعلیم کی ''نظریاتی اساس'' کی تلاش کا کام پہلے ہی 1947ء سے شروع ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں تعلیم کے شعبے کو اسلامی روپ دینے پر زور دیا گیا اگرچہ اس وقت اس کی تشریح بنیاد پرستی کی بجائے سماجی جمہوریت کلچر کے فروغ کے طور پر کی گئی۔ مذہبی تعلیم کو ترجیح دی گئی۔ اسلام پر زور دینے کا مطلب صوبائیت اور لسانی قوم پرستی کو ناجائز قرار دینا تھا۔ البتہ ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے پر اسلامائزیشن کو بنیاد پرستی کے معنوں میں نہیں لیا گیا۔ (رحمان 2004ء 7-17:)۔

اقتدار پر جنرل ضیاء الحق کے طویل عرصے تک براجمان رہنے کے دوران ٹھوس اقدامات کے ساتھ تعلیمی نظام کے ذریعے معاشرے کی گہری نظریاتی تعلیم کیلئے طویل المدت عمل شروع کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسلامی اقدار اور ثقافت کی ترویج کی جائے تاکہ طلبا خود کو اسلامی امہ کا حصہ سمجھیں اور انہیں پوری طرح آگاہی ہو کہ قیام پاکستان کا مقصد آخر کیا تھا اور انہیں اسلام اور پاکستان کا پوری طرح وفادار بنایا جائے۔ (ایضاً:17)۔ چنانچہ پرائمری سکول سے یونیورسٹی تک درسی نصاب کو مکمل طور پر بنیاد پرست خطوط پر اسلامی رنگ دیا گیا۔ پاکستانی درسی نصاب پر اولین

تصنیف ''دی مرڈر آف ہسٹری'' (1993ء) میں پاکستان کے ممتاز مؤرخ کے۔ کے عزیز نے تاریخ، معاشرتی علوم اور مطالعہ پاکستان کے موضوعات پر پرائمری سے یونیورسٹی تک 66 درسی کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح حقائق کو مسخ اور نظریات کو توڑا مروڑا گیا ہے۔ جہاں مسلمان حملہ آوروں اور فاتحین کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا وہاں ہندو مذہب کو ہدف تنقید بنایا گیا۔ اس کے علاوہ پاکستانی فوج کو فاتحانہ روپ دینے پر انتہائی توجہ مرکوز کی گئی۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ 1965ء کی جنگ میں بھارتی فوج پاکستان کے ہاتھوں شکست کے دہانے پر تھی اور اس نے اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ سیز فائر کرائی جائے۔ (ایضاً: 153)۔

پاکستان دولخت ہونے کی بابت درسی کتابوں میں بنگالیوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا جبکہ واقعے میں بھارت کو بطور ولن پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ جنرل ضیاء الحق کی اسلامائزیشن پالیسی کو قائد اعظم کی طرف سے اسلامی ریاست کے قیام کے مبینہ وعدے کی تکمیل کی مخلصانہ کوشش کے طور پر بھی سراہا گیا۔ (ایضاً: 158)۔ کے۔ کے عزیز نے لاس ویل کی اس سوچ سے مماثل زبان استعمال کی ہے جس میں کنٹرولڈ شہریت کی بات کی گئی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:

> ''ایسا لگتا ہے کہ اس کا مقصد ایسی نسل تیار کرنا تھا جس میں یہ خوبیاں ہوں: بے ضرر، سوالات نہ کرنے والی، اپنی خواہشات کے مطابق خوش کن واہموں کی حامل، آنکھوں پر پٹیاں باندھنے میں فخر محسوس کرنے والی، اوپر سے ہدایات قبول کرنے کی خواہاں، کسی کے حکم پر پسند یا ناپسند میں خوشی محسوس کرنے والی، اپنے علم میں سقم نظر انداز کرنے کی سوچ کی حامل، تصوراتی عقیدہ بنانے سے لطف اندوز ہونے والی، سچ ماننے کی اونچی قدر پر ایمان''۔ (ایضاً: 188)

کے۔ کے عزیز کے مطابق درسی کتابوں کے مواد میں پائے جانے والی بنیادی خواص میں یہ بھی شامل تھا: فوج کی حمایت، جنگ میں فتح، بھارت سے نفرت۔ (ایضاً: 3-90)۔ عزیز کے دلائل کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستانی طلبا کو نفرت کے مذہب سے ہم آہنگ عسکری نظریے religio-militarist ideology سے روشناس کرایا جائے۔ کے۔ کے عزیز نے 1996 میں مجھے لندن میں بتایا کہ انہیں کئی بار دھمکیاں دی گئیں اور انہیں محسوس ہوا کہ ان کی زندگی خطرے میں

ہے۔ کے۔ کے عزیز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی اور دانشوروں اور ماہرین تعلیم نے رویوں اور اقدار کی تشکیل کیلئے ایسے نصاب تعلیم کے مضمرات کو اجاگر کیا۔ روبینہ سہگل نے ''تاریخ، معاشرتی علوم اور شہری علوم اور تخلیق دشمناں'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں بالخصوص درسی کتب میں قومی شناخت کے حوالے سے منفی مضمرات کا احاطہ کیا ہے۔ بیرونی مسلمان حملہ آوروں کی فتوحات اور ہندوستانی مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کی تحریک کے عروج کی تاریخ جو بنیادی طور پر ہندوازم، ہندوؤں اور بھارت کو لتاڑنے پر مشتمل تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''پاکستان کی شناخت کی تعبیر کی وجہ بالعموم بھارتی عناصر اور بالخصوص ہندو ہیں۔ چونکہ پاکستان دوقومی نظریے کی سیاسی سوچ کی بنا پر وجود میں آیا جو یہ قرار دیتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو ناقابل مصالحت قومیں ہیں اس لئے درسی کتابوں کی شناخت زیادہ تر دو قوموں کی کہانی کے گرد گھومتی ہے۔ مؤخرالذکر سوچ نے ہندوؤں کو مطعون کرنے میں بڑا کردار ادا کیا''۔ (سہگل: 163:2003)۔

آگے چل کر وہ لکھتی ہیں کہ سیاسی اسلام کے پاکستانی قومی شناخت میں ادغام سے ایک جارحانہ اور مشکوک قسم کی سوچ نے جنم لیا جس میں اسلام اور پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ نہ صرف بھارت بلکہ مغربی اقوام اور اسرائیل بھی دشمنوں میں شامل ہیں لیکن بہرحال ہندوازم اور بھارت ہی مسلمانوں اور پاکستان کے بڑے دشمن اور ان کے لئے خطرہ سمجھے گئے۔ ان درسی کتابوں کے ذریعے جو پیغام دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کسی بھی حالات میں بھارت کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔ (ایضاً: 7-166)۔ مصنفہ سمجھتی ہیں کہ ضیا کے بعد کے دور میں پاکستان کی فتح یابی کی جارحانہ سوچ اس خوف میں تبدیل ہوگئی کہ بھارت ایک بڑا اور زیادہ بہتر مسلح دشمن ہے جو ہمیشہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے درسی نصاب کے اثرات گہرے اور دوررس ثابت ہوئے۔ یوں مثال کے طور پر اسلام آباد کے تھنک ٹینک ایس ڈی پی آئی سے تعلق رکھنے والے اے ایچ نیر اور احمد سلیم نے 2004 میں تعلیمی نصاب ہائے پر ایک اہم رپورٹ شائع کی جس کا عنوان تھا''

ذہانت آمیز نظام شکنی: پاکستان میں نصاب اور درسی کتب کی صورتحال''۔ان دونوں کے''جنگ اور فوج کو فتوحات سے ہمکنار کرنا'' کے عنوان سے مشترکہ مضمون میں انہوں نے درسی کتابوں میں جہاد، شہادت، غازی، شہید اور دیگر بے شمار الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ (نیر اور سلیم 2004ء: 79-90)۔

اس کے بعد ایک ٹی وی مذاکرے کے دوران دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مخالفین نے اے ایچ نیر کو''قتال'' پر تنقید کرنے پر آڑے ہاتھوں لیا۔ان مخالفین میں سے ایک عطاالحق قاسمی کا مؤقف یہ تھا کہ اگر طلبا میں جہاد اور شہادت کے جذبات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تو پھر قرآن، حدیث اور علامہ اقبال کے افکار شامل کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بالفاظ دیگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہتھیار اٹھانے پر تیار رہنا اسلام کے پیغام کی بنیادی روح ہے۔ڈشکا سید Dushka Saiyid نے بھی اس سے ملتا جلتا نقطہء نظر اختیار کرتے ہوئے کہا کہ''بچوں کو جہاد کی تعلیم دینے میں کوئی برائی نہیں۔اسلام کوئی مسیحیت تو نہیں جس میں درس دیا گیا تھا کہ تھپڑ مارنے والے کی طرف دوسرا گال آگے کردو''۔انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ جہاد اگر امریکیوں کے خلاف ہوتو وہ کیسے غلط ہوسکتا ہے۔اور یہ کہ کیا پاکستانی بھارت کے سامنے لیٹ جائیں؟۔انہیں نے کہا کہ مسلمانوں کی تاریخ جہاد سے بھری پڑی ہے اور نبی اکرمؐ نے خود بھی جہاد میں شرکت فرمائی۔ (احمد:2004ء)۔

درسی نصاب کے غیر جذباتی تجزیے سے انکشاف ہوتا ہے کہ کے کے عزیز، اے ایچ نیر اور احمد سلیم تعلیم کا مقصد ایک متوازن اور منطق آمیز ذہن تیار کرنا سمجھتے ہیں جس میں طلبا ایک لبرل اور کثیر المذہب معاشرے کا بہترین اور ذمہ دار شہری بن جائیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ لوگ جنہوں نے کتابیں تصنیف کیں ان کا مقصد درسی کتابوں کو استعمال کر کے دوقومی نظریے پر بنیادی منطق کے حوالے سے ذہن کو مزید مستقل بنانا تھا۔اس نظریے میں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ قومیں قرار دیا گیا ہے بلکہ اس بات کی نفی کی جاتی ہے کہ بھارت تمام مذاہب کا وطن ہے۔ بانی پاکستان نے خود بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں''ہم اور وہ'' کی خصوصی سوچ کی بنیاد رکھی اور جدوجہد آزادی میں اس مؤقف پر تسلسل کے ساتھ عمل بھی کیا۔1940ء میں لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطاب میں بھی محمد علی جناح نے بھی نہایت شدومد کے ساتھ

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عدم مصالحت کا ذکر کیا۔ (جناح کی تقریریں 1967 :151-72)۔اور درسی کتابوں میں ایسی سوچ میں سکہ بند طریقے سے عسکریت شامل کی گئی ہے۔

اسلام پسند سوچ

جنرل ضیا نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ ریاست کے دیگر شعبوں میں اسلامائزیشن کا عمل جاری تھا اور فوج کو اسلام پسند ادارے میں تبدیل کئے بغیر معاشرہ نامکمل ہوگا۔ درحقیقت اسلام پسند عسکری ریاست کو یکجا کرنے کا بنیادی ادارہ فوج کو ہونا چاہیئے۔اس ضمن میں بریگیڈئیر ایس کے ملک نے ''جنگ کا قرآنی تصور'' (1979) کے عنوان سے کتاب لکھی جس میں جنگ اور مسلم تصادم کے فلسفے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے جو پاکستان کے فوجی حکمران اپنے جوانوں کو اسلام پسند جنگجو بنانے کیلئے ان میں پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ کتاب میں جنرل ضیاء الحق نے چشم کشا پیش لفظ تحریر کیا ہے جس کے مطابق:

''میں نے یہ چند سطور بریگیڈئیر ایس کے ملک کی کتاب ''جنگ کا قرآنی تصور'' کی تعریف کیلئے لکھی ہیں جو فوجیوں اور سویلین افراد کیلئے یکساں اہم ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ صرف پیشہ ور فوجی کا مخصوص شعبہ نہیں اور نہ صرف فوج پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس کتاب میں اختصار، سادگی اور واضح انداز میں فوجی طاقت یعنی جہاد کے اطلاق پر قرآنی فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔مسلم فوج میں پیشہ ور فوجی جو مسلمان ریاست کے مقاصد پر چل رہا ہوتا ہے وہ اس وقت تک ''پیشہ ور'' نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنی سرگرمیوں کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ لیتا''۔ (ملک:1979ء)۔

مصنف نے یہ یہ نکتہ ثابت کرنے کے لئے کئی دلائل دیے ہیں کہ جنگ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔اس لئے پوری تاریخ انسانی میں معاشروں کا حصہ رہا ہے۔البتہ قرآن کے تصور جنگ میں علاقے ،قومی یا ذاتی مفاد کیلئے لڑائی کی کوئی گنجائش نہیں۔مولانا مودودی کے مشہور فلسفے کہ دنیا دارالاسلام ہے یا دارالحرب ہے سے متاثر ہوکر بریگیڈئیر ملک نے زور دیا ہے کہ یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غیر مسلم دشمنوں کو شکست دیں۔ انہوں نے قرآن کی اس آیت مبارکہ کا حوالہ دیا ہے کہ ''ان کے ساتھ اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ یا جبر کا خاتمہ نہ ہو جائے

اور انصاف اور اللہ پر ایمان کا ہر طرف بول بالا نہ ہو جائے''۔(28:1979ء)۔انہوں نے تسلیم کیا کہ مشرکین کے ساتھ معاہدے سے امن عارضی طور پر قائم کیا جا سکتا ہے لیکن معاہدے کی خلاف ورزی پر البتہ جنگ کی جا سکتی ہے۔اس کے علاوہ یہ کہ مشرکین کی طرف سے چاہے معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی جائے لیکن اگر اسلامی ریاست کو شبہ ہو کہ کفار غداری کر رہے ہیں تو وہ معاہدہ توڑ سکتی ہے۔(ایضاً:30)۔ایسے یہودی اور نصرانی جو جزیہ دینے پر آمادہ ہوں وہ اسلامی ریاست کی حفاظت میں آ سکتے ہیں۔منافقین کے خلاف لڑائی بھی جائز ہے۔مصنف نے قرآن کے نظریہ جہاد کو ان الفاظ میں مختصراً بیان کیا ہے کہ'' قصہ مختصر قرآن کے نقطہء نظر سے جنگ کا مقصد امن، انصاف اور عقیدے کا ماحول پیدا کرنا ہے۔اس کیلئے ضروری ہے کہ جبر و استبداد کی قوتوں کو کچل دیا جائے''۔(ملک 1979: 35)۔

ایسی گنجلک منطق سے یہ بات اخذ کرنا مشکل نہیں کہ مصنف ''امن، انصاف اور عقیدے'' کے ماحول کیلئے ضروری سمجھتا ہے کہ پوری دنیا میں اسلامی قانون رائج ہو۔انہوں نے قرآنی ''اخلاقیات جنگ'' کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ طاقت کے استعمال پر جو پابندیاں اور کنٹرول قرآن مجید نے لگائی ہیں ان کا کوئی ثانی نہیں۔(ایضاً:49)۔ایک اور مقام پر انہوں نے قرآن کی جنگی حکمت عملی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے اگر جنگ پورے جذبے کے ساتھ لڑی جائے تو ہزاروں فرشتوں کی مدد کی شکل میں خدائی امداد یقینی ہے۔(ایضاً:55)۔حضرت محمدؐ کی سپہ سالاری میں لڑی جانے والی 2 غزوات کے حوالے دیتے ہوئے بریگیڈیئر ملک کہتے ہیں کہ'' ان تمام مواقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں پر غلبہ پانا چاہتا ہو تو وہ ان کے دلوں میں دہشت پیدا کر کے ایسا کرتا ہے''۔(ایضاً:57)۔چنانچہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> '' قرآن کی عسکری حکمت عملی ہم سے اس بات کی متقاضی ہے کہ خود کو دشمن کی دہشت سے بچا کر ہم جنگ کیلئے تیار رہیں تا کہ اپنے ظاہری یا پوشیدہ دشمنوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر سکیں....دشمن کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کا صرف ایک مطلب نہیں بلکہ یہی اپنے اندر انجام ہے۔جیسے ہی دشمن کے دل میں دہشت پیدا ہونے کا ماحول حاصل کر لیا جائے تو پھر شاید ہی کسی اور مقصد کے حصول کی ضرورت باقی رہ جاتی ہو۔

یہ وہ مقام ہے جہاں مقاصد اور انجام باہم ملتے اور مدغم ہوتے ہیں۔
دہشت کا مطلب صرف دشمن پر فیصلے مسلط کرنا نہیں بلکہ یہ وہ دہشت ہے
جو ہم ان پر مسلط کرنا چاہتے ہیں"۔(ایضاً:9-58)۔

دشمن کے دلوں میں دہشت پیدا کرنے کیلئے جہاں فوجی میدان میں تیاری کرنا ضروری ہے وہاں نظریاتی محاذ پر تیاری بھی ضروری ہے۔نظریاتی تیاری کا مطلب ہے کہ اسلام بالخصوص جہاد پر غیر متزلزل ایمان...میدان جنگ یا اسلام کی سربلندی کے کسی مشن کی تکمیل کے دوران جان قربان ہونے کا کوئی خوف نہیں کیونکہ اللہ نے اس شہادت پر جنت الفردوس میں مقام عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔قرآنی آیات مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے بریگیڈیئر ملک نے اسے اللہ اور مجاہدین کے درمیان ایک ''بارگین'' قرار دیا ہے۔(ایضاً:141)۔ اس کتاب کا اختتام جہاد سے متعلق کئی قرآنی آیات پر ہوا ہے۔(ایضا:50-147)۔

اس کتاب کے لکھنے کا بظاہر مقصد ''منصفانہ جنگ کا قرآنی نظریہ'' پیش کرنا ہے۔اس کے مطابق مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کو ایک جارح کو شکست دینے کے عارضی مظہر کی بجائے غلطی سے ایک مستقل اور مسلسل مظہر کے طور پر سمجھا گیا ہے۔جنگ کا یہ عمل اسی صورت میں ختم ہوگا جب تمام غیر اسلامی قوتوں کا خاتمہ ہوگا اور اسلامی قانون کے مطابق امن وانصاف پر مبنی عالمگیر نظام قائم ہوگا۔ انہوں نے یہ اہم نکتہ بتایا ہے کہ جنگ کا جو تصور قرآن نے پیش کیا وہ زیادہ انسانیت دوست اور با معنی ہے کیونکہ جنگ میں خواتین، بچوں، خادمین اور جنگ میں اپنے آقاؤں کے ساتھ آنے والے غلاموں کی بھی جاں بخشی کا حکم دیا گیا ہے۔اسی طرح نابینا افراد، بھکشوؤں، راہبوں، بوڑھوں، ذہنی اور جسمانی طور پر معذور افراد کو بھی مارنے سے منع فرمایا گیا ہے۔(ایضاً:47)۔ ایسی چرب زبانی اور غلط بیانی کی مثالیں پوری کتاب میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔یہ ایک مخصوص اور بے لچک نظریے کو تشویش سے مسخ کر کے شیطانی قوتوں کو شکست دینے اور ان کا صفایا کرنے کے لئے لازمی ''برائی'' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔یہ عصر حاضر میں ایک متروک نظریہ ہوسکتا ہے کیونکہ کتاب میں کسی ایک جگہ پر بھی اقوام متحدہ کے چارٹر یا جنیوا کنونشنوں کا حوالہ نہیں دیا گیا۔اس کے برعکس اس میں بار بار جہاد کی آڑ میں ہتھیار اٹھانے کی بات کی گئی ہے۔

قرآن کے نظریہ جنگ کو پاکستانی فوج کا باضابطہ فلسفہ کبھی نہیں قرار دیا گیا۔البتہ کمانڈ اینڈ

سٹاف کالج کوئٹہ اور نیشنل ڈیفنس کالج (اب یونیورسٹی) اسلام آباد میں فوجی افسروں کے نصاب میں ایسا مواد پڑھنے کی زبردست سفارش کی جاتی ہے، چونکہ جنرل ضیاء الحق نے بریگیڈیئر ملک کی اس کتاب کی خود توثیق کی تھی اس لئے اس کو نہایت سنجیدگی سے لینا چاہیئے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کیا یہ ایک ٹھوس فرد جرم ہے یا ہلکی پھلکی منطق کا اظہار ہے۔ یہ کتاب اس دور میں شائع ہوئی جب افغان جہاد شروع ہوا ہی چاہتا تھا اور یقیناً ان عوامل میں سے ایک ہوگا جس کے تحت جہاد کے امریکی اور سعودی سپانسروں کو باآسانی قائل کیا گیا کہ سوویت یونین کے خلاف مہم میں پاکستانی فوج بڑا آپریشنل چینل ثابت ہوسکتی ہے۔ فوج کو اسلامیانے کے اقدامات سے اختلاف کرنے والی آوازوں کا نیچے ذکر کیا جارہا ہے۔ 1965 اور 1971ء کی جنگ میں پاکستان کے خلاف لڑنے والے بھارتی فوج کے تاثرات بھی نیچے دیے گئے ہیں۔

میجر (ر) آغا ہمایوں امین

میں نے پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں 3 مئی 1981ء کو بطور کیڈٹ شمولیت اختیار کی تھی اور تربیت مکمل کرنے پر مجھے 17 مارچ 1983ء کو 11 کیولری میں کمیشن دیا گیا۔ اس وقت اکیڈمی میں عربی کا مضمون لازمی قرار دیا جا چکا تھا۔ اکیڈمی میں جن مقررین کو مدعو کیا جاتا تھا وہ مذہب پر کافی انتہا پسند خیالات رکھتے تھے۔ نماز پڑھنا بھی لازمی تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ 1983ء میں جب جنرل ایم ملک اکیڈمی کے کمانڈنٹ تھے تو مذہبی تعلیمات اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ بریگیڈیئر ایس کے ملک کی کتاب ''Islamic Concept of War'' سٹاف کالج کوئٹہ کے کورس کے شرکاء کو پڑھنے کی زبردست سفارش کی جاتی تھی۔ کیریئر کے لحاظ سے سینئر افسروں کے ساتھ نماز پڑھنے کو اچھی سرمایہ کاری سمجھا جاتا تھا۔ اکثر افسر اپنے سینئر افسروں کو خوش کرنے کے لئے نماز پڑھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی آزاد خیال افراد بھی اپنی ترقی کو ذہن نشین رکھتے ہوئے شراب نوشی کے ساتھ ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کرتے تھے۔ 1986ء میں نظم الصلوۃ مہم کا آغاز کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کئی فوجی یونٹوں کو گھر گھر تبلیغ کے لئے بھیجا گیا۔ ایسی نیکوکاری کے برعکس دسمبر 1986 میں فوجی یونٹوں کو جنرل ضیاء الحق کے اقتدار کے حق میں ریفرنڈم میں ''ہاں'' کا ووٹ دلوانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔

بحثیت مجموعی نام نہاد اسلامائزیشن کے عمل سے صرف فوج کا پیشہ ورانہ معیار متاثر ہوا۔ اس کا آغاز کیڈٹوں کی بھرتی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا۔ ضیاء الحق نے اہم سول عہدوں پر فوجی افسر لگائے۔ مثال کے طور پر ایڈمرل شریف کو پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین لگایا گیا۔ جن کا مختلف آسامیوں پر بھرتی کیلئے آنے والے امیدواروں سے انٹرویو میں زیادہ زور صرف مذہب پر ہوتا تھا۔ وہ امیدواروں سے کہتے کہ دعائے قنوت سناؤ۔ انہوں نے ٹاپ کرنے والے امیدوار ظفر بخاری کو محض اس لئے ان فٹ قرار دے دیا کہ انہوں نے بائیں بازوں کے فیض احمد فیض کو اپنا پسندیدہ شاعر لکھ دیا تھا۔

ایک اور فوجی افسر جو اپنا نام صیغہ راز میں رکھنا چاہتا تھا نے مجھے (کتاب کے مصنف) آفیسر میسوں کی اندرونی صورتحال بتائی کہ کس طرح وہاں خوشگوار اور مساوات والے ماحول کی جگہ مذہبی روایات کو فروغ دیا گیا:۔

بھٹو دور میں آرمی میس کا خشک ماحول بنانے سے پہلے آفیسر میس ایسی جگہ ہوتے تھے جہاں جونیئر اور سینئر فوجی افسر آزادانہ طور پر ملتے اور باتیں کرتے تھے۔ لطیفے سنائے جاتے اور شراب نوش کی جاتی۔ ہم کسی مشکل کے بغیر اپنے سینئر افسروں سے مختلف امور پر اختلاف رائے کرتے اور آزادانہ انداز میں مباحثے ہوتے۔ ڈانس اور موسیقی بھی عام تھے۔ یہ ایک زندگی سے بھرپور ماحول ہوتا جس میں ہم سوشل طریقے سے رہتے تھے۔ یقیناً مذہب کا بھی عمل دخل ہوتا تھا لیکن عمومی قاعدہ یہ تھا کہ مذہب فرد کا انفرادی فعل ہے اور یہ فرد کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنے طرز زندگی کا انتخاب کرے اور اخلاقیات اور اقدار کو عسکری رنگ دینے کو ناپسند کیا جاتا۔ یہ سب ماحول اسلام پسند تجربات سے صفر ہو کر رہ گیا۔ اب آفیسر میسوں کی دیواریں اور راہداریاں آیات قرآنی سے مزین ہو گئیں اور ہر ہر شخص سے یہ توقع کی جانے لگی کہ وہ ہائی کمانڈ کے حاوی نظریے کے عین مطابق اپنے معاملات چلائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے جہاں گرمجوشی اور بے تکلفی کی فضا پائی جاتی تھی اس کی جگہ تکلف اور اصلاح پسندی نے لے لی۔ بحث ومباحثے کا رجحان عنقا ہو گیا اور اس کی جگہ نفس پر قابو پانے کے طویل خطبوں نے لے لی۔ فوج کے اندر ایسے اقدامات کو امریکیوں کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملی۔ نام نہاد افغان جہاد میں جنرل ضیا اور ان کے مشیروں نے فوج کو اسلام پسند رنگ مزید گہرا کرنے کا کام تیز کر دیا۔ اس دور میں نیوز ویک اور ٹائم میگزین کے

سرورق پر جنرل ضیاء کی تصویر شائع کی گئی۔ اس وقت تک امریکہ کی شدید خواہش تھی کہ پاک فوج جہادی ادارے میں تبدیل ہو جائے۔ افسروں سے امید کی جاتی کہ وہ نمازوں کے دوران صفوں میں شامل ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب بظاہر مساوات کے اصول پر عملدرآمد محسوس ہوتا ہو لیکن حقیقتاً ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ایک ساتھ کھڑے ہونے سے عہدے اور مرتبے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس افسروں کو ماتحتوں کیلئے اخلاقیات کی مثال بننا ہوتا ہے۔ اس صورتحال میں حقیقی تقوے کی بجائے منافقانہ رویے نے جگہ لے لی۔

اس سے پہلے مسلح افواج میں مسیحی افراد کو بھی آگے بڑھنے کے مواقع میسر تھے اور انہیں اچھے جنگجو اور محبّ وطن پاکستانی سمجھا جاتا تھا لیکن اسلامائزیشن کے عمل نے ان کی میسوں میں آنے کی حوصلہ شکنی کی اور پھر ایک وقت آیا کہ انہیں فوج میں کیریئر بنانے سے بالکل روک دیا گیا۔ ہاں البتہ ضیاء الحق نے فوج میں شیعہ اور سنی کی تفریق کرنے کی حوصلہ افزائی کی جرأت نہ کی۔ بہر حال پاکستانی فوج اسلام پسند لڑاکا فورس بن کر ابھری۔ جہاد افغانستان اسلام پسند قوتوں کی خوشحالی کا ذریعہ بنا جنہیں پھر اسلامی طریقہ جنگ کے مطابق پنپنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ یہ دراصل کوئی اسلامی طریقہ تھا ہی نہیں لیکن اسے چیف اور ان کے حواریوں کی زبردست سرپرستی حاصل ہوئی۔

حد سے زیادہ بھارت مخالف رویہ پہلے ہی پاکستان آرمی کی تربیت کا مرکزی نقطہ تھا لیکن جب جنرل ضیاء الحق آرمی چیف اور پھر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنے تو اسے اسلام کی سربلندی کیلئے لڑنے والی فوج کی تیاری کا جزو لازم سمجھا گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ ایسے حالات میں بھی پاکستان اور بھارت کی سرحدوں پر تعینات فوجی آپس میں تعلق واسطہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کئی فوجیوں کا تعلق انگریز دور کی ایک ہی رجمنٹ سے تھا اور کوئی کوئی ایک ہی گاؤں کے باسی نکل آتے۔ کبھی کبھار تو یہ تعلق اتنا قریب ہو جاتا کہ وہ سرحد کے دوسری طرف گاؤں میں چلا بھی جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ بھارت کے کچھ فوجی افسر لاہور کی مشہور ''ہیرامنڈی'' جانے کے خواہاں تھے اور ہم انہیں مجرا دکھانے وہاں لے گئے۔ اس طرح ہمارے کئی فوجی امرتسر یا قرب و جوار جا کر شراب پیتے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ یہ دونوں ایک دم سے ایک دوسرے پر گولیاں چلانا بھی شروع کر دیتے تھے۔ یہ سچ ہے''۔

بریگیڈئیر (ر) وجے نائیر

اس بات کی تصدیق بھارتی فوج کے بریگیڈئیر وجائے نائیر نے میرے ساتھ طویل انٹرویو میں کی۔ انہوں نے بتایا کہ ''ہمارے خاندان کا بنیادی طور پر تعلق گجرات کے علاقے کنجاہ سے تھا، میں نے 1965ء اور 1971ء میں پاکستان کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ معمول کے حالات میں سرحد پر تعینات دونوں طرف کے فوجیوں کے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا احترام بھی کیا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو اہم مواقع پر مبارکباد بھی دیتے ہیں اور سماجی طور پر منسلک بھی ہوتے ہیں۔ جنگ لڑنا ایک پیشہ ورانہ فرض ہوتا ہے اور ہر کوئی اپنی بہترین عسکری صلاحیتوں کے ساتھ لڑتا ہے''۔

باب 12

افغان جہاد

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ پاکستان کی قومی سلامتی کی سوچ میں ہمیشہ بھارت کے خود ساختہ خطرے کو نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ ڈیورنڈ لائن کے تنازعے کی بنا پر افغانستان کے ساتھ تعلقات بھی تشویش کا باعث رہے۔ سرد جنگ کے دوران جہاں پاکستان امریکہ کی فوجی سٹریٹیجی کا اپنے طور پر حصہ بن گیا تا کہ سوویت یونین کی گرم پانیوں کی طرف کسی پیشقدمی کو روکا جا سکے وہاں افغان بادشاہت کی پشت پناہی سوویت یونین نے کی تاہم افغانستان نے سوویت یونین کے ساتھ کوئی باضابطہ فوجی معاہدہ نہ کیا۔ افغانستان میں صورتحال اس وقت عدم استحکام کا شکار ہوگئی جب 17 جولائی 1973ء کو ظاہر شاہ (مدت حکمرانی 73-1933) کا تختہ ان کے کزن سردار محمد داؤد خان نے الٹ دیا۔ داؤد انتہائی قوم پرست پختون تھا جس نے پاکستان کے ساتھ ڈیورنڈ لائن کا تنازعہ دوبارہ زندہ کر دیا۔ تاہم داؤد شاہ کی حکومت کو اپنے عوام میں زیادہ مقبولیت نہ مل سکی کیونکہ اس نے جہاں بائیں بازو کے دھڑے پر جبر کیا وہاں قدامت پسند افغان طبقے پر بھی مظالم ڈھائے۔ جون 1975ء میں جمعیت اسلامی (پاکستان کی جماعت اسلامی سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا) نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی لیکن داؤد شاہ حکومت نے بغاوت کچل دی البتہ کئی عسکریت پسند پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ ان دنوں زیڈ اے بھٹو اقتدار میں تھے۔ انہوں نے افغان حکومت کے مخالف عناصر کی حمایت کا حکم دیا۔ (فر:1985ء:94)۔ اس سے پہلے امریکی سی آئی اے اور پاکستانی آئی ایس آئی داؤد شاہ حکومت کے خلاف مزاحمت کو ہوا دینے کیلئے آپس میں اتفاق رائے کر چکے تھے۔ یوں مثال کے طور پر مشہور زمانہ کرنل امام (سلطان امیر تارڑ)

کو 1973ء میں امریکہ بھیجا گیا تا کہ وہ شورش پسندی سے متعلق جنگ کی تربیت حاصل کر سکیں۔ تا ہم داؤد حکومت کا افغان کمیونسٹوں سے تصادم شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں افغان کمیونسٹوں کی نمائندہ جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی اے) کی قیادت میں ایک شورش وجود میں آنے لگی۔ 27 اپریل 1978ء کو پی ڈی پی اے کے حامی فوجی افسروں نے شاہ داؤد کا تختہ الٹ کر اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیا۔ اس مرحلے تک امریکہ کی اس معاملے کے ساتھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ جنرل ضیاء کے قریبی ساتھی لیفٹیننٹ جنرل (ر) کے ایم عارف نے لکھا ہے کہ یہ جنرل ضیاء الحق تھے جنہوں نے صدر کارٹر کو لکھا کہ ''امریکہ کو خطے میں پیدا ہونے والے سٹرٹیجک عدم توازن کا سنجیدہ نوٹس لینا چاہیئے تاہم جمی کارٹر نے اسے ایک کمزور ملک کا ضرورت سے زائد ردعمل قرار دے کر تنبیہ کو نظر انداز کر دیا''۔ (عارف 2001: 175)۔ لیکن امریکہ کے اس مؤقف میں بعد ازاں ڈرامائی تبدیلی آئی۔

بغاوت کے بعد پی ڈی پی اے کے سیکرٹری جنرل نور محمد ترکئی افغانستان کے بیک وقت صدر اور وزیر اعظم بن گئے جبکہ انہیں انقلابی کونسل کی معاونت حاصل تھی۔ پی ڈی پی اے پہلے ہی دھڑے بندی کا شکار تھی۔ خلق گروپ کی قیادت ترکئی اور حفیظ اللہ امین کر رہے تھے جبکہ پرچم گروپ کا سربراہ ببرک کارمل کی قیادت میں کام کر رہا تھا۔ (سلہری 1990ء: 15-14)۔ دونوں دھڑوں کے درمیان تصادم ہو گیا جس میں پرچم پارٹی کے کئی ارکان مارے گئے جبکہ دیگر کو جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ بہر حال مارکسی حکومت نے جدیدیت کے پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دیا بالخصوص شادی کی روایات میں اصلاحات کے ذریعے خواتین کی حالت زار بہتر بنانے میں کامیابی حاصل کی گئی۔ خواتین کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور قدامت پسند طرز زندگی مسترد کر دیں۔ زمینی اصلاحات سے روایتی جاگیردار کمزور ہوئے اور بڑی بڑی جاگیریں توڑنے کے ساتھ سود پر پابندی لگا دی گئی۔ ماضی میں غریب کسانوں پر چڑھے قرضے معاف کر دیے گئے۔ اوران جیسے دیگر اقدامات سے قدامت پسند افغان حلقوں کا زبردست ردعمل پیدا ہوا۔

اس سے پہلے وسط 1978ء میں نورستان کے خطے میں ایک بغاوت ہو چکی تھی جس کے فوراً بعد خانہ جنگی کے واضح آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے لیکن حکمران پی ڈی پی اے کو پہلا بڑا دھچکا اپنے اندر سے ہی خلق گروپ سے پہنچا۔ پرتشدد اندرونی تصادم کے نتیجے میں ترکئی کو بے دردی سے

قتل کر دیا گیا جبکہ ستمبر 1979ء کو حفیظ اللہ امین نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس سے عدم استحکام کی صورتحال مزید گمبھیر ہو گئی کیونکہ حفیظ اللہ امین نے پی ڈی پی اے میں اپنے مخالفین کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ جن میں سے کئی بیرون ملک اور زیادہ تر روس چلے گئے۔ حفیظ اللہ امین نے پاکستان اور امریکہ سے درون خانہ رابطوں کے ذریعے اپنے ملک میں روسی عمل دخل میں توازن لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے حکومت کی سیکولر شناخت سے روگردانی کرتے ہوئے دائیں باز و خصوصاً اسلام کی طرف جھکاؤ شروع کر دیا۔ پاکستان نے امریکہ کی طرف سے فوجی امداد ملنے سے کہیں پہلے 1978ء کے آخر میں افغانستان کو بڑھتی مزاحمت کے تناظر میں عسکری امداد فراہم کرنا شروع کر دی۔ (کے ایم عارف 2001ء:177)۔

اب تک سوویت یونین 1920 کے عشرے سے افغانستان کو فوجی اور معاشی امداد فراہم کرتا آیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ اپریل انقلاب کے بعد سوویت مشیر اور فوجی افسر بڑی تعداد میں افغان کمیونسٹوں کی مدد کرنے پہنچ گئے۔ سوویت یونین نے فوجی طیاروں سمیت اسلحہ بھی فراہم کیا۔ ایسی امداد کو دسمبر 1978ء میں ایک معاہدے کے ذریعے باضابطہ شکل دی گئی جس کے تحت افغان حکومت کو سوویت یونین سے فوجی امداد مانگنے کی اجازت مل گئی۔ حفیظ اللہ امین کے اقتدار سنبھالنے سے روسی اثر ورسوخ میں کمی آئی لیکن اسلام پسند قوتوں کی بغاوت کے باعث وہ اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے سوویت یونین سے مزید امداد مانگ لی۔ سوویت یونین نے امداد تو دے دی لیکن حفیظ اللہ امین پر بھروسہ نہ کیا۔ 27 دسمبر کو کے جی بی کے ایجنٹوں اور ان کے افغان مددگاروں نے حفیظ اللہ امین کو قتل کر دیا اور سی آئی اے کا ایجنٹ قرار دیا۔ اسی روز ریڈ آرمی نے افغانستان کے اندر اپنی پیشقدمی شروع کر دی اور طیاروں کے ذریعے فوجیں کابل ایئر پورٹ پر اتار دی گئیں۔ مختصر عرصے میں تقریباً ایک لاکھ روسی فوجی افغانستان میں تھے۔ اس حرکت پر ششدر جمی کارٹر نے اسے ''دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کیلئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا''۔ اور سوویت حکمران برژنیف کو مشورہ دیا کہ یا تو روسی فوج افغانستان سے نکالی جائے ورنہ نتائج بھگتنے کیلئے تیار رہو۔ (انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون بحوالہ جنرل عارف: 31 دسمبر 1979، 2001:175)۔

اتنی بڑی تعداد میں غیر ملکی فوجوں کی آمد کے باوجود افغانستان کی آتش فشانی صورتحال

میں کمی آنے میں کوئی مدد نہ ملی۔ اس کے برعکس کمیونسٹ حکمرانی کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ چنانچہ روسی فوج ملک کے مختلف حصوں میں شورشوں سے نمٹنے میں مصروف ہوگئی۔ اسلامی ممالک نے سوویت یونین کی مداخلت کی مذمت کی اور 34 اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ نے اس حوالے سے مذمتی قرارداد بھی منظور کی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی 18 کے مقابلے میں 104 ووٹوں سے افغانستان میں سوویت مداخلت پر احتجاج کی قرارداد پاس کی۔ اگرچہ امریکہ کی طرف سے افغانستان کیلئے امداد کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا تاہم افغانستان میں ابتدائی طور پر امریکہ داؤد کے برسراقتدار آنے کے بعد آیا۔ اس وقت پاکستانی فوج نے شورش پسندی کی جنگ کی تربیت کیلئے اپنے بعض فوجی امریکہ بھیجے۔ کمیونسٹوں کی حکومت کے قیام کے فوراً بعد امریکہ نے افغان باغیوں سے بڑے پیمانے پر رابطے شروع کر دیے۔ 3 جولائی 1979ء کو سوویت فوجوں کی تعیناتی سے کوئی 6 ماہ پہلے صدر جمی کارٹر نے ایک ایگزیکٹو آرڈر پر دستخط کئے جس کے تحت سی آئی اے کو کابل حکومت کے خلاف درپردہ پراپیگنڈہ کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ امریکہ کے لئے ایک سنہری موقع تھا کہ وہ اس ''گریٹ گیم'' کو از سر نو زندہ کر دے جو 19ویں صدی سے خطے میں جاری تھی۔ ریڈ آرمی کی افغانستان آمد سے امریکی مداخلت میں زبردست تبدیلی آئی کیونکہ اس نے غیر ملکی فوجوں کے خلاف مؤثر مزاحمت کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہی وہ موقع تھا جس کی تاک میں امریکی تھے کہ وہ اپنے بڑے دشمن کے خلاف درپردہ جنگ شروع کر سکیں اور اسے ویت نام میں جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کا انتقام لیا جا سکے چاہے اس عمل سے خطے کے باسیوں کو کوئی بھی نقصان پہنچے۔

پاکستان فرنٹ لائن سٹیٹ بن جاتا ہے

سوویت فوجوں نے افغانوں پر بہیمانہ مظالم ڈھائے جو محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں زیادہ تر پاکستان اور کسی حد تک ایران کی طرف چلے گئے۔ جہاں ایرانیوں نے افغانستان میں کارروائیوں کے لئے سختی سے اپنی سرزمین استعمال نہ ہونے دینے کی مانیٹرنگ کی وہاں پاکستان کا ردعمل بالکل الٹ رہا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت سے امریکی سٹریٹیجی میں کمیونسٹوں کی روک تھام کیلئے پاکستان کے فرنٹ لائن ملک کا کردار حاصل کرنے کی راہ ہموار ہوگئی۔ 1950ء

کی دہائی میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان عسکری تعاون کے حوالے سے طے پانے والے معاہدے جمود کا شکار ہو چکے تھے اور دونوں فریق ایک دوسرے سے کافی دور جا چکے تھے۔ اب اس اتحاد کی نشاۃ ثانیہ ہو چکی تھی...... اگرچہ شروع میں دونوں ملکوں کے تعلقات نچلی ترین سطح تک محدود رہے...... کارٹر انتظامیہ کو بالخصوص اس بات پر تشویش تھی کہ پاکستان اپنا ایٹمی پروگرام روکنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مارچ 1979 میں امریکہ نے سمنگٹن ترمیم کے تحت پاکستان کی اقتصادی امداد روکنے کی دھمکی دی۔ جنرل ضیاء نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ پاکستان کا جوہری پروگرام اتنا ہی ''پرامن'' ہے جتنا بھارت کا ہے۔ یہ امریکہ کے لئے کسی صورت میں قابل قبول نہیں تھا چنانچہ ایک ماہ بعد امریکہ نے پاکستان کی اقتصادی امداد منقطع کر دی۔ ایسے انتہائی اقدام نے بالخصوص پاکستانی حکومت کو مایوس کیا جو یہ سمجھتی تھی کہ اگرچہ جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیار متعارف کرانے والا ملک بھارت تھا لیکن اس کے باوجود کارٹر انتظامیہ نے جولائی 1977ء میں بھارتی وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور پھر امریکی صدر نے 1978ء میں بھارت کا دورہ کر کے اس کا انعام دیا۔ پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات اس وقت نچلی ترین سطح تک چلے گئے جب یہ انکشاف ہوا کہ امریکی محکمہ خارجہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر کے جوہری اثاثہ جات تباہ کرنے کیلئے حملہ کرنے کو ایک آپشن کے طور پر اختیار کر رہا ہے۔ (عباس، 2005ء: 6-95)۔

پاکستان کے نقطۂ نظر سے جنوبی ایشیا کے بارے میں امریکی پالیسی ہر لحاظ سے بھارت نواز تھی۔ ابھی یہ حالات چل رہے تھے کہ 21 نومبر 1979ء کو یہ خبر پھیل گئی کہ چند گروپوں نے مسلمانوں کے مقدس ترین مقام مکہ مکرمہ پر قبضے کی (خدانخواستہ) کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء نے بین الاقوامی نشریات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کے پیچھے امریکیوں کا ہاتھ تھا۔ یہ خبر سن کر مشتعل پاکستانیوں...... قائداعظم یونیورسٹی کے طلباء کے اسلامی جمعیت طلبہ کی قیادت میں جلوس سمیت...... نے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کی طرف مارچ شروع کر دیا۔ یہ ہجوم اللہ اکبر، امریکہ مردہ باد، ضیاء الحق زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔ مشتعل افراد پاکستانی اور امریکی محافظوں کو بے بس کر کے دیواریں پھلانگ کر اندر گھس گئے اور عمارت کو آگ لگا دی۔ اس حملے میں 2 امریکی اور سفارتخانے کے 2 پاکستانی ملازمین مارے گئے۔ اس مقام سے پاکستانی فوج کا مسکن زیادہ دور نہیں تھا اور فوجی نصف گھنٹے میں باآسانی وہاں پہنچ سکتے تھے لیکن یہ فوجی 4 گھنٹے بعد

وہاں پہنچے۔اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ فوج جنرل ضیاء الحق کی سکیورٹی پر مامور تھی جو سائیکل چلا کر گھر سے دفتر جاتے تھے۔اس پبلسٹی سٹنٹ کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ خلفائے راشدین کے دور کی طرح حکمران کو عام شہری کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔اگر چہ یہ پبلسٹی سٹنٹ اورامریکی سفارت خانے پر حملہ ایک وقت میں ہونا محض اتفاق تھا تاہم امریکیوں کو شبہ تھا کہ سفارت خانے پر حملے کا منصوبہ ساز حکومت کے اندر سے تھا۔(ایضاً:96)۔

ایسے حالات میں سوویت مداخلت نے پاکستان اورامریکہ کے تعلقات میں ایک عمل انگیز Catalyst کا کردار ادا کیا جس کے باعث دونوں ملک انتہائی قریب آ گئے اگر چہ اس کے اعتماد سازی کے ضروری تقاضے پورے نہیں کئے گئے۔اس کی بجائے دونوں ملکوں کے قریبی تعلقات فریقین کے خالصتاً اپنے اپنے مسائل سے فروغ پائے۔21 جنوری 1980 کو صدر کارٹر نے پاکستان کو 40 کروڑ ڈالر امداد کی پیشکش کی جس میں 20 کروڑ ڈالر کی فوجی ساز و سامان کی خریداری کے لئے تھے جبکہ باقی ماندہ 20 کروڑ ڈالر اقتصادی امداد کی صورت میں تھے۔اس موقع پر ضیاء الحق نے مشہور زمانہ فقرے میں اسے محض ''مونگ پھلی'' قرار دیا۔ (سلہری 1990ء:15)۔3 فروری 1980ء کو ضیاء الحق اور صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر زبیگنیو برزنسکی کے مشترکہ بیان میں 1959ء کے پاک امریکہ معاہدے کا حوالہ دیتے ہوئے برزنسکی نے زور دیا کہ امریکہ پاکستان کی آزادی اور سلامتی کا تحفظ یقینی بنانے میں پرعزم ہے۔(جین 2007 اے:109)۔البتہ محدود امریکی امداد کی پیشکش پر پاکستان مطمئن نہیں تھا۔اس کے علاوہ کارٹر انتظامیہ رکاوٹیں اٹھانے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھی اور اس نے پاکستان کو مطلع کیا کہ 1959ء کا پاک امریکہ معاہدہ صرف ایگزیکٹو آرڈر کا نتیجہ تھا اور اسے کانگریس سے منظوری لے کر باقاعدہ معاہدے کی شکل نہیں دی گئی۔5 مارچ 1980ء کو ضیاء الحق کے مشیر خارجہ آغا شاہی نے کھلے عام ''مونگ پھلی'' ملنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔بالخصوص 20 کروڑ ڈالر کا فوجی ساز و سامان کا قرضہ پاکستان کی ایسے نازک موڑ پر دفاعی ضروریات پوری کرنے کیلئے ناکافی قرار دیا گیا۔(ایضاً: 1048-5)۔

تاہم برزنسکی ...... جو مشرقی یورپ میں انسانی حقوق کے نام پر مظاہرے کرنے کا منصوبہ ساز تھا۔اس نے افغان مجاہدین کی خفیہ طریقے سے مالی امداد کا منصوبہ بھی سی آئی اے اور برطانوی

ایجنسی ایم آئی 6 کے ذریعے تیار کیا۔ 13 جون 1997ء کو ایک انٹرویو میں انہوں نے واضح طور پر افغانستان میں امریکی حکمت عملی بیان کی ہے:

''جیسے ہی ہم نے سنا کہ سوویت یونین امریکہ میں داخل ہو چکا ہے تو ہم نے فوری طور پر 2 نکاتی عمل شروع کر دیا۔ پہلا عمل یہ تھا کہ براہ راست ردعمل اور سوویت یونین پر پابندیاں۔ اس کے لئے محکمہ خارجہ اور قومی سلامتی کونسل نے ممکنہ پابندیوں کی طویل فہرست تیار کی۔ اس کے علاوہ ایسے اقدامات پر غور کیا گیا جس کے تحت سوویت یونین کو اپنے کئے کی بین الاقوامی سطح پر قیمت ادا کرنا پڑے۔ دوسرا اقدام یہ تھا کہ سوویت یونین کی چڑھائی کے بعد میں ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے پاکستان گیا تاکہ ایسی مشترکہ حکمت عملی تیار کی جا سکے جس سے سوویت یونین کو زیادہ سے زیادہ لہولہان کیا جا سکے۔ اس کیلئے ہم نے سعودی عرب، مصر، برطانیہ اور چین کا بھی تعاون حاصل کیا اور مجاہدین کو ایک بار پھر کئی ذرائع سے اسلحے کی فراہمی کا آغاز کر دیا۔ مثال کے طور پر مصر اور چین سے روسی اسلحہ، حتیٰ کہ ہم نے چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ حکومت سے بھی سوویت ہتھیار حاصل کئے کیونکہ وہ مادی فوائد حاصل کرنے کی خواہاں تھی، بلکہ ایک مقام پر ہم سوویت فوجیوں سے بھی مجاہدین کے لئے اسلحہ خریدا کیونکہ سوویت فوجی کافی کرپٹ تھی''۔ (برزنسکی: 2011)۔

یوں جہاں جمی کارٹر کے دور صدارت میں عسکری امداد انتہائی قلیل سطح پر رہی وہاں برزنسکی نے سی آئی اے کے ذریعے متبادل سرکاری ڈھانچہ تلاش کر لیا۔ اس نئے خفیہ اتحاد کا سب سے اہم کھلاڑی سعودی عرب تھا۔ اس کی تیل کی بے انتہا دولت اور ''کافر'' سوویت یونین پر جنگ مسلط کرنے کا بنیاد پرستانہ جذبہ اپنے دشمن ایران کے درپیش چیلنج سے نمٹنے کے مواقع میں تبدیل ہو گیا۔ جہاں اتنے ہی بنیاد پرستانہ سوچ کے حامل امام خمینی اور شیعہ ملا برسراقتدار تھے۔ مسلم دنیا کے اپنے تئیں لیڈر سعودی عرب کے سوویت یونین کے ساتھ باضابطہ سفارتی تعلقات تک نہیں تھے۔ کئی برسوں تک سعودی عرب سوویت یونین میں شامل وسط ایشیائی ریاستوں کے عازمین حج کو ویزہ دینے کیلئے سی آئی اے کے تعاون سے ان کے انٹرویو کرتا رہا۔ (کول 2004ء: 81)۔ برطانیہ بھی اس معاملے میں شروع سے ملوث رہا کیونکہ مشیروں میں افغان ہاتھ بھی شامل تھے۔ مجاہدین بھرتی کرنے کے لئے مصر اور دیگر چھوٹے اسلامی کھلاڑیوں نے بھی حصہ لیا۔

چین

اس ضمن میں چین کا کردار اگرچہ گہنایا ہوا تھا لیکن دراصل یہ جنگ کے باضابطہ قوانین سے پہلوتہی کے مترادف تھا۔ سوویت یونین اور چین کے درمیان سنگین اختلافات 1960ء کے عشرے میں پیدا ہوئے جس سے کمیونسٹوں کی بین الاقوامی تحریک ماسکو نواز اور بیجنگ نواز دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ چینی دھڑے کا مؤقف یہ تھا کہ سوویت یونین کی سماجی سامراجیت بین الاقوامی پرولتاری اور سوشلسٹ انقلاب کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ 1970 کی دہائی میں پاکستان کی مدد سے امریکہ، چین قربت اس مفاہمت کی صورت میں سامنے آ چکی تھی کہ ایشیا میں سوویت یونین کے اثر ورسوخ کے سامنے بند باندھا جائے۔ ماؤزے تنگ کے جانشین ڈینگ ژیاؤ پنگ نے سوویت معیشت سے ناتا قطعی طور پر توڑنے کا فیصلہ کیا اور اس کی جگہ سرمایہ داری نظام سے رشتے استوار کر لئے۔ پالیسی میں اس 180 زاویے کی تبدیلی کے بعد امریکیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ سرمائے، ٹیکنالوجی اور مارکیٹوں تک چین کو رسائی دیں۔ چین نے سرمایہ داری کے قلعے کے طور پر مشہور امریکہ کے ساتھ فوجی تعاون بھی شروع کر دیا۔ اب اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ سوویت یونین کے خلاف سرگرم اتحاد میں شمولیت پر غور کرے۔

اس طرح جنوری 1980ء کو امریکی عہدیداروں نے بیجنگ کا دورہ کیا جہاں فریقین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ افغانستان اور ویتنام میں روسی مداخلت کا مقابلہ کرنے میں تعاون کریں گے ......ویتنام کمبوڈیا میں چین نواز پول پاٹ کے ساتھ مؤخرالذکر کی جنگ کے بعد سوویت یونین کے قریب آ گیا تھا۔ امریکیوں نے ٹیکنالوجی منتقل کرنے کا بھی خفیہ وعدہ کیا۔ یوں افغان جہاد کیلئے امریکہ، سعودی عرب، مصر اور چین کی امداد کا عمل شروع ہو گیا۔ (کولے، 2000ء:7-66۔ اس مداخلت کی ایک وجہ مشہور شاہراہ ریشم میں چین کی دلچسپی بھی تھی جو پاکستان اور چین کے درمیان سے گزرتی تھی اور افغان سرحد سے صرف 35 میل دور تھی۔ چین نے اپنے اور امریکہ کے ہتھیار وں کی ترسیل کیلئے اپنی فضائی حدود اور شاہراہ قراقرم کو استعمال کیا۔ بعدازاں مشکل کا شکار افغان صدر نجیب اللہ کے مطابق چینی فوجی امداد 40 کروڑ ڈالر سے تجاوز کر گئی۔ آئی ایس آئی نے اس بات کی تردید کی کہ ہتھیاروں کی فراہمی میں چین ملوث تھا۔ (ایضاً:80-72)۔

افغان جہاد کیلئے جنرل ضیاء کی حکمت عملی

پاکستان پہلے ہی افغان مہاجرین کے انبوہ کثیر کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس نے فراخدلانہ طور پر ان کو انسانی بنیادوں پر امداد پیش کی۔ اس کے علاوہ سوویت قبضے کے خلاف افغانیوں کی مزاحمت قائم کرنے کیلئے سہولیات بھی فراہم کیں۔ پاکستان کو کئی مغربی اور اسلامی ممالک کی ہمدردی اور تعاون بھی ملا۔ افغان جہاد میں پاکستان کے کردار پر کھلے دل سے تعریفی کلمات کہتے ہوئے برزنسکی نے لکھا کہ:

> ''افغانستان پر روس کے حملے سے قبل امریکہ اور پاکستان کے درمیان کافی دوری اور سرد مہری پائی جاتی تھی لیکن حملے کے بعد ہم نے نہایت قریبی تعاون کیا اور مجھے پاکستانیوں کے حوصلے کی بھی داد دینا ہے۔ انہوں نے زبردست بہادری دکھائی۔ وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھے اور انہوں نے وہ کام کر دکھائے جو ایک کمزور ملک سے کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم، مجھے بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے، نے نہایت مؤثر انداز میں ان کی مدد کی اور ان کی پشت پر کھڑے رہے لیکن وہ وہاں ڈٹے رہے حالانکہ خطرے میں وہ تھے، ہم نہیں تھے''۔ (برزنسکی، 2011)۔

یہ بتانے کی سر مو ضرورت نہیں کہ پاکستان کے ان معاملات کی باگ جنرل ضیاءالحق کے ہاتھ میں تھی اور پاکستان جو خطرہ مول لے رہا تھا وہ ان کی قیادت کو خراج تحسین تھا۔ 21 جنوری 1981ء کو منصب صدارت پر رونالڈ ریگن کے متمکن ہوتے ہی وائٹ ہاؤس، پینٹا گون اور محکمہ خارجہ کے افغان مہاجرین کی پشت پناہی کرنے کے رویے میں یک لخت تیزی آ گئی۔ چنانچہ 1982-87ء کے دورانیے میں پاکستان کیلئے 3 ارب 20 کروڑ ڈالر کے بھاری بھرکم امدادی پیکیج کا اعلان کیا گیا۔ اس امداد کو عسکری اور معاشی امداد میں برابر برابر تقسیم کیا گیا۔ پاکستان نے بھی بلا تامل امداد قبول کر لی۔ 21 اپریل 1981ء کو امریکی وزیر خارجہ الیگزینڈر ہیگ سے ملاقات کے بعد صحافیوں سے گفتگو میں آغا شاہی نے وضاحت کی کہ امریکی پیکیج اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ یہ بڑا ہے بلکہ اس لئے کہ:

''کارٹر انتظامیہ نے امداد کی جو پیشکش کی وہ امریکہ پاکستان تعلقات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی نہ ہی سابق پیکیج خطرے کی شدت سے مطابقت رکھتا تھا، اب ریگن انتظامیہ نے پاکستان کے لئے 5 سالہ پیکیج دیا ہے جو مختلف امر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ نئی امریکی انتظامیہ پاکستان کی آزادی کی زبردست حامی ہے''۔ (جین 2007ء اے،107)۔

بنیادی فرق یہ تھا کہ جمی کارٹر انتظامیہ میں صرف برزنسکی پاکستان کے حامی تھے جبکہ ریگن انتظامیہ پوری کی پوری افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جدوجہد کو درپردہ جنگ میں تبدیل کرنے میں پاکستان کی حمایت کے حق میں تھی۔

پاکستان کی بطور محوری ریاست ستائش شروع کر دی گئی (عارف، 2001ء:5-184)۔ اس کی خدمات کے صلے میں جنرل ضیاء نے مزاحمتی جدوجہد کو منظم کرنے اور فنڈز خرچ کرنے میں فری ہینڈ کا مطالبہ کیا جو امریکہ نے بخوشی منظور کرلیا۔ یوں پاکستان کو جدید اسلحہ اور متعلقہ ٹیکنالوجی بڑے پیمانے پر مل گئی اور بھارت کے مقابلے میں اس کا اسلحہ کا ذخیرہ کئی سال کی پابندی کے بعد بحال ہو گیا۔ اگرچہ امریکی کانگریس کے بعض ممتاز ارکان نے پاکستان کے جوہری پروگرام پر تشویش کا اظہار کیا لیکن امریکی حکومت نے اسے نظر انداز کر دیا۔ (حقانی، 2005:216)۔ پاکستان نے خفیہ طور پر اپنا ایٹمی پروگرام جاری رکھا۔ (ایضاً:185)۔ جنرل ضیاء الحق نے باقاعدہ فوج کی بجائے آئی ایس آئی کو سوویت یونین اور افغان کمیونسٹوں کے خلاف کارروائیوں کی منصوبہ بندی کی بنیادی ذمہ داری سونپ دی۔ اگرچہ سی آئی اے اور آئی ایس آئی مل کر کام کر رہی تھیں لیکن اصل کارروائیاں تن تنہا آئی ایس آئی نے ہی کیں۔ ان کارروائیوں میں ایلیٹ کمانڈوز ایس ایس جی کا بہت گہرا کردار تھا۔ (ایضاً:186)۔ پوری دنیا میں جہاد کے نعرے کی گونج سنائی دینے لگی۔43 مسلمان اور بعض مغربی ملکوں سے مسلمان جہادی پشاور شہر آنے لگے۔ مجاہدین کے طور پر مشہوران جنگجوؤں کو آئی ایس آئی نے جدید ہتھیار اور دھماکہ خیز مواد چلانے کی تربیت دی۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں غیر ملکی عسکریت پسند پشاور آئے وہاں اس جدوجہد آزادی کی حقیقی معنوں میں ریڑھ کی ہڈی افغان اور پاکستانی مجاہدین تھے۔ کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے بعض لبرل دھڑوں کو چھوڑ کر افغانستان کے تمام مکاتب فکر نے جہاد میں حصہ لیا۔ بشمول دیوبندی، وہابی اور صوفی مسلمانوں کے۔ بالکل انہی خطوط پر پاکستان میں جماعت اسلامی، اہل حدیث اور

دیوبندی جماعت جمعیت علما اسلام بھی افغان جہاد کیلئے نوجوانوں کی بھرتی اور ذہنی تربیت کے کام میں ملوث تھیں۔ حتیٰ کہ صوفی مکتبہ فکر کے بریلویوں نے بھی اس مذہبی جنگ میں حصہ لیا۔ (رانا 2004ء: راشد 2000)۔

مدارس اور مجاہدین

فوری موبلائزیشن اور بھرتی کے ساتھ مذہبی مدرسوں کے ذریعے طول المدت سرمایہ کاری بھی کی گئی۔ ضیاء الحق نے سعودی عرب کے مخیّر حضرات کی حوصلہ افزائی کہ وہ افغان سرحد کے ساتھ مدرسے قائم کریں۔ مذہبی مدرسے..... جہاں طلباء کو اسلامی فقہ، شریعت اور عقائد پر مبنی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمیشہ سے مسلم معاشروں کا حصہ رہے اور حکومتوں، نجی چندہ اور فنڈز دینے والوں کی طرف سے انہیں امداد فراہم کی جاتی ہے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ برصغیر میں نوآبادیاتی نظام سے پہلے اعلیٰ خاندانوں کے بچے ان مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ یہاں سے فارغ التحصیل طلبا مساجد اور دیگر مذہبی اداروں میں تعینات کئے جاتے۔ یہ منظرنامہ اس وقت تبدیل ہوگیا جب انگریزوں کے دور میں جدید تعلیم کے حامل سیکولر سکول کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ملازمت کے لئے ضروری تھا کہ مختلف قسم کے علوم اور تربیت حاصل کی جائے۔ اس کے بعد مذہبی مدارس میں زیادہ غریب خاندانوں کے بچے جانے لگے جہاں نہ صرف انہیں کپڑے، مفت تعلیم، رہائش اور دیگر سہولیات ملتی تھیں بلکہ مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں مساجد اور دیگر مذہبی اداروں میں ملازمتیں ملتی تھیں۔ 1970 کے عشرے میں پاکستان میں محض چند سو مدارس تھے لیکن اسلام کو بطور جہادی نظریہ سیاسی رنگ دینے کے بعد 1980 کی دہائی کے وسط تک یہ تعداد 12 ہزار سے 15 ہزار تک پھیل گئی... بالخصوص پاک افغان سرحد کے ساتھ... ایک اندازہ ہے کہ 15 لاکھ سے 20 لاکھ طالبان انہی مدارس کی پیداوار تھے۔ (علی، 2009ء: 25-15)۔

اس سلسلے میں جہادی نظریے کے فروغ کیلئے امریکہ کا کردار قابل توجہ ہے۔ مسٹر جوسٹیفن اور ڈیوڈ بی اوٹاوے نے ''امریکہ کی طرف سے جہاد کی اے بی سی'' کے عنوان سے ایک آرٹیکل (23 مارچ 2002) میں لکھا ہے کہ یو ایس ایڈ کی 5 کروڑ ڈالر مالیت سے یونیورسٹی آف نبراسکا-اوماہا کے سنٹر آف افغانستان سٹڈیز نے سکولوں کا جو درسی نصاب شائع کیا اس کا مطمح نظر مجاہدین میں

جہاد کے نظریے کو فروغ دینا تھا۔انہوں نے لکھا کہ:

''سرد جنگ کے ابہام زدہ ماحول میں امریکہ نے افغان بچوں کو لاکھوں ڈالر مالیت کی درسی کتابیں فراہم کیں جو پر تشدد تصاویر اور عسکریت پسند اسلامی تعلیمات سے بھری تھیں۔اور یہ عمل سوویت یونین کے قبضے کے خلاف مزاحمت تیار کرنے کی خفیہ کوششوں کا حصہ تھا۔

ابتدائی قاعدہ جہادی تعلیمات اور بندوقوں، گولیوں،فوجیوں،سرنگوں کی تصویروں سے مزین تھا اور اس وقت سے افغانستان کے بنیادی نصاب کے طور پر سکولوں میں رائج تھا۔حتیٰ کہ طالبان نے بھی امریکہ کی تیار کردہ کتابیں استعمال کیں۔اگرچہ انہوں نے سخت گیر بنیاد پرستی کے تحت انسانی چہرے ہٹادیئے''۔(2002ء)۔

بیشتر کتابیں پاکستان میں شائع کی گئیں۔1984 سے 1994 کے دوران ایک کروڑ 30 لاکھ کتابیں افغان مہاجر کیمپوں اور پاکستانی مدرسوں میں تقسیم کی گئیں۔''جہاں طلباء کو بنیادی ریاضی کے مضمون میں مردہ روسیوں اور کلاشنکوفوں کی تعداد پڑھائی جاتی تھی''۔(جان:2002)۔اس پروگرام کے تحت چوتھی جماعت کی ایک کتاب کا ذکر معروف ماہر طبعیات اور سیاسی تجزیہ نگار اور محمود ہمدانی نے اس کا حوالہ دیا ہے۔اس میں یہ مشق بھی شامل تھی:''کلاشنکوف (یہ جدید رائفل سوویت یونین کی ایجاد تھی) کی رفتار 800 میٹر فی سیکنڈ ہے۔اگر ایک روسی فوجی کسی مجاہد سے 3200 میٹر کے فاصلے پر ہو اور روسی کے سر کو نشانہ بنانا چاہتا ہو تو اسے روسی کی پیشانی کا نشانہ بنانے میں کتنے سیکنڈ لگیں گے''۔(ہمدانی:2004، 137)۔میں نے نبراسکا یونیورسٹی کے پروفیسر جیک شروڈر سے ڈاکٹر سلیم علی کے ذریعے رابطہ کیا جنہوں نے پاکستان میں مدارس پر تحقیق کی تھی۔ شروڈر نے اس بات کی تردید کی کہ ایسا مواد نبراسکا میں شائع ہوا اور دعویٰ کیا کہ یہ سب کچھ افغانستان میں مقامی سطح پر ہوا۔انہوں نے مجھے ریاضی کے ایک سبق کی اصلی کاپی ارسال کی جس میں طلباء کو مردہ روسیوں کی تعداد کے ذریعے سبق پڑھایا جاتا تھا۔نیچے اس کی تفصیل دی گئی ہے۔

ضرب الاعداد

تعریف:ایک جیسے اعداد کو جمع کرنے کا مختصر ترین طریقہ ضرب کہلاتا ہے۔

مثال نمبر1:

24 مجاہدوں کے ایک گروپ نے روسیوں پر حملہ کیا۔ ہر مجاہد نے 12 روسی مارے، بتائیں کتنے جارح روسی مارے گئے۔

12x24=288

مثال نمبر 2:

ایک مدرسے میں 1465 طلبا ہیں۔ ہر طالبعلم کو 15 کتابیں دی گئیں۔کل کتنی کتابیں تقسیم کی گئیں۔

1465 x 15=21,975

نوٹ: یہ حوالہ افغانستان کی جلاوطن وزارت تعلیم کی تیار کردہ کتابوں میں سے ایک سے حاصل کیا گیا ہے۔ کتابیں 1980 کی دہائی میں اقوام متحدہ کی پشاور میں ٹیم نے شائع کیں۔اس سے طالب علم کی ریاضی کی صلاحیت بڑھانا تھا لیکن اس سے افغان مجاہدین کی روزمرہ کی زندگی کی بھی عکاس ہوتی ہے۔

....

اگر چہ یہ پروگرام 1994ء میں ختم کر دیا گیا لیکن درسی کتابوں کی مدارس میں تدریس بدستور جاری رہی۔سٹیو کول نے خیال ظاہر کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ روسی فوجی مارنے کی مثال سے حظ اٹھانے کا عمل اسلام آباد میں سی آئی اے کے سٹیشن چیف ہاورڈ ہارٹ کے ذہن کی کارستانی لگتی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''سی آئی اے میں کئی افراد کیلئے افغان جہاد کا اول و آخر مطلب روسیوں کو مارنا تھا۔ہاورڈ ہارٹ نے یہ تجویز دی کہ پاکستان سوویت سپاہیوں کے سر کی قیمت بھی لگا دے۔سپیشل فورسز کے فوجی کی موت پر 10 ہزار روپے، ایک عام فوجی کی ہلاکت پر 5 ہزار روپے جبکہ زندہ قیدی پکڑنے کی دگنی قیمت۔ یہ دراصل شمالی ویتنام اور ویت کانگ میں سوویت یونین کی امداد کا بدلہ تھا۔اور سی آئی اے کے کئی اہلکاروں جنہوں نے اس جنگ میں حصہ لیا کے نزدیک یہ کام خالصتاً ذاتی عناد تھا''۔(کول،59:2004)۔

ایسے اقدامات سینکڑوں، ہزاروں مجاہدین میں پرتشدد کلچر فروغ دینے کا باعث بنے ہوں گے۔اور ایک دن آیا کہ خود امریکہ بھی اس کا شکار ہو گیا لیکن اس وقت کسی کو احساس نہیں تھا۔ میں

نے سی این این اور بی بی سی پر خود سی آئی اے کے ایجنٹوں کو کسی جھجک کے بغیر یہ کہتے سنا کہ یہ پالیسی دشمن کو جنگ میں شکست دینے میں نہایت مؤثر اور دور رس ثابت ہوئی۔ مالی فوائد کا اعلان کرنے کا ایک اور منفی اثر یہ پڑا کہ کرپشن، رشوت ستانی، اسلحے کی غیر قانونی تجارت کو فروغ ملا اور پورے افغان معاشرے میں پوست کی کاشت کی برائی سرایت کر گئی اور پاکستان اور آئی ایس آئی بھی یقیناً اس سے متاثر ہوئے، جہاں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کئی مواقع پر اعتراف کیا کہ ایسی عفریتیں پیدا کرنا امریکہ کی غلطی تھی وہاں میں نے پاکستان میں سابق امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین (جولائی 2001ء سے جون 2002ء تک تعیناتی) سے یہ سوال کیا کہ کیا وہ محسوس کرتی ہیں کہ امریکہ ایسی دہشت گردانہ سوچ پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے تو انہوں نے تنک کر جواب دیا کہ جنرل ضیاء الحق نے پاکستانی معاشرے کو انتہا پسند اسلامی معاشرہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ امریکہ کی نائب وزیر خارجہ برائے جنوبی ایشیا رابن رافیل جن کے شوہر آرنلڈ رافیل ضیا دور میں پاکستان میں سفیر رہے (اور طیارے کے حادثے میں ضیاء الحق کے ساتھ ہلاک بھی ہوئے) نے اس بات پر زور دیا کہ اس دور میں پاکستان کے لئے ضروری تھا کہ وہ سوویت یونین کی مداخلت کی خواہش کے خلاف اپنی سلامیت اور بقا کی جنگ لڑے اور اس کیلئے امریکہ نے پاکستان کو اہم امداد فراہم کی۔

سٹرٹیجک گہرائی

جس وقت پاکستانی فوج نے افغانستان میں اپنے کردار کو توسیع دی، اس کے ساتھ اس نے خطے میں اپنی حیثیت کا از سر نو تعین کیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ پاکستان کے دفاعی ارباب بست وکشاد کو ہمیشہ بھارت کے مقابلے میں پاکستان کی ''سٹرٹیجک گہرائی'' کے فقدان پر پریشانی رہی۔ (چیمہ: 2003ء:3)۔ چنانچہ اس خلا کو پر کرنے کے عزائم اور اس سوچ کو تقویت ملی کہ اسلامی نظریے اور عقیدے کے باعث ایک ایسی عسکری قوت وجود میں آئی ہے جس نے سوویت یونین کو شکست دی۔ (بلکہ ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا) چنانچہ ایک ایسے منصوبے کی تیاری پر غور کیا جانے لگا جس میں ایک اسلامی بلاک......قائم ہو۔ اس سے اگلے مرحلے یں وسطی ایشیا کی کئی مسلم ریاستوں، ایران اور ترکی پر مشتمل اسلامی ممالک کی کنفیڈریشن کا قیام عمل میں لانا شامل ہے۔

جنوبی ایشیا کے امور کے ممتاز امریکی ماہر سلیگ ہیری سن نے ایک انٹرویو میں دعویٰ کیا کہ افغانستان میں جنرل ضیاء الحق کی مداخلت کا مقصد خطے میں ایک ''پان اسلامی سپر سٹیٹ'' کا قیام عمل میں لانا تھا۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ ضیاء الحق کے اس منصوبے کو پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے طاقتور حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ (ہیری سن، 2001)۔ تاہم پاکستان کے نقطہء نظر سے افغان جہاد کا اولین فائدہ یہ تھا کہ نہ صرف بڑی مقدار میں اسلحہ، جدید ٹیکنالوجی آئی بلکہ لڑنے کا تجربہ بھی حاصل ہوا۔ (حسن 1990ء:92)۔ یہ فوائد بھارت کے ساتھ حساب برابر کرنے میں بھی استعمال ہو سکتے تھے۔ بھارت نے 1971ء میں پاکستان کو شرمناک ہزیمت سے دوچار کیا وہ مسلم اکثریتی علاقے کشمیر پر بھی قابض تھا۔

سوویت یونین کو پہنچنے والے نقصانات

1984ء کے سی آئی اے کے ایک شروع کے تخمینے کے مطابق افغان مجاہدین نے 17 ہزار فوجی ہلاک یا زخمی، 350 سے 400 سوویت طیارے، 2750 ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں جبکہ 8 ہزار کے لگ بھگ گاڑیاں اور ٹرک تباہ کئے۔ یہ مقاصد امریکی ٹیکس دہندگان کے 300 ملین ڈالر سے حاصل کئے گئے جبکہ سعودی عرب نے 20 کروڑ ڈالر کی امداد دی۔ سی آئی کے ڈائریکٹر ولیم کیسے اس جہاد کے پرعزم چیمپئن بن کر ابھرے۔ رونالڈ ریگن دوبارہ امریکہ کے صدر منتخب ہو چکے تھے اور پہلے سے بھی زیادہ قدامت پسند خیالات کے مزید لوگ ریگن انتظامیہ میں شامل ہو گئے۔ وہ افغان جہاد کو خدا کا دیا ایک موقع سمجھتے تھے جس سے ایک ''شیطانی'' ایمپائر کو شکست دی جا سکے۔ امریکہ میں متعصب کمیونسٹ مخالف لابی کے سب سے بڑے بھونپو کانگریس مین چارلی ولسن تھے۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کر لئے اور سی آئی اے کے خفیہ افغان بجٹ میں مزید پیسہ اور ہتھیاروں کے جدید سسٹم بھیجنا شروع کر دیے.... بالخصوص سٹنگر میزائل جو ایک فوجی کے کندھے سے چلایا جا سکتا تھا اور سوویت ائیر فورس کیلئے نہایت مہلک ثابت ہوا کیونکہ ہیلی کاپٹر اور فکس پروں والے طیارے ان کا آسانی سے ہدف بننے لگے۔

کمیونزم کے خلاف اسلامی۔مسیحی جنگ

انتہائی کمیونسٹ مخالف جذبات رکھنے والے متعدد راسخ العقیدہ کیتھولک عیسائی اب

افغانستان میں خفیہ کارروائیاں چلا رہے تھے۔ ایسی سوچ نے انہیں اسلام پسند انتہا پسندوں کے مزید قریب کر دیا جو سوویت فوجوں کے خلاف اصل کارروائیاں کر رہے تھے۔ (کول، 2004 :89-93) سٹیو کول نے مذہبی جنونیت کے رجحان کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ولیم کیسے سوویت سامراج کی شکست کیلئے سی آئی اے کی خفیہ سرگرمیوں میں سیاسی، اسلامی اور کیتھولک چرچ کو ''حقیقت پسندانہ انسداد شورش'' میں فطری اتحادی سمجھتا تھا۔ (ایضاً:8-97)۔ جہاد کے ''عظیم چیمپئن'' چارلس ولسن نے بھی اسلامی عسکریت پسندوں کیلئے سٹنگر میزائل خریدے۔ ان میں سے بیشتر اسلحے کی غیر قانونی منڈی تک جا پہنچے۔ اس کے نتیجے میں افغان جہاد کی فنڈنگ میں ڈرامائی اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ آئی ایس آئی کے آپریشنز سمیت سوویت یونین کی وسط ایشیائی ریاستوں کے اندر عسکری اہداف کے خلاف کارروائیوں میں تیزی آئی۔ کے جی بی اور خاد نے پاکستان کے اندر تخریب کاری اور قتل و غارت گری کرائی۔ 1987ء تک پوری دنیا میں ہونے والے دہشت گردی کے 770 واقعات میں سے 90 فیصد پاکستان میں ہوئے۔ (عباس 2005ء:122)۔ لہذا اسے اینٹ کا جواب پتھر کہا جا سکتا ہے۔ جب ہلاکتیں بڑھیں تو سوویت یونین نے امریکہ اور پاکستان دونوں کو وارننگ بھیجی۔ جہاں امریکیوں نے سرے سے اپنے ملوث ہونے کو مسترد کر دیا وہاں جنرل ضیاء نے ایسی کارروائیوں کے انچارج بریگیڈیئر محمد یوسف کو حکم دیا کہ ذرا دھیرے چلو کیونکہ اس سے دہشتگردی پھیلنے کا خطرہ ہے۔ کئی عرب مجاہدین نے یہ ہتھکنڈے نہایت دلچسپی سے سیکھے اور آخر کار ایک دن القاعدہ نے الٹا امریکیوں کو سبق سکھایا۔

15 دسمبر 1986ء کو ولیم کیسے کو دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ چند ہفتے بعد چلے بسے۔ اس کے بعد امریکی پالیسی سازوں کے رویے میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس حکمت عملی کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار ہونے لگا جس سے گلبدین حکمت یار جیسے امریکہ مخالف اسلام پسندوں کو تقویت مل رہی تھی۔ جنہیں جنرل ضیاء اور آئی ایس آئی کئی افغان رہنماؤں کے درمیان اپنا آدمی سمجھتے تھے۔ تاہم سی آئی اے نے آئی ایس آئی کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔ مشن اب بھی یہی تھا کہ روسیوں کو مارو۔ کرنل امام (اصل نام سلطان امیر، پنجابی جاٹ ہیں اور روانی سے پشتو بولتے ہیں) نے دسمبر 2008ء کو راولپنڈی میں ایک تفصیلی انٹرویو میں مجھے بتایا کہ انہوں نے سینکڑوں کی تعداد میں افغان اور پاکستانی پشتونوں کو تربیت دی اور ان کی قیادت کی اور اس کا

مقصد روسیوں کی ہلاکت تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں کیونکہ وہ اسلام کی سربلندی کیلئے یہ کام کررہے تھے۔ البتہ افغانوں کی مزاحمتی تحریک میں کسی حد تک یہ تنقید ضرور پائی جاتی تھی کہ آئی ایس آئی پاکستان کے مفادات کیلئے جہاد کو استعمال کررہی تھی۔ ان ناقدین میں مقامی سطح کا کمانڈر عبدالحق بھی شامل تھا جس کی ایک ٹانگ جنگ میں ضائع ہوگئی۔ اسے امریکیوں اور امریکی صحافیوں کا بھرپور اعتماد حاصل تھا۔

بہرحال اس دوران سوویت یونین میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری گورباچوف اور ان کے مشیروں نے 1987ء کے اوائل سے افغانستان میں سوویت فوجوں کی موجودگی کی سوچ پر شکوک وشبہات کا اظہار شروع کردیا کیونکہ اس سے جانی، مادی نقصان کے علاوہ ملکی وقار کا بھی بہت بڑا نقصان ہوا۔ (عارف، 2001:179)۔ گورباچوف نے پرانے کمیونسٹ نظام میں اصلاحات شروع کیں اور وہ اس روایتی نظام سے قطع تعلق کرنے کے خواہاں تھے جو انہیں اپنے پیشروؤں سے ورثے میں ملا۔ وہ اور ان کے مشیر اسی تناظر میں افغانستان کے جھنجھٹ سے بھی نکلنا چاہتے تھے۔ وہ افغانستان سے مذاکرات کے ذریعے ایسا انخلا چاہتے تھے جس سے اقتدار اسلام پسندوں کی بجائے افغان جدت پسندوں کو منتقل ہو۔ سوویت وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورڈناڈزے نے ایسے ارادوں کے بارے میں دورہ واشنگٹن میں اپنے امریکی ہم منصب جارج شلز کو آگاہ کیا۔ اس پر بعدازاں واشنگٹن میں سی آئی اے اور کے جی بی کے سربراہوں نے بھی تبادلہ خیال کیا۔ (کول، 2004ء:168)۔

دوسری طرف افغان کمیونسٹ اس تشویش میں مبتلا تھے کہ اگر سوویت یونین والے افغانستان سے نکل گئے تو وہ شاید اقتدار پر کنٹرول برقرار نہ رکھ سکیں۔ اس دوران سوویت یونین کی مدد سے افغانستان کے اقتدار پر فائز ہونے والے ببرک کارمل کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ ملک کے سربراہ مقرر ہوگئے۔ سوویت یونین کی ہدایت پر نئی حکومت نے جدیدیت سے ہم آہنگ کثیر الجماعتی نظام اور اسلامی قوانین سے مزین تصور ابھارنے کی کوشش کی لیکن ان تبدیلیوں سے زیادہ فرق نہیں پڑا کیونکہ افغان اسلام پسند اور آئی ایس آئی نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام کے درپے تھے۔ دوسری جانب کمیونسٹ دور سے مستفید ہونے والے تعلیمیافتہ خواتین اور لبرل سوچ کے حامل افغانوں کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں حکمت یار جیسا اسلام پسند ملک کا اقتدار نہ سنبھال لے۔

اسلام آباد میں تعینات سی آئی اے کے ایسے افسروں کی مخالفت کے باوجود جو بدستور آئی ایس آئی پر اعتماد جاری رکھنا چاہتے تھے 1988 کے موسم بہار میں امریکی محکمہ خارجہ نے ایڈمنڈ مک ولیمز کو یہ ذمہ داری سونپ دی کہ وہ آئی ایس آئی کو بتائے بغیر افغانستان کے باغی رہنماؤں سے رابطے بڑھائیں۔ امریکیوں کا اب روسیوں کے ساتھ یہ خاموش معاہدہ تھا کہ افغانستان سے ریڈ آرمی کے انخلا کے بعد اقتدار میں اسلامی بنیاد پرست حکومت نہیں آنی چاہیئے۔ دونوں سپر پاوروں کی کوششوں سے آخر کار اپریل 1988 میں جنیوا معاہدے پر دستخط ہو گئے جس کے تحت 5 مئی 1988ء کو روسی فوج کو افغانستان سے نکلنا شروع کرنا تھا اور یہ عمل 15 فروری 1989ء تک مکمل کیا جانا تھا۔ معاہدے کے تحت پاکستان اور افغانستان کو ایک دوسرے کے ملک میں مداخلت نہ کرنے کا پابند بنایا گیا اور یہ کہ افغان مہاجرین کی رضا کارانہ واپسی کے لئے تعاون کیا جائے گا۔ امریکہ اور سوویت یونین اس معاہدے کے ضامن بن گئے۔ افغان باغی نہ مذاکرات اور نہ معاہدے کے فریق تھے چنانچہ انہوں نے معاہدہ مسترد کر دیا۔ اس وجہ سے روسی فوجوں کے انخلا کے بعد بھی افغانستان میں خانہ جنگی جاری رہی۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کو بھی مذاکرات سے مطلق دور رکھا گیا بالخصوص جنرل ضیاء اور آئی ایس آئی کے نئے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کو جنہیں امریکیوں نے غلطی سے مغرب نواز سمجھے رکھا لیکن وہ افغانستان میں گلبدین حکمت یار کی قیادت میں پاکستان نواز حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ (کول: 2004ء: 7-174)۔

پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر امریکی خدشات

افغانستان میں تعاون سے قطع نظر جمی کارٹر انتظامیہ نے پاکستان پر دباؤ جاری رکھا کہ وہ ایٹمی اسلحہ بنانے کا پروگرام ترک کر دے لیکن یہ دباؤ بے کار ثابت ہوا۔ اس کا اعتراف امریکی حکام کے درمیان خفیہ خط و کتابت سے بھی ہوا۔ پاکستانی حکام یہ کہتے رہے کہ یہ ان کے ملک کا بلا روک ٹوک حق ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرے۔ (دی یونائیٹڈ سٹیٹس اینڈ پاکستان کوئیسٹ فار دی بمب 2010)۔ بہرحال امریکی دباؤ کے باعث فرانس نے 23 اگست 1978ء کو پاکستان کے ساتھ نیو کلیئر پراسیسنگ پلانٹ کی فراہمی کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ یہ فیصلہ پاکستان کیلئے ایک دھچکا تھا لیکن کہوٹہ پلانٹ پر کام پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور ضیاء الحق اس کی تکمیل کیلئے بھرپور حمایت کر رہے

تھے۔زاہد ملک نے لکھا ہے کہ سکیورٹی کے مسائل کے ساتھ ساتھ پاکستان کے جوہری پروگرام کا ضیاءالحق کے عزم کا ایک نظریاتی پہلو بھی تھا۔ ہر وہ پاکستانی جو دوقومی نظریے پر یقین رکھتا ہے وہ یہ یقین محکم رکھتا ہے کہ پاکستان کا وجود صرف بھارت کی سیاسی اور عسکری حوالے سے مخالفت کر کے ہی باقی رہ سکتا ہے۔(ملک، 1990ء:78)۔

افغانستان میں روسی فوجیں داخل ہونے کے بعد امریکی دباؤ مدہم پڑ گیا۔سوچ میں یہ تبدیلی کارٹر دور میں شروع ہوگئی اور اس کا سہرا برزنسکی کے سر تھا۔صدر ریگن کے دور میں تو یہ دباؤ انتہائی نچلی سطح پر چلا گیا۔پاکستان کو جوہری عزائم سے باز رکھنے کے لئے ریگن انتظامیہ نے سمنگٹن ترمیم کو مزید تبدیل کرتے ہوئے پاکستان کو مرحلہ وار 40 ایف 16 طیارے فروخت کرنے پر رضا مندی ظاہر کر دی۔اس موقع پر دعویٰ کیا گیا کہ ایسے جدید طیارے بھارت کے ساتھ طاقت کا توازن نہیں بگاڑیں گے اور یہ کہ ریگن انتظامیہ بھارتی تشویش سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔یہ بھی قرار دیا گیا کہ پاکستان کو اپنے دفاعی کردار کیلئے ایف16 طیاروں کی ضرورت ہے۔(جین، 2007 اے :8-327)۔ بہر حال اصل بات یہ تھی کہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں خدشات پیچھے چلے گئے۔مثال کے طور پر 12 ستمبر 1983 کو نائب معاون وزیر خارجہ مارشل نے ریگن انتظامیہ کے خدشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''امریکہ کو پاکستان کے مخصوص منصوبوں پر بدستور تشویش لاحق ہے ۔۔۔ بالخصوص اس کے نئے غیر محفوظ لیبارٹری پراسیسنگ پلانٹس اور اس کی افزودگی پلانٹ مکمل کرنے کی غیر محفوظ کوششوں پر''۔(ایضاً: 330)۔رسمی طور پر امریکہ پاکستان سے کہتا رہا تھا کہ وہ ایٹمی عدم پھیلاؤ کے معاہدے این پی ٹی پر دستخط کر دے۔1987ء تک یہ بات واضح ہوتی جارہی تھی کہ ریڈ آرمی کو افغانستان سے واپس دھکیلنے کا کام اب زیادہ دور کی بات نہیں۔ چنانچہ ریگن انتظامیہ کے مؤقف میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔پاکستان پر دباؤ ڈالا گیا کہ 4 ارب ڈالر سے زائد کا امدادی پیکیج امریکی کانگریس میں پیش کرنے سے پہلے این پی ٹی دستخط کیے جائیں ۔(ملک 1990: 80)۔ضیاءالحق نے اس دباؤ کی مزاحمت زبردست سفارتی مہارت سے کی۔ صدر ریگن اور ارکان کانگریس کے ساتھ ملاقاتوں میں ضیاءالحق اپنے اس دعوے پر مصر رہے کہ پاکستان ایٹمی ہتھیار بنانے میں چنداں دلچسپی نہیں رکھتا۔لیکن حقیقت زیادہ دیر تک نہ چھپائی جا سکی۔حسن عباس کے مطابق پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے مبینہ بانی ڈاکٹر عبدالقدیر

خان ۔۔۔'' جو دولت اور شہرت کے پیچھے دوڑنے میں مشہور ہیں۔ انہوں نے 1987ء کے شروع میں ایک اخباری سٹوری میں اپنا منہ کھولا جس سے ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ اس خبر میں قدیر خان نے دعویٰ کیا کہ پاکستان یورینیم کو ہتھیاروں کی تیاری کی سطح تک افزودہ کرنے میں کامیابی حاصل کر چکا ہے''۔ (عباس، 2005ء:119)۔

اس انکشاف کے 3 ماہ کے اندر امریکہ میں 3 جبکہ کینیڈا میں 2 پاکستانیوں کو ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں معاون آلات اور مواد غیر قانونی طور پر پاکستان برآمد کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ پاکستان نے اس عمل سے لاتعلقی کا اعلان کیا تاہم امریکی اس دعوے سے متاثر نہ ہوئے۔ (ایضاً)۔

بھارت کے ساتھ تعلقات

ضیاء الحق کی سیاسی مہارت کا انتہائی دلچسپ پہلو یہ تھا کہ جہاں انہوں نے پاکستان کی اسلام پسند شناخت کیلئے نظریاتی عقائد اور سیاسی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا وہاں انہوں نے عوامی سطح پر بیانات کے برعکس بھارت کے خلاف روایتی دشمنی نہایت کامیابی سے آگے بڑھائی۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ چونکہ پاکستانی فوج افغانستان میں اُلجھی ہوئی تھی اس لئے ضروری تھا کہ بھارت مشرقی سرحدوں پر کوئی گڑ بڑ نہ کرے۔ ضیاء الحق نے یہ بات یقینی بنائی کہ امریکہ بھی یہ پہلو ذہن نشین رکھے۔ انہوں نے خود بھی بھارت کو روکنے کیلئے کئی سفارتی اقدامات کئے۔ مثال کے طور پر انہوں نے تجویز دی کہ دونوں ملک این پی ٹی پر دستخط کر دیں۔ ایک اور اقدام تجویز کیا کہ پاکستان اور بھارت دونوں اپنی ایٹمی تنصیبات اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کے لئے کھول دیں۔ انہوں نے یہ معاہدہ کرنے کی بھی تجویز دی کہ دونوں ملک ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کا پروگرام روک دیں اور ایک دوسرے کی جوہری تنصیبات کا معائنہ کریں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان اور بھارت سمیت جنوبی ایشیا کے تمام ممالک خطے کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک قرار دے دیں۔ (ملک :1990: 81)۔ بین الاقوامی محاذ پر پاکستان کو نمایاں ستائش ملی کیونکہ 1985ء میں این پی ٹی پر مشروط دستخط پر آمادگی کے اعلان سے یہ عالمی فورم پر مقبول موضوع بن گیا۔ (ایضاً:81-80)۔

کریگ باکسٹر نے ضیاء الحق کی سفارتکاری کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''بھارت اس تجویز کو قبول کر سکتا تھا نہ رد کر سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ضیاء الحق پاکستان کا ایٹمی پروگرام ختم کرنے کے حق میں تھے لیکن اس کے لئے بھارت سے کچھ رعایتیں چاہتے تھے۔ پروگرام ختم کرنے سے نہ صرف ان کے خیال میں قومی وسائل کی بچت ہوتی بلکہ ضیاء الحق امریکہ خصوصاً ارکان کانگریس کے قریب ہو جاتے۔ پاکستان نے بھارت کو ''نو وار پیکٹ'' کی بھی پیشکش کی لیکن اسے بھارت کی خاص پذیرائی نہ مل سکی''۔ (باکسٹر 1991ء: 40-139)۔

چین جس نے بھارت کو 1962ء میں شکست سے دوچار کیا اور 1964 سے ایٹمی طاقت بھی تھا کے بارے میں بھارتی خدشات کا مطلب یہ تھا کہ ضیاء الحق کی تجاویز پر کان نہ دھرے جائیں۔ اس کے ساتھ بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی بھارت کے سکھ اور بعد ازاں کشمیری علیحدگی پسندوں کی مبینہ درپردہ حمایت کے بعد ضیاء حکومت کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار تھی۔ بھارتی پنجاب میں سکھوں کی ریاست خالصتان کے قیام کا منصوبہ شمالی امریکہ اور برطانیہ میں مقیم سکھوں کی ذہنی پیداوار تھا لیکن 1980ء کی دہائی میں اس وقت بھارت کیلئے سنگین سیاسی خطرہ بن گیا جب اندرا گاندھی نے مشرقی پنجاب میں قدامت پسند سکھ جماعت اکالی دل کی قیادت کے خلاف بنیاد پرست سکھ مبلغ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کی حمایت شروع کر دی۔ اکالی دل پنجاب اور مرکز میں کانگریس حکومت کی اپوزیشن بھی تھی۔ بھارت نے الزام لگایا کہ خالصتان تحریک کے 2 بڑے رہنما ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان اور گنگا سنگھ ڈھلوں۔۔ مؤخر الذکر لیڈر پہلے برطانیہ اور پھر امریکہ میں مقیم رہا۔۔ امریکی ارکان کانگریس اور اعلیٰ پاکستانی عہدیداروں سے رابطے میں تھے۔ (پنجاب کی تحریک پر وائٹ پیپر، 1984)۔ بھارتی حکومت اور پریس نے الزام لگایا کہ پاکستان سکھ علیحدگی پسندوں کو اڈے، تربیت اور امداد فراہم کر رہا ہے۔ پاکستان کی مبینہ مداخلت ضیاء دور (88-1977) میں اپنے نقطہء عروج پر پہنچ گئی۔ البتہ پاکستان نے اس کی تردید کی۔ جہاں تک بھارت کے زیر انتظام کشمیر کا تعلق ہے تو وہاں اگرچہ جہاد ضیاء دور کے بعد شروع ہوا لیکن اس جہاد کا بنیادی فریم ورک ضیاء دور میں ہی تیار ہوا تھا۔ 31 جولائی 1988ء کو مسلح جدوجہد کا اس وقت آغاز ہوا جب جموں کشمیر لبریشن فرنٹ نے سری نگر میں 3 سرکاری عمارتوں کو بموں سے اڑا دیا۔ (نورانی، 1991: 123)۔ کشمیر کے وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ نے الزام لگایا کہ پاکستان جے کے ایل ایف کی امداد کر رہا ہے۔ یہ الزام اگست 1988 کو طیارے کی تباہی میں ضیاء الحق کی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے

اگایا گیا۔

سیاچن

پاکستان اور بھارت کے درمیان براہ راست تصادم سیاچن گلیشئر کی بلندیوں پر ہوا جو متنازعہ خطہ کشمیر میں واقع ہے۔ سیاچن گلیشئر سطح سمندر سے 20 ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ سرد ترین موسم کے باعث یہاں انتہائی دشوار حالات ہوتے ہیں اور ایسے سخت ماحول میں وہاں اڈہ قائم کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ یہ پورا علاقہ 900 سے ایک ہزار مربع میل پر مشتمل ہے۔ سیاچن کے تنازعے نے پاکستان اور بھارت کے درمیان غیر مکمل حد بندی والے علاقے NJ9842 سے جنم لیا جسے سیاچن گلیشئر کہا جاتا ہے۔ 1972ء کا شملہ معاہدہ بھی اس مسئلے کے حل کا کوئی ذکر نہیں کرتا اور محض یہ لکھا ہے کہ "NJ 9842 کے علاقے سے سرحد آگے گلیشئر کے شمال تک جائے گی"۔ البتہ پاکستان نے سیاچن کے علاقے کی بلند چوٹیوں کی تسخیر کیلئے بعض مغربی ٹیموں کو وہاں جانے کی اجازت دینا شروع کر دی۔ اس پر بھارت کو یہ تشویش لاحق ہوگئی کہ پاکستان اس طرح اس علاقے کی ملکیت کا دعویٰ کرر ہا تھا۔

چنانچہ بھارت نے سیاچن میں خفیہ طور پر فوجی مہمات بھیجنا شروع کر دیں۔ 13 اپریل 1984ء میں بھارتی فوج اور ایئر فورس کے اہلکار وہاں گئے اور بلند ترین چوٹیوں پر قبضہ کرلیا۔ اس لحاظ سے بھارت نے ایک متنازعہ علاقے میں فوجیوں کی موجودگی قائم کرنے میں پہل کی۔ پاکستان نے بھارت کو وہاں سے نکالنے کی کئی کوششیں کیں۔ سب سے منظم کوشش 1987ء میں کی گئی جب ایس ایس جی کمانڈوز نے وہاں کارروائی کی جو ناکام رہی۔ جنرل پرویز مشرف نے البتہ یہ مؤقف اختیار کیا کہ اس کارروائی میں بھارتی فوج کا کہیں زیادہ نقصان ہوا کیونکہ بھارت کو طویل راستے سے وہاں آنا پڑتا ہے جبکہ پاکستان کی طرف سے گلیشئر تک نسبتاً آسان رسائی ہوتی ہے۔ (مشرف 2006:70-68)۔ سیاچن کا مسئلہ طول اختیار کر گیا اور ابھی تک حل طلب ہے۔

بھارت کے ساتھ سفارتی تعلقات کی مجموعی صورتحال

ضیاء الحق نے غیر جانبدار ممالک NAM کے اجلاس میں شرکت کیلئے 1983 میں نئی دہلی کا دورہ کیا۔ اس موقع پر وہ اپنی مادر علمی سینٹ سٹیفن کالج بھی گئے اور بظاہر بھارتی رہنماؤں کے

ساتھ دوستانہ بنیادوں پر ملاقاتیں کیں لیکن بھارت کی طرف سے پاکستان میں بحالی جمہوریت کی تحریک ایم آر ڈی کے بارے میں مثبت ریمارکس سے ضیاء الحق جز بز ہوئے اور بھارت یہ بھی الزام لگاتا رہا کہ پاکستان سکھوں کی مدد کر رہا ہے۔ 1984 میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ان کے بیٹے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کشیدہ تعلقات میں بہتری لانے کی کوشش کی۔ ضیاء الحق نے بھی مثبت جواب دیا، چنانچہ خارجہ سیکرٹریوں کی سطح پر وفود کا تبادلہ عمل میں آیا اور دونوں ملکوں کے درمیان بالواسطہ مذاکرات کا عمل شروع ہوا۔ 1985ء میں ضیاء الحق مالدیپ کے دورے سے واپسی پر ایک بار پھر بھارت گئے جہاں دونوں ملکوں نے آپس میں اتفاق کیا کہ ایک دوسرے کی جوہری تنصیبات پر حملہ نہیں کیا جائے گا لیکن ایسی مثبت پیشرفت کے باوجود بداعتمادی کی فضا برقرار رہی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ پاکستان نے الزام لگایا تھا کہ بھارت سندھ میں ہونے والی شورش میں ملوث ہے جبکہ بھارت نے یہ الزام لگایا کہ سکھوں کی علیحدگی پسند تحریک میں پاکستان کا ہاتھ ہے۔

بھارت کی بڑی فوجی مشق براس ٹیکس

آزادی کے بعد سے بھارت نے گاہے بگاہے ایسے اقدامات کیے جن سے پاکستان کے عدم تحفظ کے احساس میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں سے ایک بھارت کی بری فوجی مشق Brasstacks تھی جو نومبر 1986 سے مارچ 1987 کے درمیان بھارتی ریاست راجستھان میں پاکستان کی سرحد کے قریب ہوئی۔ یہ اتنی بڑی مشقیں تھیں کہ بھارت کی تقریباً پوری فوج کو متحرک کیا گیا۔ ضیاء الحق نے ان مشقوں کو اشتعال انگیز اور ممکنہ طور پر پاکستان پر حملے کی تیاری سمجھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے اپنے آرمرڈ (ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر مشتمل) یونٹوں کو سرحد کے قریب تعینات کرنے کا حکم دیا۔ بھارت کو روایتی عسکری صلاحیت میں برتری حاصل تھی اور وہ ایٹمی دھماکہ بھی کر چکا تھا۔ سیکورٹی حلقوں میں اسے شکوک وشبہات بھی پائے جاتے تھے کہ پاکستان بھی ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں کسی بھی جگہ پر یہ سب سے بڑا فوجی اجتماع تھا۔ بھارت نے دھمکی دی کہ اگر پاکستان فوجی سرحد سے پیچھے نہ گئے تو وہ جوابی کارروائی کرے گا۔ اپنے تئیں یہ جائز دھمکی 23 جنوری 1987ء کو بھارتی وزیر خارجہ نٹور سنگھ نے دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر ڈاکٹر ہمایوں خان سے ملاقات میں دی۔ (عارف: 2001: 268)۔

پاکستان نے چونکہ بھارت کی طرف پہل ہونے پر اپنے فوجی سرحد پر تعینات کئے تھے اس لئے وہ
نٹور سنگھ کی منطق کو جائز سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ آرمی چیف جنرل سندر جی کی زیر قیادت بھارتی فوج
کے سخت گیر عناصر بلاشبہ اس وقت جارحانہ موڈ میں تھے۔

ضیاء الحق نے اس موقع پر اعصاب کی مضبوطی اور بہترین سیاسی تدبر کا مظاہرہ کیا۔
انہوں نے راجیو گاندھی سے رابطہ کیا اس کے نتیجے میں دونوں ملکوں نے سرحد سے کچھ فوجی ہٹانے
پر اتفاق کیا۔ بعد ازاں فروری میں جنرل ضیاء الحق انڈین کرکٹ بورڈ کی دعوت پر میچ دیکھنے
بھارت بھی گئے۔ جس سے کشیدگی مزید کم کرنے میں مدد ملی۔ اس کے بعد بتدریج صورتحال معمول
پر آتی چلی گئی، اگرچہ روایتی بدگمانی اپنی جگہ برقرار رہی، جنرل کے ایم عارف نے اپنی کتاب میں
آپریشن براس ٹیکس کا تفصیلی ذکر کیا ہے: اس کا لب لباب یہ تھا کہ بھارتی اعلیٰ فوجی قیادت نے اپنی
بریف بڑھا چڑھا کر پیش کی اور وزیراعظم راجیو گاندھی (نو آموز ہونے کے باعث) جنرلوں کے
عزائم سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔

آپریشن براس ٹیکس کے خلاف بھارتی میڈیا میں بھی کچھ ممتاز افراد نے آوازیں بلند کیں
اور یہ بات تسلیم کی کہ یہ اشتعال انگیزی ہے جس سے پاکستان کے سکیورٹی خدشات میں اضافہ ہوا
ہے۔ (عارف، 2001ء:76-246)۔ اس عرصے کے دوران دونوں روایتی حریفوں میں ممکنہ جنگ
کے بارے میں بین الاقوامی برادری نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ کیونکہ دونوں ملکوں کی ایٹمی
صلاحیت پریشانی کا باعث تھی۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ آپریشن براس ٹیکس کے باعث
پاکستان اس بات کا قائل ہو گیا کہ اسے بھارت کے مقابلے میں جوہری ڈیٹرنس کی ضرورت ہے
جسے عسکری لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل تھی۔ خاص کر اس لئے کہ ایٹمی تجربہ کر کے بھارت
اپنی صلاحیت کا برملا اظہار بھی کر چکا تھا۔

سعودی عرب

نظریاتی حوالے سے بیرونی محاذ پر ضیاء دور کی سب سے اہم پیشرفت سعودی عرب سے
قربت تھی۔ 1974ء کی پاکستان میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے بعد سعودی عرب کا پاکستان میں اثر
ورسوخ مسلسل بڑھتا رہا۔ اس کے علاوہ خلیج فارس کی عرب ریاستوں میں سینکڑوں ہزاروں پاکستانی

بسلسلہ روزگار مقیم تھے۔ یہ پاکستانی ثقافتی طور پر عربوں کی سوچ اپنانے پر مائل ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماضی کی صوفیانہ روایات کے برعکس انہوں نے سخت گیر اسلامی عادات اپنانا شروع کر دیں۔ درحقیقت سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں میں مقیم لاکھوں پاکستانیوں نے عالمگیر اسلامی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد کا کام کیا جس میں بالخصوص پاکستان بنیاد پرستی کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔

جہاں پاکستانی غیر ہنر مند افراد اور دکاندار حتیٰ کہ پیشہ ور مڈل کلاس کے افراد ان تبدیلیوں کا شکار ہوئے وہاں پاکستانی فوج بھی اس سے متاثر ہوئی کیونکہ 1983 میں 30 ہزار فوجی بیرون ملک بلکہ یوں کہیں کہ صرف عرب ممالک میں تعینات کئے گئے۔ ان میں سے سب سے بڑی تعداد میں یعنی 20 ہزار فوج ایک آرمرڈ ڈویژن صرف سعودی عرب بھجوائی گئی۔ (عارف، 2001ء: 194)۔ خود ضیاء الحق نے بھی 1970ء کے عشرے میں اردن میں خدمات انجام دی تھیں۔ جہاں انہیں ایک ایسا ذریعہ بھی میسر آیا جس نے بھٹو کو ضیاء الحق کو آرمی چیف منتخب کرنے کی طرف مائل کیا۔ پاکستان آرمی میں میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ سعودی عرب نے شیعہ پاکستانی فوجی سعودی عرب بھجوانے کی مخالفت کی لیکن جنرل ضیاء نے یہ دباؤ مسترد کر دیا کیونکہ وہ فوج میں ایسی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ البتہ دیگر ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بہر حال 1988ء میں پاکستانی فوجی دستوں کو سعودی عرب سے واپس بلا لیا گیا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان نے ایران کے ساتھ بھی اپنے قریبی رابطے برقرار رکھے۔ بعد ازاں 1991ء میں عراقی صدر صدام حسین کی طرف سے کویت پر چڑھائی کے بعد پاکستانی فوجی ایک بار پھر سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں میں تعینات کئے گئے (باکسٹر، 1991ء: 3-142)۔ پاکستانی فوج کو بنیاد پرستی کی طرف مائل کرنے میں مشرق وسطیٰ بالخصوص سعودی عرب میں فوجیوں کی تعیناتی نے اہم کردار ادا کیا۔

ضیاء کی پالیسیوں کی معاشی اساس

شاہد جاوید برکی نے ضیاء الحق کی اقتصادی پالیسی کی نہایت مثبت منظر کشی کی ہے۔۔۔ یہ کہ انہوں نے اس شعبے کی زبردست اہمیت کے پیش نظر اس میں مداخلت نہ کرنے کا دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ یوں انہوں نے اسے اسلامائزیشن کے چھکڑے سے باندھنے سے گریز کیا جس سے

پورے معاشرے کو انہوں نے باندھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ معیشت کا انتظام انہوں نے ٹیکنو کریٹ اور صنعتکار مشیروں پر چھوڑے رکھا۔ معیشت کو فری مارکیٹ کے اصولوں پر استوار کرنے کیلئے انہوں نے پلاننگ کمیشن کے چیئرمین غلام اسحاق خان کو ذمہ داری سونپی، جنہوں نے محتاط انداز میں ڈی نیشنلائزیشن کا عمل مرحلہ وار آگے بڑھایا، کچھ عرصے بعد جب غلام اسحاق خان چیئرمین سینٹ بن گئے تو معیشت کے معاملات ورلڈ بنک کے مشہور اکانومسٹ محبوب الحق کے سپرد کر دیے گئے۔ اس طرح عالمی بنک سے پاکستان کے تعلقات معمول پر آگئے اور اس نے پاکستان کی امداد بحال کر دی۔ شاہد جاوید برکی نے ان کامیابیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تبدیلیوں سے معاشی ترقی کا ایسا ریکارڈ وجود میں آیا جس کی تیسری دنیا میں کم کم مثال ملتی۔ غلام اسحاق خان کی زیر قیادت ملکی جی ڈی پی کی شرح 76 فیصد تک بڑھ گئی جبکہ فی کس آمدنی 34 فیصد ہوگئی۔ اس عمل سے غریبوں کو کتنا فائدہ پہنچا اس کا ذکر برکی کے تجزیے میں نہیں ملتا۔ البتہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ 1975 سے 1985 کے دوران مشرق وسطیٰ کے ممالک میں مقیم پاکستانیوں نے اپنے وطن میں 25 ارب ڈالر کی ترسیلات بھیجیں جس سے غریبوں کو فائدہ پہنچا۔ (برکی 1991ء: 12-15)۔

شاہد جاوید برکی نے معیشت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس پیسے کے کردار کا ذکر نہیں کیا جو اسلحے اور منشیات کی غیر قانونی تجارت سے حاصل ہوا۔ عائشہ صدیقہ نے لکھا ہے کہ ضیاء الحق کے اس دور میں سینئر فوجی جنرلوں نے سیاسی طاقت حاصل کر لی جس سے انہیں خونخوار مالیاتی اثاثے بنانے میں معاونت ملی۔ (2007ء: 139)۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ضیاء دور میں معیشت میں فوج کا حصہ بڑھانے کے لئے نئے قوانین متعارف کرائے گئے۔ کھادیں، تیل و گیس، ایگرو انڈسٹری اور آرمی فارمز ایسے شعبے بن گئے جہاں فوج نے اپنی پیداوار شروع کر دی۔ ایسے اقدامات سے فوج کو تنظیمی لحاظ سے اور انفرادی طور پر افسروں کو فائدہ پہنچا۔ مزید یہ کہ کمانڈرز کی سہولت کیلئے خفیہ ''رجمنٹ فنڈز'' بھی شروع کئے گئے۔ یہ پیسہ خفیہ منصوبوں کیلئے مخصوص دفاعی بجٹ اور چھوٹے کوآپریٹو بزنس اور صنعتی منصوبوں سے حاصل کیا گیا۔ ایسے اور اس جیسے دیگر اقدامات سے اعلیٰ افسروں کو زبردست فائدہ پہنچا۔۔۔ اور یوں حکومت سے ان کی وفاداری یقینی بن گئی۔ فوج نے ٹرانسپورٹیشن، پلوں اور سڑکوں کی تعمیر اور متعلقہ شعبوں میں بھی دلچسپی لی۔ شہری اور دیہی علاقوں میں زمینوں کی

الاٹمنٹ سے فوجی افسروں کے معاشی مفادات کو مزید تقویت ملی۔اس کے نتیجے میں فوج معاشی طور پر خود مختار بن گئی۔اس کے ساتھ ساتھ چھاؤنیوں میں فوج نے بڑے بڑے انگلش میڈیم سکول بھی قائم کئے۔فوج، نیوی اور فضائیہ میں کئی فلاحی منصوبے شروع کئے گئے۔مختصر یہ کہ فوج نے پاکستان کی معیشت میں اپنی موجودگی اور مفادات میں زبردست اضافہ کرلیا۔(ایضاً:44-139)۔

جنرل ضیاء کی رخصتی

ملکی سطح پر پیپلز پارٹی ہی جنرل ضیاء الحق کی بدستور اپوزیشن رہی۔پارٹی کی قائد ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی بے نظیر بھٹو تھیں۔جنہیں ان کی والدہ نصرت بھٹو سمیت گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ بعدازاں 1982 میں بیگم نصرت بھٹو کو علاج کیلئے بیرون ملک بھجوایا گیا۔جنوری 1984ء کو 6 سالہ نظر بندی اور قید کے بعد ضیاء الحق نے بے نظیر بھٹو کو بھی طبی بنیادوں پر بیرون ملک جانے کی اجازت دے دی۔دونوں کیسوں میں امریکی دباؤ اور بھٹو خاندان کے بیرون ملک خیر خواہوں نے مارشل لا حکومت کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔بے نظیر بھٹو اگست 1985ء کو اپنے بھائی شاہنواز بھٹو کی لاش کے ساتھ وطن واپس آئیں جو فرانسیسی شہر کانے کے ایک فلیٹ میں پراسرار طور پر مردہ پائے گئے۔ (بھٹو:2008ء اے،289)۔

بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی سے کچھ عرصہ پہلے ہی ضیاء الحق نے سندھی سیاستدان محمد خان جونیجو کو پاکستان کا وزیر اعظم مقرر کیا۔دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جنرل ضیاء الحق مارشل لاء اٹھالیں گے جبکہ محمد خان جونیجو قومی اسمبلی میں ایک آئینی ترمیم منظور کرائیں گے جس سے: ''جولائی 1977ء کی بغاوت کے بعد جنرل ضیاء اور ان کے جنرلوں کے تمام تر اقدامات کو مکمل تحفظ ملے گا۔ جنرل ضیاء الحق کو اگلے 5 سال کیلئے صدر منتخب کر لیا جائے گا اور وہ بدستور آرمی چیف رہیں گے۔انہیں وزیر اعظم اور قومی اسمبلی کو برطرف کرنے کا بھی اختیار ہوگا''۔(عباس، 120:2005)۔

اگرچہ ضیاء الحق جو آئینی تحفظ چاہتے تھے وہ انہیں مل گیا لیکن جلد ہی ان کے جونیجو کے ساتھ تعلقات خراب ہو گئے کیونکہ صدر نے متعدد ایسی ترقیاں اور تقرریاں کیں جنہیں وزیر اعظم خلاف ضابطہ اور من پسند سمجھتے تھے۔بغل بچہ بننے کی بجائے جونیجو اصول پسند اور ایماندار سیاستدان

ثابت ہوئے۔ ایسے اختلافات نے دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی۔ اختلافات اس وقت شدت اختیار کر گئے جب وزیر اعظم نے افغانستان کے بارے میں جنیوا امن معاہدے پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا جبکہ ضیاء الحق یہ یقینی بنانا چاہتے تھے کہ افغانستان میں پاکستان نواز اسلام پسند حکومت قائم ہو۔ جنرل ضیاء کو یقین ہو گیا کہ امریکہ افغانستان میں ان کے عزائم ناکام بنانے کے لئے جونیجو کو استعمال کر رہا تھا، 10 اپریل 1988ء کو جنیوا معاہدے پر دستخط سے 4 روز پہلے افغان جہاد کیلئے اسلحہ ذخیرہ کرنے کے مقام اوجڑی کیمپ میں خوفناک دھماکے ہوئے۔ اس سے شدید خوف وہراس پھیل گیا کیونکہ بم، میزائل اور دیگر دھماکہ خیز مواد دھڑا دھڑ اچھٹ رہے تھے، سینکڑوں افراد ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ تخریب کاری کا خدشہ ظاہر کیا گیا۔ محمد خان جونیجو منصوبہ سازوں کا پتہ چلانے کے لئے انکوائری کمیٹی بنانا چاہتے تھے جبکہ ضیاء الحق اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ امریکہ تباہ ہونے والے اسلحے کی جگہ نیا اسلحہ دے۔ 29 مئی 1988ء کو صدر ضیا نے جونیجو اور قومی اسمبلی کو برطرف کر دیا۔ اس فیصلے کا اعلان ضیاء الحق نے پاکستان ٹیلی ویژن پر خود آ کر کیا۔ انہوں نے وزیر اعظم اور ارکان پارلیمنٹ پر کرپشن ختم کرنے اور اسلامی نظام کے نفاذ میں ناکامی کا الزام لگایا۔ (ایضاً: 124)۔

17 اگست 1988ء کو ضیاء الحق سی 130 بی ہرکولیس طیارے میں بہاولپور سے واپس آنے کیلئے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ چیئر مین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور افغان جہاد دور میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمٰن، اسلام آباد میں امریکی سفیر آرنلڈ لیوس رافیل اور بریگیڈئر جنرل ہربرٹ واسن بھی سوار تھے۔ طیارے میں سوار ہونے سے ذرا پہلے انہوں نے امریکی ٹینک ایم۔ آئی ابریمس کی کارکردگی کا معائنہ کیا۔ طیارہ روانگی کے چند ہی منٹ بعد تباہ ہو گیا اور اس میں سوار تمام 31 افراد ہلاک ہو گئے۔ طیارے کی تباہی کی اصل وجہ تو کبھی منظر عام پر نہ آ سکی لیکن عام خال یہ تھا کہ اس میں تخریب کاری کی گئی۔ صحافتی سطح پر سی آئی اے، کے جی بی، خاد، را، حتیٰ کہ منحرف پاکستانی افسروں اور ضیاء کے سنی اسلام ازم کے مخالف شیعہ مخالفین کو حادثے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ بہرحال یہ راز کبھی سامنے نہ آ سکا۔ ضیاء الحق کے مداح سمجھتے ہیں کہ روس اور امریکہ اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ افغانستان میں اسلام پسند حکومت ان دونوں کے مفاد میں نہیں اس لئے انہوں نے ضیاء الحق سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ افغانستان میں اسلام

پسند حکومت لانا چاہتے تھے اور یہ کہ طیارہ تکنیکی خرابی کی وجہ سے بھی گر سکتا ہے۔ اس پر بیشتر تبصرہ نگار یقین کرنے پر تیار نہیں۔ ضیاء الحق اس وقت اس دنیا سے کوچ کر گئے جب وہ پر اعتماد اور صورتحال پر گرفت رکھنے کے قابل ہوئے۔ شاہد جاوید برکی کے مطابق ضیاء الحق نے انہیں 29 جون 1988ء کو بتایا کہ وہ طویل عرصے تک اقتدار میں رہیں گے لیکن ایں خیال است ومحال است و جنون....

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ عوام کی ایک بڑی تعداد نے ضیاء الحق کی اچانک موت کا سوگ منایا۔ افغان مجاہدین کے نزدیک وہ ان کے نجات دہندہ اور ہیرو تھے۔ 10 لاکھ سے زائد افراد نے اسلام آباد میں ضیاء الحق کے جنازے میں شرکت کی۔ افغان باشندوں اور اسلام پسند حلقوں کے رہنماؤں نے بھی حصہ لیا جبکہ لبرل دانشور طبقے نے ضیاء الحق کی اصلاحات سے نفرت کا اظہار کیا اور ظاہر ہے کہ ان اصلاحات کو نہ صرف پاکستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر اسلام پسندوں نے پذیرائی بخشی۔ لندن میں مقیم فلسطینی سالم عظام جو فلسطینی ہیں اور انہیں کئی لوگ اسامہ بن لادن کا استاد بھی قرار دیتے ہیں، نے اپنی ایک تحریر میں جنرل ضیاء الحق کیلئے بنیاد پرست مسلمانوں کے اندر انتہائی احترام اور ستائش کا اظہار کیا ہے:

''ضیاء ایک ایسے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے حقیقی طور پر اسلام کی سربلندی کیلئے کام کیا۔ کئی دیگر مسلم حکمرانوں کے برعکس انہوں نے اسلام کی خدمت کیلئے محض زبانی جمع خرچ نہیں کیا...صرف ضیاء الحق نے پاکستان میں نفاذ اسلام کی مخلصانہ کوشش کی اور کافی پیشرفت بھی کی۔ اگر وہ مزید زندہ رہتے تو لامحالہ اپنے مشن کی تکمیل میں کامیاب رہتے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے عوام جو ضیاء الحق سے محبت اور ان کا احترام کرتے تھے وہ حقیقی معنوں میں پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے کیونکہ قیام پاکستان کا مقصد یہی تھا''۔ (عظام، 1990:xiv)۔

باب 13

سویلین حکومتیں اور اسٹیبلشمنٹ

جنرل ضیاء الحق کے بعد حکومت پاکستان نے 19 نومبر 1988ء کو عام انتخابات کا اعلان کیا۔ ضیاء الحق کے 11 سالہ دور حکومت میں سیاسی طبقے کے مقابلے میں اسٹیبلشمنٹ کو زبردست مضبوط کیا گیا تاہم انتخابات کے اعلان کے ساتھ سیاسی مہم نے تیزی پکڑ لی۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اصل مقابلہ بے نظیر بھٹو کی زیر قیادت پیپلز پارٹی اور نواز شریف کی سربراہی میں پاکستان مسلم لیگ کے درمیان ہوگا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو سے پارٹی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور اپنے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو بھی دہشت گردی میں ملوث ہونے کے باعث پارٹی معاملات سے دور کر دیا۔ جلاوطنی کے دوران بے نظیر مغربی ملکوں کی اقتدار کی غلام گردشوں میں اپنی اور اپنی جماعت کی لابنگ کرتی رہیں، بالخصوص انہوں نے واشنگٹن کا دورہ کیا تا کہ محکمہ خارجہ کے حکام کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے بااثر سینیٹروں اور ارکان کانگریس سے ایک ایسی اعتدال پسند اور ترقی پسند لیڈر کے طور پر ملاقاتیں کیں جو اپنے والد کی طرح مزید امریکہ مخالفت جذبات نہیں رکھتی تھیں، ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ضیاء الحق پر دباؤ ڈالا گیا کہ بے نظیر کو وطن واپسی کی اجازت دی جائے۔ 1986ء میں پاکستان آمد پر ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ انہی حالات میں ضیاء الحق نے بے نظیر بھٹو کی طرف سے اپنے اقتدار کو لاحق کسی خطرے کا تدارک کرنے کا سوچنا شروع کر دیا۔ پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی کی سفارش پر ضیاء الحق نے نواز شریف کی سرپرستی کا آغاز کر دیا۔ شریف خاندان تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی کامیابی کی کہانی کا مظہر تھا۔ نواز شریف کے والد میاں محمد شریف اور ان کے بھائیوں نے 1930 کے عشرے

میں لاہور میں خام لوہے کی صنعت لگانے کیلئے اپنے وسائل استعمال کئے (وڑائچ، 2008:9-28)
۔ پاکستان کی آزادی کے بعد ان کی خوشحالی میں زبردست اضافہ ہوا لیکن بھٹو دور کی نیشنلائزیشن
کے عمل سے شریف خاندان کو شدید دھچکا لگا۔ ضیاء الحق کی سرپرستی میں اتفاق گروپ آف انڈسٹریز
کو حکومت کی طرف سے قرضوں کے اجرا کے ذریعے زبردست سنبھالا دیا گیا اور یوں یہ فیملی
پاکستان کے بڑے بڑے صنعتکار خاندانوں میں شامل ہونے لگی۔ 1981 میں نواز شریف کو پنجاب
کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدے سے نوازا گیا۔ اسی منصب سے انہوں نے دائیں بازو کے
کاروبار دوست اور فری مارکیٹ کے حامی سیاستدان کے طور پر شہرت حاصل کر لی۔ 1985ء میں
انہیں پنجاب کا وزیر اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ (ایضاً: 3-61)۔

1988 کے عام انتخابات

عام انتخابات کے اعلان سے سیاسی کارکنوں میں جوش و خروش پھیل گیا۔ نواز شریف کو
اسلامی جمہوری اتحاد (آئی جے آئی) کی حمایت حاصل تھی۔ بے نظیر بھٹو کے مطابق قائم مقام صدر
غلام اسحاق خان نے ایک حکمنامہ جاری کیا جس میں انتخابی قوانین میں ترمیم کے ذریعے پیپلز
پارٹی کے امیدواروں پر قدغن لگا دی گئی۔ انہوں نے ووٹ ڈالنے کیلئے قومی شناختی کارڈ لازمی قرار
دیا تھا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ دیہی علاقوں جہاں پیپلز پارٹی کا ووٹ بنک کافی زیادہ تھا میں لوگوں
کے پاس قومی شناختی کارڈ کم کم ہی ہوتے ہیں۔ (بھٹو، 2008ء، بی)۔ اس کے علاوہ آئی ایس آئی
کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل اور ان کے نائب بریگیڈیئر امتیاز نے دوٹوک انداز میں اسلام
پسندوں کو تنبیہ کی کہ: ''آئی ایس آئی کو انٹیلی جنس کے مطابق بے نظیر بھٹو نے امریکیوں سے وعدہ کیا
ہے کہ وہ برسر اقتدار آ کر جوہری پروگرام ختم کر دیں گی۔ وہ افغانستان میں مجاہدین کی فتح کا راستہ
روکیں گی جبکہ کشمیر میں جہاد کے منصوبے ختم کر دیں گی''۔ (بحوالہ حقانی، 2005:202)۔

آئی ایس آئی نے بے نظیر کے مخالفین کو آئی جے آئی میں جمع کرنے کے لئے کروڑوں
روپے خرچ کئے۔ کئی سال بعد آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل اسد درانی نے سپریم
کورٹ میں (اصغر خان کیس) بیان حلفی میں اعتراف کیا کہ انہیں حکومت (صدر غلام اسحاق خان
اور آرمی چیف جنرل اسلم بیگ) نے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں میں تقسیم کرنے کیلئے پیسہ

دیا۔ یہ رقم بزنس کمیونٹی نے فراہم کی۔ ممتاز سیاستدانوں کو اس حساب سے رقوم فراہم کی گئیں: صوبہ سرحد میں میر افضل خان (بعد میں وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے) کو ایک کروڑ روپیہ، پنجاب میں نواز شریف کو 35 لاکھ روپے، میڈیا میں مہم چلانے کیلئے لیفٹیننٹ جنرل (ر) رفاقت کو 56 لاکھ روپے، جماعت اسلامی کو 50 لاکھ روپے اور بیگم عابدہ حسین کو 10 لاکھ روپے دیئے گئے جبکہ سندھ جہاں بے نظیر کو زبردست حمایت حاصل تھی وہاں بھی کئی سیاستدانوں کو پیسہ دیا گیا۔ ان میں پیپلز پارٹی کے سابق رہنما غلام مصطفیٰ جتوئی کو 50 لاکھ روپے، جام صادق 50 لاکھ، کچھ عرصہ پہلے وزیر اعظم رہنے والے محمد خان جونیجو کو 25 لاکھ اور پیر پگاڑا کو 20 لاکھ روپے ملے۔ بلوچستان میں نادر مینگل کو 10 لاکھ روپے جاری کئے گئے۔ (کھرل، 2010)۔

ایسی رشوت کے باوجود الیکشن میں پیپلز پارٹی کامیابی کے لحاظ سے بڑی جماعت بن کر ابھری اور ایوان میں 217 میں سے 94 نشستیں حاصل کرلیں۔ فاٹا کے ارکان، اقلیتوں اور خواتین کی نشستوں کو ملا کر یہ تعداد 122 تک چلی گئی۔ آئی جے آئی کو محض 55 سیٹیں مل سکیں۔ بے نظیر بھٹو کے مطابق آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل نے پیپلز پارٹی کا راستہ روکنے کے لئے منصوبے بنائے اور بعض پارٹی لیڈروں کی وفاداری تبدیلی کرائی۔ (بھٹو، 2008ء اے، 197)۔ اسی دوران صدر غلام اسحاق خان نے چھوٹی جماعتوں اور آزاد امیدواروں کے تعاون سے مخلوط حکومت قائم کرنے کیلئے سیاسی رابطے شروع کر دیئے۔ یہ کوشش ثمر آور رہی لیکن اس دوران بے نظیر بھٹو نے صدر اور فوج کو یقین دہانی کرائی کہ وہ اعلیٰ فوج افسروں کے تقرر میں مداخلت کریں گی نہ پاکستان کی سکیورٹی پالیسی بالخصوص افغانستان اور بھارت سے متعلق معاملات میں مداخلت کریں گی۔ امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے اسحاق خان اور جنرل اسلم بیگ سے مذاکرات میں پس پردہ رہ کر کردار ادا کیا تاکہ بے نظیر بھٹو کو حکومت سازی کی دعوت دی جاسکے۔ (حقانی، 2005: 203)۔

بے نظیر بھٹو بطور وزیر اعظم (2 دسمبر 1988 سے 6 اگست 1990)

بے نظیر بھٹو نے پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم کے طور پر 2 دسمبر 1988ء کو حلف اٹھایا۔ انہوں نے وزارت خزانہ کا قلمدان اپنے پاس رکھا اور غلام اسحاق کو نظر انداز کیا جو ضیاء دور سے معاشی شعبے کے نگران چلے آرہے تھے اور معیشت کو درست سمت میں گامزن کرنے کے دعویدار

تھے۔ بے نظیر بھٹو نے غلام اسحاق خان کو اس وقت مزید ناراض کر دیا جب انہوں نے Placement Bureau کے ذریعے مختلف عہدوں پر تقرریاں شروع کر دیں۔ پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی کی سفارش پر 20 ہزار اسامیوں پر بھرتیاں کی گئیں۔ (عزیز، 2009:101-99)۔ دوسری طرف انہوں نے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا۔ پریس پر سنسر شپ ختم کر دی اور خواتین کی بہتری کے لئے اصلاحات کیں۔۔۔ مثال کے طور پر خواتین کی وزارت کا قیام، یونیورسٹیوں میں خواتین کے خصوصی سٹڈیز پروگرام، خواتین کا الگ بنک بنانا۔۔۔ علاوہ ازیں انہوں نے بعض مقامات پر خواتین کے الگ پولیس سٹیشن بنانے اور مزید تھانے کھولنے کا منصوبہ تیار کیا۔ لیکن انہوں نے ضیاء الحق دور کے سخت قوانین کو چھیڑنے سے گریز کیا۔ اس کا جواز انہوں نے یہ پیش کیا کہ آئین میں ترمیم کے لئے ان کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل نہیں۔

اسلام آباد میں دسمبر 1988 میں چوتھی سارک سربراہ کانفرنس کے دوران بے نظیر بھٹو اور بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کے درمیان بظاہر دوستانہ جذبہ خیر سگالی کا اظہار نظر آیا۔ بے نظیر چاہتی تھیں کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی جمہوریت سے ہم آہنگ ہونی چاہیئے اور چونکہ بھارت ایک جمہوری ملک ہے اس لئے اس کے ساتھ تعلقات بہتر ہونے چاہیئں۔ دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات میں یہ طے پایا کہ پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کی جوہری تنصیبات پر حملہ نہیں کریں گے۔ باہمی تجارت بڑھانے اور تنازعہ سیاچن گلیشئر پر بھی کچھ پیشرفت ہوئی۔ اس صورتحال سے فوج اور اپوزیشن اتحاد آئی جے آئی خوش نہیں تھے۔ (شفقت، 1997ء:5-234)۔ بہرحال ایسی افواہیں بھی گردش کرنے لگیں کہ بے نظیر بھٹو نے خالصتان تحریک کے سکھوں کی فہرستیں بھارت کے حوالے کر دی ہیں جنہیں اب تک پاکستان میں پناہ گاہیں میسر تھیں۔ امریکہ نے افغانستان سے روسی فوج کے انخلا کے بعد بند کی جانے والی اقتصادی امداد بحال کر دی۔ اس بارے میں بے نظیر نے لکھا ہے کہ:

''اسلام آباد اور واشنگٹن میں ہماری ٹیم نے وائٹ ہاؤس اور کانگریس کے ساتھ قریبی رابطے رکھے تاکہ پاکستان کی امداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں پاکستان مصر اور اسرائیل کے بعد امریکی امداد حاصل کرنے والا تیسرا بڑا ملک بن گیا۔ ہم نے امریکہ کے ساتھ جوہری شعبے میں اعتماد سازی پر بھی بات کی اور یوں ہم نے ایٹمی ٹیکنالوجی برآمد نہ کرنے کو اپنے

جوہری ڈاکٹرن کا حصہ بنالیا۔ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ہم اس وقت تک ایٹمی ہتھیار نہیں تیار کریں گے جب تک ملکی سلامتی کو خطرہ لاحق نہ ہو''۔(بھٹو،2008ء بی،200-199)۔

مبینہ طور پر اسامہ بن لادن نے 1989ء میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد کامیاب بنانے کیلئے پیپلز پارٹی سمیت ارکان پارلیمنٹ کو پیسوں کی پیشکش کی۔ جب کچھ ارکان پارلیمنٹ نے اس بارے میں بے نظیر کو آگاہ کیا تو انہوں نے انہی ارکان میں سے بعض افراد کو آئی ایس آئی اور آئی جے آئی کے کیمپ میں بطور ''ہتھیار'' استعمال کیا اور یہ ابہام پھیلانے کی کوشش کی کہ ایوان میں بے نظیر کو اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ بے نظیر نے لکھا: ''میں نے بریگیڈئیر امتیاز کی ویڈیو ٹیپ ریکارڈ کرنے کیلئے ایک اور (انٹیلی جنس) گروپ استعمال کیا جس میں وہ میری پارٹی کے ارکان کی وفاداریاں بدلنے کیلئے یہ کہتے پائے گئے کہ ''فوج'' مجھے نہیں چاہتی۔ چنانچہ میں نے اپوزیشن کے ایسے ارکان سے رابطے کئے جو میرے والد کو جانتے تھے یا پھر آئی جے آئی سے ناراض تھے''۔(ایضاً:201)۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد تحریک ناکام ہوگئی اور وہ بدستور وزارت عظمٰی پر فائز رہیں۔ بے نظیر کے اس دعوے کی تصدیق بعدازاں بریگیڈئیر امتیاز نے دنیا ٹی وی سے انٹرویو میں کر دی۔ اس کو آپریشن 'مڈ نائٹ جیکال' کا نام دیا گیا۔ بریگیڈئیر امتیاز نے انکشاف کیا کہ آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ بے نظیر بھٹو کو ہٹانا چاہتے تھے کیونکہ ان کی پالیسیاں فوج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔(دی ڈیلی ٹائمز،28 اگست 2009)۔

بے نظیر نے پیپلز پارٹی کے حامی ایسے فوجی افسروں کو بحال کرنے کی کوشش کی جنہیں بھٹو کا تختہ الٹنے کے بعد الگ تھلگ کر دیا گیا لیکن فوج نے ان کا فیصلہ مسترد کر دیا۔اس کے علاوہ جنرل حمید گل نے آئی جے آئی سے رابطے جاری رکھے۔مختصر یہ کہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ بطور سکیورٹی رسک سلوک کیا گیا۔(عباس،2005ء:38-136)۔انہوں نے پیپلز پارٹی کے حامی جج اور بیورو کریٹ تعینات کرنے کیلئے اپنے ایگزیکٹو اختیارات استعمال کرنے کی بھی کوشش کی اور بڑے پیمانے پر اپنے حامیوں کی تعیناتیاں کیں۔ دو بدو تصادم اس وقت شروع ہوگیا جب بے نظیر نے جنرل حمید گل کو ہٹا کر آئی ایس آئی کا کنٹرول حاصل کرنے اور جنرل شمشیر رحمان کلو کو ڈی جی آئی ایس آئی لگانے کی کوشش کی۔وہ لکھتی ہیں کہ:

''جنرل حمید گل نے صدر غلام اسحاق خان اور آرمی چیف مرزا اسلم بیگ کو قائل کرلیا کہ

آئی ایس آئی کی ذمہ داریاں ملٹری انٹیلی جنس کو سونپ دی جائیں ۔۔۔ چنانچہ جہاں آئی ایس آئی کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی صلاحیت ختم کر دی گئی، وہاں فوج کی سکیورٹی مہم ایم آئی کے تحت جاری رہی''۔ (بھٹو، 2008ء بی: 202)۔

بے نظیر بھٹو ملک کے طاقت کے مجموعی اندرونی توازن کے مقابلے میں نازک صورتحال کا شکار تھیں۔ ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے درمیان سندھ میں نسلی تشدد کے باعث سینکڑوں افراد ہلاک ہوئے۔ یکم جنوری 1990 سے 31 جولائی 1990 کے درمیان قوم پرستوں میں تصادم سے 1187 افراد ہلاک اور 1433 زخمی ہوئے۔ (عزیز، 2009ء: 102)۔ اس صورتحال میں بے نظیر نے فوج سے مدد مانگی تو اس نے اصرار کیا کہ چونکہ دونوں طرف عسکریت پسند موجود ہیں لہٰذا منصفانہ آپریشن کلین اپ کیلئے مناسب قانونی اختیارات ملنا ضروری ہیں۔ اس کیلئے بے نظیر تامل کا شکار تھیں، پنجاب میں مسلم لیگ (ن) نے 240 میں سے 108 نشستیں حاصل کر کے اپنی حکومت بنا لی۔ نواز شریف جنہوں نے قومی اور صوبائی اسمبلی دونوں نشستیں جیتی تھیں، انہوں نے پنجاب کا وزیر اعلیٰ بننے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح طویل آمریت کے بعد بحال ہونے والے سویلین اقتدار میں فنڈز اور وسائل کی تقسیم کی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ سینئر سیاستدان، پارلیمنٹرین، وزیر خزانہ اور وزیر خارجہ سرتاج عزیز نے دعویٰ کیا ہے کہ بے نظیر بھٹو نے آئی جے آئی کے 25 ارکان کی وفاداریاں خرید کر نواز شریف کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں۔ (ایضاً: 99)۔ اس کا جواب وزیر اعلیٰ نواز شریف نے مرکز کی طرف سے اعلیٰ سول افسروں کی پنجاب میں تعیناتی مسترد کر کے دیا۔ دونوں فریقوں نے ایسے اچھوتے اقدامات کئے جو ذمہ دار حکومت کا مذاق اڑانے کے مترادف تھے۔ آئین کی دفعہ 58-ٹو بی کا استعمال کرتے ہوئے صدر غلام اسحاق خان نے 6 اگست 1990ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ انہوں نے وزیر اعظم کے خلاف الزامات کی طویل فہرست پیش کی لیکن ان کا لب لباب یہ تھا کہ قومی دولت لوٹنے کے لئے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا گیا اور پیپلز پارٹی کے مفادات کے تحفظ کیلئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے جن سے سیاست بدعنوانی کا ہم مترادف بن کر رہ گئی۔

عبوری انتظامات اور نئے انتخابات

پیپلز پارٹی کے سندھ سے ایک منحرف رہنما غلام مصطفیٰ جتوئی کی سربراہی میں ایک عبوری

حکومت نامزد کی گئی۔ پیپلز پارٹی کے کئی دیگر سابق رہنما وفاقی کابینہ میں شامل تھے۔ نئی اسمبلی کیلئے 24 اکتوبر 1990ء کو انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی مقابلہ بےنظیر بھٹو کی سربراہی میں پیپلز ڈیموکریٹک الائنس (پی ڈی اے) اور نواز شریف کی زیر قیادت دائیں بازو کے اتحاد آئی جے آئی میں تھا۔ نواز شریف نے نہ صرف کرپشن بلکہ امریکی سامراج کے آگے جھکنے پر بے نظیر بھو کی مذمت کی۔ (کوکس، 2001:311)۔ بےنظیر بھٹو نے الزام لگایا کہ اسٹیبلشمنٹ نواز شریف کی حمایت کر رہی تھی اور یہ کہ خفیہ ایجنسیاں اس بار بھی انتخابات میں دھاندلی کر رہی تھیں حالانکہ گزشتہ انتخابات میں وہ خود جیتی تھیں۔ ائیر مارشل (ر) اصغر خان نے لکھا ہے کہ ''بیلٹ پیپروں سے بھرے ٹرک اتفاق فاؤنڈری کی حدود میں لائے گئے''۔ (خان، 2008ء:409)۔ 217 نشستوں پر مشتمل قومی اسمبلی میں آئی جے آئی نے 106 نشستیں حاصل کیں جبکہ پی ڈی اے بمشکل 44 سیٹیں جیت سکا۔ بےنظیر نے اپنی شکست کی ذمہ داری آئی ایس آئی پر عائد کی۔ دوسری طرف نواز شریف نے دعویٰ کیا کہ اسحاق خان اور جنرل اسلم بیگ غلام مصطفیٰ جتوئی کو ہی وزیر اعظم دیکھنا چاہتے تھے اور مجھے بادل نخواستہ قبول کیا حالانکہ میں نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ (وڑائچ، 2008:9-78)۔

نواز شریف بطور وزیر اعظم 6 نومبر 1990 سے 18 اپریل 1993

خلاف توقع نواز شریف ایک گہری ریاست کے مقابلے میں پر اعتماد اور دھانسو وزیر اعظم ثابت ہوئے۔ انہوں نے بھٹو دور میں قومیائے گئے اداروں کی ڈی نیشنلائزیشن اور فری مارکیٹ کی اصلاحات متعارف کرائیں۔ یہ اقدام کر کے انہوں نے دعویٰ کیا کہ پاکستان نے بھارت سے پہلے آزاد معیشت بننے میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے بے روزگار نوجوانوں کو ڈیوٹی فری درآمد کی گئی گاریاں فراہم کرنے کیلئے آسان قرضہ سکیم شروع کی تا کہ وہ اپنا روزگار کما سکیں۔ اس اقدام پر ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف نے بھی وزیر اعظم نواز شریف کی ستائش کی لیکن حیران کن طور پر امریکہ نے تعریف نہ کی جس نے بےنظیر بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد معاشی امداد روک دی تھی۔ (عباس، 2005ء:144)۔ اس کے علاوہ ڈی نیشنلائزیشن اور معیشت کی لبرلائزیشن کی پالیسی کو صدر غلام اسحاق خان نے زیادہ پسند نہ کیا جنہوں نے نیشنلائزڈ صنعتوں کو بھی احسن

طریقے سے چلایا۔ نواز شریف کے صدر غلام اسحاق خان کے ساتھ تعلقات اس وقت علی الاعلان جارحانہ ہو گئے جب وزیر اعظم نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ آٹھویں ترمیم کے بعض حصے ختم کر کے پارلیمنٹ کی بالادستی یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ (وڑائچ: 2008، 80-78)

جہاں تک فوج کے ساتھ معاملات کا تعلق ہے تو نواز شریف بتاتے ہیں کہ شروع میں ان کے اعلیٰ کمانڈروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے۔ افغانستان کے معاملے پر کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن 1990 میں کویت پر عراق کے حملے کے فوراً بعد جب آرمی چیف اسلم بیگ نے منفی ردعمل ظاہر کیا تو ان کی وزیر اعظم کے ساتھ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ شروع میں نواز شریف اور جنرل اسلم بیگ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت میں پاکستانی فوج خلیج میں بھیجنے پر اتفاق کیا لیکن جلد ہی اسلم بیگ نے فیصلہ تبدیل کر کے فوجیں بھجوانے سے انکار کر دیا۔ (کوکس، 2001:312، وڑائچ، 2008:8-85)۔ اسلم بیگ نے اگست 1991 کو اپنی جگہ جنرل اسلم نواز جنجوعہ کو آرمی چیف نامزد کر دیا اور نواز شریف جس جنرل کو آگے لانا چاہتے تھے اس کا نام مسترد کر دیا۔ جنرل جنجوعہ نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم کچھ جنرلوں پر نوازشات کی بارش اور اعلیٰ عہدوں پر من پسند افسر تعینات کر کے فوج میں اثر ورسوخ بڑھا رہے ہیں۔ ایسے اختلافات کے سیاسی مضمرات بھی سامنے آئے کیونکہ وزیر اعظم اور آرمی چیف کے درمیان سندھ میں لاقانونیت اور نسلی تصادم کی ذمہ داری پر تصادم ہوا۔ (نواز، 2008ء: 59-449)۔

جنرل جنجوعہ اور کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر ایم کیو ایم کے پر کاٹنے کے درپے تھے لیکن وزیر اعظم نے مخالفت کی کیونکہ ایم کیو ایم مرکز میں مخلوط حکومت میں شامل تھی۔ پاکستانی اخبارات کی خبروں سے یہ تاثر گردش کر رہا تھا کہ الطاف حسین کو فوج کی کارروائی کا خدشہ تھا۔ لہٰذا وہ جنوری 1992ء کو برطانیہ چلے گئے جہاں سے انہوں نے فون اور ویڈیو ٹیپ کے ذریعے کراچی میں اپنے کارکنوں کو ہدایات جاری کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح سندھ میں دہشت گردی بدستور جاری رہی۔ مئی 1992ء کے آخر میں وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین نے بیان دیا کہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' جیئے سندھ اور الذوالفقار کی فنڈنگ اور ٹریننگ میں ملوث تھی۔ (جنگ، 28 مئی)۔ اگلے ماہ جون میں نواز شریف نے بھی اس الزام کا اعادہ کیا اور اعلان کیا کہ اقوام متحدہ کو بھارتی مداخلت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ (جنگ 9 جون، 1992)، ایسے الزامات کا پس منظر وہ مسلح

گروہ تھے جو جگہ جگہ قتل وغارت، لوٹ مار اور اغوا کے واقعات میں ملوث تھے۔ جب پولیس ان کا تعاقب کرتی تو یہ لوگ صحرائی علاقے میں سرحد پار کر کے بھارت فرار ہو جاتے۔ جنرل جنجوعہ اور جنرل اختر ایسے ڈاکوؤں اور سیاسی شر پسندوں کے خلاف سخت کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ یوں مئی 1992 میں آپریشن کلین اپ شروع ہوا لیکن نتائج وہ نہیں حاصل ہو سکے جو حکومت چاہتی تھی۔

اصل ایکشن چند ہفتے بعد جون میں شروع ہوا۔ جب فوج نے ایم کیو ایم کے مضبوط مراکز پر اور اندرون سندھ میں ڈاکوؤں کے خلاف چھاپے مارے، فوج نے یہ حیرت انگیز انکشافات کئے کہ ایم کیو ایم کی نجی جیلیں، ٹارچر سیل ہیں اور دہشتگردوں سے بڑی مقدار میں اسلحہ برآمد کیا گیا ہے۔ آپریشن کے ابتدائی چند ہفتوں میں ایم کیو ایم کے بیشتر رہنما گرفتار کئے جا چکے تھے۔ (جنگ :21 سے 29 جون 1992)۔ چنانچہ قومی اور سندھ اسمبلی میں ایم کیو ایم کے ارکان اسمبلی نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔

8 جنوری 1993ء کو اچانک آرمی چیف جنرل آصف نواز جنجوعہ انتقال کر گئے۔ بظاہر اس کی وجہ ہارٹ اٹیک تھی لیکن ان کے اہل خانہ نے شکوک وشبہات کا بھی اظہار کیا تاہم پوسٹمارٹم رپورٹ سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوئی۔ البتہ مرحوم کے بھائی شجاع نواز نے پوسٹمارٹم رپورٹ پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ (نواز 2008ء:599)۔ جنرل آصف نواز جنجوعہ کے جانشین جنرل وحید کاکڑ وزیراعظم نواز شریف کی چوائس نہیں تھے۔ مبینہ طور پر صدر غلام اسحاق نے وزیراعظم کی مشاورت کے بغیر ان کا تقرر کیا۔ (ایضاً:858)۔

امریکہ کے حوالے سے دوستانہ اشارے

نواز شریف اس طاقتور تاثر کے ساتھ اقتدار میں آئے کہ وہ امریکہ کے مقابلے میں پاکستان کی آزادی کے زبردست داعی تھے لیکن وزیراعظم بننے کے بعد انہوں نے مؤقف میں تھوڑی نرمی کر دی۔ صدر صدام حسین کے خلاف اتحاد کی حمایت اس سمت میں اہم قدم تھا۔ انہوں نے یورینیم کی افزودگی روکنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن پہلے سے تیارہ شدہ ایٹمی ہتھیار تلف کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ پریسلر ترمیم کے تحت امریکہ نے پاکستان پر پابندیاں نرم کر دیں اور پاکستان کو 12 کروڑ ڈالر کا اسلحہ خریدنے کی اجازت دی۔...امداد کا بیشتر حصہ ایف 16 طیاروں

کے فاصل پرزہ جات پر مشتمل تھا۔امریکیوں کو یہ تشویش لاحق ہوگئی کہ مسلسل پابندیوں کے باعث پاکستان چین پر انحصار بڑھائے گا۔ دوسری طرف پاکستان کو بھارت کی میزائل صلاحیت میں مسلسل اضافے پر تشویش تھی۔ امریکہ کو شبہ تھا کہ چین نے کسی حدتک پاکستان کی میزائل ضروریات پوری کرنا شروع کردی تھیں۔(کوکس،2001ء:20-312)۔

نواز شریف کی برطرفی

بہرحال بین الاقوامی سطح پر ایسے اقدامات نے نواز شریف کی گہری ریاست کے مقابلے میں حیثیت کو زیادہ استحکام نہ بخشا۔صدر غلام اسحاق خان نے نواز شریف حکومت کو 20 ارب ڈالر کی بدعنوانی کے الزامات پر برطرف کردیا۔(طاہر:2010)۔ان کے خلاف جو چارج شیٹ جاری کی گئی اس میں ماورائے عدالت ہلاکتوں، مخالفین کے خلاف کارروائیوں سمیت دیگر الزامات شامل تھے۔نواز شریف کو ییلو کیب سکیم اور دیگر بڑے تعمیراتی منصوبے شروع کرنے پر شیر شاہ سوری ثانی کا لقب دیا گیا لیکن ان کے مخالفین الزام لگاتے ہیں کہ ان منصوبوں میں کک بیکس اور غیر قانونی کمیشن کھائے گئے۔اس کے علاوہ ان کی کوآپریٹو بنک سکیم ناکام ہوگئی چنانچہ ہزاروں بیواؤں، یتیموں، معذوروں اور پنشنروں کی جمع پونجی ڈوب گئی۔ان کوآپریٹو بنکوں کی اکثریت مسلم لیگ (نواز) کے ارکان اسمبلی کی ملکیت تھی۔اس سے بھی سنجیدہ معاملہ یہ تھا کہ نواز شریف کے فیملی بزنس اور اتفاق انڈسٹریز کو ٹیرف اور کسٹم ڈیوٹی کی حد میں بے بہا فائدہ پہنچایا گیا۔سرکاری عہدے کے غلط استعمال سے شریف فیملی مزید بدنام ہوئی۔(عباس،2005:146)۔

نواز شریف اپنے زوال کے بارے میں ایک سازشی نظریہ پیش کرتے ہیں کہ بے نظیر بھٹو نے اس بارے میں اسحاق خان کے ساتھ مل کر سازش کی۔اس کا ثبوت وہ یہ دیتے ہیں کہ نواز شریف حکومت کی برطرفی کے بعد عبوری حکومت میں بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری سمیت پیپلز پارٹی کے دیگر رہنماؤں کو بھی شامل کیا گیا۔(وڑائچ،2008ء:80)۔دوسری طرف بے نظیر نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے شکوہ کیا کہ نواز شریف نے ان کے شروع کردہ سماجی پروگراموں بالخصوص خواتین کی ترقی کے منصوبوں کو بند کیا۔(بھٹو،2008ء بی:203)۔

ایک اور نگران حکومت اور نئے انتخابات

میر بلخ شیر مزاری کی سربراہی میں ایک نگران حکومت قائم کی گئی۔ تاہم سپریم کورٹ نے 6 ہفتے کے بعد نواز شریف کی برطرفی کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا اور انہوں نے 26 مئی 1993ء کو دوبارہ عنان حکومت سنبھال لی۔ اس موقع پر فوج نے مداخلت کی اور نواز کو استعفیٰ دینے کو کہا۔ لیکن انہوں نے مزاحمت کی جس پر آرمی چیف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے نواز شریف، اسحاق خان اور بے نظیر کے درمیان مذاکرات میں ثالثی کا کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ حل نکالا گیا کہ نواز شریف اور اسحاق خان دونوں اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیں۔ چیئرمین سینٹ وسیم سجاد قائم مقام صدر بن گئے۔ اس کے بعد اسٹیبلشمنٹ نے ورلڈ بنک کے ریٹائر نائب صدر معین قریشی کو دعوت دی کہ وہ نگران حکومت سنبھال لیں اور 6 اکتوبر 1993ء تک الیکشن کرائیں۔ انتخابات کے نتیجے میں پہلے سے متنوع نتائج سامنے آئے۔ پیپلز پارٹی کو 86 جبکہ مسلم لیگ (ن) کو 72 نشستیں ملیں۔ باقی تمام سیٹیں چھوٹی جماعتوں اور آزاد امیدواروں کو ملیں۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو نے الزام لگایا کہ انتخابی نتائج میں کئی گھنٹوں کی تاخیر کی گئی اور خفیہ ایجنسیوں نے میرا راستہ روکنے کے لئے سازشیں کیں لیکن بہر حال پیپلز پارٹی کو سب سے زیادہ سیٹیں ملیں۔ اس کے بعد چھوٹی جماعتوں اور آزاد امیدواروں کے ساتھ حکومت سازی کے لئے مذاکرات کا آغاز کیا گیا۔ 14 نومبر کو فاروق لغاری جو پیپلز پارٹی کے انتہائی وفادار لیڈر اور سابق وزیر خارجہ تھے ملک کے نئے صدر منتخب ہو گئے۔

بے نظیر بھٹو 19 اکتوبر 1993ء سے 5 نومبر 1996ء

بے نظیر بھٹو کے 19 اکتوبر 1993ء کو دوسری بار وزیر اعظم بننے سے اپوزیشن کافی نالاں ہوئی۔ بینظیر نے الزام لگایا کہ آئی ایس آئی اور القاعدہ نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی۔ (ایضاً:205)۔ لیکن انہوں نے حوصلہ نہ چھوڑا۔ انہوں نے سابق نامکمل دور کا سماجی پروگرام ایک بار پھر شروع کیا۔ تعلیم، صحت، ہاؤسنگ، سینی ٹیشن، انفراسٹرکچر اور خواتین کے حقوق کے شعبوں میں ایکشن پلان تیار کیا گیا۔ سٹاک ایکسچینج کو جدید بنایا گیا جبکہ سٹیٹ بنک کو کمپیوٹرائزڈ کیا گیا ۔شہری اور دیہی علاقوں میں صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے شعبے میں ایک لاکھ خواتین کو بھرتی کیا گیا، 30 ہزار پرائمری اور سیکنڈری سکول تعمیر کئے گئے۔ ٹیکس ریونیو دگنا ہو گیا جبکہ قومی شرح نمو

میں 3 گنا اضافہ ہوا۔ پاکستان کا شمار دنیا کی 10 تیزی سے ترقی کرتی معیشتوں میں ہونے لگا۔ امن وامان کی صورتحال بہتر ہوگئی۔ بےنظیر حکومت نے دہشت گردی کے خلاف سخت اقدامات کئے۔اغوابرائے تاوان میں ملوث ملزموں کے خلاف کریک ڈاؤن کئے گئے۔وہ دعویٰ کرتی تھیں کہ اگر ان کی حکومت کو 5 سالہ مدت پوری کرنے دی جاتی تو دہشت گردی کو پاکستان میں پاؤں جمانے کا موقع ہی نہیں ملنا تھا۔ (ایضاً: 206)۔ بےنظیر کی حکومت میں واپسی اور ان کی پالیسیوں کومغرب میں کافی سراہا گیا۔1995ء میں امریکہ نے پاکستان کوامریکی اسلحہ خریدنے کے لئے 368 ملین ڈالر کی امداد دی۔

بےنظیر بھٹو کی سوانح عمری ''گڈ بائی شہزادی'' میں بھارتی صحافی شیام بھاٹیہ جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں بےنظیر کے ساتھ زیرتعلیم رہے نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ میں بےنظیر کے کردار پر حیران کن انکشافات کئے ہیں۔انہوں نے لکھا کہ 2003ء میں دبئی میں ایک آف دی ریکارڈ انٹرویو میں بےنظیر بھٹو نے دعویٰ کیا کہ'' جہاں میرے والد پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے معمار تھے وہاں میں پاکستان کے میزائل پروگرام کی ماں ہوں''۔(شیام بھاٹیہ،2010ء:39)۔کہانی یہ تھی کہ 1993ء میں پاکستان کے ایٹمی ریسرچ پراجیکٹ پر بھارتی، اسرائیلی، روسی اور مغربی خفیہ ایجنسیوں کی نظر تھی۔ چونکہ یہ بات عام تھی کہ پاکستانی سائنسدان مطلوبہ ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کیلئے صنعتی جاسوسی میں ملوث تھے، اس لئے ان کے بیرون ملک دوروں کی گہری مانیٹرنگ کی جاتی تھی۔ بےنظیر بھٹو کو عام طور پر ایٹمی پروگرام کے حوالے سے فاختہ (بےضرر) وزیراعظم سمجھا جاتا تھا۔اس لئے غیرملکی ایجنسیوں کو دھوکا دینے کیلئے وہ نہایت موزوں تھی۔ چنانچہ یہی کچھ انہوں نے 1993ء میں شمالی کوریا کے دورے میں کیا۔شیام بھاٹیہ کے مطابق'' بےنظیر نے جو کچھ مجھے بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام آباد سے رخصتی سے پہلے انہوں نے ایک ایسا اوورکوٹ خریدا جس میں کئی گہری جیبیں تھیں جن میں شمالی کوریا کو درکار یورینیم افزودگی سے متعلق سائنسی ڈیٹا پرمبنی سی ڈیز چھپائی گئی ....لیکن یہ بتاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں کوندا سا لہرا گیا کہ وہ ایسی ہی سی ڈیز واپس لے آئیں جن میں شمالی کوریا کی میزائل ٹیکنالوجی سے متعلق معلومات تھیں''۔(ایضاً: 41)۔

اس انکشاف پر پوری دنیا میں دھماکہ خیز ردعمل سامنے آیا۔سیلگ ہیری سن جیسے پاکستان کے امور پر ماہرین شیام بھاٹیہ کی سٹوری کو قابل بھروسہ سمجھتے ہیں۔(کیسل،2008ء)۔اس بات

میں کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ پاکستان کی وزارت خارجہ نے بھاٹیہ کے دعوؤں کو مسترد کر دیا۔

بغاوت کی ناکام کوشش

ستمبر 1994ء میں ملٹری انٹیلی جنس نے بے نظیر حکومت کے خلاف ایک سازش بے نقاب کی۔اس کے ماسٹر مائنڈ میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی، بریگیڈئر مستنصر باللہ، کرنل آزاد منہاس اور بعض دیگر فوجی افسر تھے۔منصوبہ یہ تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ کر پاکستان کو سنی اسلامی ریاست قرار دے دیا جائے اور جی ایچ کیو میں اعلیٰ کمانڈروں کو ہلاک کر دیا جائے۔منصوبہ سازوں کا خیال تھا کہ اس طرح پوری فوج ان کی مطیع ہو جائے گی۔ بظاہر یہ تمام منصوبہ ساز فوجی دستوں کے (فیلڈ) کمانڈر نہیں تھے جن کی مدد سے اسلام پسندوں کی بغاوت عملی طور پر کی جاسکتی۔ چونکہ ان کی سازش میں سینئر فوجی کمانڈروں کو قتل کرنا بھی شامل تھا اس لئے یہ سازش نہ صرف بے نظیر بھٹو کی حکومت بلکہ اسٹیبلشمنٹ کے بھی خلاف تھی۔آرمی چیف جنرل عبدالوحید کاکڑ نے اس کا جواب انٹیلی جنس پاور سٹرکچر کی تنظیم نو سے دیا۔آئی ایس آئی کے نئے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی کو آئی ایس آئی کو اسلام پسندوں سے پاک کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جو انہوں نے عزم اور حوصلہ کے ساتھ ادا کی۔سازش کے مرکزی کرداروں کا کورٹ مارشل کر کے قید کی سزائیں دی گئیں جبکہ دیگر کو ریٹائر کر دیا گیا۔(عباس، 2005ء:3-152)۔

وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی شخصیت بدستور ایسی افواہوں کی زد میں رہی کہ وہ خود اور ان کے شوہر ایک بار پھر قومی خزانہ دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔ بے نظیر بھٹو کی بھتیجی (مرتضیٰ بھٹو کی صاحبزادی) فاطمہ بھٹو نے کئی مثالوں کے ساتھ کرپشن کے ان الزامات کی تصدیق کی ہے۔(فاطمہ بھٹو، 2010ء:8-384)۔بے نظیر کی طرف سے لاہور ہائی کورٹ میں 20 ججوں کی تعیناتی سے کافی تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا۔چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس سجاد علی شاہ جو بے نظیر کی طرح سندھی تھے اور جنہیں اس منصب پر انہی نے فائز کیا تھا انہوں نے بے نظیر کی نامزدگیوں کو مسترد کر دیا جبکہ وزیر اعظم نے عدالتی حکم پر عملدرآمد سے انکار کر دیا۔ چیف جسٹس نے اس معاملے پر صدر فاروق لغاری سے مدد مانگ لی۔صدر نے وزیر اعظم کو ''ہتھ ہولا'' رکھنے کا کہا۔ بے نظیر توقع کر رہی تھیں کہ صدر لغاری ان کے فیصلوں پر من وعن مہر تصدیق ثبت کریں

گے۔صدر اور وزیر اعظم میں مزید کشیدگی اس وقت پیدا ہوگئی جب بے نظیر نے اپنے وفادار انٹیلی جنس اہلکاروں کے ذریعے فاروق لغاری کی جاسوسی کرانا شروع کر دی۔انہوں نے انہی ذرائع کے ذریعے بعض کور کمانڈروں، آئی ایس آئی اور ایم آئی کے حکام سے متعلق اطلاعات بھی حاصل کیں۔(عباس، 2005ء:7-156)۔

20 ستمبر 1996ء کو بے نظیر بھٹو کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔مرتضیٰ بھٹو نے پیپلز پارٹی میں اپنا الگ دھڑا (شہید بھٹو گروپ) بنا رکھا تھا۔بے نظیر بھٹو کے مطابق ان کی اپنے بھائی کے ساتھ مصالحت 2 ماہ قبل طے پا گئی تھی۔البتہ انٹیلی جنس ایجنسیوں نے یہ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں کہ مرتضیٰ بھٹو کو آصف زرداری نے مروایا۔اس حوالے سے قائم کردہ عدالتی کمیشن نے بے نظیر کے شوہر کو تمام الزامات سے بری قرار دے دیا۔(بھٹو، 2008ء بی: 209)۔ جبکہ فاطمہ بھٹو اس بارے میں فاروق لغاری (مرحوم) کے دنیا ٹی وی کو جنوری 2010ء کو انٹرویو کا حوالہ دیتی ہیں جس میں انہوں نے کہا کہ آصف زرداری اور بے نظیر دونوں ان کے پاس آئے تھے اور زور دیا کہ مرتضیٰ بھٹو کو راستے سے ہٹایا جانا چاہیئے۔زرداری نے کہا تھا ''وہ رہے گا یا میں''۔ (فاطمہ بھٹو، 2010ء:423)۔بہر حال وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی دوسری حکومت کی میعاد مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد شیعہ کمیونٹی پر حملے سے مختصر ہوگئی جس میں 21 افراد جاں بحق ہوئے۔صدر لغاری نے ایسے واقعات کو ملک کی امن و امان کی خراب صورتحال کا شاخسانہ قرار دیا۔چنانچہ آٹھویں ترمیم کے تحت اختیارات اور آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کی مشاورت سے انہوں نے بے نظیر حکومت کو 5 نومبر 1996ء کو برطرف کر دیا۔ان کے خلاف جانی پہچانی چارج شیٹ جاری کی گئی کہ انہوں نے بڑے پیمانے پر بدعنوانی کی اور اختیارات کا ناجائز استعمال کیا۔نیو یارک ٹائمز کے تحقیقاتی رپورٹر جان ایف برنز نے ایک رپورٹ میں بتایا کہ پاکستانی تفتیشی حکام نے غیر ملکی بنکوں میں بے نظیر بھٹو کی 10 کروڑ ڈالر خفیہ دولت کا سراغ لگایا۔بے نظیر بھٹو کے ایک قریبی ساتھی نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر مجھے (مصنف کو) بتایا کہ بے نظیر بھٹو اور ان کی فیملی کو پاکستان میں شدید معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور بعد ازاں جلاوطنی میں بھی یہی صورتحال باقی رہی۔جب بینظیر بھٹو واپس پاکستان آئیں تو معاشی حالات کافی دگرگوں تھے چنانچہ بے نظیر اور زرداری نے فیصلہ کیا کہ کرپشن کر کے سیاسی طور پر استحکام حاصل کیا جائے گا۔شیام بھاٹیہ نے بھی تسلیم کیا کہ

بے نظیر اور ان کے شوہر انتہائی زیادہ کرپشن میں ملوث رہے۔ (بھاٹیہ، 2010ء:37-28)۔

ایک بار پھر نگران حکومت

بے نظیر حکومت کی رخصتی والے روز بزرگ سیاستدان ملک معراج خالد نے 5 نومبر 1996 سے 17 فروری 1997) نگران وزیر اعظم کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ انہوں نے اپنی حکومت میں کفایت شعاری کے اقدامات کئے اور غیر ضروری پروٹوکول اور پر تعیش اخراجات ختم کر دیے۔ نئے انتخابات 3 فروری 1997ء کو ہوئے جس میں نواز شریف کو بھاری اکثریت سے کامیابی ملی۔ ان کو قومی اسمبلی میں 137 جبکہ بے نظیر کی پارٹی کو صرف 18 نشستیں ملیں۔ بے نظیر نے خفیہ ایجنسیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر دھاندلی کے الزامات لگائے۔

نواز شریف 17 اکتوبر 1997ء سے 12 اکتوبر 1999ء

نواز شریف کی قیادت میں مخلوط حکومت میں کچھ چھوٹی جماعتوں اور آزاد ارکان نے بھی شمولیت اختیار کر لی جبکہ فاروق لغاری بدستور صدر کے منصب پر فائز رہے۔ 165 ارکان کی حمایت کے ساتھ نواز شریف کو قومی اسمبلی میں فقید المثال اکثریت مل گئی۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ ایسی بھاری اکثریت کے ساتھ انہوں نے آئین میں 13 ویں ترمیم کی جس کے تحت صدر کا اسمبلی توڑنے کا اختیار ختم کر دیا۔ چند ماہ بعد انہوں نے 14 ویں ترمیم منظور کرائی جس کے تحت پارٹی سربراہ کو ایسے ارکان اسمبلی کو برطرف کرنے کا اختیار مل گیا جو پارٹی کی مرضی کے مطابق ووٹ نہیں دیتے۔ اس طرح عدم اعتماد کی تحریک کے ذریعے کسی وزیر اعظم کو ہٹانے کا اختیار نہ ہونے کے برابر رہ گیا بعض ارکان اس ترمیم کے خلاف سپریم کورٹ چلے گئے جس نے اسے خلاف آئین قرار دے دیا۔ اس سے نواز شریف کافی جز بز ہوئے۔ (عباس، 2005:60-159)۔

اس دوران وزیر اعظم نواز شریف نے احتساب بیورو قائم کیا۔ جس کا مقصد سیاستدانوں اور سرکاری عہدیداروں کو قابل احتساب بنانا تھا تاکہ کرپشن کا تدارک ہو سکے۔ لیکن اس کی آڑ میں میں مخالف سیاستدانوں اور صحافیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ نواز شریف کے چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس سجاد علی شاہ کے ساتھ اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ مسلم لیگی غنڈوں کے ایک گروہ نے سپریم کورٹ پر حملہ کر کے عدالتی کارروائی میں خلل پیدا کر دیا۔ 28 نومبر 1997ء کو وزیر اعظم نواز شریف

نے اس الزام میں سجاد علی شاہ کو برطرف کر دیا کہ چیف جسٹس اور صدر لغاری ان کی حکومت کے خاتمے کی سازش کرر ہے تھے اور ..... بے نظیر کی طرح ....انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے سنا ہے کہ چیف جسٹس خود وزیر اعظم بننے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہیں یہ اطلاعات خفیہ ایجنسیوں نے فراہم کیں۔ (ورائچ، 2008ء:108)۔

افغانستان، طالبان اور جہاد کشمیر

فوج اور بعض طاقتور بیوروکریٹس .... جنہیں عرف عام میں اسٹیبلشمنٹ، حکمران اشرافیہ یا ڈیپ سٹیٹ کہا جاتا ہے .... کا غلبہ 1990ء کی دہائی میں نواز شریف اور بے نظیر کی سویلین حکومتوں نے توڑنے کی کوششیں کیں لیکن اسی دورانیے میں افغانستان اور بھارتی کشمیر کے معاملات بہر حال فوج اور خفیہ ایجنسیوں بالخصوص آئی ایس آئی کے تحت رہے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو دونوں نے ان دونوں معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی سرتوڑ کوشش کی۔

افغانستان

جب بے نظیر بھٹو 1988ء میں اقتدار میں آئیں تو افغانستان سے سوویت فوجوں کا انخلا شروع ہو چکا تھا جو 1989ء میں مکمل ہوا۔ لیکن سوویت یونین کی حمایت یافتہ ڈاکٹر نجیب اللہ حکومت بدستور برسر اقتدار تھی۔ امریکہ اور بے نظیر افغانستان کا مذاکرات کے ذریعے تصفیہ چاہتے تھے اور کمیونسٹ اور کمیونسٹ مخالف دھڑوں میں بات چیت کے حامی تھے لیکن آئی ایس آئی اور اسلام پسند حلقے افغانستان میں افغان مجاہدین خصوصاً پختون لیڈر گلبدین حکمت یار کی سربراہی میں حکومت کے قیام کیلئے فوجی ذرائع استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ (حقانی، 2005ء:213)۔ چنانچہ افغان شہروں پر عسکری طاقت کے ساتھ حملے کئے گئے لیکن وہ ناکام رہے۔ یہاں تک کہ آئی ایس آئی نے پشاور میں عبوری افغان حکومت قائم کرنے کی بھی کوشش کی لیکن بے نظیر نے اس وقت تک ایسی کسی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جب تک اس کا افغانستان کے بڑے علاقے پر کنٹرول نہ ہو۔ جماعت اسلامی نے عبوری حکومت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جبکہ پنجاب میں نواز شریف کی سربراہی میں آئی جے آئی کی حکومت نے عبوری حکومت کے عہدیداروں کے اعزاز میں استقبالیہ بھی دیا۔ یہ آئینی لحاظ سے متنازعہ اقدام تھا کیونکہ غیر ملکی شخصیات کے اعزاز

میں ایسی تقریبات منعقد کرنا وفاقی حکومت کے اختیار میں ہوتا ہے لیکن آئی ایس آئی کی حمایت کے بعد آئین کی بالادستی غیر متعلق ہو جاتی ہے۔ بہر حال آئی ایس آئی اور اسلام پسندوں نے ڈاکٹر نجیب اللہ کو اقتدار سے نکال باہر کرنے کے لئے فوجی مہم جاری رکھی۔ امریکی فوج بھی اس مہم کی حامی تھی تاہم امریکی اور پاکستانی سفارتکار.... خصوصاً وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان.... اور بے نظیر اس کے مخالف تھے۔ (حقانی، 2005ء:5-214)۔

افغان خانہ جنگی

بے نظیر کی برخواستگی اور نواز شریف کے وزیر اعظم بننے سے آئی ایس آئی اور فوج کی افغان پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ڈاکٹر نجیب اللہ کو ہٹانے کی کوششیں جاری رہیں لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ وہ سوویت فوج کی مدد کے بغیر بھی 4 سال تک افغانستان پر اقتدار کرتے رہے۔ البتہ ازبک لیڈر عبدالرشید دوستم جیسے وارلارڈ کے انحراف اور ان کے غیر پختون تاجک لیڈر احمد شاہ مسعود کی زیر قیادت اتحاد کے ساتھ ملنے سے نجیب اللہ کمزور ہو گئے۔ اس کے بعد آئی ایس آئی کے حمایت یافتہ اسلام پسند دھڑوں اور مسعود شاہ گروپ جسے شمالی اتحاد کہا جانے لگا تھا کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ اس لڑائی میں اسلام پسند فتحیاب ہوئے اور طالبان نے 1996ء میں اقتدار سنبھال لیا اور کابل میں اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ حاصل کرنے والے افغان صدر نجیب اللہ کو بے دردی سے پھانسی دے کر ان کا مثلہ کیا گیا۔

مختصر کمیونسٹ دور حکومت کی آخری علامت کے ہٹنے کے بعد مختلف قوموں پر مشتمل افغان معاشرے میں گہرے نسلی اور علاقائی تنازعات پیدا ہو گئے۔ اب تک وارلارڈز، ریڈ آرمی اور ان کے افغان میز بانوں کو ہٹانے میں مصروف رہے لیکن یہ اتحاد گمراہ کن اور جعلی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنے والے کئی برسوں تک جو خونریزی اور دہشت گردی ہوئی اس نے سوویت یونین کے خلاف جہاد کے دور کی دہشت کو مات دے دی۔ کئی نسلی اور فرقہ وارانہ دھڑوں نے وارلارڈز کی زیر قیادت خونیں قتل و غارت شروع کر دی۔ پاکستان نے اپنا وزن پختون لیڈر گلبدین حکمت یار کے پلڑے میں ڈالا جو تاجک لیڈر برہان الدین (جنہیں دوستم۔ مسعود فوجوں کی حمایت ملی تھی) کی حکومت کے مخالف تھے۔ تاہم ایک مقام پر آئی ایس آئی نے پختون اور غیر پختون روایتی

اسلام پسندوں کے درمیان وسیع تر اتحاد قائم کرنے کی بھی کوشش کی۔ ان دنوں یعسوب علی ڈوگر (بعدازاں بریگیڈئیر ریٹائر ہوئے) افغانستان میں آئی ایس آئی کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ آئی ایس آئی نے پہلے صبغت اللہ مجددی (28 اپریل 1992ء سے 28 جون 1992ء) اور پھر برہان الدین ربانی (28 جون 1992ء سے 29 ستمبر 1992ء) کے ساتھ وسیع تر اتحاد قائم کیا۔ اس کے بعد حکمتیار نے 94-1993ء میں اور پھر مختصر عرصے کیلئے دوبارہ 1996ء میں افغانستان کے وزیر اعظم کے طور پر فرائض انجام دیے۔ اس سے خطے میں پاکستان کی بطور علاقائی طاقت ساکھ میں نمایاں اضافہ ہوا۔ لیکن گلبدین حکمت یار نے اپنی زیادہ توانائیاں اپنے نسلی مخالفین کے ساتھ پر تشدد تصادم میں خرچ کیں۔ ہزاروں افغان مارے گئے اور خواتین سے زیادتی سمیت دیگر عورت دشمن اقدامات جبکہ ہزارہ شیعہ کمیونٹی کے خلاف کارروائیوں پر مبنی فرقہ وارانہ واقعات عام ہو گئے۔ وارلارڈز کے درمیان جنگ کے دوران کی صورتحال انتہائی حد تک بگڑ گئی۔ (امین، اوسنسکی اینڈ ڈی جارجز، 2010ء: 7-25)۔ یہ وہ دور تھا جب بین الاقوامی طاقتوں اور دھڑوں نے بھرپور انداز میں وارلارڈز کی حمایت شروع کر دی۔ سب سے اہم بات یہ کہ بھارت نے ازبک۔ تاجک اتحاد کی پشت پناہی کی جبکہ پاکستان نے پختون قوتوں کی حمایت کی لیکن طاقت کا توازن اس طرح سے تھا کہ گلبدین حکمتیار اور شمالی اتحاد دونوں ایک دوسرے کو فیصلہ کن انداز میں کمزور نہ کر سکے۔ خانہ جنگی کے دوران ہونے والی تباہی اور بربادی نے افغان عوام کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ (حقانی، 2005ء: 238)۔

طالبان

یہی وہ حالات تھے جب 1994 کے آخر میں سرحد کے دونوں طرف پختون طالبان ملا عمر کی قیادت میں اس جنگ میں کود پڑے۔ جاری خانہ جنگی کا نتیجہ طوائف الملوکی اور شورش کی صورت میں نکلا تھا۔ منشیات کا کاروبار کرنے والے اور دیگر جرائم پیشہ عناصر مضبوط تر ہو گئے۔ سوویت یونین سے لڑنے والے مجاہدین کے برعکس طالبان نوعمر تھے اور سوویت یونین کی فوجوں کے انخلا کے بعد اس لڑائی میں شامل ہوئے۔ تاہم ان کے لیڈر سوویت مخالف جہاد میں حصہ لیتے رہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دیوبندی مکتبہ فکر کے سخت گیر عسکریت پسند سنی اسلام کے پیروکار ہونے کے

ساتھ طالبان کو پاکستان کے ٹرانسپورٹ اور سمگلنگ مافیا کی حمایت بھی حاصل تھی جو وسط ایشیا کی منڈیوں تک رسائی چاہتا تھا۔ طالبان کے دیگر حامیوں میں بے نظیر بھٹو کی اتحادی مولانا فضل الرحمٰن کی جے یو آئی اور پاکستان کے پختون فوجی اور سیاسی افسر شامل تھے۔ دیگر الفاظ میں یہ ایک ایسی پختون تحریک تھی جو شدید مذہبی رنگ اور سرحد کے دونوں اطراف میں پختونوں کے مادی مفادات کی حامل تھی۔

امریکہ نے شروع میں طالبان اور دیگر افغان دھڑوں کو امن مذاکرات کی میز پر لانے کی پاکستان کی کوششوں کی حمایت کی۔ اس دوران امریکی تیل کمپنی Unocol نے ترکمانستان سے افغانستان کے راستے گیس پائپ لائن پاکستان تک لانے پر بات چیت کا آغاز کیا۔ (حقانی، 238-40:2005)۔ کئی دیگر بین الاقوامی کمپنیاں بھی ایسے امکانات میں حصہ ڈالنے کی خواہاں تھیں۔ امریکہ یہ بھی توقع کر رہا تھا کہ طالبان نہ صرف دہشت گردی کا خاتمہ کریں گے بلکہ منشیات کی سمگلنگ بھی روکیں گے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ سنی مکتبہ فکر کے حامل ہیں اس لئے وہ خطے میں ایرانی اثر ورسوخ کے آگے بھی بند باندھیں گے لیکن طالبان حکومت کے قیام کے بعد امریکہ نے محسوس کیا کہ اس کے کئی اندازے محض واہمے تھے۔ (کوکس، 2001ء:7-336)۔ بہرحال طالبان کی قندھار سے کابل کی جانب پیشقدمی نہایت تیز اور ڈرامائی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے تو مقامی لوگ انہیں نیک اور متقی سمجھ کر ان میں شامل ہوتے جاتے۔ لوگوں کو یہ بھی خوشی تھی کہ کوئی وار لارڈ طالبان میں موجود نہیں۔ کابل جاتے ہوئے راستے میں جہاں جہاں وہ گئے انہوں نے ''امن وامان'' کی صورتحال بحال کر دی۔ یہ لوگ ہر طرف پھیل گئے اور بالآخر ستمبر 1996 میں طالبان نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان نے طالبان کی فتح پر خوش کے شادیانے بجائے کیونکہ پہلی بار افغانستان میں پاکستان کی دوست حکومت وجود میں آئی تھی۔ بے نظیر اور نواز شریف دونوں نے طالبان حکومت کا خیر مقدم کیا۔ آنے والے برسوں میں بینظیر بھٹو نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے وزیر داخلہ میجر جنرل (ر) نصیر اللہ بابر کے ساتھ طالبان کی مدد کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تاہم انہوں نے اس بات پر افسوس کیا کہ سعودی عرب نے انہیں اس کام کے لئے ہائی جیک کیا۔ (خان، 2005ء: 197)۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو کے اس لمبے چوڑے دعوے کے مضمرات کا خود انہیں اندازہ نہیں تھا۔ ہمسایہ ملک میں طالبان حکومت کے قیام کے بعد پاکستان

میں بھی اسلام پسندوں کے اس مطالبے، جوش اور عزم میں تیزی آ گئی کہ ایسا نظام حکومت پاکستان میں بھی نافذ کیا جائے۔ حسب معمول جماعت اسلامی نے غیر لچکدار اسلام پسندوں کے سرخیل کا کردار ادا کیا۔

پاکستان کی فوجی اسٹیبلشمنٹ اور آئی ایس آئی نے طالبان کی کامیابی کا جشن ایک سٹرٹیجک اثاثے کے طور پر منایا۔ پہلی بار افغانستان میں ایک ایسی حکومت قائم تھی جو پاکستان کے بارے میں جارحانہ عزائم نہیں رکھتی تھی: شمالی اتحاد کو کابل سے نکال باہر کرنے اور شمالی افغانستان کے چند مقامات تک محدود کرنے سے بھارت کا کابل میں عمل دخل ختم ہو گیا۔ البتہ یہ بات مکمل سچ نہیں ہو سکتی تھی کہ طالبان محض آئی ایس آئی کی تخلیق تھے اور ان کے اپنے کوئی مفادات نہیں تھے۔ یوں مثال کے طور پر پاکستان کے دباؤ کے باوجود طالبان نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ڈیورنڈ لائن پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تھی۔ (راشد، 2008ء اے، 7-186)۔ اس کے علاوہ طالبان نے چین، وسط ایشیائی ریاستوں، افغانستان اور پاکستان سے آنے اور وہاں جانے والی سمگل شدہ اشیا کے روٹ کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس عمل سے پاکستانی معیشت کو بڑا دھچکہ لگا اور 1992 سے 1998 کے درمیان ریونیو میں 90 کروڑ ڈالر کا خسارہ دیکھنے میں آیا۔ افغان سمگلنگ کے مافیاز نے جنوبی صوبے بلوچستان میں جڑیں قائم کر لیں۔ (ایضاً: 191)۔

بہر حال آغاز میں طالبان حکومت ملک میں امن قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ انہیں افیون کی کاشت روکنے، ہیروئن کے سمگلروں کی بیخ کنی اور انصاف کی فراہمی میں بھی کسی حد تک کامیابی ملی۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد انہوں نے اسلامی شریعت کے نفاذ کا آغاز کر دیا جس نے بنیاد پرستی میں ایران اور سعودی عرب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، بالخصوص معاشرے میں خواتین کے کم سے کم کردار کو بھی ناممکن بنا دیا گیا۔ اس بارے میں ان کا مؤقف یہ تھا کہ عوامی سطح پر خواتین کی موجودگی سے اخلاق باختگی کو فروغ مل سکتا ہے جبکہ تمام متقی مسلمانوں کے لئے پرہیز گاری ضروری ہے۔ اگرچہ خواتین سے زیادتی اور دیگر گھناؤنے جرائم میں ملوث عناصر کو سرعام پھانسیاں دی گئیں لیکن طالبان کے قہر کا حقیقی نشانہ خواتین ہی تھیں۔ خواتین ڈاکٹروں، نرسوں اور اساتذہ کو ملازمتوں سے فارغ کر کے گھر بھجوا دیا گیا۔ خواتین کی تعلیم کو غیر اسلامی قرار دے دیا گیا اور کسی خاتون کو محرم مرد کے بغیر گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ فرقہ واریت کے شعبے میں دیکھیں تو طالبان نے شیعہ

کمیونٹی کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیا۔ اس کے علاوہ طالبان نے مبینہ جرائم پیشہ عناصر کو سر عام سخت سزائیں دینا شروع کر دیں۔ حیران کن جوش کے ساتھ زنا کے مرتکب افراد کو سنگسار کرنے، کوڑے لگانے اور ہاتھ کاٹنے کی سزائیں دی گئیں۔ موسیقی، سینما گھروں اور فوٹوگرافی پر پابندی لگا دی گئی، آلات موسیقی اور فوٹوگرافی کا سامان رکھنے والے دکانداروں کو سر عام کوڑے لگائے گئے۔ احمد رشید نے افغان عوام کے ساتھ طالبان کے سلوک کی تفصیل سے منظر کشی کی ہے۔ 1998ء کے موسم گرما تک طالبان کا ملک کے 90 فیصد علاقے پر قبضہ ہو چکا تھا اور شمالی اتحاد لرزہ بر ندام تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران نے افغانستان پر حملے تک کی دھمکی دے ڈالی اور الزام لگایا کہ طالبان کا بڑا حامی پاکستان تھا۔ (ایضاً: 5-1)۔

طالبان کی انتہا پسند توحید پرستی نے ایک خاص پیچیدگی کی شکل اختیار کر لی کیونکہ ان کے جہاد میں تمام غیر مسلم شامل تھے جو ان کا جائز ہدف تھے۔ (غزالی اینڈ انصاری، 2002ء: سٹرن، 2000)۔ کم از کم مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور سے افغانستان میں کئی سکھ اور ہندو مقیم تھے، پختونوں کے روایتی ضابطہ اخلاق ..پختون ولی.. میں اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے لیکن طالبان نے انہیں ہراساں کرنا شروع کر دیا اور شرط لگائی کہ اسلام قبول کرو یا جزیہ دو۔ چنانچہ سکھوں اور ہندوؤں کی بڑی تعداد پاکستان آ گئی یا بھارت چلی گئی۔ اس تناظر میں نہ صرف بھارت بلکہ امریکہ ، اسرائیل یہاں تک پوری ''کافر دنیا'' کو اسلام کا دشمن قرار دے دیا گیا۔ (رائٹ، 2000)۔

جہاد اور مقبوضہ کشمیر

طالبان حکومت کی وجہ سے بظاہر افغان سرحد محفوظ ہونے کے بعد پاکستانی فوج بالخصوص آئی ایس آئی نے بھارتی قبضے سے کشمیر آزاد کرانے کیلئے جنگجوؤں کی بھرتی شروع کر دی ... مقصد Strategic Depth حاصل کرنے کے خواب کی تعبیر حاصل کرنا تھا۔ طالبان کی فتحیابی کے بعد اس نظریے کو تقویت ملی کہ ایران، ترکی، وسط ایشیائی ریاستوں، افغانستان اور پاکستان پر مشتمل وسیع تر اسلامی ریاست یا ریاستہائے متحدہ کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا تھا لیکن کشمیر کی بھارتی غلبے سے آزادی تک پان اسلام پسند ریاست کا خواب عملی شکل نہیں اختیار کر سکتا تھا۔ یہ فوجی اصطلاح میں ایک مضحکہ خیز تصور تھا کیونکہ پاکستان کے ممتاز سکالر اور کارکن اقبال احمد کے

مطابق ایسی جگہ جہاں شکست خوردہ فوج کو چھپنے کیلئے محفوظ ٹھکانے نہ میسر ہوں کے بغیر ایسا ہدف نہیں حاصل ہوسکتا۔ (راشد، 2008ء اے:187)۔

لیکن کشمیر کی آزادی کی خوش امیدی اس وقت بڑھ گئی جب 1980ء کے عشرے کے آخر میں کشمیری مسلمانوں نے مقبول عسکری جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ ہزاروں کشمیری سرحد پار کر کے پاکستان آ گئے جہاں انہیں پاکستان اور افغانستان میں قائم کیمپوں میں تربیت دی گئی۔ ریڈ آرمی کی رخصتی کے بعد کئی غیر ملکی مجاہدین بھی جہاد کشمیر میں شامل ہو گئے۔ آئی ایس آئی نے سیکولر نظریے کی حامل اور کشمیر کی خودمختاری کی حامی جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (جے کے ایل ایف) کی بجائے اسلام پسند اور پاکستان نواز حزب المجاہدین کی پشت پناہی کی۔ 1990ء کے عشرے میں حرکۃ المجاہدین، لشکر طیبہ اور جیش محمد نے جہاد کیلئے پاکستان میں اپنی تنظیم سازی کی اور بھارت کے خلاف بالخصوص کشمیر میں جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ (حسین، 2008ء:5-24)۔ آئی ایس آئی اور سعودی ارب پتی اسامہ بن لادن جو افغانستان جہاد میں کافی سرگرم رہا اس نے افغانستان میں کشمیری عسکریت پسندوں کے اڈوں کی مالی معاونت کی۔

پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی نے پاکستانی بنیاد پرست تنظیموں کی پرورش شروع کر دی جنہوں نے بدلے میں بھارتی کشمیر میں لڑنے کیلئے رضا کار بھرتی کئے۔ یہ روایت عام ہوگئی کہ نماز جمعہ کے اجتماعات میں نمازیوں سے جہاد کشمیر کیلئے چندہ اکٹھا کیا جاتا، بھارتی حکومت نے بار بار الزام لگایا کہ ایسی تنظیموں کو حکومت پاکستان کی حمایت حاصل ہے اور یہ کہ آزاد کشمیر اور پاکستانی علاقوں میں عسکریت پسندوں کے تربیتی کیمپ موجود ہیں۔ پاکستانی حکومت نے ان کیمپوں کی موجودگی کی تردید کی تاہم عسکریت پسندوں کو حریت پسند قرار دیا۔ (رانا، 2004)۔ 1990ء کے اوائل میں بھارت نے کشمیر میں بھاری تعداد میں فوج تعینات کر دی جس کے جواب میں پاکستان نے بھی آزاد کشمیر میں ایسا کیا۔ بھارت کے نئے وزیراعظم وی پی سنگھ نے سرعام پاکستان کے ساتھ جنگ کی باتیں کی۔ اس صورتحال میں بھارت اور پاکستان میں امریکی سفیروں کو تشویش ہوئی کیونکہ اس بارے میں شکوک وشبہات پائے جاتے تھے کہ دونوں ملکوں کے پاس ایٹمی ہتھیار تھے۔ چنانچہ امریکہ کے نائب مشیر برائے قومی سلامتی رابرٹ گیٹس نے جنوبی ایشیا کا دورہ کیا اور دنوں ملکوں پر صبر وتحمل سے کام لینے پر زور دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بھارت نہایت آسانی سے پاکستان کو

شکست دے سکتا ہے اور انہوں نے پاکستان کا یہ مؤقف بھی تسلیم نہ کیا کہ وہ کشمیر میں شورش میں ملوث نہیں۔ بہر حال رابرٹ گیٹس کے دورے سے کشیدگی کم کرنے میں مدد ملی اور دونوں حریف ملکوں کے درمیان تصادم کے خطرات ٹل گئے۔ (کوکس، 2001ء:7-306)۔

1992-93ء میں بھارت کے دباؤ پر امریکہ پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دینے کے فیصلے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ردعمل میں پاکستان نے عسکریت پسندوں کے اڈے پاکستان سے مشرقی افغانستان میں منتقل کر دیے۔ پاکستان نے ان تنصیبات کا وجود برقرار رکھنے کے لئے طالبان کو رقوم دیں۔ (راشد، 2008ء اے:186)۔ وزیر اعظم نواز شریف نے سخت گیر جنرل جاوید ناصر کو تبدیل کر کے نسبتاً لبرل جنرل جاوید اشرف قاضی کو آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کر دیا۔ پاکستانی حکام یہ شکوہ کرتے رہے کہ یہی عسکریت پسند جب روس کے خلاف برسر پیکار تھے تو امریکہ نے انہیں مجاہد کہا لیکن اب انہیں دہشت گرد قرار دے رہا ہے۔ حالانکہ اب کشمیری صرف بھارتی قبضے سے آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ (کوکس، 2001:23-322)۔ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کو اس وقت زبردست تقویت پہنچی جب 28 اکتوبر 1991ء کو جنوبی ایشیا کے لئے امریکہ کے معاون وزیر خارجہ رابن رافیل نے صحافیوں کو بتایا کہ:

''ہم کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ سمجھتے ہیں۔ ہم کشمیر کے بھارت سے الحاق کے معاہدے کو تسلیم نہیں کرتے، اس کا مطلب ہے کہ ہم اس لئے تسلیم نہیں کرتے کیونکہ الحاق کا مطلب یہ نہیں کہ کشمیر ہمیشہ کیلئے بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، جیسا کہ ہم سب یہاں جانتے ہیں کہ اس ٹائم فریم میں کئی دیگر ایشوز بھی تھے....تنازعہ کشمیر کے کسی بھی حتمی حل سے پہلے کشمیریوں سے مشاورت ضرور کی جانی چاہیئے کیونکہ ابھی ہم سمجھتے ہیں کہ کشمیری عوام کی رضامندی کے بغیر مسئلے کا کوئی مستحکم اور دیرپا حل نکل سکتا ہے''۔ (جین، 2007ء اے:8-127۔

یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ اس بیان پر جہاں پاکستانیوں نے بغلیں بجائیں وہاں بھارتی سیخ پا ہوئے۔ لیکن رابن رافیل اپنی بات پر ڈٹی رہیں اور امریکی سینٹ کی کمیٹی کے روبرو سماعت میں 4 فروری 1994ء کو انہوں نے اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ کشمیر پر امریکہ کا مؤقف تبدیل ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ:

''ہم سابق خود مختار ریاست (کشمیر) کو مجموعی حوالے سے دیکھتے ہیں۔ یہ کہنے سے ہماری

مراد یہ ہے کہ نہ صرف بھارتی حصے والا بلکہ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر بھی متنازعہ علاقہ ہے.... ہم باقاعدگی کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے بھارتی حکومت پر زور دیتے ہیں کہ وہ کشمیر میں انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں کو جانے کی اجازت دے''۔(ایضاً:129)۔

ایسے وضاحتی بیانات سے بھارت کے ان خدشات میں کمی نہ ہوئی کہ امریکہ کا جھکاؤ پاکستان کی طرف ہے۔ رابن رافیل نے یہ تاثر اس وقت دور کرنے کی کوشش کی جب 9 فروری 1994ء کو ایشیا سوسائٹی اور محکمہ خارجہ کی انڈین کونسل کے مشترکہ ظہرانے سے خطاب میں انہوں نے کہا کہ افغان جنگ کے بعد پاکستان کی تمام امداد روکنے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر اس فیصلے کا دفاع کیا کہ چونکہ دنیا کی صورتحال تبدیل ہو چکی تھی اس لئے امریکہ کو اپنے مفادات کی بنیاد پر پالیسی مقاصد کا از سر نو تعین کرنا چاہیئے۔(ایضاً)۔ اس بیان سے امریکی عزائم کے بارے میں بھارتی شکوک وشبہات اور خدشات میں اضافہ ہو گیا۔ پھر 25 مارچ 1994ء کو رابن رافیل نے نئی دہلی کے امریکن سنٹر میں خطاب کرتے ہوئے اپنے مؤقف میں معمولی ردوبدل کیا۔ انہوں نے شرکا کو بتایا کہ امریکہ کے مؤقف (جو انہوں نے اکتوبر 1993ء میں بیان کیا تھا) کی غلط تشریح کی گئی بلکہ خوفناک حد تک اسے مسخ کیا گیا۔ درست مؤقف یہ تھا کہ امریکہ مسئلہ کشمیر کے مذاکرات کے ذریعے حل کا حامی ہے اور اسے شملہ معاہدے کے تحت حل ہونا چاہیئے اور بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر زبردست نظر رکھنی چاہیئے۔ ہم ''باہر سے عسکریت پسندوں کی امداد کے خلاف ہیں اور ہم نے اس کی بارہا وضاحت کی ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے''۔(ایضاً:130)۔ ان کی طرف سے اور کلنٹن انتظامیہ کے دیگر حکام کے اس مؤقف کو اس تناظر میں دیکھا گیا جبکہ پاکستان میں سویلین حکومتیں برسر اقتدار تھیں۔ میرے (مصنف) ساتھ ایک انٹرویو میں رابن رافیل نے کہا کہ انہیں اس مؤقف پر بعد ازاں بھارت کی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا جبکہ امریکی اسٹیبلشمنٹ میں بھی زیادہ پذیرائی نہ ملی جو بتدریج بھارت نواز ہو رہی تھی۔

کلنٹن انتظامیہ کی بڑی تشویش بدستور پاکستان کا ایٹمی ہتھیاروں کا پروگرام تھا۔ امریکی حکام نے اعتراف کیا کہ معاشی اور فوجی امداد کی بندش سے پاکستان کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا لیکن انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ پاکستان کے ایٹمی عزائم واضح ہونے تک کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ امریکہ نے بھارت پر بھی زور دیا کہ وہ ایٹمی پروگرام آگے نہ بڑھائے، لیکن نئی دہلی کا عذر لنگ یہ تھا

کہ بھارت کی قومی سلامتی کو چین سے خطرہ لاحق ہے اس لئے ہم ''تمام آپشن کھلے رکھیں گے''۔ (ٹالبوٹ، 2004ء:46)۔

ایٹمی دھماکوں کا تجربہ

یہ تمام دباؤ بے کار ثابت ہوا۔ 11 اور 13 مئی 1998ء کو بھارت نے یکے بعد دیگرے 5 ایٹمی دھماکے کر دیے۔ اس جوہری تجربے پر بھارتی شہری خوشی سے دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے اور اپنی وحشیانہ طاقت کا جشن منانے لگے۔ یہ خوشی تمام دھڑوں کے سیاستدانوں نے بلاتفریق منائی۔ حقیقت میں کانگریس کی سابق نرسیماراؤ حکومت نے ایٹمی تجربات پر غور کیا تھا لیکن چونکہ اس پر عملدرآمد ہندو قوم پرست جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی نے کیا اس لئے انتہا پسند وطن پرستی اور احساس برتری عروج پر پہنچ گیا۔ ایسے حالات میں یہ بات حیران کن نہیں کہ پاکستان کے عدم تحفظ کے احساس میں بے انتہا اضافہ ہوگیا۔ حکومت پاکستان نے منہ توڑ جواب کے نتائج وعواقب کا اندازہ لگایا لیکن ردعمل کیسا ہو اس کا فوری فیصلہ نہ کر سکی۔ بے نظیر بھٹو نے محاذ جنگ کے انداز میں ٹیلی ویژن پر آ کر کہا کہ نواز شریف اگر مردانہ انداز میں جواب نہیں دے سکتے تو چوڑیاں پہن لیں۔ کلنٹن انتظامیہ، یورپی یونین اور جاپان نے پاکستان پر شدید دباؤ ڈالا کہ وہ جوہری دھماکے کرنے سے باز رہے۔ جبکہ سعودی عرب نے کہا کہ دھماکہ کرو۔ چنانچہ پاکستان نے 28 اور 31 مئی کو ایٹمی دھماکے کر ڈالے۔ اس اقدام پر پاکستانی قوم نے نواز شریف کا والہانہ خیر مقدم کیا کیونکہ بلاشبہ بھارت کی طرف سے فوجی طاقت کے بہیمانہ اظہار کے بعد پاکستانی خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے۔ تاہم جب یہ جنون اترا اور امریکہ سمیت دیگر ملکوں نے پاکستان پر سخت پابندیاں لگائیں تو معیشت اپاہج ہونے کے قریب پہنچ گئی۔ (وڑائچ، 2008ء:113)۔

اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے حکومت نے فارن کرنسی اکاؤنٹس منجمد کر دیے۔ ایسی افواہیں پھیل گئیں کہ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے نواز شریف اور ان کی فیملی نے غیر قانونی طور پر اپنی رقوم بیرون ملک منتقل کر دیں۔ نواز شریف کی مقبولیت تیزی سے نیچے گر گئی۔ صورتحال اس وقت مزید سنگین ہوگئی جب انہوں نے کئی شہری آزادیاں معطل کر دیں اور سندھ حکومت برطرف کرنے کے علاوہ فوجی عدالتیں قائم کر دیں۔ 8 اکتوبر 1998ء کو ان کی حکومت نے قومی اسمبلی میں شریعت

بل پیش کیا جس کے تحت قرآن وسنت کو سپریم قانون قرار دیا گیا۔ اس بل پر پہلے کابینہ میں بحث ہوئی اور کچھ ردوبدل کے بعد اسے پارلیمنٹ کے ایوان زیریں قومی اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ یہ بل 10 اکتوبر 1998ء کو 16 کے مقابلے 151 ووٹوں سے منظور کرلیا گیا تاہم ابھی ایوان بالا سینٹ کی منظوری حاصل کرنا باقی تھی۔

اس بل کے خلاف انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کی تنظیموں نے احتجاجی مظاہرے کئے۔ حکومت نے اس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور مظاہرے کرنے والوں کو مغربی سامراج اور اسلام مخالف قوتوں کا دشمن قرار دیا۔ (احمد، 2002)۔ لیکن حکومت کو سینٹ میں دوتہائی اکثریت حاصل نہیں تھی اس لئے بل منظور نہ کیا جا سکتا۔ تاہم نواز شریف اس پر مصر رہے اور 16 جنوری 1999ء کو پاک افغان سرحد کے قریب قبائلی علاقوں میں یہ قانون نافذ کر دیا گیا۔ انہوں نے پاکستان میں بھی سخت شرعی قوانین کے نفاذ کی دھمکی دی۔ حالانکہ سینٹ نے اس بل کو سند قبولیت نہیں بخشی تھی۔ بہرحال اس سے پہلے کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھاتے نواز شریف کی حکومت کو 12 اکتوبر 1999ء کو آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے الٹا دیا۔ (عباس، 2005ء:5-164)۔

اسامہ بن لادن کے ایک معتمد علی محمد نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے اسامہ بن لادن اور نواز شریف کے نمائندوں کے درمیان ملاقات کرائی۔ اس ملاقات کے صلے میں نواز شریف کے نمائندوں کو مبینہ طور پر 10 لاکھ ڈالر دیے گئے تا کہ طالبان کو افغانستان میں مضبوط ہونے کا موقع دیا جائے اور انہیں پاکستان کے صوبہ سرحد میں بھی اثر ورسوخ قائم کرنے دیا جائے۔ (اے بی سی نیوز، 30 نومبر 2007)۔ ایسے الزامات نواز شریف کے بعض اقدامات سے میل نہیں کھاتے۔ مثال کے طور پر نواز حکومت نے اتوار کو ہفتہ وار چھٹی کر دی جو بھٹو نے جمعہ کی کی تھی۔ کم از کم اس معاملے میں نواز شریف کی کاروباری خصلت اسلام پسند طبع پر حاوی آ گئی۔ اکتوبر 1998ء سے نواز شریف آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کے ساتھ تصادم میں ملوث تھے جنہوں نے (فوج کی نمائندگی سمیت) قومی سلامتی کونسل کی وکالت کی تھی۔ نواز شریف نے اس تجویز کو پاکستانی سیاست میں فوج کو ملوث کرنے اور اس کا کردار بڑھانے کی سازش سے محمول کیا۔ چنانچہ انہوں نے آرمی چیف پر کڑی تنقید کی جنہوں نے بالآخر استعفیٰ دے دیا۔ (وڑائچ، 2008ء:9-117)۔ اس معاملے میں ان کے منتخب کردہ آرمی چیف اور دیرینہ حریف مشرف جتنا بے لاگ تبصرہ شاید ہی کسی نے کیا

ہو۔ وہ لکھتے: ''جس بات سے مجھے شدید صدمہ پہنچا وہ آرمی چیف کے انتہائی شرافت سے استعفیٰ دینے کا طریقہ تھا۔ اس سے فوج میں شدید ناراضگی پھیل گئی کیونکہ سپاہیوں اور افسروں نے اس پر اپنی ذلت محسوس کی''۔ (مشرف، 2006: 84)۔ جنرل کرامت کے بعد نواز شریف نے کئی سینئر جنرلوں کو نظر انداز کر کے پرویز مشرف کو آرمی چیف لگا دیا۔ اس فیصلے پر بعد ازاں نواز شریف نے صحافی سہیل وڑائچ کے ساتھ گفتگو میں نہایت پشیمانی کا اظہار کیا۔ پرویز مشرف نے دعویٰ کیا کہ آرمی چیف بننے کے بعد شروع میں ان کے نواز شریف کے ساتھ تعلقات دوستانہ تھے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ جب انہوں نے وزیر اعظم کی (فوج میں) کی گئی تقرریوں اور برطرفیوں پر اعتراض کیا اور ایک صحافی کا کورٹ مارشل کرنے سے انکار کیا تو نواز شریف سٹپٹا اٹھے۔ اس کے علاوہ وہ خود کوئی چیز نہیں پڑھتے تھے بلکہ صرف اباجی (والد، میاں محمد شریف مرحوم) سے احکامات لیتے تھے جن کے ہاتھ میں مبینہ طور پر اقتدار کی اصل باگیں تھیں چنانچہ دونوں (وزیر اعظم اور آرمی چیف) کے درمیان مخاصمت تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ (مشرف، 2006ء: 113)۔

اٹل بہاری واجپائی کا لاہور امن مشن

نواز شریف اور آرمی چیف جنرل پرویز مشرف کے درمیان مخاصمت کا واضح اظہار اس وقت ہوا جب بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی فروری 1999ء کو امن مذاکرات کے لئے لاہور آئے۔ اصل میں بھارت کی طرف سے امن مذاکرات کا ڈول سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے ڈالا تھا۔ گجرال اور نواز شریف کے درمیان مئی 1997ء کو ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی۔ (دونوں پنجابی وزرائے اعظم کی) ملاقات کا ماحول کافی خوشگوار تھا۔ اس لئے انہوں نے دونوں ملکوں کو قریب لانے کا فیصلہ کیا۔ (گجرال، 2011ء: 407)۔ حسن اتفاق دیکھیں کہ آئی کے گجرال کا خاندان پاکستانی پنجاب سے بھارت جبکہ نواز شریف کا خاندان مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب منتقل ہوا تھا۔ دونوں نے ملاقات میں مادری زبان پنجابی میں بات چیت کی۔ اس پر بے نظیر بھٹو نے تنقید کرتے ہوئے اسے پاکستان کے وقار کے منافی قرار دیا۔ میں نے خود یہ تبصرہ ٹی وی پر سنا۔ بہر حال اب واجپائی وہی سوچ لے کر لاہور آئے۔ انہیں مئی 1998 میں ایٹمی دھماکے کرنے پر اپنی پارٹی کے عقابی ہندو قوم پرستوں کی زبردست ستائش ملی تھی۔ جب پاکستان نے بھی جواب میں

ایٹمی دھماکے کیئے تو بھارتی قیادت نے محسوس کیا کہ طاقت کا توازن مستحکم ہو گیا ہے۔

بھارتی وزیر اعظم نے لاہور میں مینار پاکستان کے تاریخی منٹو پارک کا بھی دورہ کیا جہاں 23 مارچ 1940ء کو مسلمانوں نے پہلی بار الگ وطن کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ اس خاص مقام پر آنے کا مطلب یہ تھا کہ بھارت کے ہندو قوم پرستوں نے تقسیم ہند کو واپس نہ ہونے والا عمل تسلیم کر لیا اور دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کے نئے دور کے آغاز کی خواہش کا اظہار کیا۔ (ٹالبوٹ، 2004ء: 153)۔ 21 فروری 1999ء کو اعلان لاہور میں کہا گیا کہ دونوں ملک باہمی طور پر سود مند تعلقات کیلئے کوششیں کریں گے اور اسلحے کی دوڑ سے گریز کیا جائے گا اور کشمیر سمیت تمام تنازعات کا مذاکرات کے ذریعے حل نکالا جائے گا۔ دونوں ملکوں نے تسلیم کیا کہ جوہری طاقت ہونے کے ناتے دونوں ملکوں کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ واجپائی ایک بڑے وفد کے ساتھ پاکستان میں آئے جس میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے جن کا تعلق ماضی میں مغربی پنجاب سے تھا۔ ان میں 1950ء اور 1960ء کی دہائی کے مشہور اداکار دیوانند، گلوکار مہندر کپور اور صحافی کلدیپ نیر بھی شامل تھے۔ واہگہ بارڈر پر بیشتر مہمانوں کو بسوں کے ذریعے لاہور لایا گیا جبکہ وزیر اعظم واجپائی ہیلی کاپٹر سے گورنر ہاؤس پہنچے۔ سڑک کے تمام راستے جماعت اسلامی اور مصالحتی عمل کے دیگر مخالفین نے مظاہرہ اور بسوں پر پتھراؤ کیا۔ نواز شریف الزام لگاتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے ساتھ پتھراؤ میں آئی ایس آئی کے ایجنٹ بھی شامل تھے۔ (وڑائچ، 2008ء: 4-123)۔ آنجہانی اداکار دیو آنند نے اس ناسٹلجیا کا ذکر کیا ہے جس نے انہیں اپنی مادر علمی گورنمنٹ کالج لاہور کے دورے میں گرفت میں لیا۔ راستے کے دونوں طرف کھڑا ہجوم خوشی سے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ ان کے اعزاز میں انتہائی دوستانہ استقبالیہ دیا گیا۔ نواز شریف نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی کابینہ کے ارکان سے ملوایا۔ دیو آنند نے اپنی روداد میں کسی ناخوشگوار واقعے کا ذکر نہیں کیا شاید وہ دوطرفہ تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے اس دورے کے بارے میں کوئی منفی تاثر نہیں دینا چاہتے تھے۔ (2007ء: 70-364)۔

کارگل کی محدود جنگ

یہ امن عمل اپنے ڈرامائی انجام تک اس وقت پہنچا جب جنرل پرویز مشرف اور ان کے ہمنوا

جنرلوں نے کنٹرول لائن کے ساتھ کارگل کی پہاڑیوں پر خفیہ آپریشن شروع کر دیا۔ بظاہر یہ کارروائی واجپائی کی لاہور آمد سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ وزیر اعظم نواز شریف نے اس آپریشن سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا:

''بحثیت وزیر اعظم مجھے بالکل اعتماد میں نہ لیا گیا اور جب 4 ماہ گزرنے کے بعد مجھے تھوڑا بہت کچھ بتایا گیا تو یہ بھی ساتھ کہا گیا کہ اس حملے سے کوئی مشکل پیدا ہوگی نہ جانی نقصان ہوگا۔ یہ بھی کہا گیا کہ کارروائی میں فوج حصہ نہیں لے گی بلکہ صرف مجاہدین لڑیں گے لیکن جب حملہ کیا گیا تو (دشمن کی طرف سے) پوری کی پوری ناردرن لائٹ انفنٹری اڑا دی گئی۔ 2 ہزار فوج شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ ہلاکتوں کی تعداد 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے مجموعی جانی ضیاع سے زیادہ تھی۔ جب اتنا بڑا نقصان ہو گیا تو میں نے مشرف کو یاد دلایا کہ نقصان آپ کا نہیں بلکہ فوج کا ہو رہا ہے اور پوچھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟۔ انہوں نے بتایا کہ بھارتی فوج طیاروں سے کارپٹ بمنگ کر رہی ہے۔ میں نے پوچھا کیا آپ کو اندازہ نہیں تھا کہ بھارتی فوج جواب میں کیا کیا کر سکتی ہے۔ تو انہوں نے فرمایا، جی نہیں اندازہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ہمارے آدمیوں کو بری طرح مارا جا رہا ہے کیونکہ ہمارے سپاہیوں کے مورچوں کے اوپر چھتیں نہیں تھیں اور بھارتی طیارے بھرپور بمباری کر رہے تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ جب واشنگٹن معاہدہ طے پایا تو بھارتی فوج کارگل خالی کر چکی تھی۔ انہوں نے نہایت تیز رفتاری سے پیشقدمی کی۔ یہ میں ہی تھا جس نے فوج کو بے آبرو اور رسوا ہونے سے بچایا''۔ (وڑائچ، 2008ء:126)۔

نواز شریف نے مزید بتایا کہ کارگل مہم جوئی کے باعث پاکستان بین الاقوامی برادری کی ہمدردیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سب سے بڑا دھچکہ مسئلہ کشمیر کو لگا جس پر نواز واجپائی ملاقات میں طے پایا تھا کہ اسے پر امن انداز میں حل کیا جائے گا۔ بین الاقوامی میڈیا پر پاکستان آرمی کو خود سر فوج کہا جانے لگا۔ بھارتی قیادت نے اسے غداری کے مترادف قرار دیا کیونکہ کارگل آپریشن اعلان لاہور کے سراسر منافی تھا۔ اس رسوا کن شکست کے باوجود فوج اپنی بات پر مصر رہی اور جنرلوں نے یہ نہ بتایا کہ آپریشن میں باقاعدہ فوجیوں نے حصہ لیا۔ تاہم یہ واجپائی تھے جنہوں نے نواز شریف کو بتایا کہ آپ کے باقاعدہ سپاہیوں نے لڑائی لڑی۔ جب نواز شریف امریکی صدر کلنٹن سے ملاقات کرنے واشنگٹن روانہ ہونے لگے تو جنرل مشرف نے ان کے ساتھ ملاقات کی

اور زور دیا کہ بھارت کو ہر صورت میں جنگ بندی پر آمادہ کیا جائے بصورت دیگر پاکستان ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو جائے گا۔نواز شریف نے کلنٹن کی امن اور جنگ بندی کیلئے مساعی کو سراہا۔اگر اس وقت امریکہ مدد کو نہ پہنچتا تو پاکستان کو شرمناک شکست کا منہ دیکھنا پڑتا۔ملاقات میں کلنٹن نے نواز شریف کو یہ بھی بتایا کہ پاکستان اپنے ایٹمی ہتھیاروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر رہا ہے۔اس اقدام سے بھارت کو نہایت تشویش ہے اور یہ کہ اس اقدام سے دونوں حریف ملکوں کے درمیان ایٹمی جنگ بھی ہوسکتی ہے۔(ایضاً:127)۔

یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ جنرل مشرف نے کارگل جنگ کی بالکل الٹ تشریح کی۔انہوں نے بتایا کہ کنٹرول لائن پر کارگل پر حملے کی تیاری فوج جنوری 1999 سے کر رہی تھی۔مشرف کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت نے سیاچن کے کئی مقامات پر فوج تعینات کر کے پہلے ہی شملہ معاہدے کی خلاف ورزی کی اور اس کے بعد مبینہ طور پر کنٹرول لائن کے کئی مقامات کی طرف بھی اپنے قدم بڑھائے۔چنانچہ جوابی کارروائی کیلئے میں نے بھی پاکستانی فوج کو حکم جاری کر دیا۔یہ کام نہایت کامیابی سے کیا گیا کیونکہ کشمیری مجاہدین اور پاکستانی رضا کاروں نے برق رفتاری کے ساتھ ان بنکروں اور چوکیوں پر قبضہ کرلیا جو بھارتی فوج سردیوں میں خالی کر دیتی تھی۔مئی 1999ء میں جب بھارتی فوج کو علاقے میں مجاہدین کی موجودگی کا اندازہ ہوا تو اس وقت کارگل کے علاقے میں 500 میل کا علاقہ مجاہدین کے قبضے میں جا چکا تھا۔انہوں نے کارگل آپریشن کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

''خالصتاً فوج کی اصطلاح میں کارگل آپریشن پاکستانی فوج کی تاریخ میں اہم سنگ میل تھا۔حریت پسندوں کی مدد کیلئے محض 5 بٹالین پاکستانی فوج نے بھارت کی 4 ڈویژن فوج اور بھاری تعداد میں توپخانے کو جنوبی میدانی علاقے سے کارگل میں آنے سے روکنے میں کامیابی حاصل کی۔بھارت کو اپنے تمام وسائل اور ایئر فورس استعمال کرنے پر بھی مجبور کر دیا گیا۔4 جولائی تک انہوں نے کچھ کامیابیاں ضرور حاصل کیں، جو میرے نزدیک چنداں اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ہماری فوجیں واٹرشیڈ سے آگے مقامات پر قبضہ کرنے کیلئے پوری طرح تیار تھیں''۔(مشرف، 2006ء:93)۔

مشرف نے اپنی کتاب میں نواز شریف کے صدر کلنٹن کے سامنے جھکنے کی سخت مذمت کی

ہے اور دعویٰ کیا کہ پاکستان نہایت بہتر پوزیشن میں تھا اور حریت پسند مزید پیشقدمی کے لئے پر عزم تھے۔ نواز شریف کو سیز فائر پر رضا مند ہونے سے پہلے کشمیر پر نہ صرف رعایات مانگنی چاہیئں تھیں بلکہ غیر مشروط فوجی انخلا کا بھی مطالبہ کرنا چاہیئے تھا۔ پرویز مشرف نے دعویٰ کیا کہ اگر انہوں نے منتخب حکومت کو اس اہم معاملے پر شرمندہ کرنا ہوتا تو میں عوام میں جا کر بتاتا کہ سیاسی مس ہینڈلنگ کی وجہ سے اس اہم موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ انہوں نے نواز شریف کا یہ دعویٰ مسترد کر دیا کہ آرمی چیف نے انہیں اعتماد میں نہیں لیا۔ مشرف کے مطابق، وزیر اعظم کو پہلے 25 جنوری، پھر 5 فروری 1999ء کو اور اس کے بعد 15 مارچ کو آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر میں بریفنگ دے کر مقبوضہ کشمیر کی اندرونی صورتحال پر تفصیلی بریفنگ دی گئی۔ اسی طرح 17 مئی، 2 جون اور 22 جون کو بھی بریفنگ دی گئی۔ مشرف نے یہ تاثر مسترد کر دیا کہ بھارتی ائیر فورس یا زمینی فوج نے حریت پسندوں کی ایک نہ چلنے دی۔ (ایضاً: 6-95)۔ بھارت کے ساتھ ماضی میں جنگوں کی طرح کارگل محاذ پر بھی بڑے کھلاڑیوں نے ذمہ داری دوسرے پر تھوپی۔ اس کیس میں مشرف کا مؤقف کم قابل اعتبار نظر آتا ہے۔ ایک بار پھر یہ بات واضح ہو گئی کہ آپریشن میں مناسب منصوبہ بندی کا فقدان تھا۔ امریکہ کے سابق نائب وزیر خارجہ سڑوب ٹالبوٹ کے مطابق جنرل مشرف اور ان کے ساتھی جنرلوں کو توقع تھی کہ وہ ایک ایسی کنٹرول لائن قائم کریں گے جو پاکستان کے لئے موزوں ہو۔ (ٹالبوٹ، 2004ء: 157)۔

میں نے 14 نومبر 2010ء کو بھارتی فوج کے بریگیڈیئر وجے سنگھ نائر سے دلی کے نواحی علاقے نوئیڈا میں انٹرویو کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ''چونکہ پاکستان نے یہ مضحکہ خیز مؤقف اختیار کیا کہ پاکستانی فورسز کا اس لڑائی میں کوئی عمل دخل نہیں اور یہ خالصتاً کشمیری مجاہدین اور پاکستانی رضا کاروں کی کارروائی تھی۔ اس لئے بھارت کے پاس جنگی قاعدوں کے مطابق ایسا کوئی طریقہ نہیں رہ جاتا جس کے تحت مرنے والوں کی لاشیں پاکستان کے حوالے کی جاتیں چنانچہ تمام لاشوں کو اسلامی طریقے کے مطابق دفنا دیا گیا''۔ یہ بات درست لگتی ہے کیونکہ بھارتی فوج میں کافی تعداد میں مسلمان بھی ہیں اس لئے فوجی یونٹوں میں مولوی بھی رکھے جاتے ہیں۔ انہی مولویوں نے کارگل میں جان سے ہاتھ دھونے والوں کے جنازے پڑھے ہوں گے۔

بھارت اور امریکہ میں بڑھتی مفاہمت

امریکی صدر بل کلنٹن نے کارگل پر بھارتی مؤقف کی زبردست حمایت کی جسے نئی دہلی میں کافی سراہا گیا۔ اس تناظر میں امریکی نائب وزیر خارجہ ٹالبوٹ اور بھارتی وزیر دفاع جسونت سنگھ کے درمیان ملاقاتیں ہوئیں۔ اس سے دونوں عہدیداروں کے درمیان تعلقات کافی خوشگوار ہو گئے جس سے امریکہ اور بھارت کو قریب آنے میں نہایت مدد ملی۔ (ٹالبوٹ:2004)۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ تھی کہ دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان تعاون کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔ چنانچہ مئی 1998 میں ایٹمی دھماکوں کے بعد کلنٹن انتظامیہ کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کے اثرات زائل کرنے میں مدد ملی۔ (کوہن اینڈ داس گپتا، 2010ء:166)۔ بلاشبہ اس مفاہمت کے پیچھے ایشیا میں چین کی معاشی اور عسکری شعبے میں بڑھتی طاقت پر دونوں ملکوں کی تشویش تھی۔

ڈرامائی 12 اکتوبر 1999ء

کارگل کے مس ایڈونچر کے نتیجے میں نواز شریف اور آرمی چیف جنرل مشرف کے درمیان انتہائی مخاصمت پیدا ہو گئی۔ نواز شریف نے الزام لگایا ہے کہ کارگل آپریشن کے بڑے منصوبہ سازوں.....جنرل مشرف، جنرل عزیز اور جنرل محمود نے ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش شروع کر دی تا کہ کارگل میں ناکامی کی ذمہ داری پر پردہ ڈالا جا سکے۔ دوسری طرف جنرل مشرف نے کہا کہ نواز شریف ٹھگوں کی حکومت کی سربراہی کر رہے تھے جو صرف اپنے من پسند افراد کو نوازتی اور اختیارات کے غلط استعمال سے ذاتی دولت میں اضافہ کرتی رہی۔

12 اکتوبر 1999ء کو نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ ان کی جگہ انجینئر کور کے جنرل ضیاء الدین (جو نواز شریف کی طرح کشمیری النسل ہیں) کو آرمی چیف مقرر کر دیا۔ نواز شریف نے دعویٰ کیا ہے کہ جنرل ضیاء الدین اس عہدے کے لئے میرٹ پر پورا اترتے تھے اور آرمی چیف مقرر کئے جانے کے وقت آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ جنرل مشرف کو اس فیصلے کی اطلاع اس وقت دی گئی جب وہ کولمبو کے دورے کے بعد پی آئی اے کی پرواز سے واپس کراچی آ رہے تھے۔ نواز شریف نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے 12 اکتوبر کو اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل عثمان سے کہا جائے کہ جنرل

مشرف کو وطن واپسی پر عزت واحترام کے ساتھ گھر پہنچایا جائے۔ مشرف کی برطرفی کے فیصلے سے کارگل کے ایشو پر جنرل مشرف کے ہمنوا جنرل عزیز اور جنرل محمود سمیت تمام کورکمانڈروں کو آگاہ کردیا گیا۔ (وڑائچ، 2008ء:6-143)۔

مشرف نواز شریف کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ جس طیارے پر وہ آرہے تھے اسے اترنے سے روکنے کیلئے کراچی ائیر پورٹ کو سیل کردیا گیا۔ اس کے علاوہ پائلٹ سے کہا گیا کہ طیارے کو پاکستان سے کسی اور جگہ پر لے جائے۔ پائلٹ نے مشرف کو مطلع کیا کہ طیارے میں صرف ایک گھنٹے کی پرواز کا ایندھن ہے اور اس کے ساتھ پاکستان سے کسی دوسرے ملک نہیں جایا جاسکتا۔ اس طرح نہ صرف مشرف بلکہ 200 دیگر مسافروں کی زندگیوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا گیا، ان میں سکولوں کے متعدد بچے بھی تھے جو سری لنکا کے خیر سگالی کے دورے سے واپس آرہے تھے۔ مشرف نے فوج کے سینئر کمانڈروں کے ساتھ طیارے سے ہی رابطہ کیا اور ٹیک اوور کر کے حکومت پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ طیارہ پہلے نوابشاہ ائیر پورٹ پر اترا اور جب کراچی ائیر پورٹ کلیئر کیا گیا تو وہاں چلا گیا۔ اکثر فوجی کمانڈر مشرف کے وفادار رہے۔ کسی خون خرابے کے بغیر بغاوت کا عمل مکمل ہوگیا۔ مشرف نے دعویٰ کیا کہ فوج کو صورتحال سے مکمل لاعلم رکھا گیا اور نواز شریف نے سب کچھ خفیہ طور پر کیا۔ (مشرف، 2006ء:40-101)۔

مشرف نے دعویٰ کیا کہ انہیں اقتدار سنبھالنے کے بعد اندازہ ہوا کہ نواز حکومت کس درجے تک لوٹ مار کررہی تھی۔ سڑکوں کے منصوبوں کو چھوڑ کر دیگر تمام منصوبے ناکام رہے اور زائد لاگت کی مد میں خزانے کو اربوں روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ انہوں نے 1988 سے 1999 تک کے نواز شریف دور اور بے نظیر بھٹو کی 2 دفعہ مدت پوری نہ کرسکنے والی حکومتوں سمیت پر تنقید کی کہ اس عرصے کے دوران قوم کو بے کار منصوبوں کی مد میں 1.1 ٹریلین روپے کا بوجھ برداشت کرنا پڑا۔ (مشرف، 2006ء:40-101)۔

نواز شریف کے خلاف مقدمہ انسداد دہشت گردی کی عدالت میں چلایا گیا جس نے 2000 میں اغوا، ہائی جیکنگ، اقدام قتل اور بدعنوان کے الزامات میں سزائے عمر قید سنائی۔ ہائی جیکنگ کی دفعہ نواز شریف کی طرف سے طیارہ اترنے کی اجازت نہ ملنے پر لگائی گئی تھی۔ اصل میں یہ افواہیں گردش کررہی تھیں کہ نواز شریف کو سزائے موت سنائی جائے گی لیکن چونکہ ان کے سعودی

عرب کے شاہی خاندان سے نہایت اچھے تعلقات تھے اس لئے ان کی مداخلت پر عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ بعد ازاں فوجی حکومت نے انہیں جلاوطنی کی اجازت دے دی۔ نواز شریف نے یہ نا قابل یقین دعویٰ کیا کہ وہ سزا کے بعد جیل کاٹنے پر تیار تھے لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے مقدس مقام کی طرف بھیجنا ایک ایسی نعمت تھی جس سے میں انکار نہیں کر سکا۔ نواز شریف نے مبینہ طور پر ایک بیان حلفی دیا کہ وہ 10 سال تک سیاست میں حصہ نہیں لیں گے لیکن انہوں نے اس کا اقرار نہیں کیا۔ (وڑائچ، 2008ء: 156)۔

لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی نے میرے ساتھ ایک انٹرویو میں نواز شریف اور بے نظیر کے بارے میں دلچسپ تبصرہ کیا ہے:

''میں 1990ء کے عشرے میں جی ایچ کیو میں تعینات تھا (بعد ازاں آئی ایس آئی کا چیف بن گیا)۔ نواز شریف اور بے نظیر کے نمائندے گاہے بگاہے جی ایچ کیو کا دورہ کرتے تا کہ سینئر فوجی افسروں کی اپنے لئے اور مخالف کے خلاف ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔ ان دونوں میں سے جب بھی کوئی اقتدار میں ہوتا/ہوتی تو وہ سرکاری حیثیت کو خوشامدیوں کو فائدہ پہنچانے کیلئے استعمال کرتا/کرتی۔ دونوں میں کوئی بھی چیز قابل رشک نہیں۔ انہوں نے جمہوریت اور ذمہ دار حکومت کا مذاق اڑایا''۔

فوج کو اسلامیانے کا عمل جاری رہا

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے دونوں نامکمل دور اقتدار میں سیاسی تبدیلیوں سے قطع نظر صرف بری فوج نہیں بلکہ مسلح افواج کی اسلامائزیشن کا عمل جاری رہا۔ ایک سرکاری دستاویز..... پاکستان آرمی گرین بک: ائیر آف دی کمانڈنگ آفیسر 1991.....اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ پاکستان آرمی کو ایک نظریاتی فورس ہونا ہوگا اور جنگ کے جس نظریئے سائنس اور آرٹ کی اسے پیروی کرنی چاہیئے اس کا ماخذ لازماً قرآن ہونا چاہیئے۔ (گرین بک، 1991ء)۔ میجر (ر) آغا ہمایوں امین نے مجھے آرمی ریگولیشن جلد دوم (ہدایات) 1991، کی ایک کاپی بھیجی ہے جس کی دفعہ 18 کہتی ہے کہ:

''ایک مرد مجرم کو سنگسار کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو جبکہ

خاتون مجرم کو کمر تک کسی گڑھے میں کھڑا کیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک ہاتھ یا پاؤں کاٹنے کا تعلق ہے تو مجرم کا طبی معائنہ کرنے کے بعد یہ بااختیار ڈاکٹر کی صوابدید پر ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ کس انداز میں سزا پر عملدر آمد کیا جائے''۔(آرمی ریگولیشنز 1991ء:1080)۔

فرقہ وارانہ دہشت گردی

1990ء کی دہائی میں پاکستان نے سہ رخی در پردہ جنگ کے میدان کے طور پر کام کیا۔ یہ ایک طرف ایران، سعودی عرب اور دوسری طرف ایران اور عراق کی لڑائی تھی۔ (احمد، 1998 :8-176)۔تینوں متحارب ریاستوں کا واحد ذریعہ آمدن خام تیل کی دولت تھا جس کی بنا پر پاکستانی معاشرے میں فرقہ واریت کے میدان میں پیسہ اور پراپیگنڈہ مواد جھونکا گیا۔ مسلح ملیشیاؤں نے ایک دوسرے اور معصوم افراد کے خلاف ظلم و جبر کا بازار گرم کر دیا۔1990ء سے 2002 کے دوران فرقہ وارانہ دہشتگردی کے واقعات میں 994 افراد مارے گئے۔ان میں 593 شیعہ اور 388 سنی تھے۔اس کے علاوہ مرنے والوں میں 44 افراد پولیس یا قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کے اہلکار تھے۔(رانا، 2004ء:586)۔منتخب حکومتیں ان واقعات کی مذمت کرنے کے سوا ایسے جرائم کے خلاف محض بے دست و پا اور غیر مؤثر ہی رہیں۔

ہندوؤں، عیسائیوں اور احمدیوں کے خلاف کارروائیاں

جہاں تک مذہبی اقلیتوں کا تعلق ہے تو....احمدیوں، ہندوؤں، عیسائیوں۔ان کے خلاف سویلین حکومتوں کے دور میں کارروائیوں اور ان کی عبادت گاہوں پر حملوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ (احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بعد ان کی عبادت گاہوں کو مسجد کا نام استعمال کرنے کی اجازت نہیں)۔ 1991ء میں توہین مذہب قانون میں ترمیم کی گئی اور اس میں زیادہ سے زیادہ سزا عمر قید سے بڑھا کر سزائے موت کر دی گئی۔ (احمد، 2001ء:90)۔اس کے نتیجے میں کئی غیر مسلموں کو گرفتار کر لیا گیا۔اکثر غیر مصدقہ شواہد کی بنا پر....ان ملزموں کو ماتحت عدالتوں سے سزائیں ہوئیں

تاہم اعلیٰ عدالتیں نے بعض سزاؤں میں تخفیف کر دی۔ بعض کیسوں میں توہین مذہب کے مقدمات میں سزا سے پہلے ہی جنونیوں نے ملزم کو جان سے مار دیا۔ کچھ کو مغربی ممالک میں سیاسی پناہ دے دی گئی اور یوں وہ جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے اغوا اور جبری تبدیلی مذہب کے واقعات بھی رپورٹ ہوئے۔ (احمد، 2002ء: 89-57)۔

باب 14

مشرف دور میں آنے والی تبدیلیاں

گیارہ سال کے وقفے کے بعد جب فوج دوبارہ اقتدار میں آئی تو پاکستان معاشی دیوالیہ پن کے دہانے پر کھڑا تھا۔ معاشی پابندیوں بالخصوص 1998 میں ایٹمی دھماکوں کے بعد لگنے والی پابندیوں نے ملک کے کمزور معاشی ڈھانچے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اس کے علاوہ (سویلین حکومتوں کے) 11 سالوں کے دوران ان شکوک وشبہات کا بھی خاتمہ ہوا کہ اقتدار کی حقیقی باگیں جی ایچ کیو کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سویلین اتھارٹی کو بری طرح گزند پہنچا۔

بین الاقوامی سطح پر کارگل کے واقعے نے پاکستان کی ساکھ کو نہایت متاثر کیا۔ بڑی مغربی طاقتوں نے پاکستان کو اچھوت ریاست سمجھنا شروع کر دیا۔ اس کی بڑی وجہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے ساتھ جنرل تھے جن کی خودسری نے جنوبی ایشیا اور اس سے بھی آگے تک امن کو خطرے میں ڈال دیا۔ مشرف کے اس دعوے کو قطعی پذیرائی نہیں ملی کہ کارگل کی لڑائی سے مسئلہ کشمیر ایک بار پھر بین الاقوامی سیاسی ایجنڈے میں شامل ہو گیا۔ پاکستان نے مسئلہ کشمیر پر اب تک عالمی سطح پر جو ساکھ بنائی تھی وہ جاتی رہی۔ ان حالات میں مشرف حکومت شروع میں مغربی طاقتوں کے حوالے سے مکمل تنہائی کا شکار رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ کارگل آپریشن کے مضمرات سے زیادہ کسی اور چیز نے پاکستان کو نقصان نہیں پہنچایا، امریکہ اور مغربی طاقتوں کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہو گیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ صدر کلنٹن نے جب 2000ء میں جنوبی ایشیا کا دورہ کیا تو بھارت میں 5 روز تک قیام کیا جبکہ پاکستان میں انہوں نے محض 5 گھنٹے گزارے۔ پاکستان کے دورے میں انہوں نے پاکستانی قوم سے ٹیلی ویژن پر خطاب کیا اور جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کی خوبیوں پر روشنی

ڈالی لیکن انہوں نے مشرف کے ساتھ (جنہوں نے چیف ایگزیکٹو کا عہدہ سنبھالا تھا) ٹی وی پر آنے سے انکار کر دیا۔

11 ستمبر 2011ء کا دہشت گردوں کا حملہ (نائن الیون)

1990ء کی دہائی سے القاعدہ امریکہ میں کئی اہداف کو نشانہ بنانے میں ملوث تھی۔ ان میں 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور 1998 میں مشرقی افریقہ کے 2 ملکوں میں امریکی سفارتخانوں پر حملے کے واقعات شامل ہیں۔ افغان جہاد نے کئی انتہا پسند تحریکوں کو جنم دیا جو خلافت کی بحالی کا عزم رکھتی تھیں۔ خلافت کا 1924 میں ترک لیڈر کمال اتاترک نے خاتمہ کیا اور اس کی جگہ سیکولر اور قوم پرست جمہوریہ قائم کی۔ بین الاقوامی سطح پر لندن میں قائم حزب التحریر بین الاقوامی جہاد کی آواز بن کر ابھری۔ جنوب مغربی ایشیا میں طالبان کے ساتھ گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی، کئی دیگر تاجک اور ازبک تنظیمیں، پاکستان میں بھارت کے خلاف سرگرم حزب المجاہدین، لشکر طیبہ، جیش محمد اور شیعہ کمیونٹی کی مخالف جماعتیں سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی سرگرم تھیں۔ ان تنظیموں نے ایسے لنک اور نیٹ ورک قائم کئے جن کا تعلق افغانستان اور پاکستان کی انتہا پسند سیاست سے تھا۔ قبائلی بیلٹ میں ہزاروں غیر ملکی جنگجو مقیم تھے۔ مختصر یہ کہ اسلام پسند انتہا پسندی کئی مقامی، علاقائی اور عالمگیر ایجنڈوں کے ساتھ عالمی مظہر بن گئی۔ (زہب اور رائے، 2002)۔

11 ستمبر 2001ء کو دہشت گردوں کی متعدد ٹیموں نے امریکہ کے مختلف شہروں کو جانے والے 4 کمرشل طیارے اغوا کر لئے۔ ان میں سے 2 طیارے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرا دیے گئے جبکہ تیسرے طیارے نے پینٹا گون کو نشانہ بنایا۔ چوتھے طیارے نے بادی النظر میں امریکی کانگریس بلکہ وائٹ ہاؤس کو نشانہ بنانا تھا لیکن وہ پنسلوانیا ریاست کے دیہی علاقے میں گر کر تباہ ہو گیا۔ ان واقعات میں اندازاً 2749 امریکی اور غیر ملکی شہری مارے گئے۔ اس طرح یہ امریکی سرزمین پر تاریخ کا بدترین سانحہ تھا۔ امریکی قوم سکتے میں آ گئی۔ ممتاز امریکی سیاستدانوں اور تجزیہ نگاروں نے اسے امریکہ کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا۔ سی این این سے انٹرویو میں سینئر سفارتکار رچرڈ ہالبروک نے زور دیا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت امریکہ ایسے عناصر کے خلاف جوابی کارروائی کا مکمل جواز رکھتا ہے جنہوں نے امریکہ کی سکیورٹی توڑی اور غیر معمولی تعداد میں

ہلاکتوں کا باعث بنے۔

حملے کے فوراً بعد امریکہ نے القاعدہ کو مورد الزام ٹھہرایا، شروع میں القاعدہ نے اس کی تردید کی لیکن جب نا قابل تردید شواہد سامنے آنے لگے اور القاعدہ کے بعض گرفتار ارکان نے اپنے ملوث ہونے کا اعتراف بھی کر لیا تو اسامہ بن لادن نے اپنے ہتھکنڈے تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ القاعدہ کی طرف سے جاری ایک ویڈیو میں اسامہ بن لادن نے حملوں کی ذمہ داری قبول کر لی۔ بلکہ انہوں نے یہ یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی کہ ایک انجینئر ہونے کے ناتے انہوں نے طیارے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت سے ٹکرانے کے اثرات کا اچھی طرح جائزہ لیا تا کہ دھماکوں کی شدت اتنی ہو کہ دونوں ٹاور ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو جائیں۔ اسلامی دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص مختلف افواہوں کا طوفان آ گیا جس میں نام نہاد ماہرین، ٹاک شوز کرنے والے بزرجمہروں اور میزبانوں نے مضحکہ خیز نظریات پیش کئے کہ یہ بش انتظامیہ، سی آئی اے، موساد، یہودیوں اور مکار ہندوؤں کی سازش تھی تا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بڑے حملے کی راہ ہموار ہو سکے۔ خود امریکہ کے اندر بھی سازشی نظریات گردش کرتے رہے جس میں کہا گیا کہ یہ کارروائی ڈک چینی، رمز فیلڈ اور صدر بش کی مثلث کی ریشہ دوانی کا شاخسانہ ہے جس کا مقصد مشرق وسطیٰ کے تیل کے کنوؤں پر قبضہ کرنا ہے۔ بعد ازاں سعودی عرب نے اعتراف کیا کہ 19 ہائی جیکروں میں سے 15 اس کے شہری تھے۔ امریکہ نے کچھ دہشت گردوں کی فلائنگ کلب اور سکول سے طیارے اڑانے کی تربیت لینے کی تفصیل بھی بتائی۔ بہر حال سازشی نظریات برقرار رہے اور پھیلتے رہے۔

افغانستان پر امریکی حملہ

12 ستمبر کو امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے مشرف کو فون کیا جو ان دنوں کراچی کے دورے پر تھے۔ مشرف نے اس کی تفصیل یوں بتائی ہے۔

''اگلی صبح کو میں گورنر ہاؤس سندھ میں ایک اہم اجلاس کی صدارت کر رہا تھا کہ میرے ملٹری سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ امریکی وزیر خارجہ فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں فارغ ہو کر انہیں خود فون کروں گا لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ میں اجلاس سے باہر آ کر بات

کروں۔کولن پاول نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ''آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف ہیں''۔ میں نے اس بات کو ایک کھلا الٹی میٹم سمجھا....اگلے روز جب میں واپس اسلام آباد آیا تو آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل محمود جوان دنوں واشنگٹن کے دورے پر تھے نے مجھے فون پر نائب امریکی وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے کولن پاول کی طرح انتہائی غیر سفارتی بات کی کہ پاکستان ہمارا ساتھ دے یا پھر دہشت گردوں کا'' لیکن اگر پاکستان دہشتگردوں کا ساتھ دے گا تو اسے پتھر کے دور میں واپس جانے کیلئے تیار رہنا چاہیئے''۔یہ ایک خوفناک کھلی دھمکی تھی لیکن یہ بات واضح تھی کہ امریکہ (نائن الیون کے بعد) جوابی کارروائی کرنے پر تلا تھا۔سخت کارروائی....''۔(مشرف،2006ء:201)۔

آرمیٹج نے تصدیق کی کہ گفتگو ہوئی لیکن اس بات کی تردید کی کہ انہوں نے پاکستان کو حملے کی دھمکی دی تھی۔بہر حال مشرف نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے صورتحال کا ''عسکری انداز'' میں غیر جذباتی تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان امریکی حملے کی صورت میں ....فوجی، معاشی یا کسی اور طرح سے ....اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا، اگلے روز پاکستان میں امریکی سفیر وینڈی چیمبر لین امریکہ کی طرف سے 7 مطالبات لے کر آئیں۔مشرف کے مطابق (2006ء:205-200)۔

1:۔ پاکستان کی سرحد پر القاعدہ کے ارکان کو روکا جائے اور اسامہ بن لادن کو ہر قسم کے اسلحے کی سپلائی اور لاجسٹک سپورٹ روکی جائے۔

2:۔ امریکہ کو عسکری اور انٹیلی جنس کارروائیوں کیلئے پاکستان کی فضائی حدود فراہم کی جائے۔

3:۔ دہشت گردی کے منصوبہ سازوں سے متعلق ہر قسم کی فوجی انٹیلی جنس تک امریکہ کو رسائی دی جائے۔اس کے علاوہ پاکستان کی نیول، ائیر فورس تنصیبات اور سرحد پر سٹریٹیجک مقامات تک رسائی دی جائے۔

4:۔ دہشتگردوں کو مزید جرائم کرنے سے روکنے کیلئے پاکستان فوری طور پر امریکہ کو انٹیلی جنس، امیگریشن معلومات، ڈیٹا بیس اور داخلی سکیورٹی کی اطلاعات فراہم کرے۔

5:۔ دہشت گردوں کی عوامی سطح پر مذمت کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور امریکہ، اس کے دوستوں اور اتحادیوں کے خلاف دہشت گردی کی داخلی طور پر حمایت روکی جائے۔

6:۔ طالبان کو ایندھن کی فراہمی مکمل طور پر روکی جائے اور ان کیلئے پاکستان سے بھرتیاں روکی

جائیں۔

7:۔ چونکہ شواہد سے واضح اندازہ ہوتا ہے کہ افغانستان میں اسامہ بن لادن اور القاعدہ نیٹ ورک کو پناہ دی جا رہی ہے۔ چنانچہ پاکستان طالبان حکومت کے ساتھ سفارتی روابط منقطع کردے اور اسامہ بن لادن اور اس کا نیٹ ورک تباہ کرنے میں معاونت کرے۔

پرویز مشرف نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے امریکہ کا دوسرا اور تیسرا مطالبہ مسترد کر دیا کیونکہ یہ ماننے سے پاکستان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ ہاں ایک محدود علاقے میں پروازوں کی اجازت دی گئی جو حساس نوعیت کا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ شمسی ائیر بیس بلوچستان اور جیکب آباد ائیر بیس سندھ تک محدود رسائی دی گئی۔ اس کا استعمال صرف لاجسٹکس اور طیاروں کے اترنے اور اڑنے تک محدود تھا جبکہ یہاں سے حملے نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اس لئے امریکہ کو ''کھلی چھٹی'' نہ دی گئی۔ باقی تمام مطالبات قابل قبول تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ امریکہ نے ہماری جوابی تجاویز کو کسی اعتراض کے بغیر قبول کر لیا۔ (مشرف، 2006ء:206)۔

اگلے روز سینئر جرنلوں کے ساتھ ملاقات کے بعد 13 ستمبر کو مشرف نے ایک بیان جاری کیا جس میں دیگر چیزوں کے علاوہ یہ باتیں شامل تھیں:

''میں صدر بش اور امریکی حکومت کو دہشتگردی کے خلاف جنگ میں غیر متزلزل حمایت کا یقین دلانا چاہتا ہوں.... ہم دہشت گردی کو ایسی برائی سمجھتے ہیں جس سے پوری عالمی برادری خطرے میں ہے.... دہشت گردی کی تمام اقسام سے نمٹنے کے لئے مربوط بین الاقوامی کوششوں کی ضرورت ہے.... پاکستان دہشت گردی کے خلاف ماضی میں بھی عالمی برادری سے تعاون کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرے گا''۔

19 ستمبر کو مشرف نے پاکستانی قوم سے خطاب کیا۔ نائن الیون کے دہشت گردی کے حملے کی مذمت اور متاثرہ خاندانوں سے تعزیت کے اظہار کے بعد انہوں نے بتایا کہ امریکی اس حملے سے نہایت غضبناک ہیں اور اس کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کا اولین ہدف اسامہ بن لادن، القاعدہ اور انہیں پناہ دینے والے طالبان ہیں۔ مشرف نے خطاب میں یہ بھی ذکر کیا کہ امریکہ طویل عرصے سے اسامہ بن لادن اور اس کے قریبی ساتھیوں کی حوالگی کا مطالبہ کرتا رہا ہے کیونکہ وہ امریکی سفارتخانوں پر حملے کے الزام میں امریکہ کو مطلوب ہیں۔ دہشتگردی کے خلاف

جنگ طویل ہوگی۔امریکہ اسے اسلام یا افغان عوام کے خلاف جنگ قرار نہیں دے رہا بلکہ یہ صرف دہشتگردوں کے خلاف جنگ ہے۔(مشرف،19 ستمبر 2001)۔انہوں نے مزید بتایا کہ پاکستان سے 3 طرح سے تعاون کرنے کیلئے رابطہ کیا گیا ہے....انٹیلی جنس اور اطلاعات، پاکستانی فضائی حدود کا استعمال اور عمومی لاجسٹکس تعاون۔امریکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد کی روشنی میں ایک مربوط مہم شروع کرنے والا ہے اور اسے جنرل اسمبلی کی بھی حمایت حاصل ہے۔کئی اسلامی ممالک نے قرارداد کی حمایت کردی ہے۔مشرف نے اس کے بعد پاکستان کی اندرونی صورتحال کا ذکر کیا کہ 1971ء میں پاکستان دولخت ہونے کے بعد سے ملکی حالات دگرگوں ہیں۔ سب سے سنگین خطرہ پاکستان کے جوہری اثاثوں کولاحق ہے اور کشمیر کاز بھی خطرے میں ہے۔اس کے بعد انہوں نے بھارتی عزائم کا ذکر ان الفاظ میں کیا کہ:

''بھارت نے امریکہ کو ہر قسم کی عسکری سہولیات مہیا کرنے کی پیشکش کی ہے۔بھارت نے کسی جھجک کے بغیر یہ پیشکش کی ہے۔تمام عسکری اڈوں اور لاجسٹک سپورٹ کی پیشکش۔وہ امریکہ کے ساتھ اتحاد کرنا اور پاکستان کو دہشت گرد ریاست قرار دینا چاہتا ہے۔وہ ہمارے ایٹمی اثاثوں اور کشمیر کاز کے درپے ہے''۔(ایضاً)۔

یہ بات واضح رہے کہ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے امریکہ کو ہوائی اڈوں، فضائی حدود کے استعمال سمیت ہر قسم کی سہولیات فراہم کرنے کی پیشکش کی تھی۔اگر پاکستان تعاون سے انکار کردیتا اور بھارت دہشتگردی کے خلاف جنگ میں بڑا کھلاڑی بن جاتا تو اس سے پاکستان کی سلامتی سخت خطرے میں پڑ جاتی۔اس کے باوجود بھارت کا.... پاکستان کی قیمت پر فائدہ اٹھانے والے....کا حوالہ پاکستانی عوام کا غم وغصہ ٹھنڈا کرنے کیلئے کافی نہیں تھا جنہیں بار بار یہ بتایا گیا کہ طالبان اور القاعدہ اسلامی بہادری اور جہاد کی روح سے لبریز ہیں۔اس لئے مشرف نے اپنی تقریر کو مقبول لہجے کا لبادہ پہنایا جس کے تحت امریکہ سے تعاون اسلامی انداز میں جائز ہو سکتا۔انہوں نے بے داغ اسلامی تاریخ اور حضرت محمدؐ کے دور مبارک کی مثالیں دیں کہ کس طرح اسلام کے وسیع تر مفاد میں سمجھوتے کیئے گئے۔یوں انہوں نے یہ تاویل دی کہ امریکہ کیساتھ کام کرنا بزدلی نہیں بلکہ یہ ملک کو بیرونی خطرات سے محفوظ کرنے کیلئے بہترین طریقہ ہے۔اس طرح پاکستان کے جوہری اور میزائل اثاثوں اور کشمیر کاز کا تحفظ ممکن ہوگا۔

7 اکتوبر 2001ء کو امریکہ، برطانیہ اور افغانستان کے شمالی اتحاد نے مل کر آپریشن اینڈیورنگ فریڈم Enduring Freedom کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد طالبان حکومت کا خاتمہ اور القاعدہ کو تہس نہس کرنا تھا۔ طالبان نے القاعدہ کے رہنما امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تاہم انہوں نے کسی غیر جانبدار ملک میں غیر جانبدار عدالت کے قیام پر آمادگی ضرور ظاہر کی۔ امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ طالبان کو اقتدار سے نکال باہر کر کے جمہوری حکومت کے قیام میں مدد کرے گا۔ شروع میں یہ آپریشن نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ مسلسل فضائی بمباری نے طالبان کی کمر توڑ دی اور وہ 13 نومبر کو کابل سے نکل گئے جس کے بعد شمالی اتحاد نے حکومت سنبھال لی۔ دسمبر 2001ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے انٹرنیشنل سکیورٹی اسسٹنس فورس (ISAF) قائم کی گئی تاکہ کابل اور اردگرد کے علاقوں کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے۔ اس فورس کی کمانڈ 11 اگست 2003ء کو نیٹو نے سنبھال لی۔ ایساف میں کئی ملکوں کے فوجی شامل تھے جس کا بڑا حصہ نیٹو کے رکن ممالک پر مشتمل تھا۔ امریکی، برطانوی اور شمالی اتحاد کے فوجیوں کو لڑنے کا کردار سونپا گیا۔

اس دوران امریکہ نے پاکستان کے ساتھ ''مار اور پیار'' 'stick and carrot' strategy کی حکمت عملی اپنائی۔ ''مار'' سے مراد وہ دھمکی تھی جس کا ذکر مشرف نے کیا (پتھر کے دور میں پہنچانے کی دھمکی)۔ جبکہ پیار کی تفصیل اسلام آباد میں 16 اکتوبر کو صدر مشرف اور کولن پاول کی مشترکہ پریس کانفرنس میں بتائی گئی۔ مشرف نے افغانستان میں پائیدار امن قائم کرنے اور پاکستان میں موجود افغان پناہ گزینوں کی واپسی میں مدد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ امریکی وزیر خارجہ نے اس موقع پر بتایا کہ صدر بش نے پاکستان پر لگائی گئی متعدد پابندیاں اٹھالی ہیں۔ ہم نے پاکستان کے ذمے واجب الادا 479 ملین ڈالر کے قرضے ری شیڈول کرنے اور آئی ایم ایف سے نئے قرضوں کی حمایت میں مدد کی ہے۔ (جین، 2007ء اے: 169)۔

اسکے علاوہ مزید رعایات کا اعلان امریکہ محکمہ خارجہ کے ترجمان رچرڈ باؤچر نے 31 اکتوبر 2001 کو کیا:

''صدر بش نے ایک بل پر دستخط کئے ہیں جس کے تحت انہیں مالی سال 2003ء میں پاکستان پر پابندیاں اٹھانے کا اختیار مل گیا ہے۔ یہ 1999ء میں فوجی بغاوت کے بعد پاکستان پر لگائی گئی پابندیاں نرم کرنے کا آخری مرحلہ ہے۔ صدر بش نے اپنے اختیارات استعمال کرتے

ہوئے گلین ترمیم (ایٹمی دھماکوں پر پابندی)، پریسلر ترمیم (ایٹمی ہتھیار اور یورینیم رکھنے) اور سمنگٹن ترمیم (یورینیم کی افزودگی) کے تحت لگائی گئی پابندیاں ختم کردی ہیں"۔(ایضاً:1-170)

رچرڈ باؤچر نے مطلع کیا کہ پاکستان کی اقتصادی امداد میں ڈرامائی اضافہ کیا جارہا ہے۔ امریکہ ایک ارب ڈالر کی امداد فراہم کرے گا۔ مزید کئی ارب ڈالر بین الاقوامی امدادی اداروں سے ملیں گے۔ پاکستان کی برآمدات میں تیزی لانے میں بھی مدد کی جائے گی۔ ایسے مزید کئی بیانات اس وقت سامنے آئے جب 10 نومبر 2001ء کو صدر مشرف اور صدر بش کی نیویارک میں ملاقات ہوئی۔

انتہائی آزادانہ معاشی فریم ورک کے اندر ترقی پسندی

اکتوبر 1999ء کو اقتدار سنبھالنے پر جنرل مشرف نے اپنے لئے "چیف ایگزیکٹو" کا منصب استعمال کیا۔ یہ اعلیٰ ترین سیاسی منصب ممتاز قانون دان شریف الدین پیرزادہ کی ذہنی اختراع تھی جنہوں نے ماضی میں سابق حکومتوں کو ہوشیاری کے ساتھ قانونی موشگافیوں کے ذریعے جمہوریت کی بحالی کے مطالبات سے نمٹنے کے مشورے دیے تھے۔ مشرف نے معیشت کی بحالی پر بھرپور توجہ دے کر اپنی حکومت کی مقبولیت کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی جو امریکی پابندیوں کے بعد بحران کا شکار تھی۔ جنرل ایوب اور جنرل ضیاء الحق کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا اور ایسے ٹیکنوکریٹس منتخب کئے جن کی بطور بنکر اور اکانومسٹ ساکھ بہت اچھی تھی۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ایسے ماہرین اقتصادیات کا چناؤ کرتے ہوئے میں نے جو معیار مقرر کیا وہ یہ تھا کہ ایسے افراد پر بدعنوانی کا دھبہ نہ لگا ہو۔ چنانچہ بین الاقوامی بنکر شوکت عزیز کو وزیر خزانہ، عشرت حسین کو گورنر سٹیٹ بنک، معروف صنعت کار رزاق داؤد کو وزیر تجارت جبکہ طارق اکرام کو ایکسپورٹ پروموشن بیورو کا سربراہ لگایا گیا۔

جب مشرف نے محسوس کیا کہ عوامی سطح پر انہیں کافی پذیرائی مل گئی ہے تو انہوں نے 20 جون 2001ء کو صدارت کا منصب سنبھال لیا۔ جب ان کے اس اقدام کو اعلیٰ عدلیہ میں چیلنج کیا گیا تو انہوں نے ایک حکمنامہ جاری کیا جس کے تحت ججوں کیلئے فوجی حکومت سے وفاداری کا حلف اٹھانا لازمی قرار دیا گیا۔ کچھ ججوں نے انکار کر کے استعفیٰ دے دیا تاہم بعض دیگر نے پی سی او حلف اٹھانا

گوارا کرلیا۔ مشرف کی طرف سے خود کو صدر بنانے کے متنازعہ فیصلے اوراس کی توثیق میں سپریم کورٹ کے حکم سے صورتحال میں تناؤ کچھ ہو گیا کیونکہ عدالت نے انہیں 12 اکتوبر 2002ء تک انتخابات کا بھی حکم دیا۔

فوجی اقتدار کی سویلائزیشن

اس اثناء میں مشرف کے حامی سیاستدانوں نے فوجی اقتدار کو سویلین روپ دینے کے لئے زمین ہموار کرنے کا آغاز کر دیا۔ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کی عام روایت ہے۔ چنانچہ الیکشن 2002 سے پہلے پاکستان مسلم لیگ قائداعظم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ ایک دائیں بازو سے سنٹر کی طرف رجحان رکھنے والی جماعت تھی جس میں جنرل ضیاءالحق کے حامی اور نواز شریف سے الگ ہونے والے سیاستدان جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ جلد ہی مسلم لیگ (ق) کو کنگز پارٹی کہا جانے لگا۔ اگلے مرحلے میں معاشرے میں کافی پذیرائی ملنے کے بعد حکومت نے 30 اپریل 2002ء کو ایک ریفرنڈم کا انعقاد کرایا جس کے تحت مشرف کے اقتدار کو 5 سال کی توسیع دی گئی۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ریفرنڈم کا ٹرن آؤٹ 70 فیصد تھا اور 90 فیصد ووٹروں نے مشرف کے حق میں فیصلہ دیا جبکہ 5 فیصد نے مخالفت کی۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے بعض واضح بے قاعدگیوں کی نشاندہی کی۔ اس نے الزام لگایا کہ بعض مقامات پر ایک شخص نے کئی کئی ووٹ ڈالے جبکہ ریاست کے ملازمین پر بھی مشرف کے حق میں ووٹ ڈالنے کیلئے دباؤ ڈالا گیا۔ حکومت نے ایسی تنقید کو غیر ضروری قرار دے کر مسترد کر دیا کیونکہ اس کا دعویٰ تھا کہ مشرف حکومت کو جائز قرار دینے کا مقبول عمل پورا کرلیا گیا ہے۔

''جائز'' قرار دینے کا عمل آگے بڑھانے کیلئے اعلان کے مطابق اکتوبر میں عام انتخابات کرائے گئے۔ انتخابی نظام میں کئی شرائط اور تبدیلیاں متعارف کرائی گئیں۔ مثال کے طور پر ضیا دور کا جداگانہ طرز انتخاب ختم کر دیا گیا جس کے تحت اقلیتوں نے عام ووٹر کے طور پر حق رائے دہی استعمال کیا۔ اسمبلیوں میں اقلیتوں اور خواتین کیلئے نشستیں مخصوص کی گئیں۔ اس کے علاوہ مذہبی جماعتوں سمیت تمام جماعتوں کے لئے اقلیتوں اور خواتین کو امیدوار نامزد کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ سزا یافتہ افراد کو الیکشن میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ ووٹر کی عمر 21 سال سے گھٹا کر 18 برس کر دی

گئی۔ بی اے تعلیم کی شرط عائد کی گئی۔ اس پابندی سے کئی سیاستدان بالواسطہ طور پر متاثر ہوئے کیونکہ ان کی تعلیم کم تھی۔ انتخابات میں 70 سے زائد جماعتوں نے حصہ لیا۔ دونوں بڑے اپوزیشن لیڈر نواز شریف اور بے نظیر بھٹو جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی جماعتوں نے بالترتیب مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز کے نام سے حصہ لیا۔ دیگر بڑی جماعتوں میں 6 مذہبی جماعتوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل اور ایم کیو ایم شامل تھیں۔

الیکشن میں کسی جماعت کو واضح اکثریت نہ ملی۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ مسلم لیگ ق کو 342 کے ایوان میں 126 نشستیں مل گئیں۔ پیپلز پارٹی کو 81 سیٹیں جبکہ مسلم لیگ ن کو صرف 19 نشستیں مل سکیں۔ مجلس عمل نے ایک بڑا حصہ جیت لیا۔ 63 نشستوں کے ساتھ یہ پارلیمنٹ کی تیسری بڑی جماعت بن کر ابھری۔ مجلس عمل نے انتخابات میں دہشتگردی کے خلاف امریکی جنگ کی مخالفت کا مقبول نعرہ کیش کرایا۔ اس اتحاد کو صوبہ سرحد میں واضح اکثریت مل گئی جہاں اس نے اپنی حکومت بنائی۔ جبکہ بلوچستان میں مخلوط حکومت کا حصہ بن گئی۔ پنجاب میں مسلم لیگ ق نے حکومت بنائی جبکہ سندھ میں بھی مخلوط حکومت بنی کیونکہ کسی جماعت کو وہاں واضح اکثریت نہیں ملی۔ ٹرن آؤٹ 41.8 فیصد رہا۔

مرکز میں مسلم لیگ ق نے ایم کیو ایم اور آزاد امیدواروں کی حمایت سے حکومت بنائی لیکن اس حکومت کا طویل عرصے تک اپوزیشن ایم ایم اے نے ناک میں دم کئے رکھا جو امریکہ کے ساتھ اتحاد جاری رکھنے کے خلاف تھی۔ جو ان کے نزدیک اسلام اور متقی مسلمانوں کے خلاف تھا۔ مشرف نے مجلس عمل کے ساتھ دسمبر 2003 میں ایک ڈیل کر کے یہ رکاوٹیں عبور کر لیں کہ وہ پارلیمنٹ سے 17 ویں آئینی ترمیم کی منظوری میں تعاون کرے گی۔ جس کے تحت ان کے 1999ء کی فوجی بغاوت کو آئینی تحفظ دیا گیا اور یہ کہ وہ 21 دسمبر 2004 سے پہلے وردی اتار دیں گے لیکن انہوں نے اس ڈیل سے مکرتے ہوئے قومی اسمبلی سے ایک بل منظور کرالیا جس کے تحت وہ صدر اور آرمی چیف کے عہدے بیک وقت رکھ سکتے تھے۔ خود کو آئینی دفعات سے مسلح کرنے اور اپنی پوزیشن کم و بیش محفوظ بنانے کے بعد جنرل مشرف نے سول انتظامیہ میں بڑے پیمانے پر فوجی داخل کرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ 300 اعلیٰ حکومتی عہدوں پر فوج افسر تعینات کئے گئے۔ قومی تعمیر نو بیورو کے چیئرمین لیفٹیننٹ جنرل تنویر نقوی نے اختیارات کی منتقلی کے نام سے مشہور مقامی

حکومتوں میں اصلاحات کا نظام 2000 میں متعارف کرایا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں ماضی میں ضلع کا کرتا دھرتا سمجھے جانے والے ڈپٹی کمشنر کے اختیارات کم کر دیے گئے۔ اس کی جگہ منتخب ناظم ضلع کا سربراہ بن گیا۔ البتہ ناقدین کا خیال تھا کہ نئی مقامی انتظامیہ صوبائی حکومتوں کی بجائے براہ راست وفاقی حکومت پر انحصار کرنے لگی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعتوں کو بھی کافی دھچکہ لگا کیونکہ مقامی حکومتوں کے انتخابات میں سیاسی نظریے کی بجائے برادری کے تعلقات اور لسانی عوامل کو ترجیح دی گئی۔ بالالفاظ دیگر اس نظام سے وفاقی حکومت کو وفاقیت مضبوط کرنے میں مدد ملی اور طاقت کے مقامی بزرجمہروں کو براہ راست وفاق پر انحصار کرنا پڑا۔ (ڈیولوایشن ان پاکستان، 2004ء)۔

بہرحال ان حالات میں پاکستانی وفاق میں ایک ایسی سیاسی قیادت ابھری جو مختلف آئینی ترمیم اور مسلم لیگ ق جیسی انتہائی وفادار سیاسی جماعت کی حمایت سے مسلح صدر کے ماتحت تھی۔ جنہوں نے ایک اعتدال پسند مسلمان لیڈر کے طور پر اپنے اقتدار کا اظہار کیا لیکن اس کا اطلاق صوبہ سرحد میں طالبان نواز ایم ایم اے کی حکومت پر نہ ہوا جس نے غیر لچکدار اسلامی قوانین متعارف کرائے جس میں معاشرتی تقسیم کا نسخہ پیش کیا گیا جبکہ موسیقی اور فلم جیسی تفریح پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ مخلوط حکومت ہونے کے باوجود بلوچستان میں اسلام پسند اصلاحات کو زیادہ پذیرائی نہ ملی کیونکہ بلوچ سرداراس کے خلاف تھے۔ بحیثیت مجموعی طالبان اور دیگر انتہا پسندوں نے مجلس عمل کی حکومت کی آڑ میں سازگار ماحول پیدا کرنے کیلئے ہاتھ پیر مارے۔ اس سے وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) اور کوئٹہ میں القاعدہ اور طالبان کو پیر جمانے کا بھرپور موقع مل گیا۔

پاک بھارت تعلقات

مشرف کے سیاسی نظریے میں سب سے ڈرامائی تبدیلی بھارت کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے تھی، ایک ایسی انتہائی عقابی شخصیت جس نے بھارت کے ساتھ جنگ کی اشتعال انگیزی کی جو مکمل جنگ میں تبدیل ہوتے ہوتے رہ گئی وہ اب امن کی داعی بن گئی اور بھارت کے ساتھ مصالحت اور مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر حل کرنے کی خواہاں تھی۔ سوچ میں تبدیلی کا پس منظر وہ عسکری اندازہ تھا کہ کشمیر کی بزور بازو آزادی کی بات زیادہ مؤثر نہیں۔ (مشرف، 2006:

297)۔ بظاہر امریکہ نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنائیں کیونکہ امریکہ القاعدہ اوراس کے حمایتی طالبان کی شکست کی حکمت عملی پر اپنی توجہ منقسم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس معاملے میں بریک تھرو اس وقت آیا جب ایک بڑے زلزلے نے بھارتی ریاست گجرات کو ہلا کر رکھ دیا۔ مشرف نے بھارتی وزیراعظم واجپائی کو فون کرکے ہمدردی کا اظہار کیا اور امدادی سامان کی پیشکش کی۔ اس عمل سے برف پگھل گئی اور واجپائی نے انہیں مذاکرات کے لئے آگرہ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مشرف بھارت کے دورے پر چلے گئے اور دہلی میں اپنی آبائی حویلی بھی گئے۔ انہوں نے اپنی گفتگو اور دیگر شخصی کشش سے بھارتی حاضرین مجلس اور میڈیا کو کافی متاثر کیا۔ اس کے بعد بھارتی وزیراعظم اور صدر مشرف کی ملاقات ہوئی۔ میں نے ٹی وی پر یہ منظر بی بی سی اور سی این این کے ذریعے بہت دور سویڈن کے شہر سٹاک ہوم میں بیٹھ کر دیکھا، مشرف نے اس ملاقات کی بابت یہ بتایا ہے کہ:

''ہم نے 16 جولائی 2001ء کی صبح کو باضابطہ بات چیت کا آغاز کیا۔ شروعات تو نہایت حوصلہ افزا رہی لیکن اختتام پر مایوس کن نتیجہ دیکھنے میں آیا۔ لنچ سے پہلے اور بعد میں 2 طویل مراحل کے دوران پہلے ون آن ون بات ہوئی پھر وزرائے خارجہ کے ساتھ مذاکرات ہوئے۔ ہم نے ایک مشترکہ اعلامیہ تیار کیا۔ اس اعلامیے میں دہشت گردی کی مذمت کی گئی جبکہ مسئلہ کشمیر کے حل کے ذریعے دوطرفہ تعلقات بہتر بنانے پر اتفاق کیا گیا.... دستخطوں کی تقریب ہوٹل جے پی پیلس میں ہونا تھی جہاں بھارتی وزیراعظم کا قیام تھا اور ہم نے جہاں مذاکرات کئے تھے۔ ہوٹل میں تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ ایک میز اور 2 کرسیاں تھیں جس پر بیٹھ کر ہمیں مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کرنا تھے۔ ہوٹل کے تمام سٹاف میں کافی اشتیاق پایا جاتا تھا.... ہم اس دورے کے کلائمیکس پر پہنچنا ہی چاہتے تھے، لیکن درحقیقت یہ اینٹی کلائمیکس ثابت ہوا۔ ایک گھنٹے بعد میرے وزیرخارجہ اور سیکرٹری خارجہ نے مجھے مطلع کیا کہ بھارت مکر گیا ہے۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ میں نے پوچھا ''ایسا کیونکر ہوا؟''۔ جواب ملا کہ '' کابینہ نے اسے مسترد کر دیا ہے''۔ میں نے پوچھا ''کون سی کابینہ؟، آگرہ میں تو کوئی کابینہ نہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا چنانچہ میں نے فوراً اسلام آباد واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وزیرخارجہ اور سیکرٹری دونوں نے مجھے ٹھنڈا کیا اور کہا کہ وہ مسودہ دوبارہ تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اجازت دے دی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا اجمیر شریف کا دورہ منسوخ

کردیا۔ دوبارہ مسودہ تیار ہونے میں مزید 2یا3 گھنٹے لگ گئے جس میں تلخ الفاظ اور جملوں کا تبادلہ ہوا۔لیکن آخرکار میری ٹیم واپس آئی اور کامیابی کا اشارہ دیا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے نیا مسودہ دکھایا جس کی میں نے منظوری دے دی۔ میرا خیال تھا کہ ہم جو کچھ چاہتے تھے وہ نئے مسودے میں بھی موجود تھا لیکن زبان تھوڑی مختلف تھی۔ وہ دونوں دوسرے ہوٹل گئے تاکہ دستخط شدہ مسودے کی نقول حاصل کرسکیں۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اعلان آگرہ اگلے روز اخبارات میں شہ سرخی کے ساتھ شائع ہوگا لیکن افسوس ابھی اس کے آثار نظر نہ آئے۔ ہم ہوٹل سے نکلا ہی چاہتے تھے کہ مجھے پیغام ملا کہ بھارت ایک بار پھر مکر گیا ہے۔ یہ انتہائی مضحکہ خیز بات تھی.... میں نے بھارتی میڈیا کو پیغام بھجوایا کہ میں ہوٹل میں پریس کانفرنس کروں گا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ بھارتی حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ میڈیا کے کسی رکن کو میرے یا واجپائی کے ہوٹل میں داخلے کی اجازت نہ دی گئی۔'' دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت'' میں آزادی اظہار کا یہ حال تھا''۔(مشرف،2006ء:99-298)۔

15 دسمبر 2008ء کو کرنل (ر) اسلم چیمہ کی معیت میں، میں نے جنرل پرویز مشرف سے ان کی رہائش گاہ پر طویل بات چیت کی۔ انہوں نے مجھے اپنی واجپائی اور بعدازاں من موہن سنگھ سے ملاقاتوں کے بارے میں بتایا کہ دونوں رہنما دوطرفہ تعلقات میں بہتری کے خواہاں تھے لیکن بھارت کے سیاسی نظام نے دونوں بھارتی وزرائے اعظم کے خارجہ پالیسی کے معاملات جن میں یقیناً سب سے حساس معاملہ کشمیر کا تھا میں رکاوٹیں ڈالیں۔ مجھے مشرف کی منطق مناسب لگی کیونکہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ بھارت کی طرف سے سخت گیر عناصر نے پاکستان اور بھارت کے تعلقات معمول پر لانے کی کوششوں کو اپنی سازشوں سے ناکام بنایا۔ افواہیں یہ تھیں کہ وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی اور وزیر اطلاعات سشما سوراج جن کا تعلق بی جے پی کے دائیں بازو سے تھا نے پاکستان کو ایسی کوئی رعایت دینے کی مخالفت کی جس کے تحت مسئلہ کشمیر کو بین الاقوامی معاملہ قرار دیا جائے۔

مزید فاصلے

آگرہ میں بدگمانی کا جو رجحان پیدا ہوا اس کو اس وقت تقویت ملی جب یکم اکتوبر کو سری نگر

میں کشمیر اسمبلی پر دہشت گردوں کا حملہ ہوا۔ حملے میں کافی جانی نقصان ہوا۔ امریکہ، یورپی یونین، جاپان سمیت کئی ملکوں نے حملے کی مذمت کی۔ یہ جاری معاملات سے ایک بڑی پہلو تہی تھی جس نے امریکہ کو ناراض کیا کیونکہ وہ اس وقت طالبان کو سزا دینے کے مشن پر تھا۔ اس سے بھی بدترین کچھ روز بعد ہوا جب 13 دسمبر کو مسلح عسکریت پسندوں نے بھارتی پارلیمنٹ کے اندر گھسنے کی کوشش کی۔ حملہ آوروں کی نیت تھی کہ کچھ ارکان پارلیمنٹ کو یرغمال بنالیا جائے۔ (ہود بھائی، 2006ء: 160)۔ 5 مسلح افراد وزارت داخلہ اور پارلیمنٹ کی پلیٹوں والی کاروں اور دستاویزات پر وہاں پہنچے اور اپنے ہتھیاروں سے فائرنگ شروع کردی۔ پارلیمنٹ کے سکیورٹی گارڈز نے جوابی فائرنگ کی جس سے ایک عسکریت پسند مارا گیا جبکہ اس کے 4 ساتھ پکڑے گئے۔ حملہ آوروں کی فائرنگ سے 5 پولیس اہلکار، پارلیمنٹ کا ایک سکیورٹی گارڈ اور ایک مالی ہلاک ہوگئے جبکہ 18 دیگر افراد زخمی ہوگئے۔ پارلیمنٹ کا کوئی رکن زد میں نہیں آیا۔ یہ تمام مناظر ٹیلی ویژن کی سکرینوں پر نظر آئے اور یوں پوری دنیا اس حملے سے آگاہ ہوگئی۔ بھارت نے الزام لگایا کہ حملے کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے تاہم پاکستان نے اس کی سختی سے تردید اور مذمت کی۔

اس کارروائی کے نتیجے میں اچانک جنوبی ایشیا دونوں روایتی حریفوں کے درمیان مسلح تصادم کی طرف بڑھتا نظر آنے لگا۔ بھارت نے پاکستان کی سرحد اور کنٹرول لائن پر ہزاروں فوجی تعینات کردیے۔ پاکستان نے بھی اس کا جواب دیا چنانچہ سرحد کی دونوں طرف 10 لاکھ فوجیوں کا اجتماع ہوگیا۔ (یوسف، 2006ء: 18)۔ مجھے یاد ہے کہ جنرل مشرف نے ٹی وی پر آکر قوم کو یقین دلایا کہ پاکستان کی مسلح افواج ملک کا ہر طرح سے دفاع کرنے پر تیار ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مشہور زمانہ فقرہ دہرایا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، انہوں نے اس حقیقت سے قطع نظر یہ لہجہ اختیار کیا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ تباہ کن نتائج کی حامل ہوسکتی ہے، اگر کشیدگی بڑھتی ہے تو دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں سے حملوں کا خطرہ منڈلانے لگا۔ پوری دنیا کی طرف سے دونوں ملکوں پر فوجوں کے انخلا کیلئے دباؤ بڑھنے لگا لیکن بھارت نے بقول اس کے پاکستان کی طرف سے سرحد پار دہشت گردی کی حمایت روکنے تک فوجیں واپس بلانے سے انکار کردیا۔ یہ کشیدگی بلاشبہ امریکی مداخلت سے کم ہوگئی جس نے کئی اعلیٰ سطحی وفود دونوں ملکوں میں بھیجے۔ (بداوی، 2006ء: 54)۔ اس کے علاوہ بھارت نے پاکستان پر زبردست دباؤ ڈالا کہ وہ مسلح

گروپوں کی حمایت ترک کردے۔ (کوہن، 2006: 91)۔ برطانیہ، جاپان اور یورپی یونین جیسے دیگر بڑے کھلاڑیوں نے بھی پاکستان پر اپنا چلن تبدیل کرنے کا دباؤ ڈالا۔

مشرف کا کشمیر پالیسی میں تبدیلی کا اعلان

بڑھتے ہوئے بین الاقوامی دباؤ کے نتیجے میں صدر جنرل پرویز مشرف نے 12 جنوری 2002ء کو پاکستانی قوم سے خطاب میں کشمیر میں عسکریت پسندی سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کیا اور کہا کہ عالمگیر بنیاد پرست اسلام سے پاکستان کا کوئی ناتا نہیں، انہوں نے کہا کہ:

''کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام کی امنگوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق پرامن طریقے اور مذاکرات سے حل کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس مسئلے کا حل نکالنا ہوگا۔ کسی تنظیم کو کشمیر کے نام پر دہشت گردی میں ملوث ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہم 11 ستمبر، یکم اکتوبر اور 13 دسمبر کے دہشت گردی کے واقعات کی مذمت کرتے ہیں، جو کوئی دہشت گردی کی کارروائی میں ملوث ہوا اس کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔ پاکستان کے ایسے تمام افراد، تنظیموں یا گروپوں کے خلاف سخت کارروائی ہوگی جو ملک کے اندر یا باہر دہشت گردی میں ملوث ہوں گے۔ ہمارا قومی رویہ بہرحال بین الاقوامی اقدار سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے''۔ (جین 2007اے: 174)۔

انہوں نے اپنی تقریر میں اقتدار سنبھالنے کے بعد ملک میں اعتدال پسندی کے فروغ کیلئے اٹھائے گئے انتھک اقدامات .... مثلاً جون 2001 کو سپاہ صحابہ، سپاہ محمد، لشکر جھنگوی جیسی تنظیموں پر پابندی.... سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس کے باوجود ڈاکٹروں سمیت معصوم شہریوں کی زندگی کو تہہ و بالا کیا جا رہا ہے۔ (سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی نے بالخصوص شیعہ ڈاکٹروں کو نشانہ بنایا)۔ انہوں نے اس عزم کا اعلان کیا کہ انتہا پسند تنظیموں کو کچل دیا جائے گا۔ اس تناظر میں انہوں نے مزید دو تنظیموں جیش محمد اور لشکر طیبہ پر بھی پابندی لگا دی۔ (ایضاً، 75-174)۔ کشمیر میں کارروائیوں تک محدود ان دونوں تنظیموں کو کالعدم قرار دینے کا مطلب مشرف حکومت اور سابق حکومتوں کی اس کشمیر پالیسی سے لاتعلقی کا واضح اشارہ تھا کہ کشمیر میں برسر اقتدار افراد حریت پسند ہیں۔ کئی سال تک جمعہ کی نمازوں کے بعد نمازیوں سے جہاد کشمیر کے لئے چندہ جمع کیا جاتا رہا۔ ایسی تنظیموں کو

دہشت گرد قرار دینا دراصل پاکستانی عوام کو غضبناک اور ابہام کا شکار کرنا تھا۔ اس بارے میں مزید لاتعلقی ایک اور طویل خطاب میں سامنے آئی جس کو اسلام کی اعتدال پسند اور رواداری پر مبنی اسلام کی بنیاد پر جدت پسند پاکستان کے طور پر پیش کرنے کیلئے تیار کیا گیا تھا۔ تقریباً نصف صدی کے سابق حکومتوں کے جبر کے بعد بالآخر محمد علی جناحؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا احیائے نو ہو گیا۔ جنرل مشرف نے اس خطاب کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان کا مقصد ایک ایسی ترقی پسند ریاست کا قیام تھا جس میں تمام شہریوں کو یکساں حقوق میسر ہوں۔ بعدازاں 18 جنوری کو مسلم علما سے خطاب میں مشرف نے اسلام کی رواداری اور غیر منقسم سوچ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اسلامی یکجہتی، رحم دلی کے فروغ اور انتہا پسندی اور تشدد کے خاتمے کی اپیل کی۔ انہوں نے علماء سے اپیل کی کہ وہ اسلام کا انسان دوست اور رواداری پر مبنی تصور ابھارنے میں ان کی مدد کریں جو صوفی روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ (مشرف، 18 جنوری 2002ء)۔ لیکن عوامی سطح پر انہوں نے جو تقریریں کیں ان میں جدت پسندی سے گریز نظر آتا ہے۔ انہوں نے ایسی افواہوں کو یکسر مسترد کر دیا کہ پاکستان سیکولر ملک بن سکتا ہے۔ انہوں نے امریکی ارکان کانگریس کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ 1974ء میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے سے متعلق جو قانون قومی اسمبلی سے منظور کرایا گیا اسے منسوخ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ حدود اور توہین مذہب کے قوانین پاکستانی آئین کا جزو لاینفک ہیں اور بدستور نافذ العمل رہیں گے۔ البتہ ان کا غلط استعمال روکنے کے اقدامات ضرور کئے جائیں گے۔

متفرق اقدامات

صدر مشرف نے بعض ترقی پسند تبدیلیاں بھی متعارف کرائیں۔ جداگانہ طرز انتخاب کا نظام ختم کر دیا گیا۔ اقلیتی امیدوار اب منتخب اسمبلیوں کی نشست کیلئے کہیں سے بھی الیکشن لڑ سکتے تھے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور مقامی حکومتوں میں غیر مسلموں کیلئے نشستیں مخصوص کی گئیں۔ اسلام پسند جماعتوں سمیت تمام سیاسی جماعتوں کیلئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ مخصوص نشستوں پر غیر مسلم امیدوار نامزد کریں۔ (احمد، 2011ء اے: 96)۔ اس کے علاوہ ضیاء دور کے زیادتی Rape کے قانون میں اصلاحات کی گئیں۔ تحفظ نسواں ایکٹ 2006 کے تحت خواتین سے زیادتی

کوحدود کے جرائم کی کیٹگری سے نکال کر پاکستان پینل کوڈ میں شامل کر دیا گیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاتون سے زیادتی ثابت کرنے کے لئے 4 مرد گواہوں کی جو شرط تھی وہ ختم کر دی گئی۔ نئے قانون کے تحت فرانزک اور متعلقہ حالات کے شواہد کو قابل قبول قرار دیا گیا۔اس کے علاوہ متاثرہ خاتون اور دیگر خواتین کی طرف سے دیے گئے شواہد بھی عدالتوں میں قابل قبول ہو گئے۔(احمد، 2011ءبی:6-115)۔

کارگل کی محدود جنگ کے بعد 1998ء سے سالانہ سارک سربراہ کانفرنس نہیں ہو سکی تھی۔ آخر کار جنوری 2002ء میں جب کھٹمنڈو میں سربراہ کانفرنس ہوئی تو مشرف نے بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی ایک اور کوشش کی۔اس موقع پر مشرف نے مشہور زمانہ ''کمانڈو ایکشن'' کیا اور کانفرنس سے خطاب کے بعد اچانک مصافحہ کرنے بھارتی وزیر اعظم کی طرف چلے گئے۔ واجپائی نے بھی کچھ ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔اس کے بعد واجپائی نے 2004ء میں آئندہ سارک سربراہ کانفرنس میں شمولیت کا فیصلہ کیا جو اسلام آباد میں ہوئی۔اس کے نتیجے میں اعلان اسلام آباد میں دونوں ملکوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ باہمی طور پر سودمند تعلقات کے فروغ کیلئے جامع مذاکرات کا آغاز کریں گے۔لیکن عام انتخابات میں غیر متوقع طور پر حکمران جماعت بی جے پی کو شکست ہوئی جس کے باعث اب تک مکمل ہونے والا عمل ضائع ہو گیا اور نئے سرے سے آغاز کرنا پڑا۔اس کیلئے کچھ وقت لگا۔صدر مشرف کے کانگریس پارٹی کے وزیر اعظم منموہن سنگھ سے رابطے بھی واجپائی کی طرح مثبت ثابت ہوئے اور صدر نے محسوس کیا کہ منموہن بھی اپنے پیشرو کی طرح پاکستان کے ساتھ تعلقات کے فروغ کے خواہاں تھے۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان نئی دہلی میں ملاقات ہوئی جہاں مشرف منموہن کی دعوت پر کرکٹ میچ دیکھنے گئے۔اس ملاقات میں دونوں سربراہان حکومت کو مسئلہ کشمیر پر تبادلہ خیال کا موقع بھی ملا۔دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس تنازعے پر بیرونی ثالثی کی ضرورت نہیں۔

مشرف اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں:۔''بھارتی وزیر اعظم نے یہ کہا کہ وہ نئی سرحدیں کھینچنے پر رضامند نہیں ہو سکتے لیکن میں نے جواب دیا کہ میں بھی کنٹرول لائن کو مستقل سرحد تسلیم نہیں کر سکتا''۔(مشرف، 2006ء:301)۔اگلی ملاقات ستمبر 2005ء کو نیویارک میں ہوئی جہاں مشرف نے منموہن سنگھ کو دورہ پاکستان کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی لیکن یہ دورہ نہ ہو سکا۔

مشرف سمجھتے ہیں کہ منموہن سنگھ تو مسئلہ کشمیر حل کرنے میں مخلص تھے لیکن بھارتی اسٹیبلشمنٹ اس پر تیار نہیں تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ”میرے خیال میں بھارتی اسٹیبلشمنٹ .... بیوروکریٹس، سفارتکار، خفیہ ادارے حتیٰ کہ فوج.....نے انہیں مجبور کر دیا“۔ (ایضاً:302)۔ مشرف نے کشمیر کے منصفانہ حل پر اپنے مجموعی مشاہدات میں 4 نکاتی فریم ورک پیش کیا۔ نکتہ اول میں غیر منقسم جموں و کشمیر کے 5 جغرافیائی خطے بنائے گئے ہیں۔ پاکستانی حصے والے کشمیر میں شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر جبکہ بھارت کے زیرانتظام کشمیر میں جموں، کشمیر وادی اور لداخ کے علاقے شامل ہیں۔ مذاکرات کے وقت پانچوں خطوں کو زیر بحث لایا جائے۔ نکتہ دوم میں پانچوں خطوں سے فوجیں نکالنے اور وہاں عسکریت پسندی ختم کرنے کی تجویز دی گئی۔ نکتہ سوم پانچوں خطوں میں خودمختار حکومت کے قیام کی تجویز پر مشتمل تھا۔ آخری نکتے میں یہ تجویز دی گئی کہ پاکستان، بھارت اور کشمیریوں پر مشتمل مشترکہ انتظامی میکانزم تیار کیا جائے جو سیلف گورننس اور اہل کشمیر کے معاملات پر نظر رکھے۔ (ایضاً:303)۔

انہوں نے واضح کیا کہ یہ پاکستان کا سرکاری مؤقف نہیں بلکہ محض ان کے ذاتی خیالات تھے۔ لیکن یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی ترجمانی کررہے تھے جو مسئلہ کشمیر کے حل کے معاملے میں بھارتیوں کے مقابلے میں زیادہ بدنام تھی۔ اس کے بعد کے بیانات میں مشرف نے مزید رعایتوں کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کنٹرول لائن پر مزید لچک دکھانے کا خواہاں ہوگا۔ دوسری طرف بھارت نے پاکستان کے تجویز کردہ امن اقدامات پر سست ردعمل کا مظاہرہ کیا، البتہ 2006ء میں وزیراعظم من موہن سنگھ نے پاکستان کے ساتھ ”امن، سلامتی اور دوستی“ کا معاہدہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ (احمد، 6 جنوری 2007ء)۔ 2007ء کا بیشتر دورانیہ گومگو میں گزرا کیونکہ پاکستان میں جو سیاسی ابتری تھی وہ حکومت کی توجہ مبذول کرانے کی متقاضی تھی، اس طرح مذاکراتی عمل معطل رہا۔ چنانچہ بھارت نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

تجارت اور مواصلات کے شعبے میں دونوں ملکوں کے درمیان کچھ پیشرفت دیکھنے میں آئی۔ 1999ء میں جب بھارتی وزیراعظم واجپائی پاکستان کے تاریخی دورے پر آئے تو دونوں ملکوں کے درمیان دہلی تا لاہور بس سروس کا افتتاح کیا گیا۔ یہ سروس کارگل کی محاذ آرائی کے دوران بھی جاری رہی تاہم 13 دسمبر 2001ء کو بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے بعد یہ بس سروس معطل

کردی گئی۔ البتہ 2003ء میں تعلقات بہتر ہونے پر یہ بس سروس بحال کردی گئی۔ اس کے بعد 2005ء میں آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد اور مقبوضہ کشمیر کے مرکزی شہر سری نگر کے درمیان بھی بس سروس شروع کی گئی جبکہ جنوری 2006 میں امرتسر اور ننکانہ صاحب کے درمیان بس سروس کا آغاز ہوگیا۔ دوطرفہ تجارت کے حجم میں 2006ء سے 2007ء کے دوران نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ 88 فیصد کے تناسب سے ایک ارب 60 کروڑ ڈالر کا تھا جو 2007ء میں بڑھ کر 2 ارب 70 کروڑ ڈالر ہونے کی توقع تھی تاہم پاکستان میں سیاسی ابتری اور مشرف حکومت کی کمزور پوزیشن کے باعث یہ ہدف حاصل نہ ہوسکا۔ دوسری طرف دونوں ملکوں نے اپنے اپنے میزائل پروگرام کو جدید بنانے پر کام جاری رکھا۔ یوں جنگ کی صورت میں ہلاکت خیز صلاحیت میں زبردست اضافہ کیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر کے خلاف کارروائی

امریکہ جس نے اس وقت تک پاکستان کو بھاری اقتصادی اور عسکری امداد فراہم کرنا شروع کردی تھی نے مشرف پر دباؤ ڈالا کہ وہ ایٹمی پھیلاؤ میں ملوث ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اس کے ہمنواؤں کو لگام ڈالیں۔ جب دسمبر 2003ء میں لیبیا نے اعلان کیا کہ وہ اپنا جوہری پروگرام جو اس کے بقول پاکستان کی خفیہ معاونت سے آگے بڑھ رہا تھا وہ روک رہا ہے تو پاکستانی حکومت کا ایسے کسی کام میں ملوث نہ ہونے کا روایتی مؤقف مزید قابل پذیرائی نہ رہا۔ اچانک ایسے شواہد سامنے آنے لگے کہ نہ صرف لیبیا بلکہ ایران اور شمالی کوریا کو بھی ایٹمی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی منتقل کی گئی۔ مشرف نے جہاں ڈاکٹر قدیر کی سرگرمیوں کی تحقیقات کا حکم دیا وہاں یہ مضحکہ خیز مؤقف اختیار کیا کہ اگر ایسا کوئی کام ہوا بھی ہے تو اس میں حکومت پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ (مشرف، 2006: 447-50)۔ تاہم ناقدین سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایران، لیبیا، شمالی کوریا، نائجیریا، مالی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دورے سرکاری طیارے پر ہوئے تھے اور ان کے ساتھ پاکستان کی ایٹمی اسٹیبلشمنٹ کے سینئر حکام بھی شامل تھے۔ جنوری 2004ء میں پاکستان کے تفتیش کاروں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے پوچھ گچھ کی۔ 25 جنوری 2004ء کو حکام نے رپورٹ دی کہ عبدالقدیر خان اور دیگر اعلیٰ حکام نے کروڑوں ڈالر رقم کے عوض 1980ء اور 1990ء کی دہائی میں

مبینہ طور پر ایران کے جوہری ہتھیاروں کے پروگرام میں بلا اجازت معاونت کی تھی۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ بھی اس غیر قانونی ایٹمی تجارت میں شامل تھے۔ (جان، 2007ء: 174)۔ 31 جنوری کو ڈاکٹر عبدالقدیر کو صدر پاکستان کے مشیر کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ 4 فروری کو انہوں نے ٹی وی پر آکر اپنے جرم کا اعتراف کیا تاہم اگلے روز صدر مشرف نے انہیں معاف کر دیا۔ (مشرف، 2006ء: 94-289)۔ اگرچہ انہیں گھر پر نظر بند کیا گیا لیکن امریکی تفتیش کاروں کی ان تک رسائی کی درخواست مسترد کر دی گئی۔

خارجہ پالیسی کے متفرق اقدامات

مشرف نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بعض قدامت پسند خدوخال بھی تبدیل کرنے کی جرات کی جن سے دائیں بازو کی قوتوں کو تقویت ملی۔ روایتی طور پر پاکستان فلسطینیوں کی حمایت میں پیش پیش رہا جس کے تحت یہودیوں اور اسرائیل کے خلاف کھلے عام جارحانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ مشرف نے ایسا تنازعاتی رویہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے نزدیک اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ چنانچہ انہوں نے ایک بیان جاری کیا کہ اگر اسرائیل آزاد فلسطین کو تسلیم کر لے تو پاکستان، اسرائیل کو تسلیم کرنے پر غور کر سکتا ہے۔ اس اعلان کا امریکی یہودیوں نے زبردست خیر مقدم کیا اور مشرف کو نیویارک میں امریکن جیوش کانگریس سے خطاب کی دعوت دی۔ ایسا ہونے سے پہلے وزیر خارجہ خورشید قصوری نے یکم ستمبر 2005ء کو استنبول میں اپنے اسرائیلی ہم منصب سے ملاقات کی۔ چند روز بعد 17 ستمبر کو جنرل پرویز مشرف نے امریکن جیوش کانگریس سے خطاب کیا۔ ان کی تقریر کا زبردست خیر مقدم کیا گیا کیونکہ انہوں نے 2 ریاستوں (فلسطین اور اسرائیل) کے قیام کے حق میں بات کی جس سے اسرائیل کو اسلامی ممالک کی طرف سے تسلیم کر لیا جاتا۔ (ایضاً: 305)۔ ملک کے اندر اس بات کو زیادہ پذیرائی نہ ملی کیونکہ ٹیلی ویژن سکرین پر وہ منظر بھی دکھایا گیا جس میں مشرف نے آگے بڑھ کر اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون سے ہاتھ ملایا اور یہ وہ شخص تھا جس پر 1982ء میں لبنان میں صابرہ اور شتیلہ کیمپوں میں عیسائی ملیشیا کے ہاتھوں فلسطینی پناہ گزینوں کے قتل عام کی منصوبہ بندی کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

پاکستان میں دہشت گرد حملوں کا آغاز

انتہائی سخت گیر اور قوم پرست اسلام پسندوں کے نزدیک مشرف نے اپنے محبّ وطن ہونے کے دعوے کی اسی روز نفی کر دی تھی جب انہوں نے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے ساتھ القاعدہ اور طالبان کے خلاف جنگ میں بلا چوں و چرا ہاتھ ملا لیا.... ستم ظریفی دیکھیں کہ اسی مشرف نے نواز شریف کی طرف سے کارگل تنازعے پر کسی مزاحمت کے بغیر فوجیں واپس بلانے پر اتفاق کرنے پر انہیں سخت ہدف تنقید بنایا تھا۔ چنانچہ مشرف کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ساتھ دینے پر نہ صرف پاکستان بلکہ اسلام اور امت مسلمہ کا بھی غدار قرار دیا گیا، جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ طالبان اور القاعدہ کے جنگجوؤں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں فاٹا میں پناہ حاصل کر رکھی تھی اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں نا قابل رسائی ٹھکانوں سے انہوں نے پاکستان میں اپنی دہشت گردی کی کارروائیاں آگے بڑھانا شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ اسلام پسندی کا ریاستی اداروں بالخصوص انٹیلی جنس اور مسلح افواج میں بھی اثر ونفوذ تھا۔ اسی لئے دہشت گردوں کے خلاف کسی بھی کارروائی سے پہلے انہیں پتہ چل جاتا اور وہ موقع سے فرار ہو جاتے۔ جو لوگ ریٹائر تھے وہ بدستور انتہا پسندوں کے ہمدردوں کے نیٹ ورک کا حصہ بنے رہے۔ یوں ایک انتہاء وسیع و عریض خفیہ حمایتی اساس موجود تھی جس سے دہشت گردوں کو پاکستان میں کارروائیوں کیلئے معاونت میسر تھی۔ نائن الیون کے فوراً بعد پاکستانی سرزمین پر دہشتگردی نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ بلاشبہ مشرف کو اب بھی مسلح افواج کی حمایت دستیاب تھی بلکہ کور کمانڈروں کی مدد کے بغیر فوجی بغاوت میں کامیابی ممکن ہی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ خودسر عناصر کے باوجود مشرف کو آئی ایس آئی سمیت دیگر خفیہ اداروں اور ق لیگ جیسے اپنے اتحادیوں کی حمایت بھی میسر رہی۔ مخالفت اور حمایت کا یہی وہ پیچیدہ فریم ورک تھے جس نے پاکستان میں دہشت گردی کو پنپنے کا موقع دیا۔

امریکی صحافی ڈینیل پرل کا سر قلم

دسمبر 2001ء میں امریکی اخبار وال سٹریٹ جرنل کے رپورٹر ڈینیل پرل اور ان کی بیوی میریان ایک مذہبی شخصیت کا برطانوی شہری رچرڈ ریڈ Richard Reed کے ناکام حملے کے سلسلے میں انٹرویو کرنے پاکستان آئے۔ رچرڈ ریڈ برطانوی نومسلم تھا جس نے اپنے جوتوں میں دھماکہ

خیز مواد چھپا کر برطانیہ سے امریکہ جانے والے طیارے کو دوران پرواز اڑانے کی کوشش کی۔ ڈینیل پرل ایک اور سٹوری پر بھی کام کر رہا تھا۔ کراچی میں قیام کے دوران اسے اغواء کر کے تشدد کیا گیا اور پھر اس کا سرتن سے جدا کر دیا گیا۔ اس کا گلا کاٹنے کی ہولناک ویڈیو انٹرنیٹ پر جاری کر دی گئی جو فوراً پوری دنیا میں شہ سرخی کی خبر بن گئی۔ پاکستانی حکام کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ اغوا کاروں میں عمر شیخ جیسے سکہ بند دہشت گرد شامل تھے جس نے 1994ء میں بھارت میں کئی سنگین کارروائیاں کیں۔ عمر شیخ کو جیش محمد کے رہنما مولانا مسعود اظہر کے ساتھ بھارت میں گرفتار کر کے قید کر دیا گیا لیکن دونوں کو 1999 میں بھارتی طیارہ اغواء کر کے مسافروں کی رہائی کے بدلے رہا کرایا گیا۔ طیارہ اغواء کر کے افغانستان کے شہر قندھار لے جایا گیا جہاں طالبان برسر اقتدار تھے۔ مشرف کے مطابق عمر شیخ نے ڈینیل پرل کے اغوا میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا لیکن اس کی تردید کی کہ اس کا سر قلم کرنے کے فیصلے میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ القاعدہ کا سینئر رہنما خالد شیخ محمد، امجد فاروقی اور کئی دیگر ڈینیل پرل کے اغواء میں ملوث تھے اور لازمی بات ہے کہ یہی لوگ اس کو ہلاک کرنے میں شامل تھے۔ خالد شیخ محمد کو امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ مئی 2002ء میں شیعہ مخالف لشکر جھنگوی کا رکن فضل کریم پکڑا گیا۔ تفتیش کے دوران اس نے برملا اعتراف کیا کہ ڈینیل پرل کا سر قلم کرنے میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے امریکی صحافی کی لاش برآمد کرنے میں بھی پولیس کی مدد کی جس کے 10 ٹکڑے کئے گئے تھے۔ (مشرف، 2006ء: 8-225)۔ دوسری جانب عمر شیخ کو ٹرائل کے لئے پاکستان کی جیل میں بھیج دیا گیا۔

دہشت گردی سے پاکستانیوں میں خوف وہراس

جہاں ایک طرف ڈینیل پرل کی کہانی سے پوری دنیا کو صدمہ پہنچا وہاں پاکستان میں دہشتگردوں نے دہشت گردی کا بازار گرم کرتے ہوئے کئی اہداف کو نشانہ بنایا۔ چونکہ ڈینیل پرل یہودی النسل تھا اس لئے اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون نے اس کے بہیمانہ قتل کا انتقام لینے کا عہد کیا لیکن اس عہد کو ڈینیل کے باپ نے مسترد کر دیا کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کو سیاسی طور پر استعمال کرنے کے خلاف تھے۔ 1990ء کے عشرے کی دہشت گردی جس کا بنیادی طور پر نشانہ مذہبی اور لسانی اقلیتیں بنیں کے برعکس اس بار جنونی جہادیوں کی پہنچ سے کوئی فرد یا ادارہ دور

نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنا نقطۂ نظر مسلط کرنے میں انتہا پسند اور پاکستان میں ہر طریقے سے اپنی خواہش کا سماجی اور سیاسی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں۔ 17 مارچ 2002ء کو اسلام آباد کے ڈپلومیٹک انکلیو میں پروٹسنٹ چرچ میں عبادت کرتے مسیحیوں پر دستی بم سے حملہ کیا گیا۔ جس سے 6 افراد ہلاک اور سری لنکا کے سفیر سمیت 42 افراد زخمی ہو گئے۔ بظاہر دہشت گرد نے خود کو بھی دھماکے سے اڑا لیا اس لئے منصوبہ سازوں کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ یوں پاکستان میں خودکش حملوں کی لہر کا آغاز مارچ 2002ء میں ہوا۔

غیر ملکیوں پر حملے کا ایک اور واقعہ 8 مئی کو کراچی میں ہوا۔ جس میں خودکش بمبار نے غیر ملکی انجینئروں کو ہوٹل سے لے جانے والی پاکستانی نیوی کی بس کے ساتھ دھماکہ خیز مواد سے بھری کار ٹکرا دی۔ یہ فرانسیسی پاکستان میں ''آگستا'' آبدوز کی تیاری کا کام کر رہے تھے۔ حملے میں 11 فرانسیسی اور 2 پاکستانی مارے گئے جبکہ 24 افراد زخمی ہو گئے۔ ان دنوں پاکستان کے دورے پر آئی نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم جسے اس روز میچ بھی کھیلنا تھا وہ دورہ منسوخ کر کے وطن واپس چلی گئی۔ ایک بار پھر غلط وجوہات کی بنا پر پاکستانی عالمی میڈیا کا مرکز بن گیا۔ تفتیش کاروں کے مطابق کارروائی حرکۃ المجاہدین العالمی نے کی جو بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں دہشت گردی کی کارروائیوں کی بانی تنظیم حرکۃ المجاہدین (HUM) کا بین الاقوامی ونگ ہے۔

چند ماہ بعد 5 اگست کو ایک مسیحی سکول دہشت گردانہ بربریت کا نشانہ بنا تاہم وہاں کے سکیورٹی گارڈ نے اپنی جان دے کر حملہ ناکام بنا دیا۔ اس نے مرنے سے پہلے خطرے کی گھنٹی بجا دی جس سے حملہ آور کسی کو نشانہ نہ بنا سکے۔ فوج کے ایک جونیئر کمیشنڈ آفیسر نے ان کا تعاقب کیا لیکن تینوں خودکش بمباروں نے خود کو اڑا لیا۔ چار روز بعد دہشت گرد ایک بار پھر حملہ آور ہوئے اور اس مرتبہ ان کا ہدف کرسچین ہسپتال کے اندر واقع چرچ تھا۔ اس کارروائی میں 4 خواتین ہلاک اور 24 افراد زخمی ہوئے۔ ایک حملہ آور کامران میر ہاتھ میں دستی بم پھٹنے سے مارا گیا جبکہ اس کے ساتھی موقع سے فرار ہو گئے۔ پولیس نے کامران میر کے گھر چھاپہ مار کر اہم ثبوت قبض میں لے لئے جس سے سازش میں شریک دیگر افراد کا سراغ لگانے میں مدد ملی۔ تفتیش پر انکشاف ہوا کہ مسیحی برادری پر حملے ایک بڑی سازش کا حصہ تھا جس میں جیش محمد کے سربراہ مسعود اظہر اور لشکر جھنگوی کے دیگر عناصر بھی ملوث تھے۔ اس گروہ کے لیڈر سیف الرحمٰن سیفی کے بارے میں مشرف نے تبصرہ کیا کہ:

''سیفی انتہائی نظریے کا پکا انسان تھا۔ایک بار وہ 15 اگست 2002ء کو ملتان میں گرفتار ہوا تو اس نے اعتراف کیا کہ اس کا تعلق لشکر جھنگوی اور القاعدہ سے تھا۔اس طرح القاعدہ اور دیگر مقامی تنظیموں کا باہمی گٹھ جوڑ واضح ہو گیا۔القاعدہ پیسہ،ہتھیار اور آلات کی فراہمی کرتی جبکہ مقامی تنظیمیں افرادی قوت اور حملہ کرنے کے لئے ترغیب کا اہتمام کرتیں''۔(ایضاً:231)۔

دہشت گردی کے حملوں کی پہلی لہر میں کچھ توقف آ گیا کیونکہ پولیس اور خفیہ اداروں نے کچھ رنگ لیڈرز اور کارکنوں کا سراغ لگا لیا۔تفتیش کے دوران ملنے والی معلومات کی روشنی میں کچھ کو گرفتار کر لیا گیا۔لیکن پاکستان میں دہشت گردی کے سیل اور دیگر گٹھ جوڑ وسیع پیمانے پر پھیل چکے تھے اور انہوں نے نظریاتی محاذ پر نہایت مؤثر طریقے اور تکنیکس بنا لیں۔وہ یہ کہ پاکستان کو امریکہ سمیت اسلام کے دیگر دشمنوں کے ساتھ تعاون کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔صورتحال اس وقت انتہائی پیچیدہ ہو گئی جب 14 دسمبر 2003ء کو راولپنڈی میں صدر مشرف کا قافلہ گزرنے کے چند منٹ بعد پل میں دھماکہ ہو گیا۔بظاہر مشرف کی گاڑی میں لگے جامر نے دھماکہ خیز مواد پھٹنے نہ دیا جو بعد ازاں پھٹ گیا۔(ڈیلی ٹائمز،15 دسمبر 2003ء)۔کرنل (ر) اسلم چیمہ جو اس وقت کار میں ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے نے مجھے پوری تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ سنایا۔جنرل مشرف نے اس وقت اپنے حواس مختل نہ ہونے دیے اور شوفر کو گاڑی چلائے رکھنے کی ہدایت کی اور آرمی چیف ہاؤس پہنچے جہاں ان کی رہائش گاہ تھی۔حملے میں ٹائر پھٹ گئے اور کار ایک طرف کو جھک گئی لیکن اس کے باوجود وہ رہائش گاہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

مشرف کو ہلاک کرنے کی اس طرح کی ایک اور کوشش محض 11 روز بعد 25 دسمبر کو ہوئی۔2 خودکش بمباروں نے انہیں جان سے مارنے کی ناکام کوشش کی۔بعد میں انکشاف ہوا کہ ایس ایس جی کور جس سے مشرف کا بھی تعلق تھا کے بعض جونیئر اہلکار مشرف کو ہلاک کرنے کی سازش میں ملوث تھے۔(مشرف،2006ء:215)۔ڈینیل پرل کیس میں ملوث امجد فاروقی اس سازش کا ماسٹر مائنڈ تھا کیونکہ انٹیلی جنس اور سکیورٹی ایجنسیوں نے اس کی فون کالیں پکڑ لیں۔ایک بڑی کارروائی کے دوران بالآخر امجد فاروقی کو سکیورٹی فورسز نے ستمبر 2004ء میں ہلاک کر دیا۔ (ایضاً:7-254)۔

بہر حال دہشتگردوں نے مشرف حکومت کے دیگر کئی اعلیٰ عہدیداروں کو نشانہ بنانے کی

کوششیں جاری رکھیں۔10 جون 2004ء کو کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل احسن سلیم حیات کی دفتر جاتے ہوئے کار پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ گولیاں اس لئے چلائی گئیں کہ ریموٹ کنٹرول بم جو سڑک پر نصب تھا وہ موبائل فون نہ چلنے سے نہ پھٹ سکا۔ جنرل کا ڈرائیور اور دیگر سٹاف مارا گیا۔ کور کمانڈر کی کار کے پیچھے آنے والی گاڑی میں سوار تمام 7 افراد اور 2 راہگیر بھی جاں بحق ہو گئے۔ البتہ جنرل احسن سلیم حیات محفوظ رہے۔ حملہ آور بوکھلاہٹ میں فرار ہوتے ہوئے اپنا فون وہیں پھینک گئے۔ تفتیش میں ایک اور شیعہ مخالف گروپ جنداللہ کا انکشاف ہوا جو زیادہ تر ایران کے صوبہ بلوچستان میں سرگرم تھا۔ بعدازاں میں نے یوٹیوب پر خود اپنی آنکھوں سے وہ ویڈیو دیکھی جس میں جنداللہ کے جنونی زمین پر لیٹے افراد کے سر قلم کر رہے تھے جبکہ سربریدہ لاشیں بری طرح تڑپ رہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس طرح کاٹے گئے سر لہرائے جس طرح قصاب بھیڑوں اور بکریوں کے سر کاٹ کر ہلاتے ہیں۔ 30 جولائی 2004ء کو وزیراعظم شوکت عزیز پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جو ان دنوں اٹک سے قومی اسمبلی کی نشست کیلئے انتخابی مہم چلا رہے تھے۔ وہ خود تو محفوظ رہے لیکن ان کے قافلے میں شریک کئی دیگر افراد مارے گئے۔

اس کا جواب حکومت نے القاعدہ کے کئی ارکان گرفتار کر کے دیا۔ ان میں سے کئی کو امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ چونکہ پاکستان امریکی اور اتحادی افواج کو سامان پہنچانے کے لئے ٹرانزٹ روٹ تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ سے انٹیلی جنس شیئرنگ کے باعث امریکہ افغانستان میں القاعدہ کو نشانہ بناتا تھا۔ اس لئے طالبان کا قہر مشرف پر ٹوٹا۔ مشرف نے اپنی کتاب کے کم از کم 2 ابواب ان افراد کیلئے وقف کئے ہیں انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں خدمات انجام دیں۔ 2006ء میں جنرل پرویز مشرف نے لکھا کہ:

''ہم نے 689 دہشت گرد پکڑے جن میں سے 369 امریکہ کے حوالے کئے گئے۔ اس سے ہمیں سر کی قیمت کی مد میں کروڑوں ڈالر ملے۔ جو لوگ ہمیں مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ''کافی کچھ نہیں کیا'' وہ صرف سی آئی اے سے پوچھ لیں کہ اس نے انعام کی مد میں پاکستان کو کتنی رقم ادا کی''۔ (ایضاً:237)۔

جو افراد القاعدہ کے حوالے کئے گئے وہ زیادہ تر القاعدہ کے ارکان اور عرب اور دیگر قومیتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس کام پر جہاں مشرف اور ان کے قریبی جنرلوں سے امریکہ

کی محبت بڑھی وہاں پاکستان کے اسلام پسند انتہائی غضبناک ہو گئے۔ انتہا پسند گروپوں کی دہشت گردی کی لعنت نے 2004ء سے 2006ء کے دوران پاکستان معاشرے کو بدستور اپنی لپیٹ میں لئے رکھا۔

امریکہ بھارت جوہری معاہدہ

پاکستان کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت کے برعکس سٹریٹجک شراکت داری کے شعبے میں امریکہ نے بل کلنٹن کے دور میں بھارت سے قربت کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ ان کے پیشرو جارج بش کی حکومت کے دوران مزید تیز ہو گئی۔ مارچ 2006ء میں صدر بش نے بھارت کے دورے میں بھارت کو ایٹمی آلات کی سپلائی پر ماضی میں لگائی گئی پابندیاں ختم کرنے کا اعلان کیا۔ امریکہ کے شدید دباؤ کے باوجود پاکستان اور بھارت نے سی ٹی بی ٹی اور این پی ٹی پر دستخط نہیں کئے تھے۔ اس لئے امریکہ نے دونوں ملکوں کو ایٹمی ٹیکنالوجی کی برآمد پر پابندی لگا دی۔ امریکہ بھارت کی زبردست اقتصادی ترقی اور مستحکم جمہوریت سے کافی متاثر ہوا اور بھارت کی منڈی پر دسترس کا خواہاں تھا۔ معاہدے کے تحت امریکہ نے بھارت کو جو ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کرنا تھا وہ صرف سول مقاصد کیلئے استعمال ہو سکتی تھی۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ سویلین جوہری تعاون کے معاملے پر مذاکرات کیلئے دونوں ملکوں کو کئی سال لگ گئے۔ بی جے پی اور بائیں بازو کی جماعتوں کی طرف سے اس معاہدے کی کافی مخالفت کی گئی کیونکہ ان کے نزدیک من موہن سنگھ کی حکومت نے سویلین جوہری ری ایکٹر عالمی ادارہ برائے ایٹمی توانائی IAEA کے معائنے کیلئے کھولنے پر رضامندی ظاہر کر کے ملکی خودمختاری اور سلامتی پر سمجھوتہ کیا ہے۔ حالانکہ قومی مقاصد کی ایٹمی تنصیبات اس معاہدے سے مستثنیٰ تھیں۔ بہرحال مزید 3 سال تک مذاکرات کے بعد آخرکار بھارت اور امریکہ کے درمیان 20 اکتوبر 2008ء کو معاہدہ طے پا گا۔ (سیکری، 2009ء:84-175)۔

امریکہ نے 5 ممالک پر مشتمل ایٹمی کلب کے ارکان بالخصوص چین کی طرف سے معاہدے کی ممکنہ مخالفت کی روک تھام کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ اس طرح بھارت دنیا کا واحد ملک بن گیا جو ایٹمی ہتھیار رکھنے اور این پی ٹی پر دستخط نہ کرنے کے باوجود پوری دنیا کے ساتھ ایٹمی

آلات کی لین دین کرسکتا تھا۔ اس معاہدے پر پاکستان نے زبردست احتجاج کیا اور زور دیا کہ ایسا ہی سلوک پاکستان کے ساتھ کیا جائے لیکن امریکہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پاکستان کو قبل ازیں 2004ء میں امریکہ کا بڑا ''نان نیٹو اتحادی'' ملک کا درجہ دیا گیا تھا۔

بلوچستان میں تنازعہ

بین الاقوامی سطح پر مایوس کن صورتحال کا سامنا کرنے کے ساتھ پاکستان کو داخلی محاذ پر بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام پسندوں کی طرف سے دہشت گردی کی تابڑتوڑ کارروائیوں کے علاوہ مشرف حکومت بلوچ قوم پرستوں کے پیدا کردہ مسائل سے بھی دوچار تھی۔ وسیع وعریض لیکن کم آباد صوبہ بلوچستان کو ہمیشہ مرکزی حکومت کے خلاف شکایات لاحق رہیں۔ جمیل احمد جنہوں نے بلوچستان میں کئی سال تک سول سرونٹ کے طور پر خدمات انجام دیں اور بعدازاں چیف سیکرٹری کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ فوج بلوچوں کے خلاف طاقت کا اندھادھند استعمال کرنے کی ذمہ دار تھی اور ملک کا یہ حصہ دیگر حصوں بالخصوص پنجاب کے غلبے والے مرکز کے مقابلے میں خود کو تنہا محسوس کرتا رہا۔

21ویں صدی کے اوائل میں بلوچستان میں ایک بار پھر شورش اور مسلح تصادم نے جنم لیا۔ یہ تصادم بلوچ قوم پرستوں اور اسلام آباد کی نمائندگی کرنے والی فورسز کے درمیان ہوا۔ اس شورش کے پس منظر میں صوبے کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار اور گوادر میں بندرگاہ کے قیام کی وجوہات بھی شامل تھیں۔ کیونکہ بلوچوں کو ان میں مناسب حصہ نہیں دیا گیا۔ بلوچوں کی مشکلات کا ذمہ دار چین کو بھی سمجھا جاتا ہے جس کو معدنیات کی کان کنی کے حقوق دیے گئے اور جو گوادر بندرگاہ کی ترقی میں بھی ایک اہم کردار ہے۔ جہاں تک کان کنی کا تعلق ہے تو تانبے کا 297 ملین ڈالر کا سینڈک پراجیکٹ 10 سالہ لیز پر چینی کمپنی کو دے دیا گیا۔ یہ اہم منصوبہ کسی نگرانی کے بغیر 3 سال تک چلتا رہا۔ مئی 2009ء میں سینڈک میٹل لمیٹڈ نے اعداد وشمار جاری کئے کہ 2004ء سے 2008ء کے درمیان اس کان سے 7746 ٹن سونا، 86013 ٹن تانبا، 11 ٹن چاندی اور 14482 ٹن میگنائٹ ملا لوہا نکالا گیا۔ ان کی مالیت 633 ملین ڈالر تھی۔ اس دولت سے بلوچوں یا ضلع چاغی جہاں سے یہ قیمتی دھاتیں نکالی جاتی ہیں مقامی افراد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا گیا۔ کنٹریکٹ کے مطابق بیشتر منافع

چینیوں کو ملا جبکہ پاکستان کو اگلے 10 سال تک 5 لاکھ ڈالر ماہانہ ملیں گے۔ بلوچستان کو محض سالانہ 70 ہزار ڈالر رائلٹی ملتی ہے۔ اس کان کنی سے بلوچستان کو جو ماحولیاتی نقصان پہنچ رہا ہے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ (تالپور، 5 دسمبر 2009) لیکن چین کیلئے سب سے اہم پراجیکٹ گوادر بندرگاہ ہے۔ قراقرم ہائی وے مکمل ہونے کے بعد گوادر پورٹ چینی برآمدات کی وسطی اور مغربی ایشیا کو ترسیل میں ایک مرکز کا کردار ادا کرے گی۔ پاکستان کے دفاعی امور کے ممتاز تجزیہ نگار احمد فاروقی کے مطابق گوادر بندرگاہ چینی آبدوزوں کیلئے نیول بیس کا بھی کردار ادا کرے گی۔ (2:2008)۔ جیسے ہی بحیرہ عرب کی نگرانی اور دیگر معاشی سرگرمیوں کے لئے گوادر بندرگاہ کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی تو پاکستان ملٹری نے بلوچستان میں کئی مقامات پر نئی چھاؤنیاں قائم کر لیں۔ 2005ء میں بلوچ رہنماؤں نواب اکبر بگٹی اور میر بالاچ مری نے حکومت پاکستان کو 15 نکاتی ایجنڈا پیش کیا۔ جس میں زیادہ تر زور اس بات پر دیا گیا کہ صوبے کے معدنی وسائل پر بلوچستان کا وسیع تر کنٹرول ہونا چاہیئے جبکہ مزید چھاؤنیاں تعمیر کرنے سے گریز کیا جائے۔ (نیویارک ٹائمز، 2 اپریل 2006)۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا آیا ہے کہ ایسے مطالبات مرکز کو قبول نہیں تھے چنانچہ بلوچوں نے ان کے بقول بلوچستان کے معدنی وسائل کا استحصال کرنے والے پنجابیوں کے غلبے والی اسلام آباد کی فوجی حکومت کے خلاف مسلح مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ یوں مسلح تصادم اور جھڑپوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

15 دسمبر 2005ء کو بلوچستان میں پرواز کے دوران ہیلی کاپٹر پر فائرنگ سے فرنٹیئر کور کے سربراہ میجر جنرل شجاعت ضمیر ڈار اور ان کے نائب بریگیڈیئر سلیم نواز زخمی ہو گئے تاہم ہیلی کاپٹر بحفاظت اتار لیا گیا۔ اس کے بعد پاکستانی فوج نے مزاحمتی تحریک کے بڑے ذمہ داروں کے خلاف آپریشن شروع کر دیا اور اس کے نتیجے میں 26 اگست 2006ء کو نواب اکبر بگٹی جاں بحق ہو گئے۔ (نیویارک ٹائمز، 28 اگست 2006ء)۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے دعویٰ کیا کہ مرحوم اکبر بگٹی مشرف پر راکٹ حملے سمیت کئی بم دھماکوں میں ملوث تھے۔ یہ الزام لگایا گیا کہ بلوچ مزاحمت کاروں کے ہاتھوں کم از کم 60 پاکستانی فوجی اور 7 افسر جاں بحق ہو گئے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے الزام لگایا کہ بلوچستان میں شورش کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہے جو باغیوں کو امداد فراہم کرتا ہے۔ دوسری طرف بلوچ باغیوں نے مشرف حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے صوبے میں فوجی

کارروائیاں کیں جن کے نتیجے میں سینکڑوں افراد موت کا شکار ہوئے۔

پاکستانی طالبان

اس دور کی ایک دلچسپ پیشرفت ڈیورنڈ لائن کے اس طرف پاکستان کے اندر طالبان کی ایک خودمختار تحریک کا آغاز تھی۔ اس تحریک کی قیادت عسکریت پسندوں کی نئی نسل کے ہاتھ میں تھی جن میں سے بیت اللہ محسود کا نام زیادہ اہم تھا۔ بیت اللہ محسود کے بطور جنونی اسلام پسند ابھرنے کی کہانی بھی ان ہزاروں نوجوانوں سے مختلف نہیں جو نوعمری میں جہادی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ مسلح گروپوں میں بیت اللہ محسود کی بھرتی 1989 میں افغانستان سے ریڈ آرمی کے انخلا کے بعد ہوئی ہوگی کیونکہ اس کی پیدائش 1974 میں ہوئی اور انخلا کے وقت اس کی عمر صرف 15 سال ہوگی۔ اس نے قبائلی علاقے کے ایک مدرسے میں چند ماہ تک تعلیم حاصل کی اور کئی افراد اور تنظیموں کے اس نقطہء نظر پر ایمان لے آیا کہ عسکریت پسندی کی حمایت والے اسلام کی مخالفت کرنے والوں کا قتل کرنا جائز ہے۔ اس نے افغان طالبان کے سربراہ ملا عمر سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ جہاں ملا عمر بدستور افغان طالبان کا سربراہ رہا وہاں بیت اللہ محسود پاکستانی طالبان کی قیادت سنبھالنے کی پوزیشن میں آ گیا۔ طالبان نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں چوروں کے ہاتھ کاٹنے جبکہ زنا کے مرتکب افراد کو سنگسار کرنے کی سزائیں متعارف کرائیں۔ اس بات کے کچھ شواہد موجود ہیں کہ افغان اور پاکستانی طالبان نے کبھی مل کر کام نہیں کیا اور ملا عمر کی مجموعی قیادت صرف علامتی تھی۔ 2005ء سے 2006ء کے دوران طالبان اور پاکستان کے اندر ان کے ہم عقیدہ اتحادیوں نے شیعوں، عیسائیوں، احمدیوں اور غیر ملکیوں کو نشانہ بنایا جس سے کئی افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ قبائلی علاقوں سے باہر پاکستانی قصبوں اور شہروں میں دہشت گردی کے واقعات میں اضافے کے بعد مشرف حکومت نے طالبان اور القاعدہ کے ٹھکانوں کے خلاف آپریشن تیز کر دیا۔

طالبان کے ساتھ تصادم اور جنگ بندی

امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے مارچ 2006ء میں جنوبی ایشیا کا دورہ کیا۔ اگرچہ یہ بات قابل فہم ہے کہ بھارت کو زیادہ توجہ ملی لیکن اس بات کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ کارگل کے تنازعے کے

وقت سابق امریکی صدر کلنٹن کے دورہ پاکستان کی طرح پاکستان سے ذلت آمیز برتاؤ کیا جائے۔ اس بات میں شک نہیں کہ بھارت کے ساتھ ''سٹریٹیجک پارٹنر شپ'' بش کے ذہن میں زیادہ اہمیت کی حامل تھی لیکن انہوں نے 4 مارچ 2006ء کو اسلام آباد میں صدر مشرف کے ساتھ ملاقات میں پاکستان کے ساتھ بھی قریبی تعلقات کی خواہش اور دہشتگردی کے خلاف لڑائی میں پاکستان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس موقع پر کہا کہ:

''جناب صدر (مشرف) اور میں نے وسیع تر اور دیرپا اشتراک کار کے عزم کا اعادہ کیا ہے اور یہ اشتراک کار دہشتگردی کے خلاف جنگ میں قریبی تعاون سے شروع ہوتا ہے۔ صدر مشرف نے 11 ستمبر کے بعد اپنے عوام اور امن کیلئے جراتمندانہ فیصلہ کرتے ہوئے دہشتگردی کے خلاف جنگ میں تعاون پر رضامندی ظاہر کی۔ امریکی عوام آپ کی قیادت کو سراہتے ہیں... جناب صدر... اور میں بھی''۔ (بش، وائٹ ہاؤس آرکائیوز 2006ء)۔

انتہا پسندوں نے اس کا جواب طالبان کے گڑھ میر علی، شمالی وزیرستان میں فوجی قافلے پر حملہ کر کے دیا۔ اس کے ردعمل میں پاکستانی فوج نے ہیلی کاپٹر اور توپخانے سے حملہ کیا۔ ایک ترجمان نے بتایا کہ کارروائی میں کم از کم 49 افراد مارے گئے۔ اس کارروائی کا پس منظر چند روز پہلے کا وہ واقعہ ہے جس میں فوج نے قریبی گاؤں سید گئی میں القاعدہ کے مشتبہ کیمپ پر حملہ کیا۔ اگرچہ افغانستان کی سرحد کے ساتھ پاکستان نے 80 ہزار فوجی تعینات کئے لیکن اس کے باوجود عسکریت پسند زیادہ مشکل کے بغیر سرحد آر پار جاتے ہیں۔ اس کے بعد لڑائی مرکزی شہر میرانشاہ تک پھیل گئی جہاں 500 مسلح قبائلیوں کی بازار میں پیرا ملٹری فورسز سے جھڑپ ہوئی اور سکیورٹی حکام کے مطابق عسکریت پسندوں نے بعض سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرلیا۔ کچھ مارٹر گولے قریبی دکانوں پر بھی گرے۔

فوج کے شعبہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل شوکت سلطان کے مطابق ایک مقامی عالم مولوی عبدالخالق نے پاکستانی فوج کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ اس کارروائی میں میر علی کے علاقے میں 21 جبکہ میرانشاہ میں 25 عسکریت پسند مارے گئے تاہم انہوں نے کہا کہ ہلاکتوں کی تعداد اس سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ کارروائی میں 3 فوجی اہلکار جاں بحق جبکہ 10 زخمی ہوئے۔ ترجمان نے بتایا کہ عسکریت پسندوں نے میرانشاہ میں ایف سی کے اڈے پر

راکٹ باری بھی کی۔مقامی حکام نے بتایا کہ ہیلی کاپٹروں سے بھی دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر بمباری کی گئی۔نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر انٹیلی جنس ذرائع نے بتایا کہ طالبان کے حامیوں کی ہلاکتوں کی تعداد 80 تھی۔اس کے علاوہ فوج نے اس ہوٹل کو بھی تباہ کر دیا جس کی آڑ میں عسکریت پسند فوج پر فائرنگ کر رہے تھے۔

دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ اگلے کئی ماہ تک جاری رہا۔آخر کار ستمبر 2006 میں فریقین کے درمیان ایک جنگ بندی طے پائی۔البتہ فائرنگ کا سلسلہ ایک بار پھر اس وقت شروع ہو گیا جب 30 اکتوبر 2006ء کو قبائلی علاقے ڈمہ ڈولہ کے ایک مدرسے پر پاکستان نے فضائی حملے کا حکم دیا۔اس حملے میں 80 سے زائد افراد ہلاک ہوئے جس میں سے اکثریت کم عمر افراد کی تھی۔فوج نے الزام لگایا کہ جس مدرسے کو کامیابی کے ساتھ نشانہ بنایا گیا وہ دہشت گردی کے کیمپ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔بعد میں انکشاف ہوا کہ مدرسے کو امریکی ڈرون نے نشانہ بنایا۔اس کے ردعمل میں خودکش بمبار نے حملہ کر کے درگئی میں 42 فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔(رامن،2006)۔اگرچہ ڈرون حملے 2004 سے شروع ہو چکے تھے اور ان بغیر پائلٹ کے طیاروں کو ہزاروں میل دور امریکی ریاست نواڈا کے کریچ Creech ائیر فورس بیس سے آپریٹ کیا جا رہا تھا لیکن یہ پتہ چلا کہ یہ طیارے بلوچستان کے شمسی ائیر بیس سے اڑان بھرتے تھے۔(انٹرویو کرسٹائن فیئر)۔ایسی کارروائیوں سے امریکہ اور پاکستان کی فوجوں کے درمیان قریبی خفیہ تعاون کا پتہ چلتا ہے۔تاہم عوامی سطح پر پاکستانی فوج نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ ڈرون حملوں میں کوئی بے گناہ نشانہ بنایا پھر یہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کے مترادف ہے۔

دہشت گردی کے واقعات میں تیزی اور پھیلاؤ

دہشت گردی کے حملوں کی نئی لہر خودکش بمباری کے ہولناک مظہر کے ساتھ ابھری۔2007ء میں 56 خودکش حملے ہوئے جن میں 419 سکیورٹی اہلکار اور 217 سویلین مارے گئے۔ان حملوں میں شدت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ برس صرف 8 خودکش حملے ہوئے اور ان کا نشانہ بھی فوج تھی۔خودکش حملوں میں کئی گنا اضافے کے باوجود حکومت ایک بھی ملزم کے پس منظر کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔(راشد 2008:379)۔2007ء کے آغاز سے

تقریباً ہر روز افغان سرحد کے ساتھ علاقے کے اندر یا وہاں سے پولیس اور سکیورٹی اہلکاروں پر حملوں کی خبریں آتی رہیں۔ 26 جنوری کو اسلام آباد کے ممتاز میریٹ ہوٹل میں ایک خودکش حملہ آور اور ایک سکیورٹی اہلکار ہلاک ہوئے۔ اس ہوٹل میں بھارت کے یوم جمہوریہ کی تقریب ہونا تھا اور بھارتی سفارتکاروں نے اس میں شرکت کرنا تھی۔ بلاشبہ حملہ آور کا ہدف تقریب والی جگہ تھی لیکن دھماکہ پہلے ہی ہو گیا۔ (ڈیلی ٹائمز، 27 جنوری 2007ء)۔ اسلام آباد۔ راولپنڈی کے علاقے میں چھاؤنی نما سکیورٹی انتظامات پر اس وقت سوالیہ نشان لگنے لگا جب پاکستان کے دارالحکومت میں مارچ 2007ء میں سخت گیر بنیاد پرستوں کی سرگرمی میں ایک بغاوت سر اٹھانے لگی۔

لال مسجد کا واقعہ

مشرف حکومت کی ناک کے عین نیچے لال مسجد اسلام آباد میں اسلام پسندی کا سرچشمہ بن کر سامنے آئی۔ یہ مسجد افغان جہاد میں حصہ لینے والے اور اسامہ بن لادن کے زبردست مداح عبداللہ غازی اور ان کے دو بیٹوں عبدالعزیز غازی اور عبدالرشید غازی نے بنائی اور انہوں نے طالبان ٹائپ کا اسلام پاکستان پر مسلط کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ (حسین، 2010: 111-105)۔ 28 مارچ کو لال مسجد سے ملحقہ مدرسے جامعہ حفصہ سے تعلق رکھنے والی مسلح نقاب پوش خواتین.... جنہیں عرف عام میں لال بریگیڈ بھی کہا جاتا تھا۔ نے قریبی آبادی پر دھاوا بول کر ایک خاتون میڈم اور اس کے اہل خانہ کو قحبہ خانہ چلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ انہوں نے بزور طاقت میڈم سے یہ اعتراف کرایا کہ وہ مبینہ طور پر جسم فروشی کے دھندے میں ملوث تھی۔ (دی نیوز انٹرنیشنل، 29 مارچ 2007ء)۔ ٹھیک اسی روز صوبہ سرحد کے ضلع ٹانک میں قبائلی عسکریت پسندوں نے پہلے بم دھماکے کئے اور سکیورٹی فورسز کو نشانہ بنایا۔ ان حملوں میں ایک ایف سی اہلکار سمیت 25 افراد مارے گئے۔ (ایضاً)۔ 6 اپریل کو اسلام پسندوں نے مسجد کے اندر ایک شرعی عدالت قائم کی۔ مسجد کے سب سے بڑے عالم مولانا عبدالعزیز نے خبردار کیا کہ حکومت نے اگر شرعی عدالت کے معاملات میں مداخلت کی کوشش کی تو ہزاروں خودکش حملے کئے جائیں گے۔ 9 اپریل کو شرعی عدالت نے وزیر مملکت برائے سیاحت نیلوفر بختار کے خلاف فتویٰ جاری کیا جس میں انہیں فرانس میں پیرا گلائیڈنگ کے جمپ میں غیر ملکی مرد انسٹرکٹر کے ساتھ فوٹو شائع ہونے پر

گناہ کا مرتکب قرار دیا گیا۔ (احمد، 16 جولائی 2007ء)۔ صورتحال اس وقت مزید بگڑ گئی جب 28 اپریل کو وفاقی وزیر داخلہ آفتاب احمد شیر پاؤ پر ان کے آبائی علاقے چارسدہ پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی گئی۔ اگر چہ وہ خود محفوظ رہے لیکن دیگر 28 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ (دی نیوز 29 اپریل 2007ء)۔ 23 جون کو نام نہاد لال بریگیڈ نے اسلام آباد میں ایک چینی مساج سنٹر پر دھاوا بول دیا اور اس کے مالک چینی جوڑے کے ساتھ 5 چینی اور 2 پاکستانی خواتین ورکروں کو اغواء کر لیا۔ بعد ازاں ان کو چھوڑ دیا گیا۔

پاکستان کے سدابہار دوست ملک چین سے تعلق رکھنے والے شہریوں پر ایسے حملے مشرف کیلئے شرمساری کا باعث تھے۔ واضح رہے کہ چین کے صوبہ سنکیانگ کے یغور مسلمانوں میں بڑھتی انتہا پسندی اور دہشت گردی چینی حکومت کیلئے تشویش کا باعث رہی ہے۔ مشرف نے چینی مجاہدین کی پاکستان میں موجودگی روکنے کیلئے کئی اقدامات کئے بلکہ انہوں نے دورہ چین میں یغور مسلمانوں سے خود جا کر خطاب کیا اور کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ بدستور چین کے وفادار شہری رہیں۔ (مراد یہ کہ علیحدگی پسندی چھوڑ دیں)۔ تاہم اس کے باوجود یغور مسلمانوں نے پاکستان میں جہادی تنظیموں کے قائم کردہ تربیتی کیمپوں میں تربیت لینا جاری رکھی اور اس کام پر چینی حکومت کو سخت اعتراض تھا۔ (فاروقی، 2008ء: 3-1)۔ پاکستان میں ہونے والے واقعات پر غیر معمولی تشویش کا اظہار اس وقت سامنے آیا جب چین کے وزیر سکیورٹی ژویون گینگ نے بیجنگ کے دورے پر آئے وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ سے کہا کہ ''ہمیں امید ہے کہ پاکستان چینی باشندوں اور اداروں پر دہشت گردی کے حملوں کے معاملے کا نوٹس لے گا اور مجرموں کو سخت سزائیں دی جائیں گی''۔ (شنگھائی ڈیلی، 27 جون 2007ء)۔ معاملات نے اس وقت انتہائی شکل اختیار کر لی جب 8 جولائی کو نامعلوم افراد نے پشاور کے قریب 3 چینی ورکروں کو ہلاک کر دیا جبکہ ایک چینی ورکر زخمی ہوا۔ اس کے بارے میں پاکستانی حکام نے کہا کہ یہ لال مسجد کے جاری محاصرے کا جواب ہے۔ (دی نیوز، 9 جولائی 2007ء)۔ ٹھیک اسی روز لال مسجد کے اندر سے ہونے والی فائرنگ سے باہر تعینات فوجی کرنل ہارون اسلم جاں بحق ہو گئے۔

اس موقع پر مشرف نے محسوس کیا کہ سخت اور بے رحم کارروائی ناگزیر ہو چکی ہے۔ چنانچہ سکیورٹی فورسز کو پوری طاقت سے آپریشن ''سن رائز'' شروع کرنے کا حکم دیا گیا۔ شروع میں اسے

آپریشن ''سائیلنس'' کا نام دیا گیا تھا۔ (ڈان، 12 جولائی 2007ء)۔ پہلے پہلے حکومت امید کر رہی تھی کہ حملہ چھوٹے پیمانے پر کیا جائے گا لیکن مسجد کے اندر سے ہونے والی زبردست مزاحمت نے ایسا ناممکن بنا دیا۔ یوں جیسے ہی آپریشن ''سن رائز'' شروع ہوا، اس نے ایک بڑی فوجی کارروائی کی شکل اختیار کر لی۔ جہاں مسجد کے اندر خوف کا شکار کئی افراد نے خوفزدہ ہو کر ہتھیار پھینکنے یا فرار ہونے کی کوشش کی وہاں کئی سو بنیاد پرست افراد نے لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سکیورٹی فورسز نے بڑی کارروائی 10 جولائی کو شروع کی۔ اس آپریشن میں 10 فوجیوں سمیت 150 افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں ایک فوجی افسر بھی شامل تھا۔ البتہ کئی حلقوں نے حکومتی اعداد و شمار سے عدم اتفاق کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ مسجد کے اندر کئی مزید افراد بھی مارے گئے۔

امریکہ نے لال مسجد آپریشن کی حمایت کی جبکہ القاعدہ کے دوسرے بڑے رہنما ایمن الظواہری نے ایک ویڈیو پیغام جاری کیا جس میں انہوں نے نوجوانوں سے کہا کہ وہ اسلام پسندوں کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لئے مشرف کے خلاف جہاد میں شامل ہو جائیں۔ لال مسجد آپریشن کا جواب جلد ہی ملا جب 10 جولائی کو صوبہ سرحد (نام تبدیل ہونے سے پہلے) یکے بعد دیگرے بم دھماکوں سے لرز اٹھا۔ کم از کم 49 افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ ان میں 11 سکیورٹی اہلکار تھے۔ (دی نیوز، 16 جولائی 2007ء)۔ اس کے بعد 19 جولائی کو حب، ہنگو اور کوہاٹ میں حملے کئے گئے۔ جن میں مزید 52 افراد ہلاک اور 127 زخمی ہوئے۔ اس علاقے میں کام کرنے والے چینی انجینئرز دہشت گردوں کا ہدف تھے لیکن ان کی جگہ سکیورٹی اہلکار اور خواتین سمیت دیگر عام افراد نشانہ بنے۔ (دی نیوز، 20 جولائی 2007)۔

دہشت گردی کے حملوں کی شدت برقرار

2 اگست کو سرگودھا میں پولیس نے ایک مشتبہ خودکش بمبار کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب اس کے جسم کے ساتھ بندھا دھماکہ خیز مواد پھٹ نہ سکا۔ وہ ایک پولیس ٹریننگ سنٹر میں جا گھسا اور مرنے سے پہلے ایک اہلکار کو ہلاک کر دیا۔ 4 ستمبر کو راولپنڈی کینٹ میں خودکش بم حملے میں 25 افراد ہلاک اور 66 زخمی ہو گئے۔ مرنے والوں میں یونیفارم میں ملبوس اہلکار اور سویلین افراد دونوں شامل تھے جو ایک بس میں سوار ہو کر ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ (دی نیوز انٹرنیشنل، 5 ستمبر

2007ء)۔13 ستمبر کو تربیلا ڈیم کے قریب بظاہر خودکش حملے میں 25 آف ڈیوٹی کمانڈوز اپنے میس کے پاس ہلاک ہو گئے۔ مرنے والوں میں ایس ایس جی کی ''کرار'' کمپنی کے کمانڈوز بھی شامل تھے جن کے بارے میں خیال تھا کہ انہوں نے لال مسجد کے آپریشن میں حصہ لیا تھا۔

بے نظیر بھٹو پر پہلا حملہ

اس دوران امریکہ پس منظر میں رہ کر مشرف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان ایک ڈیل کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس کے تحت بے نظیر کی وطن واپسی، ان کے اور آصف زرداری کے خلاف مقدمات واپس لینا اور طے شدہ انتخابی نتائج کے تحت انہیں وزیراعظم بنانا ممکن ہوتا اور جنرل مشرف بدستور صدر رہتے۔ مشرف اور بے نظیر کی دبئی میں خفیہ ملاقات سمیت یہ مذاکرات بہ احسن آگے بڑھے۔ مشرف نے بے نظیر کو خبردار کیا کہ وہ پاکستان نہ آئیں کیونکہ وہاں ان کی زندگی کو خطرہ ہے۔ لیکن انہوں نے وارننگ نظرانداز کر دی اور امریکہ سے اپنی امیدیں وابستہ کر لیں کہ وہ مشرف سے کہہ کر ان کی سکیورٹی یقینی بنائے گا۔ طویل جلاوطنی کے بعد بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر کو کراچی واپس پہنچیں جہاں ان کا عوام کی بہت بڑی تعداد نے پرجوش استقبال کیا۔ ائیرپورٹ سے مزار قائد تک جلوس کئی گھنٹے میں پہنچا۔ نصف شب کے فوراً بعد بے نظیر اور ان کے قافلے پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑی۔ غالباً یہ 2 خودکش بمبار تھے۔ ابتدائی رپورٹوں کے مطابق حملے میں 125 افراد ہلاک اور 500 زخمی ہوئے۔ البتہ بم پروف ٹرک میں سوار ہونے کی وجہ سے بے نظیر اور ان کے قریبی ساتھ محفوظ رہے۔ (دی نیوز، 19 اکتوبر 2007)۔ بعدازاں بے نظیر بھٹو نے دعویٰ کیا کہ 179 افراد ہلاک ہوئے جن میں ان کی جماعت کے 50 رضا کار 'جانثاران بے نظیر' بھی شامل تھے۔ (بھٹو، 2008ء پی:12)۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا دہشت گردی کا خوفناک ترین واقعہ تھا۔ بے نظیر بھٹو نے انکشاف کیا (میں نے خود ٹی وی پر انہیں سنا، مصنف) کہ انہوں نے صدر مشرف کو خط لکھا کہ انہیں قاتلانہ حملے کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور ان کے قتل کی سازش میں ان کی حکومت کے ہمدرد شامل تھے۔

دہشت گردی کی لہر ابھی تھمنے والی نہیں تھی۔ 30 اکتوبر کو جنرل پرویز مشرف کے کیمپ آفس سے بمشکل ایک میل دور راولپنڈی کے ہائی سکیورٹی زون میں ایک خودکش بمبار پولیس چیک

پوسٹ سے جا ٹکرایا۔ (دی نیوز، 31 اکتوبر، 2007ء)۔ میں ان دنوں اسلام آباد میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شریک تھا۔ یکم نومبر کو سرگودھا جہاں پی اے ایف کا ریجنل ہیڈکوارٹر واقع ہے میں ایک اور خودکش حملہ آور نے خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ (دی نیوز، 2 نومبر 2007ء)۔ 24 نومبر کو راولپنڈی میں فوج کے 2 مختلف اہداف پر الگ الگ حملوں میں 32 اموات ہوئیں۔ اس بار بالخصوص آئی ایس آئی کو نشانہ بنایا گیا۔ (دی نیوز، 25 نومبر)۔ مزید حملے 9 دسمبر کو ہوئے جب 3 پولیس اہلکاروں، 2 بچوں سمیت 10 افراد سوات کے علاقے مٹہ میں ہلاک ہو گئے۔ اگلے روز سرگودھا میں ایئرفورس کے ملازمین کے بچوں کو سکول جانے والی بس کو نشانہ بنایا گیا۔ (دی نیوز، 11 دسمبر 2007ء)۔ 13 دسمبر کو کوئٹہ میں آرمی چیک پوائنٹ کے قریب خودکش بمباری میں فوج کے 3 اہلکاروں سمیت 7 افراد موت کا شکار ہوئے۔ (دی نیوز، 14 دسمبر 2007ء)۔ 15 دسمبر کو صوبہ سرحد کے شہر نوشہرہ میں ایک خودکش بمبار نے بارود سے بھری موٹر سائیکل فوجی چوکی سے ٹکرا دی۔ جس سے 5 افراد ہلاک اور 11 دیگر زخمی ہوئے۔ (دی نیوز)۔ 17 دسمبر کو کوہاٹ میں خودکش حملے میں فوج کی فٹبال کی مقامی ٹیم کے کھلاڑیوں کو نشانہ بنایا گیا جس میں 12 سکیورٹی اہلکار ہلاک اور 5 زخمی ہوئے۔ (ایضاً)۔ 21 دسمبر کو آفتاب احمد شیر پاؤ کو ایک بار پھر نشانہ بنایا گیا۔ خودکش بم دھماکہ ضلع چارسدہ کی جامع مسجد میں ہوا جس سے 57 افراد ہلاک ہوئے۔ آفتاب شیر پاؤ خوش قسمتی سے محفوظ رہے تاہم ان کا چھوٹا بیٹا مصطفیٰ خان شیر پاؤ زخمی ہو گیا۔ (دی نیوز، 22 دسمبر)۔ 23 دسمبر کو ضلع سوات کے مرکزی شہر مینگورہ میں خودکش دھماکے میں 4 سکیورٹی اہلکاروں سمیت 23 افراد مارے گئے۔ (ایضاً)۔

خونیں تشدد کا پس منظر دسمبر 2007ء میں تحریک طالبان پاکستان کا قیام تھا۔ ڈیورنڈ لائن پر پاکستان کی طرف طالبان کے 13 گروپوں نے بیت اللہ محسود کی قیادت میں پاکستانی ریاست کے خلاف مزاحمت، شریعت کا اپنی تعریف کے مطابق نفاذ اور افغانستان میں امریکی اور نیٹو اتحادیوں کو سخت مزاحمت سے دوچار کرنے کا عزم کیا۔ دہشت گردی کی اس لعنت کے آلہ کار غیر ریاستی عناصر تھے۔

مشرف کے خلاف وکلاء تحریک

جس وقت اسلام پسندوں نے مشرف حکومت بالخصوص فوج کے خلاف حملوں میں تیزی

لائی کیونکہ فوج القاعدہ اور طالبان کے خلاف آپریشن میں مصروف تھی ٹھیک اس وقت مارچ 2007 میں جمہوریت کی بحالی کیلئے ایک پرامن اور مقبول تحریک نے شدت اختیار کی۔ پاکستان کے زیادہ تر معطل رہنے والے اور بھاری ترامیم کے حامل 1973ء کے آئین کے مطابق ہر 5 سال بعد عام انتخابات کرانا ضروری ہے۔ اکتوبر 1999 میں نواز شریف حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد جنرل پرویز مشرف نے چیف ایگزیکٹو کا منصب سنبھالا۔ 20 جون 2001 کو وہ خود صدر پاکستان بن بیٹھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اقدامات کو جائز قرار دینے کے کئی اقدامات کئے۔ ان میں سے اکتوبر 2002ء میں انتخابات کرانا بھی تھا۔ دھاندلی، حلقوں کی نئی حد بندی اور ڈرانے دھمکانے سمیت مشرف کی حامی مسلم لیگ (ق) کی کامیابی کیلئے تمام ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔ یورپی یونین کے مبصرین نے انتخابی عمل کو خامیوں سے بھرپور قرار دیا۔ (ڈیلی ٹائمز، 13 اکتوبر 2002)۔ مسلم لیگ (ق) نے دائیں بازو کی بعض جماعتوں اور آزاد امیدواروں کی مدد سے مخلوط حکومت قائم کرلی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ مشرف نے وقت گزرنے کے ساتھ اپنی شناخت اعتدال پسند اور ترقی پسند مسلم لیڈر کے طور پر بنالی تھی۔ اس کے علاوہ کئی بین الاقوامی مالیاتی اور اقتصادی اداروں کے مطابق اگرچہ پاکستان کی معاشی صورتحال میں بہتری آئی تاہم مہنگائی، بیروزگاری اور بدترین غربت پاکستان کی ایک چوتھائی آبادی کا بدستور مقدر بنی رہی جو سرکاری طور پر خط غربت سے نیچے رہنے والی آبادی قرار دی گئی۔ (احمد، یکم دسمبر 2007ء)۔

بہر حال اعلان کے مطابق نئے انتخابات 2007 میں ہونا تھے اور سال کے آغاز پر صاف اور شفاف انتخابات کیلئے آوازیں اٹھنا شروع ہوگئی تھیں۔ کئی سیکولر اور لبرل حلقے جو اسلام پسندوں کے مقابلے میں مشرف کی حمایت کر رہے تھے وہ اس وقت ان کے خلاف ہو گئے جب جنرل مشرف نے 2007ء کے موسم بہار میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو غیر فعال قرار دے دیا (غیر فعال کا مطلب عہدے سے عملاً برطرف کرنا ہے) چیف جسٹس پر اختیارات کے غلط استعمال کا الزام لگایا گیا۔ عام خیال یہ پایا جاتا ہے کیہ چیف جسٹس نے صدر مشرف سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ وردی میں صدارتی الیکشن نہیں لڑ سکتے اور یہ کہ صدارتی انتخابات 2007ء کے اختتام سے پہلے کرانا ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ چیف جسٹس نے کئی ایسے شہریوں، اکثریت صحافیوں کی تھی، کے حبس بے جا کے مقدمات کا از خود نوٹس لیا۔ اس کے ساتھ سکیورٹی فورسز کی طرف سے اٹھائے

گئے سیاسی کارکنوں کے کیس سنے اور قرار دیا کہ ایسے افراد کو عدالتوں میں پیش کیا جائے۔ (دی نیوز، 17 مارچ 2007ء)۔

چیف جسٹس افتخار چودھری کو ہٹانے کے نتیجے میں احتجاجی مارچوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں زیادہ تر وکلاء اور سیاسی کارکن شامل ہوئے۔ (احمد، 2007ء: زیدی، 2008)۔ پولیس اور سکیورٹی ایجنسیوں کے پر تشدد جواب کے باوجود عدالتوں کی حدود میں مظاہرے اور احتجاجی پروگرام جاری رہے۔ سیاسی قیادت کی عدم موجودگی میں سول سوسائٹی نے آمریت کے خلاف احتجاج کی قیادت سنبھال لی۔ بین الاقوامی برادری کی طرف سے حمایت اور یکجہتی کے پیغامات سے یہ جدوجہد آگے بڑھانے میں مدد ملی۔ چنانچہ 10 جولائی کو سپریم کورٹ کے ایک بنچ نے جسٹس چودھری کو دوبارہ چیف جسٹس بحال کر دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مشرف اور افتخار چودھری کے درمیان کشمکش ختم ہو گئی بلکہ جسٹس افتخار نے مشرف حکومت کے خلاف جوڈیشل ایکٹوازم کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اسی اثناء میں سول سوسائٹی کے رہنماؤں اور اپوزیشن نے صدر مشرف سے مطالبہ شروع کر دیا کہ وہ استعفیٰ دیں اور صاف اور شفاف انتخابات کرائیں۔ پیشگی اقدام کے طور پر اپنی صدارت کو لاحق کسی خطرے کا تدارک کرنے کیلئے جنرل مشرف نے 6 اکتوبر کو خود کو موجودہ اسمبلیوں کی میعاد ختم ہونے سے پہلے دوبارہ صدر منتخب کرا لیا۔ بہر حال اسی دوران الیکشن کمیشن نے اعلان کر دیا کہ عام انتخابات 8 جنوری 2008ء کو ہوں گے۔

سیاسی بحران میں اس وقت مزید شدت آ گئی جب جلا وطن نواز شریف نے امریکہ اور سعودی عرب کے شدید دباؤ کے پیش نظر 27 نومبر کو پاکستان واپسی کا اعلان کر دیا۔ چند ماہ قبل جب انہوں نے اپنے بھائی شہباز شریف کے ساتھ وطن واپسی کا فیصلہ کیا تو حکومت کی طرف سے انہیں بتایا گیا کہ انہیں ہرگز خوش آمدید نہیں کہا جائے گا۔ نواز شریف اور بے نظیر کی موجودگی میں انتخابی مہم میں تیزی آنے لگی اور بڑے بڑے جلسے ہونے لگے۔ 28 نومبر کو پرویز مشرف نے آرمی چیف کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور جنرل اشفاق پرویز کیانی ان کی جگہ فوج کے سربراہ مقرر ہوئے۔ جنرل کیانی قبل ازیں کور کمانڈر راولپنڈی اور ڈی جی آئی ایس آئی کے طاقتور عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ میڈیا میں ان کا جو تاثر سامنے آیا وہ خاموش طبع اور ایسے پیشہ ور فوجی کا تھا جو تشہیر سے دور بھاگتا ہے۔ یہ خوبیاں ان کے پیشرو جنرل مشرف سے بالکل الٹ تھیں۔

جنرل اشفاق پرویز کیانی کے جاری کردہ ڈائریکٹوز

آرمی چیف بننے کے بعد فوج کیلئے جاری کردہ اولین ہدایت ناموں میں یہ ڈائریکٹو شامل تھا کہ فوجی افسر سیاستدانوں سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ انہیں واضح کیا گیا کہ سیاست میں ان کا کوئی کردار نہیں اور فوجیوں کو صرف اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے۔ اسی پالیسی کے تحت جنرل کیانی نے فوجی حکام سے کہا کہ وہ کسی سیاستدان کو جی ایچ کیو میں طلب نہ کریں۔ ہدایت کی خلاف ورزی کرنے والوں سے باز پرس کی جائے گی۔ (دی نیوز، 14 جنوری 2008ء)۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم کام جنرل کیانی نے یہ کیا کہ 11 فروری 2008 کو ایک حکمنامے میں انہوں نے سویلین اداروں میں تعینات فوجی افسروں کو واپس بلا لیا۔ فوج کے شعبہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس نے پریس کو بتایا کہ: ''اس وقت سول محکموں یں 300 سے زائد فوجی افسر کام کر رہے ہیں اور ان کی اکثریت کو فوری طور پر جنرل ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے کا حکم دیا گیا ہے''۔ (ڈان، 12 فروری 2008ء)۔

اس فیصلے کی جنرل کیانی کی زیر صدارت 7 فروری 2008ء کو کور کمانڈرز کانفرنس میں توثیق کی گئی۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ جنرل کیانی نے جنرل (ر) پرویز مشرف کی چیف جسٹس افتخار چودھری کے ساتھ کھینچا تانی سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ جنرل کیانی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ذاتی یا رشتہ داروں کے فائدے کیلئے اپنے منصب کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ (یوسفزئی، 28 نومبر 2007ء)۔ تاہم بعض دیگر ذرائع سمجھتے ہیں کہ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے سیاسی جوڑ توڑ میں لازمی طور پر حصہ لیا ہوگا جس کیلئے آئی ایس آئی بدنام ہے۔ اس کے علاوہ ان کے طالبان، لشکر طیبہ اور جیش محمد جیسی پنجابی انتہا پسند تنظیموں کے ساتھ بھی ضرور رابطے ہوں گے اور اس تناظر میں ایسی تنظیموں کے خلاف ان کا برتاؤ بھی سخت نہیں ہوگا۔

بہر حال نہ صرف سیاستدانوں بلکہ سول سرونٹس کے اندر بھی فوج کے خلاف ناراضگی بڑھ رہی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد سول بیوروکریسی نے فوج کے ساتھ مل کر مقتدرہ قائم کی جو مختار کل تھی جبکہ سیاستدانوں کا کردار محض کٹھ پتلیوں کا سا تھا۔ اس گٹھ جوڑ میں ضیاء الحق دور میں تبدیلی آئی اور فوج کو زیادہ سے زیادہ کردار دیا گیا۔ اکبر ایس احمد جو پروفیسر بننے سے قبل خود سول بیوروکریٹ

تھے نے میرے (مصنف) ساتھ ایک انٹرویو میں تفصیلی طور پر بتایا کہ کس طرح 1980 کے عشرے میں بہتر تعلیم یافتہ سول بیوروکریٹس کو فوج نے سائیڈ لائن لگا دیا۔ فوج کی اس مداخلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ برسوں تک انتظامیہ کا عمومی معیار روبہ زوال رہا۔ کیونکہ فوج کو سول معاملات چلانے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ پنجاب کے سابق گورنر شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ ضیاءالحق کے دور سے آگے تک صدر مملکت اور آرمی چیف ہی فیصلہ سازی کے عمل اور اقتدار کے ڈھانچے کے کرتا دھرتا رہے۔ وزیر اعظم اور دیگر وزراء کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر دفاعی اخراجات کے معاملے میں صدر اور آرمی چیف ہی فیصلے کرتے ہیں جبکہ وزرائے دفاع کا کوئی اہم کردار نہیں ہوتا۔ سویلین معاملات میں فوج کی مداخلت پر صوبہ پنجاب میں بھی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں جہاں ماضی میں خاکی وردی والوں کو زبردست مقبولیت ملتی رہی۔ یوں پنجاب کے ایسے بڑے شہر جہاں سے عموماً سول سرونٹس کی بھرتی ہوتی تھی میں فوج کی مقبولیت کم ہوتی چلی گئی۔ اس کے برعکس فوجی افسروں کا سماجی پس منظر دیہی ہے یا پھر وہ پنجاب کے چھوٹے شہروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے 2000 سے 2009 کے دوران پنجاب کے کئی طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے بات چیت کا موقع ملا جس میں پنجابی اشرافیہ نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ ایسے حالات میں فوج کو سماجی ساکھ بہتر بنانے کی نہایت ضرورت تھی۔ اس تناظر میں جنرل کیانی کی طرف سے سویلین اداروں سے فوجی افسروں کو واپس بلانے کا فیصلہ دوررس اثرات کا حامل تھا۔

بے نظیر بھٹو کا قتل

جہاں ایک طرف سکیورٹی اور فوجی اہلکاروں پر پے در پے حملوں کا سلسلہ جاری رہا وہاں دوسری جانب بے نظیر بھٹو 8 جنوری کو عام انتخابات کے سلسلے میں ووٹروں کے جلسوں سے بلاتوقف خطاب کر رہی تھیں۔ 27 دسمبر کو راولپنڈی میں ایک عوامی جلسے سے خطاب کے فوراً بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔ (دی نیوز، 28 دسمبر 2007ء)۔ اس بم حملے میں پیپلز پارٹی کے 5 رضا کار سکیورٹی کارکنوں سمیت 20 دیگر افراد بھی مارے گئے۔ محترمہ کے قاتلوں کے بارے میں سازشی نظریات سے بھرپور تلخ تنازعہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہ کہ آیا بے نظیر کی موت قاتلوں/ قاتل کی فائرنگ سے ہوئی یا بم دھماکے سے ہوئی۔

حکومت نے دعویٰ کیا کہ اس نے ایک ٹیلی فون گفتگو پکڑی ہے جس میں القاعدہ کا لیڈر، بیت اللہ محسود اور ایک مذہبی عالم ایک دوسرے کو بے نظیر کی موت اور حملے میں حصہ لینے والوں کو مبارکباد دے رہے تھے۔ (احمد، 31 دسمبر 2007ء)۔ بے نظیر بھٹو نے (اقتدار ملنے پر) امریکہ کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں قریبی تعاون کا وعدہ کیا تھا بلکہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے پوچھ گچھ کیلئے ان تک رسائی پر بھی آمادگی ظاہر کی تھی۔ القاعدہ کی طرف سے جاری بیان میں بے نظیر کی موت کو ''پاکستان میں امریکہ کے انتہائی قیمتی اثاثے کا خاتمہ'' قرار دیا گیا تاہم بیت اللہ محسود کے ترجمان نے اس بات کی تردید کی کہ ان کا بے نظیر پر حملے سے کوئی تعلق ہے۔ (احمد، 31 دسمبر 2007ء)۔ بم دھماکوں اور فائرنگ میں کون ملوث تھا اس کی تحقیقات کو بعد ازاں رونما ہونے والی بے قاعدگیوں سے دھچکا لگا۔ آصف زرداری اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی سربراہی میں مارچ 2008ء کو اقتدار سنبھالنے والی حکومت نے قتل کی تحقیقات کیلئے سکاٹ لینڈ یارڈ سے مدد مانگی۔ جس نے تحقیقات کے بعد نتیجہ یہ نکالا کہ دھماکے بعد گاڑی کی چھت سے سر ٹکرانے اور کھوپڑی چٹخنے کے باعث محترمہ کی موت ہوئی۔ برطانوی ماہرین یہ پتہ چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے کہ موت فائرنگ کے بعد گرنے سے ہوئی یا بم دھماکوں سے لگنے والے جھٹکوں نے جان لی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بے نظیر بھٹو کا پوسٹمارٹم نہیں کرایا گیا کیونکہ ان کے شوہر آصف زرداری نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ اقوام متحدہ کے ایک تحقیقاتی کمیشن نے سکیورٹی کی خامیوں، طالبان کی دھمکیوں، بعض عہدیداروں اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے عجیب رویوں سمیت کئی مشکوک حالات کی نشاندہی کی لیکن اس نے بھی واضح طور پر یہ نہیں بتایا کہ دراصل قاتل تھا کون؟۔ البتہ اس نے رپورٹ میں کہا کہ پولیس نے جان بوجھ کر بے نظیر کے قتل کی مؤثر تفتیش نہیں کی۔ (اقوام متحدہ کا انکوائری کمیشن، 2010)۔

کمیشن نے قرار دیا کہ القاعدہ کے پاس محترمہ کے قتل کا حکم دینے کیلئے ان کی مغربی قسم کی جمہوریت، امریکہ کی طرف جھکاؤ اور جہاد اور دہشت گردی کی مخالفت سمیت کئی دیگر ٹھوس جواز موجود تھے۔ ایسی ہی جارحانہ منطق طالبان کی بھی تھی جو جدید نظریات کی حامل خاتون کو اپنے انتہائی متعصبانہ نقطۂ نظر سے متصادم سمجھتے تھے۔ رپورٹ میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو بھی موردالزام ٹھہرایا گیا کیونکہ بے نظیر بھٹو اکثر اپنے اخباری مضامین میں آئی ایس آئی کو رگیدتی رہتی تھیں اور

اس عزم کا اظہار کرتی تھیں کہ وہ برسر اقتدار آ کر فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو سویلین حکومت کے کنٹرول میں لائیں گی۔ انہوں نے مرنے سے پہلے الزام لگایا تھا کہ آئی ایس آئی کے سابق چیف جنرل (ر) حمید گل، آئی بی کے سابق سربراہ اور آئی ایس آئی کے افسر بریگیڈیئر اعجاز شاہ ریٹائر ہونے کے باوجود ان کے قتل کیلئے انتہا پسندوں سے رابطے میں ہیں۔ (اقوام متحدہ انکوائری کمیشن 2010ء، 53-45)۔ کمیشن کی تحقیقات میں ایک دلچسپ پہلو فرقہ واریت کا بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی والدہ اور شوہر شیعہ ہیں اور خود ان کے بارے میں بھی اہل تشیع ہونے کا شبہ تھا۔ اس لئے فرقہ وارانہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (ایضاً، 50-49)۔

پاکستان کی سازشوں کی ہر لمحہ سرسراتی منڈی میں یہ بات کافی اہم تھی کیونکہ بے نظیر بھٹو (2008ء بی، 54) اور ان کی بھتیجی فاطمہ بھٹو (2010ء، 502) نے بلا خوف تردید اپنی کتابوں میں کہا کہ وہ سنی العقیدہ مسلمان ہیں۔ سینئر سیاستدان اور بے نظیر بھٹو کی قریبی ساتھی سیدہ عابدہ حسین جو معروف شیعہ خاندان سے ہیں نے 2010ء میں میرے ساتھ ایک طویل گفتگو میں مجھے بتایا کہ بے نظیر نے ان کے سامنے برملا اعتراف کیا تھا کہ وہ سنی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ محترمہ جب دبئی میں مقیم تھیں تو وہ باقاعدگی کے ساتھ سنی مسجد میں بچوں کے ساتھ نماز پڑھنے جاتی تھیں۔ سچ کچھ بھی تھا لیکن ان سے پاکستان میں فرقہ وارانہ پولرائزیشن کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ اس سے پہلے 2 سربراہان حکومت سکندر مرزا اور جنرل یحییٰ خان شیعہ تھے اور اس فرقے سے تعلق رکھنے والے کئی افراد اہم وزارتوں، فوجی اور سول عہدوں پر فائز رہے۔

باب15

جمہوریت کو مراجعت اور دہشت گردی کا پھیلاؤ

2008ء کے عام انتخابات انتہائی آتش فشانی اور غم و غصے کے ماحول میں ہوئے، خصوصاً سندھ میں صورتحال دھماکہ خیز تھی۔ اندرون سندھ میں مہاجروں کی دکانوں اور کاروبار پر حملے کئے گئے اور جانی نقصان بھی ہوا۔ چنانچہ فوج نے موقع پر گولی مارنے کا حکم دے دیا۔ آصف زرداری نے عوام سے پرامن رہنے کی اپیل کرتے ہوئے بے گناہ افراد پر حملوں کی مذمت کی اور پرتشدد واقعات پر افسوس کا اظہار کیا۔ جنرل کیانی نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ انتخابی عمل میں فوج کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ کم از کم جنرل ضیاءالحق کے دور سے آئی ایس آئی انتخابات میں جوڑ توڑ میں ملوث رہی اور اس کی ''ریاست کے اندر ریاست'' کے طور پر ساکھ کو پاکستان کے سیاسی ماحول میں مقبول سیاسی استعارے کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ کیانی نے واضح کہا کہ صاف اور شفاف الیکشن کرانا صرف اور صرف الیکشن کمیشن کی ذمہ داری ہے۔ اور فوج کا کام امن وامان برقرار رکھنے کیلئے سول انتظامیہ کی مدد کرنا ہے۔ (ڈان، 12 فروری 2008ء)۔ اگر 27 دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو قتل نہ ہوتیں تو محترمہ اور مشرف کے درمیان امریکی ثالثی میں ہونے والی ڈیل کے 2 مقاصد کا حصول ممکن ہوتا، ایک تو پارلیمنٹ کی بیشتر نشستیں مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی کو مل جاتیں، دوم مشرف بطور صدر برقرار رہتے۔ بے نظیر چاہتی تھیں کہ ان کی پاکستان واپسی پر امریکہ ان کی مناسب سکیورٹی کا اہتمام کرے اور دوسرا یہ کہ ان کے خلاف بدعنوانی کے تمام الزامات واپس لئے جائیں۔ (سسکنڈ، 2008ء: 66-262)۔

بہر حال مقامی سطح پر بااثر افراد اور کچھ انتظامی عہدیداروں کی ملی بھگت سے بعض مقامات

پر دھاندلی کے اکا دکا واقعات کے سوا 18 فروری 2008ء کو عام انتخابات مجموعی طور پر صاف اور شفاف ہوئے۔ انتخابی نتائج آمریت کے خلاف زبردست احتجاج کے حامل تھے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) بڑی جماعتیں بن کر ابھریں اور انہیں بالترتیب 120 اور 90 نشستیں ملیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں دونوں جماعتوں کو وہاں زبردست کامیابی ملی جہاں ان کا روایتی طور پر اثر ورسوخ ہے۔ سٹرٹیجک اہمیت کے حامل صوبہ سرحد جہاں افغان سرحد کے ساتھ طالبان اور القاعدہ کے مضبوط ٹھکانے تھے میں اسلام پسند جماعتوں کا صفایا ہو گیا۔ سیکولر جماعت اے این پی جس کو ماضی میں اس صوبے میں نمایاں حیثیت حاصل رہی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ مشرف کی حمایت یافتہ جماعت (ق) لیگ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور قومی اسمبلی میں اسے صرف 51 نشستیں ملیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی اسے اسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ بلوچستان میں اسے کچھ پذیرائی ملی۔ کیونکہ 2006ء میں طاقتور قبائلی سردار اکبر بگٹی کے قتل کے بعد ہونے والے پرتشدد واقعات کے تناظر میں قوم پرست جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اس لئے مسلم لیگ (ق) کو نشستیں مل گئیں۔

ماضی میں بدترین حریف رہنے والی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نے اے این پی اور مشرف نواز ایم کیو ایم اور جے یو آئی (ف) کے تعاون سے وسیع تر مخلوط حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ کئی ہفتوں تک سیاسی جوڑ توڑ کے بعد 22 مارچ کو پیپلز پارٹی کے رہنما یوسف رضا گیلانی کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار نامزد کر دیا گیا۔ 24 مارچ کو قومی اسمبلی میں انہیں 342 میں سے 264 امیدواروں نے ووٹ دیا جبکہ ان کے حریف مسلم لیگ (ق) کے چودھری پرویز الٰہی کو صرف 42 ووٹ مل سکے۔ یوسف رضا گیلانی نے 25 مارچ کو صدر مشرف کے سامنے حلف اٹھایا لیکن آصف زرداری سمیت کئی ممتاز سیاستدانوں نے تقریب حلف برداری کا بائیکاٹ کیا۔ غالباً یہ مشرف کی صدارت کے تسلسل کے خلاف احتجاج تھا۔ (دی نیوز، 26 مارچ 2008ء)۔

وزیراعظم بننے کے بعد یوسف رضا گیلانی نے پہلا حکم چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور دیگر ججوں کی نظر بندی ختم کرنے اور ان کی رہائشگاہوں کے باہر سے رکاوٹیں ہٹانے کا دیا۔ قومی اسمبلی میں بطور وزیراعظم اپنی پہلی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ان کی حکومت دہشت گردی کے خلاف لڑے گی لیکن اس کیلئے صرف فوجی ذرائع استعمال نہیں کئے جائیں گے۔ پاکستان میں امن

وامان کے استحکام کیلئے سیاسی حل بھی تلاش کیا جائے گا۔ (دی نیوز، 30 مارچ) البتہ ججوں کی بحالی کیلئے پیپلز پارٹی اور اس کی اتحادی جماعت مسلم لیگ (ن) کے درمیان مذاکرات میں ڈیڈ لاک آ گیا۔ دونوں جماعتوں نے 9 مارچ 2008ء کو اعلان بھوربن میں ایک قرارداد میں اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ حکومت بننے کے بعد 30 یوم کے اندر ججوں کو بحال کر دیا جائے گا۔ اس معاہدے پر عملدرآمد نہ ہونے پر نواز شریف نے اپنی جماعت کے 9 وزراء کو وفاقی کابینہ سے الگ کر لیا۔ مخلوط حکومت جاری رہی جبکہ مسلم لیگ (ن) نے اپوزیشن میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔

دہشت گردی 2008ء میں

فاٹا میں جہاں طالبان اور القاعدہ لیڈروں کے مشتبہ ٹھکانے تھے وہاں سے 2007 کے دوران ہونے والے دہشت گردانہ حملوں سے سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ان گروپوں کو حقانی گروپ جیسی انتہا پسند تنظیموں نے پناہ دی جس کا سربراہ ایک افغان مولوی جلال الدین حقانی اور اس کا بیٹا سراج دین حقانی تھا جن کے بارے میں امریکہ کو شبہ تھا کہ ان کا شمالی وزیرستان میں آئی ایس آئی کی چھتری تلے نیٹ ورک تھا۔ فاٹا FATA کا علاقہ پاکستان کے عام علاقوں کی طرح انتظامی کنٹرول میں نہیں تھا۔ اگرچہ قومی اسمبلی اور سینٹ میں یہاں کی نمائندگی ضرور تھی۔ وہاں کے سماجی معاملات اب تک معروف ضابطے ''پختون ولی'' کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ انتہائی غربت، محرومی، تعلیم کی کمی اور اقتصادی مواقع کے فقدان کے ساتھ ہتھیار رکھنے کی روایت نے فاٹا میں انتہا پسندی اور پرتشدد نظریات اور کارروائیوں کو آسان بنا دیا۔ (ڈوگر، 2009ء)۔

بہر حال وجوہات کچھ بھی تھیں لیکن باقی ماندہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی سے امن کی بحالی میں زیادہ مدد نہ ملی۔ 2008ء کے دوران بھی خودکش حملوں.... زیادہ تر حکومتی اہلکاروں اور عمارتوں پر.... کا سلسلہ جاری رہا۔ 10 جنوری کو لاہور ہائی کورٹ کے باہر جہاں وکلاء کا احتجاجی مارچ ہونے والا تھا خودکش بم حملے میں 24 افراد ہلاک اور 73 زخمی ہوئے۔ حملہ آور کا ہدف وہاں کھڑے پولیس اہلکار تھے۔ (دی نیوز 11 جنوری)۔ 4 فروری کو راولپنڈی میں فوجی ہیڈ کوارٹر کے قریب آرمی میڈیکل کالج کے طلباء اور اہلکاروں کی بس سے خودکش حملہ آور نے اپنی موٹر سائیکل ٹکرا دی۔ اس حملے میں 10 افراد ہلاک اور 27 زخمی ہو گئے۔ (دی نیوز، 5 فروری 2008)۔ فروری

کے دوران اے این پی اور پیپلز پارٹی کی انتخابی ریلیوں اور پولیس اور فوجی اہلکاروں پر حملے کئے گئے۔ 25 فروری کو فوج کے میڈیکل کور کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل مشتاق بیگ اور ان کا ڈرائیور اور ایک محافظ خودکش حملے میں جاں بحق ہو گئے۔ دہشت گردوں نے دوبارہ لاہور پر حملہ آور ہوتے ہوئے نیوی وار کالج پر خودکش بمباری کی۔ اس واقعے میں 8 افراد ہلاک اور 24 زخمی ہوئے۔ (دی نیوز، 26 فروری 2008)۔

لاہور میں ہی 11 مارچ کو ایک بار پھر بیک وقت 2 بہیمانہ حملے ہوئے۔ پہلے خودکش حملے میں شہر کے عین وسط میں ٹیمپل روڈ پر فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) کی عمارت سے بارود سے بھری گاڑی ٹکرا دی گئی۔ عمارت تباہ ہو گئی جبکہ 16 پولیس اہلکاروں سمیت 30 افراد ہلاک ہوئے۔ حملے کا ہدف امریکہ کی مدد سے انسداد دہشتگردی کی کارروائیوں کیلئے اہلکاروں کی تربیت سے متعلق دفتر تھا۔ اسی روز دوسرا حملہ شہر کے پوش علاقے ماڈل ٹاؤن میں آصف زرداری کی ملکیت بلاول ہاؤس کے قریب ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے دفتر پر حملہ کیا گیا۔ (دی نیوز 12 مارچ 2008)۔ تاہم نئی حکومت کے حلف اٹھاتے ہی بم حملوں میں کچھ توقف آ گیا.... شاید اس کی وجہ دہشت گردوں کی یہ امید تھی کہ مشرف صدارت سے الگ ہو جائیں گے اور یوں پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ سے الگ ہو کر امریکہ سے تعاون بند کر دے گا لیکن چونکہ ایسا نہ ہوا چنانچہ جولائی سے آگے تک دہشت گردی کی ایک نئی لہر نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔

خونیں جولائی

6 جولائی 2008ء کو اسلام آباد کی لال مسجد کے قریب کچہری میں ایک بمبار نے خود کو اڑا لیا۔ اس حملے میں 15 پولیس اہلکاروں سمیت 21 افراد جاں بحق ہوئے۔ ان دھماکوں سے یہ تلخ حقیقت آشکار ہوئی کہ دہشت گردوں کے جو نیٹ ورک کچھ عرصے کیلئے خاموش ہوئے تھے وہ دوبارہ ہلاکت آمیز کارروائیوں پر اتر آئے ہیں۔ حکومت نے دعویٰ کیا کہ دہشت گردوں کے حملے روکنے کیلئے مناسب سکیورٹی انتظامات کئے گئے ہیں۔ لال مسجد پر حملے کی یاد میں اسلام آباد میں اسلام پسندوں کی تقریب کے موقع پر 3 ہزار پولیس اہلکار تعینات کئے گئے۔ پاکستانی میڈیا کے مطابق تقریب کے کئی مقررین نے جذباتی خطابات کئے اور لال مسجد آپریشن میں مرنے والوں کو

شہدائے اسلام قرار دیا۔ یہ امر زیادہ حیران کن نہیں کہ ایسی بات کا مطلب یہ تھا کہ پاکستانی فوج کو قاتلوں اور جارحیت پسندوں کے کردار میں دکھایا گیا۔ تیاریاں اور اندازے چاہے کچھ بھی ہوں تاہم لال مسجد کے سانحے کی یاد میں انتہا پسندوں کو اجتماع کی اجازت دینا ہرگز دور اندیشی پر مبنی فیصلہ نہیں تھا۔ 7 جولائی کو کراچی کے مختلف حصوں میں 6 کریکر دھماکے ہوئے جس میں 26 افراد زخمی ہوئے۔ پاکستان نے بیت اللہ محسود کو حملوں کا ذمہ دار ٹھہرایا...تحریک طالبان کے بارے میں شبہ تھا کہ اس نے کراچی میں پختونوں کی اکثریت والے علاقوں میں اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا ہے جس کے باعث طالبان اور ایم کیو ایم کے درمیان تصادم ہوا۔ (حسین، 2008)۔

کابل میں بھارتی سفارتخانے پر حملہ

7 جولائی 2008ء کو کابل میں بھارتی سفارتخانہ دہشت گردوں کے حملے کا بڑا نشانہ تھا۔ دہشت گردوں نے کامیابی کے ساتھ سکیورٹی حصار توڑا اور قلعہ نما سفارتی علاقے میں گھس کر سفارتخانے کے گیٹ پر کئی دھماکے کر ڈالے۔ بھارتی سفارتخانے کے 4 ملازمین سمیت 59 افراد مارے گئے۔ افغان حکومت نے فوری طور پر ہمسایہ ملک کی ایک انٹیلی جنس ایجنسی پر کارروائی کا ماسٹر مائنڈ ہونے کا الزام لگایا۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان کشیدہ تعلقات کے تناظر میں یہ سمجھنا سرمو مشکل نہیں تھا کہ افغانستان کا اشارہ پاکستان کی طرف تھا۔ چند روز بعد بھارت نے بھی ایسے الزامات عائد کئے۔ صدر حامد کرزئی نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کی حکومت کے پاس ٹھوس شواہد ہیں جن سے پاکستانی انٹیلی جنس کے ملوث ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے شروع میں کہا کہ انہیں پاکستان کے ملوث ہونے کا ثبوت نظر نہیں آتا لیکن انہوں نے اس وقت اپنی رائے بدل لی جب افغانستان اور بھارت نے بش انتظامیہ کو جمع کئے گئے شواہد دیے۔ (احمد، 11 جولائی 2008ء)۔

صدر بش کے علاوہ امریکہ کے صدارتی امیدوار جان مکین اور بارک اوباما سمیت دیگر امریکی رہنماؤں نے وزیراعظم گیلانی سے ملاقاتوں میں زور دیا کہ پاکستان دہشت گردی اور انتہا پسندی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے مزید اقدامات کرے۔ امریکی میڈیا نے بھی ایسے ہی خدشات ظاہر کئے۔ جب صدر بش نے دھمکی دی کہ امریکہ سخت ایکشن لے گا تو گیلانی نے تحقیقات پر

آمادگی ظاہر کردی لیکن پاکستان کے دفتر خارجہ نے آئی ایس آئی کے ملوث ہونے کے الزامات کو بکواس قرار دیا۔ بہرحال وزیراعظم گیلانی کے دورہ امریکہ کو متاثر کرنے والے منفی تاثر کے باوجود امریکی کانگریس نے پاکستان کے لئے 15 ارب ڈالر کے پیکیج کی منظوری دے دی جس میں سے بڑا حصہ اقتصادی ترقی کیلئے خرچ کیا جانا تھا۔ پاکستان کے باب میں امریکہ کے اس عجیب رویے سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ امریکہ افغانستان میں بالخصوص اور جنوبی ایشیا میں بالعموم اپنے طویل المدت مقاصد کے حصول کیلئے پاکستان کی اہمیت کا قائل تھا۔ 26 جولائی کو حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ آئی ایس آئی کو وزارت داخلہ کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس رات پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ نے وضاحتی بیان میں کہا کہ آئی ایس آئی بدستور وزیراعظم کے ماتحت ہے۔ بعد میں اعلان کیا گیا کہ آئی ایس آئی کو دوبارہ وزارت دفاع کے کنٹرول میں دے دیا گیا ہے۔ (دی نیوز، 6 اگست 2008ء)۔ ایک اور اقدام کے طور پر 25 اگست 2008ء کو حکومت نے اعلان کیا کہ تحریک طالبان پاکستان کو کالعدم قرار دے کر اس کے اثاثے اور بنک اکاؤنٹس منجمد کر دیے گئے ہیں اور اس کی میڈیا پر کوریج بھی روک دی گئی۔ یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ تحریک طالبان صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے ساتھ حکومتی ملازمین اور تنصیبات پر حملے کر رہی تھی۔

کولمبو میں وزیراعظم گیلانی کو شرمندگی کا سامنا

کچھ عرصے بعد وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے کولمبو سری لنکا، میں سارک سربراہ کانفرنس میں شرکت کی۔ (27 جولائی، 3 اگست)۔ وہاں بھی جمہوری طور پر منتخب اپنی حکومت کی کارکردگی بتانے کی بجائے ان کا بیشتر وقت یہ بتانے میں گزرا کہ ان کی حکومت دہشت گردی سے نمٹنے میں پرعزم ہے۔ سری لنکا کے ایک اخبار سے انٹرویو میں انہوں نے ان تمام الزامات کو بکواس قرار دیا کہ آئی ایس آئی کابل کے دھماکوں میں ملوث تھی اور یہ دعویٰ کیا کہ آئی ایس آئی پاکستان کے دستور کے مطابق ان سے احکامات لیتی ہے، بھارتی ہم منصب ڈاکٹر من موہن سنگھ کے ساتھ 45 منٹ کی ملاقات میں انہوں نے کہا کہ پاکستان خود دہشت گردی کا شکار ہے اور دونوں ملکوں کو اس لعنت کیخلاف مل کر لڑنا چاہیئے۔ افغان صدر حامد کرزئی کے ساتھ الگ ملاقات میں انہوں نے

وعدہ کیا کہ وہ اس بات کی تحقیقات کرائیں گے کہ کابل بم دھماکوں میں آئی ایس آئی کا کوئی ہاتھ تھا یا نہیں۔ یوں انہوں نے سری لنکا کے اخبار کو دیے گئے انٹرویو میں اپنی بات کی خود ہی نفی کر دی۔

تکنیکی اعتبار سے گیلانی یہ بات ٹھیک کہہ رہے تھے کہ آئینی طور پر آئی ایس آئی ان کے ماتحت اور ان کو جوابدہ تھی۔ لیکن عملی طور پر یہ دیکھا جائے تو آئی ایس آئی صرف آرمی چیف سے احکامات لیتی تھی اور انہیں ہی جوابدہ تھی۔ ماضی میں جب کبھی سویلین حکومت نے آئی ایس آئی پر کنٹرول کی اور مرضی کا جنرل اس کا سربراہ لگانے کی کوشش کی تو اسٹیبلشمنٹ نے داخلی انٹیلی جنس کے ذمہ دار سٹرٹیجک عہدوں پر اپنے آدمی لگا دیے۔ اس طرح آئی ایس آئی نے سویلین حکومت کی سرگرمیوں پر بدستور نظر رکھنا جاری رکھا۔ (احمد، 15 اگست 2008)۔

بہر حال گیلانی کو صدر مشرف کی حمایت بدستور حاصل رہی جنہوں نے آئی ایس آئی کو ''پاکستان کی اولین دفاعی لائن'' قرار دیا۔ (دی نیوز، 6 اگست 2008ء)۔ ایک سرکاری بیان میں امریکہ کے اس الزام پر تنقید کی گئی کہ دہشت گردی کے حالیہ واقعات میں پاکستان ملوث تھا۔ بیان میں کہا گیا کہ 24 مئی 2008ء کو امریکہ کو بیت اللہ محسود کی نقل و حرکت اور موجودگی کی درست جگہ کی نشاندہی کی گئی کہ وہ ٹیوٹا لینڈ کروزر میں پریس کانفرنس کیلئے جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ خیر و عافیت سے نکل گیا۔ حالانکہ امریکی فوج کے پاس صلاحیت ہے کہ وہ نہایت کم وقت میں مقررہ ہدف کو میزائل سے نشانہ بنا سکے۔ اور اس نے پاکستان کی حدود کے اندر گزشتہ برسوں کے دوران القاعدہ کے اہداف کو 21 مرتبہ نشانہ بنایا لیکن بیت اللہ محسود کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ پاکستان نے اس امریکی رویے کو ابہام اور سازش سے بھرپور قرار دیا۔ پاکستان نے یہ بھی الزام لگایا کہ بلوچستان میں گڑبڑ میں بلوچستان کا ہاتھ ہے اور یہ کہ افغانستان نے بلوچ علیحدگی پسندوں کو پناہ دے رکھی ہے۔

مشرف کی رخصتی

18 اگست 2008ء کو بالآخر مستعفی ہونے سے پہلے صدر پرویز مشرف نے آئی ایس آئی کے حق میں آخری اہم مگر متنازعہ بیان دیا۔ استعفیٰ دینے کی تقریر میں مشرف نے اصرار کیا کہ وہ طویل عرصے سے جاری اقتدار کی کشمکش اور سیاسی غیر یقینی کی صورتحال سے گریز کیلئے قوم کے مفاد میں

استعفیٰ دے رہے ہیں۔مشرف کے 2انتہائی حامی یعنی امریکہ اور پاکستانی فوج لگتا تھا کہ اب مزید ان کی حمایت میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ملک کے اندران کی حمایت میں تیزی سے کمی آئی۔مثال کے طور پر چاروں صوبوں کی اسمبلیوں میں ان کے خلاف قراردادیں پیش کی گئیں جن میں مطالبہ کیا گیا کہ وہ قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لیں جس کا انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ وہ نہیں لے سکتے۔ (جیٹلی ،25اگست 2008)۔

آصف زرداری بطور صدر

پرویز مشرف کے استعفے کے 3 ہفتے بعد نئے صدر کے انتخاب کیلئے الیکشن ہوا۔آصف زرداری نے یہ کہہ کر کئی حلقوں کو حیران کردیا کہ وہ خود صدارت کے امیدوار ہوں گے۔پیپلز پارٹی اورایم کیوایم نے ان کی حمایت کی جبکہ اپوزیشن جماعت مسلم لیگ (ن) نے جسٹس (ر) سعید الزمان صدیقی اور مسلم لیگ (ق) نے مشاہد حسین سید کو صدارتی امیدوار نامزد کیا۔چاروں صوبائی اسمبلیوں،قومی اسمبلی اور سینٹ پر مشتمل الیکٹورل کالج کے 702 ووٹوں میں سے آصف زرداری کو 481 ووٹ ملے۔9 ستمبر کو 2008 میں تقریب حلف برداری میں افغانستان کے صدر حامد کرزئی مہمان خصوصی تھے۔اپنے پہلے صدارتی خطاب میں آصف زرداری نے دہشت گردی کے خاتمے، جمہوریت کے استحکام اور جنوبی ایشیا میں امن کے قیام کا عزم ظاہر کیا۔لیکن آصف زرداری کے صدر بننے کے فوراً بعد بھارت کے ساتھ تعلقات کے معاملے پر ان کے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اختلافات سامنے آ گئے۔ بھارتی اخبارات نے آصف زرداری کے امریکی اخبار ''وال سٹریٹ جرنل'' کو انٹرویو کا حوالہ دیا جس میں صدر نے مقبوضہ کشمیر میں سرگرم عسکریت پسندوں کو دہشت گرد قرار دیا۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ بھارت پاکستان کی سلامتی کیلئے خطرہ نہیں۔(ہندوستان ٹائمز،5 اکتوبر 2008ء،دی ہندو،6اکتوبر)۔یہ خبر پاکستانی میڈیا میں نمایاں نہیں ہوئی تاہم 7اکتوبر کو لاہور کے انگریزی اخبار ڈیلی ٹائمز نے خبر شائع کی کہ صدر زرداری کے بیان کی جماعۃ الدعوۃ کے سربراہ حافظ سعید نے مذمت کی ہے۔آصف زرداری کا ایک اور متنازعہ بیان یہ تھا کہ بھارت کے ساتھ کسی جنگ کی صورت میں پاکستان ایٹمی ہتھیار چلانے میں پہل نہیں کرے گا۔(ٹائمز آف انڈیا، 22 نومبر 2008)۔ایسا طرزعمل اس لئے معقول دکھائی دیتا ہے کہ زرداری ایسے غیرروایتی بیانات

اس لئے دے رہے تھے کیونکہ انہیں امریکہ کی حمایت حاصل تھی اور امریکہ نے کئی حلقوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ تینوں مؤقف فوج کے مؤقف سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اس کی تصدیق کچھ عرصہ بعد وکی لیکس کے انکشافات سے ہوئی جس میں امریکہ کے ایک سفارتی مراسلے میں کہا گیا کہ جنرل کیانی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ پاکستان پہلے ایٹمی ہتھیاروں سے حملہ نہیں کرے گا۔ (ٹائمز آف انڈیا، 6 مئی 2011)۔

اگرچہ فوج کے ترجمانوں نے کئی مواقع پر طالبان کو پاکستان کی سکیورٹی کیلئے بڑا خطرہ قرار دیا لیکن اس بات کے آثار نظر نہیں آئے کہ بھارت کو سب سے بڑا خطرہ قرار دینے کے مؤقف پر نظر ثانی کی جارہی تھی۔ اس کے برعکس فوج بلکہ سویلین وزراء تک الزام لگاتے رہے کہ افغانستان کے سرحدی شہروں میں واقع بھارتی قونصل خانے پاکستان میں جاسوسی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک کو شہہ دے رہے ہیں۔ اپریل 2011 میں اخبارات نے سابق برطانوی وزیر خارجہ ڈیوڈ ملی بینڈ کا یہ بیان شائع کیا کہ زرداری اور منموہن سنگھ کشمیر پر معاہدے پر رضا مند ہو چکے تھے لیکن جنرل کیانی اس کی منظوری سے گریزاں رہے۔ (ڈان، 4 اپریل 2011ء)۔ کشمیر کے معاملے پر بریک تھرو کی طویل عرصے سے توقع کی جارہی تھی اور کئی مواقع پر ایسا لگتا رہا کہ حل بالکل قریب ہے تاہم ٹھیک آخری لمحے دونوں طرف کے قدامت پسند عناصر نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

میریٹ ہوٹل اسلام آباد پر حملہ

20 ستمبر 2008ء کو بارود سے بھرا ٹرک اسلام آباد کے اونچے میریٹ ہوٹل کے گیٹ سے ٹکرا دیا گیا۔ سفارتی علاقے کے قریب واقع ہوٹل پر حملے میں 54 افراد ہلاک اور 255 زخمی ہوئے۔ زیادہ تر مرنے والے پاکستانی تھے تاہم 15 غیر ملکی بھی ہلاک اور 15 زخمی ہوئے۔ یہ بم دھما کہ صدر زرداری کے پارلیمنٹ سے پہلے خطاب کے فوراً بعد ہوا۔ یوں ایک بار پھر پوری دنیا میں پاکستان کے دہشت گردی کے مرکز ہونے کی بازگشت گونجنے لگی۔ منتخب حکومت بے بس نظر آئی جبکہ فوج اور انٹیلی جنس ادارے بھی دہشت گرد سرگرمیوں کی بیخ کنی میں غیر مؤثر دکھائی دیے۔

ممبئی میں دہشت گردانہ حملے

صورتحال اس وقت انتہائی خطرناک نہج پر پہنچ گئی جب 26 نومبر 2008ء کو پاکستان میں قائم جہادی تنظیم لشکر طیبہ کے مبینہ ارکان نے بھارت کے سب سے بڑے شہر اور مالیاتی مرکز ممبئی میں پے در پے دہشتگردی کے حملے کئے۔ پاکستان کے اندر پنپنے والے غیر ریاستی عناصر کی طرف سے غیر ملکی سرزمین پر کارروائیوں سے پوری بھارتی قوم سکتے میں آ گئی اور بین الاقوامی برادری نے بھی مذمت کی۔ اگرچہ جولائی 2006ء میں ٹرین بم دھماکوں میں 209 افراد مارے گئے تھے لیکن ممبئی بم دھماکوں نے دنیا کی زیادہ توجہ حاصل کی۔ حملہ آوروں نے نہ صرف کئی مقامات پر بم چھپا رکھے تھے بلکہ انہوں نے پوری کارروائی بھی سرعام کی۔ تقریباً 60 گھنٹے تک بھارتی سکیورٹی فورسز نے حملہ آوروں سے لڑائی کی۔ آخر میں صرف ایک ملزم اجمل امیر قصاب کو زندہ پکڑا جاسکا۔ بھارتی حکام نے 9 مبینہ دہشت گردوں کی لاشیں برآمد کرنے کا دعویٰ کیا۔ بظاہر حملہ آوروں نے ساحلی شہر کراچی سے ممبئی تک کا راستہ سمندر سے طے کیا۔ بھارت کا ساحلی دفاع اور انٹیلی جنس کا نیٹ ورک ان کا پتہ چلانے میں مکمل ناکام رہا۔ کچھ لکھنے والوں نے ممبئی حملوں کو بھارت کا نائن الیون قرار دیا کیونکہ حملہ آوروں نے منصوبہ بندی کے ساتھ تاج محل، ہوٹل اوبرائے اور غیر ملکی سیاحوں کے مسکن لیوپولڈ کیفے جیسے بھارتی شان وشوکت اور اثر ورسوخ کی علامتوں کو نشانہ بنایا۔ نریمان ہاؤس میں یہودیوں کے مرکز کو نشانہ بنانے کا واضح مقصد حملے کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانا اور بین الاقوامی توجہ حاصل کرنا تھا۔

حملوں کی ذمہ داری خود کو ''دکن مجاہدین'' کہنے والے گروپ نے قبول کی۔ اس نام سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حملہ آوروں کی جڑیں بھارت میں تھیں یا ان کا تعلق جنوبی بھارت کے علاقے حیدرآباد دکن سے تھا۔ لیکن بھارتی حکام نے اسے جعلی نام اور توجہ ہٹانے کی کوشش قرار دے کر مسترد کر دیا۔ انہوں نے دہشتگردوں کو مناسب اسلامی رسوم کے مطابق اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفنانے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف پاکستانی اور غیر ملکی صحافیوں اور ٹی وی چینلوں کے نمائندوں نے جنوبی پنجاب کے قصبے فرید کوٹ جا کر اجمل قصاب کے دوستوں اور ہمسائیوں کے انٹرویو کئے جنہوں نے

تصدیق کی کہ بھارتی ٹی وی پر دکھائی دینے والی فوٹو اجمل قصاب ہی کی تھی۔ اس انکشاف پر بھارت نے شدید برافروختگی کا اظہار کیا۔ بھارتی حکام کا خیال تھا کہ اجمل قصاب کو مستوجب سزا قرار دینے کیلئے یہی ثبوت کافی تھا۔ اس کے بعد پاکستانی حکومت نے کسی بھی صحافی کے فرید کوٹ جانے پر پابندی لگادی۔

میں 29 نومبر 2008 کو پاکستان آیا۔ اس دورے کی منصوبہ بندی کئی ماہ پہلے کی گئی تھی کیونکہ مجھے انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشیا کیلئے پاکستانی فوج کے کردار پر ریسرچ کیلئے آنا تھا۔ پاکستانی فوج کے سینئر افسروں اور ممتاز شخصیات سے مل کر فوج سے متعلق ان کے تاثرات جمع کرنا میرا مطمح نظر تھا۔ میں پاکستان ملٹری کے بارے میں بھارتی نقطۂ نظر سے بھی آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ممبئی حملوں کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات خطرناک حد تک کشیدہ ہو گئے۔ حملوں کا ماسٹر مائنڈ جو کوئی بھی تھا وہ دونوں ملکوں کو جنگ کے دہانے پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ حملوں کے چند گھنٹے کے اندر بھارتی وزیر اعظم منموہن سنگھ نے پاکستانی مداخلت کا الزام لگا دیا۔ دیگر سرکاری ترجمانوں نے بھی ایسے ہی رابطوں کی بات کی۔ شروع میں پاکستان کا ردعمل مصالحتی اور ہمدردانہ تھا اور تحقیقات میں تعاون کی پیشکش کی گئی۔ نومنتخب صدر آصف زرداری اور وزیر اعظم گیلانی دونوں نے اس بات کی تردید کی کہ ان کی حکومت نے حملوں کا حکم دیا۔ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے وعدہ کیا کہ تحقیقات میں مکمل تعاون کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم گیلانی نے بھارت کی درخواست پر آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل احمد شجاع پاشا کو بھارت بھجوانے پر بھی آمادگی ظاہر کی تاکہ وہ ان بھارتی شواہد کا معائنہ کریں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ حملہ آور پاکستانی تھے۔ تاہم بعد میں پاکستان نے یہ پیشکش واپس لے لی۔ بادی النظر میں اس فیصلے کے پیچھے فوج کا دباؤ تھا چنانچہ آئی ایس آئی کے کسی عہدیدار کو بھارت نہ بھیجا گیا۔

اس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کم کرنے کیلئے بین الاقوامی سفارتی حلقے متحرک ہو گئے۔ برطانیہ اور امریکہ جیسی بڑی طاقتوں سمیت بین الاقوامی برادری نے بھارتی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور دہشت گردی کی مذمت کی۔ امریکہ کی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس اور برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن بھارت کا دورہ کرنے والوں میں شامل تھے۔ دونوں حریف

ملکوں کے درمیان کسی بھی تصادم سے نہ صرف خطے کا بلکہ عالمی امن بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ اس تناظر میں بین الاقوامی برادری کی تشویش قابل فہم تھی۔

اس بات میں بہت کم شبہ ہے کہ ممبئی حملوں کے بعد پاکستان کے ایک خودسر ریاست اور ''دہشت گردی کا مرکز'' ہونے کا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔ امریکہ کی سابق وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے ممبئی حملوں کے تناظر میں پاکستان کے بارے میں امریکہ میں پائے جانے والے جذبات کا بڑے واضح انداز میں اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ''پاکستان کے پاس وہ سب کچھ ہے جو عالمی برادری کی سردردی کا باعث بن سکتا ہے، اس کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں، وہاں دہشت گردی ہے، انتہا پسندی ہے، کرپشن ہے، بہت غریب ملک بھی ہے اور جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے جو حقیقتاً ہمارے لئے اہمیت کا حامل ہے''۔ اسی بیان میں میڈلین البرائٹ نے زور دے کر کہا کہ صدر آصف زرداری اس صورتحال سے نمٹنے کی انتہائی کوششیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو تاثرات بیان کئے وہ بش انتظامیہ بلکہ بھارت تک کی سوچ کی عمومی عکاس کرتے تھے کہ ممبئی حملوں کا حکم پاکستان کی منتخب حکومت نے نہیں دیا۔ تاہم فوج اور انٹیلی جنس کا کردار بدستور افواہوں کی زد میں رہا۔ بھارت نے پاکستان کا یہ سرکاری مؤقف مسترد کر دیا کہ حملوں میں غیر ریاستی یا پھر خودمختار عناصر کا ہاتھ تھا۔ حتیٰ کہ بھارتی صدر پرتیبھا پٹیل نے یوم جمہوریہ کے موقع پر اپنے خطاب میں بھی ایسے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ دلائل کہ دہشتگردی کے اقدامات خودمختار عناصر نے کئے خود شکستگی کے مترادف اور ناقابل قبول ہیں۔ ملکوں اور عالمی برادری کو دہشت گردی کو شکست دینے کے لئے اپنی ذمہ داریاں نبھانا ہوں گی''۔

بھارتی صدر کے الزامات دیگر بھارتی رہنماؤں کے تاثرات کا اعادہ تھا جو پاکستان کے پہلے معقول اور پرسکون بیانات کے بعد نظر انداز کرنے کے رویے پر مایوسی کا شاخسانہ تھا۔ یہ نام نہاد مایوسی زیادہ تر پاکستان اور بھارت کے درمیان ''میڈیا وار'' کے باعث تھی۔ کچھ بھارتی مبصرین نے پاکستان کے خلاف کھلی جنگ کا مطالبہ کیا جبکہ بعض دیگر نے لشکر طیبہ کے دفاتر اور کیمپوں پر سرجیکل سٹرائیکس کی حمایت کی۔ بھارتی غم و غصہ جنگی جنون میں تبدیل ہو گیا۔ دوسری طرف پاکستان میں جنگ کے رسیا عناصر نے بھی بھارت کو جنگ کی صورت میں سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی دی کیونکہ آخر پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے۔ کچھ حلقوں نے تو یہ منطق بھی جھاڑی کہ یہ

سارا ڈرامہ بھارتی انٹیلی جنس نے رچایا ہے تاکہ پاکستان کی بین الاقوامی سطح پر ساکھ خراب کرنے کے ساتھ فوجی کارروائی کی راہ ہموار کی جاسکے۔ مشتعل بھارتی تجزیہ نگاروں نے اس سے بھی بڑھ کر اشتعال انگیزی کی جبکہ بعض نام نہاد ماہرین نے دونوں طرف فوجوں اور ہتھیاروں کا موازنہ کر کے فیصلہ دیا کہ بھارت کو برتری حاصل تھی۔

اس کے ردعمل میں پاکستان کے میڈیا کی بھی سمت تبدیل ہوگئی جو قبل ازیں مشتعل بھارت سے ممکنہ خطرے کے تناظر میں پاکستان کے ممبئی حملوں سے تعلق کی وضاحت تک محدود تھا۔ عدم سلامتی کے بڑھتے احساس کے جواب میں وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے ممکنہ بھارتی حملے کے حوالے سے تبادلہ خیال کے لئے کل جماعتی کانفرنس طلب کر لی۔ اس کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں ممبئی حملوں کے دوران قیمتی جانوں کے ضیاع پر تعزیت کا اظہار کیا گیا لیکن زیادہ تر زور جنگ کی صورت میں حکومت کی حمایت پر تھا۔ حتیٰ کہ پاکستانی طالبان جو سرکاری سکیورٹی فورسز کے خلاف خونریز تصادم میں ملوث تھے نے اعلان کیا کہ جنگ ہونے پر وہ پاکستانی فوج کے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر لڑیں گے۔

دن گزرنے کے ساتھ بھارتی قیادت نے پاکستان پر دباؤ بڑھا دیا اور مطالبہ کیا کہ حملے میں مبینہ طور پر ملوث افراد کو بھارت کے حوالے کر دیا جائے۔ چونکہ دونوں ملکوں کے درمیان تحویل ملزمان کا کوئی معاہدہ موجود نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان نے مطالبہ مسترد کر دیا۔ البتہ پاکستان یہ کہتا رہا کہ اگر بھارت ملزموں کے خلاف شواہد فراہم کرے تو قانونی عمل کے مطابق سخت کارروائی کی جائے گی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی پاکستان کے خلاف دباؤ بڑھ گیا کیونکہ اقوام متحدہ نے جماعۃ الدعوۃ کو دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ کا مالیاتی وسیلہ قرار دیا۔ (لشکر طیبہ کو حکومت پاکستان نے 2002 میں کالعدم قرار دے دیا تھا)۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان نے لشکر طیبہ کے کئی رہنماؤں کو گھروں پر نظر بند کر دیا اور ان کے دفاتر سیل کر دیے۔

اس کے علاوہ بھارت نے امریکی ایجنسی ایف بی آئی اور پاکستان کو وہ مواد فراہم کر دیا جو اس کے نزدیک اجمل قصاب اور دیگر حملہ آوروں کے پاکستانی ہونے کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ ایف بی آئی نے بھارتی شواہد کو ٹھوس اور قابل اعتبار قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ اس کی اپنی آزادانہ تحقیقات میں بھی واقعے کا لشکر طیبہ سے تعلق ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھارت نے پھر

دہشت گردی میں ملوث ملزموں لشکر طیبہ کے سربراہ حافظ محمد سعید، جیش محمد کے سربراہ مولانا مسعود اظہر اور دیگر کو بھارت کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ بھارتی حکام نے دعویٰ کیا کہ تفتیش کے دوران اجمل قصاب نے اعتراف کیا کہ ذکی الرحمٰن لکھوی اس کا استاد تھا اور اسی نے ممبئی میں حملوں کا حکم دیا۔ ذکی الرحمٰن لکھوی کے علاوہ لشکر طیبہ کے یوسف مزمل کو ممبئی حملوں کا براہ راست ذمہ دار قرار دیا گیا۔ 7 جنوری 2009ء کو حکومت پاکستان نے تسلیم کر لیا کہ اجمل قصاب کی شہریت پاکستانی ہو سکتی ہے۔ (احمد، 30 جنوری)۔

ممبئی حملوں پر پاکستانی فوجی افسروں کے تاثرات

2008ء میں پاکستان کے دورے میں مجھے کئی اعلیٰ ریٹائرڈ فوجی افسروں سے گفتگو کا موقع ملا۔ سابق آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل جاوید اشرف قاضی دونوں نے دعویٰ کیا کہ فوج اور خفیہ اداروں کو اسلام پسندوں سے پاک کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے تاہم یہ اعتراف کیا کہ کچھ ریٹائر اسلام پسند اب بھی اثر ورسوخ کے حامل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ مختلف نیٹ ورکس کا حصہ تھے۔ بیشتر سینئر افسروں نے یہ رائے دی کہ بھارت مسئلہ کشمیر کے حل سے انکار کر کے جہادیوں کو پھیلنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ یہ بات اس تناظر میں ٹھیک لگتی ہے کیونکہ جنرل مشرف نے بھارتی خدشات کم کرنے کیلئے یہاں تک تجویز دی کہ پاکستان اقوام متحدہ کی کشمیر پر قراردادوں پر زور نہیں دے گا اور ایسے کسی حل پر غور کا خواہاں ہو گا جس سے بھارت، پاکستان اور کشمیریوں کی تشفی ہوتی ہو۔ لیکن چونکہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا چنانچہ جہادیوں نے ایک بار ہتھیار اٹھا لئے۔ جنرل پرویز مشرف جنہوں نے اسلام پسند عفریت جواب پاکستان کے اندر دہشتگردی کے حملے کر رہی ہے کی تخلیق میں آئی ایس آئی اور فوج کے کردار پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ:

''امریکہ ایسے اسلامی جنگجو پیدا کرنا چاہتا تھا جو افغانستان میں جہاد کیلئے استعمال ہو سکیں۔ ہم نے یہ سوچے بغیر امریکہ کا ساتھ دیا کہ نوجوانوں کی برین واشنگ خود ہمارے معاشرے کو بھی شکار بنا سکتی ہے۔ ہم نے جہادی بننے کیلئے ان کی تربیت کی۔ ہم نے انہیں لوگوں کو مارنے کی تربیت دی۔ ہم نے انہیں افغانستان اور بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں بھجوایا۔ اب انہی عناصر

نے ہمارے اپنے عوام پر دہشت مسلط کر دی ہے۔ یہ ہمارے فوجیوں کو مار رہے ہیں اور اپنا نظریہ مسلط کرنے کیلئے کچھ بھی کر گزرنے کے درپے ہیں۔ میں نے حال ہی میں ایک ویڈیو دیکھی جس میں ایک شخص کا گلا خنجر سے کاٹا جا رہا تھا جبکہ پس منظر میں کچھ باریش افراد اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے''۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) نصیر اختر جو 1990ء کے عشرے میں کور کمانڈر کراچی رہے اور انہیں مہاجر قومی موومنٹ اور سندھی قوم پرستوں سے تعلق رکھنے والی دہشت گردی سے نمٹنے کا خاصا تجربہ ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ممبئی پر حملوں میں القاعدہ کا بھی ہاتھ تھا اور تیاریوں کے لئے عرب سرپرستوں سے پیسہ آیا ہوگا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ مسئلہ کشمیر فوری حل کا متقاضی ہے اور کنٹرول لائن کو مختلف راستوں والی سرحد میں تبدیل کرنا وہ واحد حل ہے جس پر بھارت رضامند ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بھی زور دے کر کہا کہ جنرل مشرف کی تجویز نہ مان کر بھارت نے بہت اچھا موقع ضائع کر دیا۔ ایک سینئر افسر جو حال ہی میں آئی ایس آئی میں اہم عہدوں پر فائز رہے اور براہ راست قومی سلامتی کی پلاننگ کے ذمہ دار تھے انہوں نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر میرے سامنے اعتراف کیا کہ اگر بھارت پاکستان کے اندر فوجی حملے کر لیتا تو اس کا نتیجہ بھاری نقصان کی صورت میں نکلتا۔ ان کا خیال تھا کہ ذمہ دار علاقائی طاقت کا کردار ادا کر کے بھارت نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ افغان جہاد کی وجہ سے پاکستان پر اسلام پسندی اور انتہا پسندی مسلط ہوئی۔ انہوں نے ایسے شکوک و شبہات کی تردید کی کہ فوج کے کسی حاضر سروس عہدیدار یا آئی ایس آئی نے 26 نومبر 2008ء کو دہشت گردی کے حملوں کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایسے مس ایڈونچر سے پاکستان کو فائدہ کچھ نہیں ہونا تھا جبکہ نقصان بہت ہوتا۔ بھارت نے ذمہ دار اور امن پسند ملک کی حیثیت سے بہت فائدہ اٹھایا اور طاقت کے استعمال سے گریز کیا جبکہ پاکستان پوری دنیا میں خودسر ریاست کے طور پر مطعون ہے۔ اس افسر کا خیال ہے کہ پاکستانی طالبان اور القاعدہ نے ممبئی پر حملے میں تعاون کیا اور یہ کہ انتہا پسندوں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ منشیات کی سمگلنگ اور سعودی عرب اور عرب امارات کے ان کے عرب سرپرستوں سے روپے کی بھاری مقدار آتی ہے۔

مشہور اسلام پسند اور آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل نے ان تمام الزامات کو

مسترد کر دیا کہ پاکستان یا پاکستان کا کوئی گروپ حملوں میں ملوث تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ آئی ایس آئی پر یہ الزام من گھڑت ہے کہ اس نے فروری 2007ء میں سمجھوتہ ایکسپریس میں بم نصب کیا تھا۔ بعد میں بھارتی تفتیش کاروں کو پتہ چلا کہ اس واقعے میں ہندو انتہا پسند اور کرنل شری کانت پروہت جیسے بھارتی فوج کے اہلکار ملوث تھے۔ حمید گل نے یہ بھی زور دے کر کہا کہ ممبئی حملے بھی بھارت کے اندر ہندو انتہا پسندوں کا کیا دھرا ہے۔ جنرل حمید گل نے بتایا کہ:

''مجھے بتایا گیا کہ ممبئی حملوں کے بعد امریکیوں نے میرا نام دہشت گردوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ کتنی منافقت ہے! جب انہیں افغانستان میں ہماری ضرورت رہتی ہے تو وہ ہمیں حریت پسند قرار دیتے ہیں لیکن اب ہم دہشت گرد ہو گئے۔ مجھے دہشت گردی کا لیبل لگنے کی کوئی پرواہ نہیں۔ درحقیقت عراق اور افغانستان میں انسانیت کے خلاف جرائم کی مرتکب حکومت کی طرف سے مجھے دہشت گرد قرار دینا ایک اعزاز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوشلزم چند سال پہلے ناکام ہو چکا ہے اور اب کیپٹل ازم کی باری ہے۔ امریکہ زوال کے راستہ پر چل پڑا ہے اور اب مستقبل اسلام کا ہے''۔

بریگیڈئیر (ر) یعسوب علی ڈوگر نے میری توجہ پاکستانی فوج اور دفاعی تجزیہ نگاروں کی اس سوچ کی طرف مبذول کرائی کہ طالبان جس انداز میں پاکستانی فورسز کے ساتھ لڑتے ہیں اس سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ انہیں بیرونی قوتوں کی مدد حاصل ہے۔ منشیات سمگلنگ کے دھندے اور عرب ڈونرز کے پیسے کے علاوہ اس بات کا شدت سے شبہ کیا جاتا ہے کہ طالبان کو مضبوط کرنے کیلئے بھارتی انٹیلی جنس بھی ملوث ہے۔ بھارت نے پاکستان کی سرحد کے ساتھ افغان شہروں میں کئی قونصل خانے قائم کر رکھے ہیں۔ جو خفیہ نیٹ ورکس کے ذریعے طالبان کو پیسہ اور دیگر وسائل فراہم کرنے کا کام کرتے ہیں۔ طالبان کے ساتھ تصادم سے پاکستانی فوج اسی طرح لہولہان ہو رہی ہے جس طرح مقبوضہ کشمیر میں بھجوائے گئے لشکر طیبہ کے عسکریت پسندوں نے تصادم اور سبوتاژ سرگرمیوں سے بھارتی فوج کو زخمی کیا۔ سیدھی سی بات ہے، اینٹ کا جواب پتھر۔

بھارتی نقطہ نظر

میرے بھارت کے مختصر دورے میں مجھے بھارتی فوج کی جنوبی کمان کے سابق سربراہ

لیفٹیننٹ جنرل (ر) ڈاکٹر بی ایس ملک کا انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ ان کا خیال یہ تھا چونکہ پاکستان میں مضبوط جمہوری اداروں کی کمی ہے اس لئے یہ بات حیران کن نہیں کہ وہاں کا سب سے مضبوط ادارہ فوج شروع سے ہی من مرضی کرتا ہے۔ ان کا یہ یقین نہیں تھا کہ فوج نے ممبئی حملوں کا حکم دیا تھا لیکن ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ پاکستان میں حالات قابو سے باہر تھے۔ لشکر طیبہ کے علاوہ کئی اور سازشی عناصر ممبئی حملوں میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ بھارت کے ادارے انڈین ڈیفنس سٹڈیز اینڈ اینالسز کے ساؤتھ ایشین کلسٹر اور انڈین سنٹر فار لینڈ وارفیئر سٹڈیز میں مختلف ملاقاتوں کے دوران یہ بات واضح ہوئی کہ ممبئی حملوں نے بھارت کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا جہاں ماہرین دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کے سنگین خطرے سے آگاہ تھے وہاں انہیں شدید شبہ تھا کہ ممبئی واقعے کی تحقیقات میں پاکستان کے تعاون اور ملزموں کو مناسب سزا دینے تک پاک بھارت تعلقات معمول پر آ سکتے ہیں۔

وائٹ ہاؤس کے محافظ کی تبدیلی

نومبر 2008ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار بارک حسین اوباما امریکہ کے پہلے افریقی نژاد اور 44 ویں صدر منتخب ہوئے۔ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے زور دیا تھا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے ساتھ ایک ایسی حکمت عملی اختیار کریں گے جس کے تحت پاکستان کو امریکی امداد کے بدلے زیادہ مؤثر کردار ادا کرنے کا پابند بنایا جائے گا۔ امریکی عہدیدار رچرڈ ہالبروک نے 2008ء میں ''افپاک'' کی اصطلاح متعارف کرائی جس کا مقصد افغانستان اور پاکستان کو فوجی کارروائیوں کا ایک ہی محاذ ظاہر کرنا تھا۔ اوباما انتظامیہ نے ہالبروک کو افغانستان اور پاکستان کیلئے اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ انہوں نے ''افپاک'' کی اصطلاح کی وضاحت یوں کی ہے:

''اس کا مطلب یہ ظاہر کرنے کی کوشش ہے کہ غیر طے شدہ سرحد ڈیورنڈ لائن ہونے کی وجہ سے محاذ جنگ ایک ہی ہے اور سرحد کے مغربی جانب نیٹو فورسز کارروائی کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن بین الاقوامی دہشتگرد مشرقی سرحد کے اندر واقع ٹھکانوں میں موجود ہیں''۔ (ورلڈ وائڈ ورڈز 2009ء)۔

پاکستان نے ''افپاک'' کی اصطلاح کے استعمال اور پاکستان کو افغانستان سے نتھی کرنے

پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ اپنی عزت نفس کے لحاظ سے پاکستان خود کو بھارت کا ہم پلہ سمجھتا ہے اور اس کی جگہ افغانستان کو قبائل اور وار لارڈز کی ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریسی سمجھتا ہے جس میں کابل کی حکومت کو علاقائی اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ شروع میں رچرڈ ہالبروک اور بعض دیگر ماہرین کا خیال تھا کہ پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پورے جذبے کے ساتھ شامل رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ امریکہ یہ یقین دلائے کہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کو افغانستان میں بھارت کی ضرورت سے زیادہ موجودگی پر بھی شدید تحفظات تھے۔ چنانچہ اوباما انتظامیہ نے جنوبی ایشیا سے متعلق پالیسی اقدامات میں بھارت کو براہ راست شامل کرنے سے گریز کیا تاہم باضابطہ طور پر ''افپاک'' کی اصطلاح کبھی تجویز نہیں کی گئی۔ اس تجویز پر بھارت سیخ پا ہوگیا اور واضح کیا کہ امریکہ کی ثالثی کا کوئی اقدام اسے قبول نہیں ہوگا۔ امریکیوں نے فوراً پسپائی اختیار کر لی اور اس کے بعد ''افپاک'' کے معاملے میں بھارت کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔

دہشت گردی عفریت بدستور قابو سے باہر رہا جس سے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی ''اسلام کے قلعے'' کو کسی نقصان سے بچانے کی صلاحیت طشت از بام ہوگئی۔ تحریک طالبان اور اس کے شریک گروپوں نے پاکستان کے اندر اپنی منظم اور ٹھوس دہشتگردی جاری رکھی۔ 2009 کے اوائل میں دہشتگردی کا مرکز قبائلی علاقوں سے وادی سوات کو منتقل ہوگیا۔

سوات میں اسلامی امارت کا قیام

1989ء سے افغان جہاد کا ایک عمر رسیدہ عسکریت پسند صوفی محمد پورے جوش و جذبے سے سیاحتی مرکز وادی سوات میں وہابیت کے فروغ کا کام کر رہا تھا۔ صوبہ سرحد کے دیگر حصوں کے برعکس سوات کے لوگ اگرچہ پختون ہی ہیں لیکن وہاں ہتھیار رکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ بلکہ تاریخی اعتبار سے یہ لوگ پرامن بقائے باہمی کے قائل تھے کیونکہ ماضی بعید میں یہاں بودھ تہذیب کافی پھلی پھولی ہوئی تھی۔ تقسیم ہند کے وقت بھارت سے کئی ہندو خاندان سوات منتقل ہو گئے کیونکہ یہاں کا حکمران والی رواداری پر مبنی پالیسی رکھتا تھا۔ اگرچہ والی سوات نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا لیکن یہ 1969ء تک صوبہ سرحد میں مدغم نہیں ہوا تھا۔

صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی نے پرانے نظام میں اتھل پتھل شروع کر دی۔ اس کی

جگہ وہی مشہور اور ظالمانہ اور امتیازی حکومت کا نظام متعارف کرانے کی کوشش کی گئی جس میں جنسی فعل کے مرتکب افراد اور مجرموں کو فوری سماعت کے بعد پھانسی دے دی جاتی ہے۔ تحریک نفاذ شریعت محمدی تحریک طالبان پاکستان سے منسلک جماعت کے طور پر ابھری۔ البتہ وہابی نظریے سے اخذ کی گئی اس کی مقامی خودمختاری اور نظریاتی خصوصیات بھی تھیں..... یہ دراصل مجموعی طور پر دیو بندی مکتبہ فکر کے طالبان سے الگ نظریہ تھا۔ سیاسی معنوں میں دونوں کے درمیان شاید ہی کچھ فرق ہوگا۔ درحقیقت تحریک نفاذ شریعت کی لڑکیوں کے سکول مسمار کرنے اور طلبہ اور طالبات کو جدید علوم سے روکنے کا جذبہ عین طالبان والا ہی تھا۔ حکومت پاکستان اور تحریک نفاذ شریعت محمدی کے درمیان پہلے 2007ء اور پھر 2008ء میں ہونے والے معاہدے کے تحت صوفی محمد کو اپنے زیر اثر علاقے میں شرعی قوانین نافذ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بدلے میں ریاستی رٹ تسلیم کرنے اور انہیں دہشت گردی کی سرگرمیاں روکنے کی شرط لگائی گئی۔ تحریک طالبان اور تحریک نفاذ شریعت محمدی دونوں معاہدے کا احترام کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ امریکہ نے اس معاہدے کو حکومت کے ہتھیار پھینکنے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بلاتفریق حصہ لینے کے وعدے سے غداری کے مترادف قرار دیا۔ تاہم پاکستان اس بات پر مصر رہا کہ محدود علاقے میں شرعی قوانین کا نفاذ دہشت گردی کے خلاف لڑائی کے عزم سے متصادم نہیں۔

جنوری 2009ء میں ایسی اطلاعات ملنا شروع ہوگئیں کہ سوات کو اسلامی امارت میں تبدیل کرنے کیلئے تحریک نفاذ شریعت ایک بڑا حملہ کرنے والی ہے۔ اس تنظیم نے قبل ازیں باجوڑ اور مہمند ایجنسی میں سکولوں اور حکومتی عمارتوں کو تباہ کیا اور اب سوات وادی میں بھی یہی کچھ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ایسی امارت کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ سکولوں کی سینکڑوں عمارتوں کو تباہ کر دیا جائے اور جنسی افعال اور دیگر جرائم میں ملوث افراد کو سرعام اعضا کاٹنے، کوڑے لگانے، سنگسار کرنے کی سزائیں دی جائیں۔ فوج نے اس سے پہلے صوفی محمد کے ساتھ معاہدے کئے تھے جس کے تحت تحریک شریعت کو سخت اسلامی قوانین نافذ کرنے کی اجازت دی گئی اور بدلے میں صوفی محمد نے ریاست کی مجموعی عملداری تسلیم کر لی۔ ان معاہدوں کے نفاذ کے فوراً بعد ان کی خلاف ورزی شروع ہوگئی کیونکہ ٹی این ایس ایم نے لوگوں کو سزائیں دینا اور سرکاری دستوں کو ہراساں کرنے کا عمل جاری رکھا۔ آخری معاہدہ 5 فروری 2009ء کو کیا گیا جس کے تحت شرعی قوانین کے نفاذ اور شرعی

عدالتوں کے قیام کی اجازت دی گئی تاہم مالاکنڈ میں سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ کے قیام کے ذریعے حکومتی نگرانی بھی طے پائی۔ اس اقدام کو سوات کے عوام کے ساتھ ظالمانہ سلوک کے لئے ٹی این ایس ایم کو کھلی چھوٹ سے تعبیر کیا گیا۔ لڑکیوں کے سکول تباہ کرنے کے ساتھ ٹی این ایس ایم نے حکم جاری کیا کہ مستقبل میں لڑکیاں صرف پانچویں جماعت تک سکول میں پڑھ سکیں گی۔ جب صدر آصف زرداری نے اعلان کیا کہ شرعی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سپریم کورٹ میں سنی جائیں گی تو ٹی این ایس ایم نے اسے مسترد کر کے دہشت گردی کی مہم تیز کر دی۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے ایک اور علاقے ...اورکزئی ایجنسی... میں تحریک طالبان نے یہ مطالبہ کر کے دہشت پھیلا دی کہ مقامی سکھ جزیہ ادا کریں، علاقہ چھوڑ دیں یا پھر تلوار کا سامنا کریں۔ اب تک ہندو اور سکھ قبائلی علاقوں میں پختونوں کے درمیان پرامن طریقے سے پختون ولی کے مطابق رہ رہے تھے۔ ان حالات میں سکھ، ہندو اور عیسائی برادریوں کے ہزاروں افراد قبائلی علاقوں سے بھاگنا شروع ہو گئے۔

سری لنکا کی ٹیم پر حملہ

اگرچہ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں میں 1980ء کے عشرے سے جبر و بربریت جبکہ پنجاب میں 1980ء کے عشرے کے آخر سے فرقہ واریت نے زندگیوں میں زہر گھول رکھا تھا لیکن مارچ میں عسکریت پسند انتہا پسندی سے کھیلوں کا شعبہ بھی محروم نہ رہا۔ 3 مارچ 2009ء کو دہشت گردی کا مرکز ثقل پنجاب کے دارالحکومت لاہور منتقل ہو گیا۔ اس روز سری لنکا کی کرکٹ ٹیم کی بس قذافی سٹیڈیم کے قریب پہنچی تھی کہ اس پر دستی بموں، راکٹ لانچروں اور فائرنگ سے حملہ کر دیا گیا۔ چونکہ بس تیزی سے بھاگ رہی تھی اس لئے تمام اسلحے کی زد میں آنے سے محروم رہی۔ حملے میں سری لنکا کے 8 کرکٹر معمولی زخمی ہوئے جبکہ پاکستان کے 5 سکیورٹی اہلکار ان کا دفاع کرتے موت کے منہ میں چلے گئے۔ 2 راہگیر مرنے کی بھی اطلاعات آئیں۔ ٹی وی پر لائیو دکھائے جانے والے مناظر میں دیکھا جا سکتا تھا کہ دہشت گرد کتنے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ فائرنگ کر رہے تھے اور ان کے چہرے سے کوئی بوکھلاہٹ اور جلدی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ بات حیران کن نہیں کہ پنجاب کے سینئر وزیر راجہ ریاض نے اس حملے اور ممبئی کے واقعات کو ایک ہی

قوت کا شاخسانہ قرار دیا۔ پاکستان میں دہشت گردی کی بدترین صورتحال کی وجہ سے کسی ملک کی ٹیم نے یہاں آنے سے انکار کر دیا تھا تاہم سری لنکا کی ٹیم نے کھیلنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس حملے نے پاکستان کے میڈیا کیلئے ایک عمل انگیز کا کام کیا کہ وہ ملک میں دہشت گردی کے بڑھتے خطرے کو اجاگر کرے۔ بہرحال اس واقعے میں بھارت اور افغانستان کا ہاتھ ہونے کے سازشی نظریات گردش کرتے رہے۔

نواز شریف نے لانگ مارچ کا اعلان کر دیا

جہاں ایک طرف دوست ملک سری لنکا کی ٹیم پر دہشت گردوں کے حملے سے عوام سکتے کی کیفیت میں تھے وہاں نواز شریف کے مارچ 2009ء کے دوسرے ہفتے میں لانگ مارچ کرنے کے اعلان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ لانگ مارچ دراصل افتخار چودھری سمیت معزول ججوں کی بحالی کیلئے وکلا کے لانگ مارچ میں شمولیت کا اعلان تھا۔ اس فیصلے کی جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ لاہور ہائی کورٹ کے 3 رکنی بینچ نے نواز شریف اور ان کے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو سرکاری عہدوں کے لئے نااہل قرار دیا تھا۔ اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا کہ (ن) لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان سڑکوں پر تصادم نہ شروع ہو جائے۔ ان خدشات کو نظرانداز کرتے ہوئے نواز شریف نے لاکھوں کارکنوں کو اسلام آباد میں جمع کرنے کی دھمکی دے دی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ سپریم کورٹ کے جج صاحبان کو ان کے فاضل بنچوں پر بحال کرنے کیلئے انہوں نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی۔ یہ بات کہتے ہوئے شاید ان کا مطمع نظر وہ داغ دھونا تھا جو سابق دور میں سپریم کورٹ کی عمارت اور ججوں پر حملہ کرنے سے ان پر لگا تھا۔ جماعت اسلامی اور تحریک انصاف کے کرشماتی لیڈر عمران خان نے بھی مجوزہ مارچ میں شرکت کرنے کا اشارہ دیا۔

ان عزائم کا جواب وزیراعظم گیلانی نے دفعہ 144 کا نفاذ کر کے دیا جس کے تحت 5 یا اس سے زائد افراد کے ایک جگہ جمع ہونے پر پابندی ہوتی ہے۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد اور بعض دیگر مقامات پر پولیس کی مظاہرین سے جھڑپیں ہوئیں۔ ہزاروں سیاسی کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ حکومت نے محسوس کیا کہ طاقت کے بے دریغ استعمال کے بغیر لانگ مارچ نہیں روکا جا سکتا۔ سندھ میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی مخلوط حکومت، اسی طرح صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں

نے پیپلز پارٹی کی قیادت کو یہ کہہ کر نہایت ذمہ دارانہ کردار ادا کیا کہ لانگ مارچ ہونے کی صورت میں ان کے صوبوں کے عوام بھی اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ واشنگٹن تک میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ امریکہ پاکستان میں عدم استحکام نہیں چاہتا تھا۔ وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے صدر زرداری اور نواز شریف دونوں سے کہا کہ تحمل کا مظاہرہ کیا جائے۔ پاکستان میں امریکی سفیر این پیٹرسن سمیت دیگر امریکی سفارتکاروں نے بھی کشیدگی کم کرانے کیلئے رابطے کئے۔ مبینہ طور پر نواز شریف نے امریکی سفیر پر واضح کیا کہ وہ اپنے مؤقف سے پیچھے نہیں ہٹیں گے اور اگر پیپلز پارٹی نے اپنی آمرانہ پالیسیاں تبدیل نہ کیں تو مارچ آگے ضرور جائے گا۔ جیسے جیسے تصادم کے امکانات بڑھے اور نواز شریف نے 16 مارچ 2009ء کو لانگ مارچ شروع کرنے کی تاریخ بھی دے دی تو پیپلز پارٹی قیادت کی طرف سے عدم اتفاق کے بڑے آثار ڈرامائی انداز میں منظر عام پر آنے لگے۔ وزیر اطلاعات شیری رحمان نے مقبول ٹی وی چینل کی نشریات بند کرنے میں مشاورت نہ کرنے پر احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ اس سے پہلے آصف زرداری کے ذاتی وکیل فاروق نائیک کو چیئرمین سینٹ بنانے پر بین الصوبائی رابطوں کے وفاقی وزیر میاں رضا ربانی مستعفی ہو چکے تھے۔ ربانی کی طرح نائیک اس وقت سینٹ کے ممبر تک نہیں تھے۔ پنجاب پولیس نے عوام کے خلاف مزید تشدد اور جبر سے انکار کر دیا۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اہم صوبہ پنجاب میں پیپلز پارٹی اس سیاسی مظاہرے میں (ن) لیگ کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ فروری 2009ء کے آخر میں دورہ واشنگٹن میں آرمی چیف جنرل اشفاق کیانی نے امریکیوں کو یقین دہانی کرائی کہ فوج سیاسی معاملات سے دور رہے گی۔ لیکن پاکستان میں سیاستدانوں کے ایک بڑے سیاسی شو کے خدشات کے پیش نظر انہوں نے فوج کو حاصل بالادستی کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ رپورٹ کے مطابق آرمی چیف نے حکومت سے کہا کہ طاقت کا استعمال کرنے سے گریز کیا جائے۔ فوج نے محسوس کر لیا تھا کہ عوام جسٹس افتخار چودھری اور ان کے ساتھ ججوں کی بحالی چاہتے تھے۔ ان حالات کے تناظر میں حکومت نے ہتھیار پھینکنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ نواز شریف کی زیر قیادت لانگ مارچ شروع ہوتے ہی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اعلان کیا ''میرے ہم وطنو، میں اپنے اور صدر پاکستان کے وعدے کے مطابق مسٹر افتخار محمد چودھری سمیت تمام برطرف ججوں کی بحالی کا اعلان کرتا ہوں''۔ اس تقریر میں انہوں نے یہ بھی

اعلان کیا کہ حکومت شریف برادران کو لاہور ہائی کورٹ سے نااہل قرار دینے کے فیصلے کے خلاف اپیل کرے گی کیونکہ عدالتی فیصلے پر عوام میں کافی منفی جذبات پائے جاتے تھے۔

امریکی دباؤ بڑھ گیا

پاکستان میں ہونے والے واقعات سے سینکڑوں میل دور امریکہ میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ امریکہ نے پیسے اور میٹریل کے ساتھ اس امید پر پاکستان پر بھاری سرمایہ کاری کی کہ پاکستانی فوج دہشتگردوں کے نیٹ ورکس اور ان کے ٹھکانوں کے خلاف کارروائی کرے گی لیکن داخلی طور پر جو عدم استحکام اور امن و امان کی صورتحال پیدا ہو رہی تھی وہ امریکہ کا مطمع نظر نہیں تھی۔ ''افپاک'' کی اصطلاح..... جس پر پاکستان نے ناراضگی کا اظہار کیا لیکن امریکہ نے اپنی پالیسی پر سمجھوتہ کئے بغیر اس کا نسبتاً کم استعمال جاری رکھا.... کے آغاز کے بعد پاکستان میں امریکی عہدیداروں کی آمد و رفت میں اضافہ ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکہ نے پے در پے اور مسلسل دورے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ پاکستان کو القاعدہ اور طالبان کے خلاف کارروائی پر بدستور آمادہ رکھا جا سکے۔ ان حالات میں ایک خاص صورتحال نے جنم لیا۔ جہاں ایک طرف بعض ممتاز امریکی عہدیداروں نے فوج کے دہشتگردوں سے لڑنے کے عزم پر شکوک کا اظہار کیا.... پاکستان نے غصے سے تردید بھی کی.... وہاں چند دیگر امریکی عہدیدار پاکستان کے دہشتگردی کے خلاف جنگ میں کردار پر رطب اللسان رہے۔ یہ نیا طریقہ واردات جنرل کیانی کے آرمی چیف بننے پر زیادہ ٹھوس شکل اختیار کر گیا۔ سابق آرمی چیف جنرل مشرف بش کے دور سے وابستہ تھے جبکہ جنرل کیانی تبدیلی کی نمائندگی کرتے تھے.... جو فوج کی جاری بالادستی کی پالیسی سے الٹ تھی۔ بالخصوص امریکہ کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی ایڈمرل مائیک مولن نے 2008 سے 2009 کے درمیان اسلام آباد کے کئی دورے کئے۔ اپریل 2009ء میں افغانستان اور پاکستان کے لئے امریکہ کے نئے نمائندے رچرڈ ہالبروک اور مائیک مولن دونوں نے پہلے افغانستان اور پھر پاکستان کا دورہ کیا۔ امریکی سفیر این پیٹرسن کی طرف سے ایک استقبالیہ تقریب میں ممتاز پاکستانی شخصیات سے غیر رسمی گفتگو میں ہالبروک نے واضح کیا کہ سٹرٹیجک حوالے سے پاکستان بدستور امریکہ کیلئے انتہائی تشویش کا باعث ہے۔ ہالبروک نے یہ بھی کہا کہ افغان حکومت کہتی ہے کہ

افغانستان کے مسئلے کی جڑ پاکستان میں ہے اور بالخصوص آئی ایس آئی اس کی ذمہ دار ہے۔ آئی ایس آئی پر اس تنقید پر سفارتی محاذ آرائی شروع ہوگئی کیونکہ فوج نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس پر مائیک مولن نے یہ کہہ کر معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی ایک صاف گو انسان ہیں جن کے ساتھ ہم سٹرٹیجک سطح پر باہمی اعتماد اور مفاد کیلئے مل کر کام کر سکتے ہیں۔ البتہ ہالبروک اور مولن دونوں نے یہ بات واضح کرنے میں ذرا بھر تامل نہ کیا کہ پاکستان کے لئے امریکہ کی عسکری اور اقتصادی امداد القاعدہ کے خلاف پاکستان کے ٹھوس تعاون سے مشروط ہوگی اور یہ کہ امریکہ پاکستان کی خودمختاری کا احترام کرتا ہے اور قبائلی علاقوں میں ''امریکی بوٹ'' آنے کا کوئی امکان نہیں۔ (ڈیلی ٹائمز 7 اپریل 2009ء)۔

ہیلری کلنٹن نے الزام لگایا کہ ملک کے کچھ حصوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ پر آمادگی ظاہر کر کے پاکستان طالبان کے آگے جھک گیا ہے اور یہ کہ ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح پاکستان دنیا کی سلامتی کیلئے ''اخلاقی خطرہ'' ہے۔ ہیلری کے ریمارکس کے فوراً بعد سی این این سے انٹرویو میں امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی نے پاکستان میں طالبانائزیشن کے خطرے کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے امریکی میڈیا کی ایسی رپورٹوں کو حد سے زیادہ بڑھا ہوا قرار دیا کہ پاکستان میں طالبان تیزی سے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے ہیں اور دارالحکومت اسلام آباد سے محض 60 میل دور رہ گئے ہیں۔ (دی نیوز، 23 اپریل 2009ء)۔

لیکن ان تردیدوں سے پاکستان میں زمینی حقائق سے پہلو تہی ممکن نہیں تھی۔ یوٹیوب پر دکھائی گئی ایک ویڈیو فوٹیج میں دکھایا گیا کہ طالبان ایک لڑکی کو کسی محرم کے بغیر گھر سے باہر آنے پر کوڑے مار رہے تھے۔ جیسا کہ پہلے ہوتا آیا ہے۔ دائیں بازو کے میڈیا عناصر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ویڈیو جعلی ہے۔ طالبان کے ایک ترجمان نے بھی ویڈیو فوٹیج کے خلاف وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی طالبان نے تقریباً روزانہ کی بنیاد پر اعلانات شروع کر دیے کہ وہ پورے پاکستان میں شرعی قوانین نافذ کریں گے۔ ایک بیان میں انہوں نے وکلا برادری کو دھمکی دی کہ وہ انگریزوں سے ورثے میں ملنے والے غیر اسلامی قانونی نظام کے تحت کام کرنے پر سنگین نتائج کے لئے تیار رہیں۔ وفاقی وزیر داخلہ رحمان ملک نے اس موقع پر ایک اور ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہوئے اس مسئلے پر توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ بلوچستان میں علیحدگی

پسندوں کو تقویت دینے کیلئے بھارت اور روس دونوں مل کر سازش کر رہے ہیں۔ رحمان ملک نے بھارت پر زور دیا کہ وہ بلوچستان لبریشن آرمی کی حمایت کرنے اور صوبے میں مداخلت سے باز رہے۔ انہوں نے یہ کہہ کر کلہاڑا چلا دیا کہ ''بھارت پاکستان کا کھلا دشمن ہے''۔ بلوچستان کے بعض سینیٹروں نے رحمان ملک کے الزامات کو مسترد کیا لیکن وہ بدستور اپنی بات پر مصر رہے۔ (دی نیوز، 23 اپریل 2009)۔

فوج کا تحریک نفاذ شریعت محمدی کے خلاف آپریشن کا فیصلہ

2009 کے ابتدائی مہینوں میں تسلسل کے ساتھ پاکستانی پرنٹ میڈیا اور ٹی وی کے ٹاک شوز میں طالبان کی زیادتیوں کی خبریں نمایاں ہوتی رہیں اور بعض مبصرین نے جہادیوں کے قدامت پسند طریقوں کی مذمت کی۔ اسلام آباد کے ایوانوں میں اس وقت خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں جب تحریک نفاذ شریعت محمدی نے اوائل اپریل میں سرکاری دفاتر تباہ کر دیے اور سول اور فوجی اہلکار وہاں سے سراسیمگی میں بھاگ گئے جبکہ ہزاروں افراد بھی نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ 24 اپریل 2009ء میں جنرل کیانی نے سخت الفاظ میں طالبان کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا کہ ''فوج طالبان کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ حکمت کو ہدایات جاری کریں یا پاکستان کے معاشرے پر اپنا طرز زندگی مسلط کریں''۔ (ڈیلی ٹائمز، 25 اپریل 2009ء)۔ ان کا اشارہ طالبان کے اپنے زیر اثر علاقوں میں سخت شرعی قوانین کے نفاذ کی طرف تھا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ طالبان سے نمٹنے کیلئے فوج کی صلاحیت اور اس کے ارادے کے حوالے سے شکوک و شبہات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی سالمیت اور علاقائی خودمختاری کے تحفظ کیلئے فوج کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔ دہشت گردوں کے خلاف ہر قیمت پر فتح حاصل کی جائے گی۔ (ڈیلی ٹائمز، 25 اپریل 2009ء)۔ آرمی چیف نے کئی ممالک کی طرف سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں تشویش کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ 17 کروڑ عوام اور جمہوری نظام کا حامل ملک ہر قسم کے بحران کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (ڈیلی ٹائمز، 25 اپریل، 2009ء)۔ 26 اپریل 2009ء کو وادی سوات کے کئی علاقوں میں آپریشن ''بلیک تھنڈر سٹارم'' شروع کر دیا گیا۔ اس کا آغاز بھاری توپخانے اور فضائی بمباری کے استعمال سے ہوا جس کے بعد انفنٹری کے دستوں نے علاقہ کلیئر

کیا۔ اس دوران ڈیلی آپریشن ''راہ راست'' شروع کیا گیا جس میں وادی سوات میں فضا سے کمانڈوز اتارے گئے۔ چند ہی ہفتوں میں شہری علاقوں سے طالبان کو نکال دیا گیا۔ فوجی دستوں اور طالبان کے درمیان سڑکوں پر دست بدست لڑائی ہوئی اور دونوں طرف سینکڑوں ہلاکتیں ہوئیں۔ 30 مئی کو فوج نے بتایا کہ باقی ماندہ مزاحمتی چوکیوں کے خاتمے کے بعد مرکزی شہر مینگورہ پر کنٹرول واپس لے لیا گیا ہے۔ لڑائی سے پہلے مینگورہ کی آبادی 2 لاکھ تھی۔ ان میں سے بیشتر جان بچا کر سوات سے باہر چلے گئے۔ جیسے جیسے لڑائی سوات کے دیگر علاقوں کی طرف منتقل ہوئی تو لوگوں کا ایک انبوہ کثیر گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی تعداد 20 لاکھ بھی بتائی جاتی ہے۔

جنرل کیانی نے فضا سے سوات آپریشن کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں موجود ائیر چیف مارشل راؤ قمر سلیمان نے کہا کہ دہشت گردی کی لعنت ختم کرنے کیلئے فوج اور فضائیہ متحد ہیں۔ (ڈیلی ٹائمز، 16 جون 2009ء)۔ لڑائی جون اور جولائی میں بھی جاری رہی۔ فوج نے اس میں مکمل کامیابی کا دعویٰ کیا۔ صوفی محمد کو جون میں پکڑ لیا گیا۔ اس کا داماد اور ان سے زیادہ جنونی ملا فضل اللہ فضائی حملے میں زخمی ہوا لیکن پکڑا نہ جا سکا۔ فوج نے وادی سوات پر مکمل کنٹرول کا دعویٰ کیا چنانچہ 22 اگست تک 22 لاکھ افراد میں سے 16 لاکھ گھروں کو واپس آ چکے تھے۔

جنوبی وزیرستان میں آپریشن راہ نجات

سوات آپریشن میں ملنے والی کامیابی نے پاکستانی فوج کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ جنوبی وزیرستان میں تحریک طالبان کا ان کے مضبوط گڑھ میں تعاقب کرے۔ آپریشن راہ نجات 19 جون 2009ء کو شروع ہوا۔ 5 اگست 2009ء کو امریکہ کے ڈرون سے چلائے گئے میزائل حملے میں بیت اللہ محسود مارا گیا۔ یہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی میں امریکی اور پاکستانی فورسز کے درمیان تعاون کا واضح اشارہ تھا۔ 2 ستمبر کو وفاقی وزیر مذہبی امور حامد سعید کاظمی پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس کی فوری وجہ یہ لگتی تھی کہ حامد سعید کاظمی نے علماء اور مشائخ کا ایک اجلاس بلایا جس کے شرکا نے نہ صرف دہشت گردی کی مذمت کی بلکہ اس کے خلاف فتویٰ بھی دیا۔ مئی 2009 میں میری ان سے اسلام آباد میں ایک کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ نہ صرف صوبہ سرحد بلکہ پنجاب میں بھی طالبان کے حامی مولویوں نے بریلوی مکتبہ فکر کی مساجد پر قبضہ کر لیا ہے لیکن حکومت بے

بس ہے۔

اس تمام صورتحال میں ستمبر کے شروع میں جنرل کیانی نے ایسے مردوں کیلئے ایک بحالی مرکز کا افتتاح کیا جنہیں طالبان نے نظریاتی طور پر تیار کیا اور دہشت گردی اور خودکش بمباری کی تربیت دی۔انہوں نے زور دے کر کہا کہ فوج نے دہشتگردوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے اور آخری دہشت گرد کے خاتمے تک آپریشن راہ راست جاری رہے گا۔انہوں نے مقامی قبائلی عمائدین کے وفد سے ملاقات میں کہا کہ دہشت گردوں کا نیٹ ورک توڑ کر سوات میں امن بحال کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے آپریشن سے بے گھر ہونے والے مقامی افراد کی بحالی کے ایشو پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ مقامی رہنماؤں نے فوج کی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔(ڈیلی ٹائمز 5 ستمبر 2009)۔ 11 ستمبر 2009 کو سوات کے طالبان کے بعض سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔فوج نے اعلان کیا کہ سوات آپریشن میں 1800 طالبان مارے گئے۔

گیری لوگر بل

امریکہ کی طرف سے پاکستانی فوج کے مؤثر اور پرعزم آپریشنز کی فوری طور پر ستائش سامنے آئی۔24 ستمبر 2009ء کو امریکی سینٹ جبکہ 30 ستمبر کو ایوان نمائندگان نے" پاکستان کے ساتھ توسیع شدہ شراکت داری ایکٹ 2009" جسے کیری لوگر بلکہ مزید تصحیح کے ساتھ کیری۔لوگر۔ برمن بل کا نام دیا گیا کی منظوری دی گئی۔جس کے تحت اگلے 5 برسوں میں پاکستان کو ساڑھے 7 ارب ڈالر کی اقتصادی اور فوجی امداد دی جانی تھی۔اس بل کا بظاہر مقصد القاعدہ اور طالبان کے خلاف جنگ میں پاکستان کی سول اور عسکری اشرافیہ سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنا تھے لیکن اس کے پیچھے سیاسی انجینئرنگ کا منصوبہ بھی کارفرما تھا جس کے تحت جمہوریت کے مفاد میں فوج پر سویلین بالادستی کی راہ ہموار کرنا تھا۔اس کے علاوہ بل میں ایسی شرائط اور طریقہ ہائے کار بھی شامل کئے گئے تھے جس سے امریکی امداد کی مؤثر نگرانی اور پاکستان کی طرف سے خورد برد کے امکانات کو کم سے کم کرنا تھا۔(کیری لوگر بل،2009)۔

اس بل پر پاکستان کے دائیں بازو کے میڈیا نے طوفان بدتمیزی برپا کر دیا۔عوامی دانشوروں اور اسلام پسندوں نے بل کے خلاف تبصرے کئے اور اسے پاکستان کی خودمختاری سلب

کرنے کی سوچی سمجھی امریکی سازش قرار دیا۔ ماضی میں ان قوتوں کا ضمیر اس وقت شرمندگی کا شکار نہیں ہوا جب افغانستان میں جہاد کیلئے امریکہ سے پیسہ لیا گیا۔ اب جبکہ اوباما انتظامیہ یہ روش تبدیل کرنا اور دنیا میں قیام امن کیلئے اقوام متحدہ کے اصل چارٹر کی طرف لوٹنا چاہتی تھی تو پاکستان کے منفی سیاستدانوں نے شور برپا کر دیا کہ ان کے بقول پاکستان کی خودمختاری پر سمجھوتہ کیا جا رہا تھا۔ یہ الزام لگایا گیا کہ کیری لوگر بل پاکستان پر اقتصادی، سیاسی اور عسکری میدان میں بتدریج کنٹرول حاصل کرنے کا مکروہ منصوبہ تھا۔ بل پر پاکستان کی تشویش دور کرنے کیلئے اس بل کے ایک خالق اور رچرڈ ہالبروک نے پاکستان کا دورہ کیا۔ (ڈیلی ٹائمز، 20 اکتوبر 2009)۔ ان دونوں امریکی رہنماؤں نے یقین دلایا کہ بل کسی بھی طرح سے پاکستان پر شرائط عائد کرنے یا اس کی خود مختاری پر سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں۔ یقیناً اس بل پر پاکستان میں ایک اور حلقے کی طرف سے بھی تنقید کی گئی اور وہ تھا فوج۔ اگر چہ کیری لوگر بل میں پاکستانی سکیورٹی اداروں کو دہشت گردوں سے لڑنے کی تربیت دینے اور جدید آلات مہیا کرنے کا ذکر شامل تھا لیکن یہ شق بھی شامل تھی کہ پاکستان لشکر طیبہ اور جیش محمد جیسی دہشت گرد تنظیموں کو غیر مسلح کرنے کے ساتھ القاعدہ اور طالبان کا بھی خاتمہ کرے گا۔

آئی ایس پی آر نے ایک بیان جاری کیا کہ آرمی چیف کی زیر صدارت کور کمانڈروں کے اجلاس میں کیری لوگر بل میں قومی سلامتی کے منافی شقوں پر سخت تشویش کا اظہار کیا گیا۔ جنرل کیانی نے اجلاس میں کہا کہ ''پاکستان ایک خودمختار ملک ہے اور اپنے قومی مفادات کے مطابق لاحق خطرات کا جواب دینے کا پورا حق رکھتا ہے''۔ البتہ اجلاس میں فوجی کمانڈروں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ''پارلیمنٹ ہی وہ ادارہ ہے جو پاکستان کے عوام کی خواہشات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو اس مسئلے پر ذمہ داری کا مظاہرہ کرے گی اور حکومت کو قومی سطح پر رسپانس دینے کی طرف مائل کرے گی''۔ جنرل کیانی نے اپنے اختتامی کلمات میں کہا کہ ''پاکستان علاقائی اور عالمی امن کیلئے پرعزم ہے اور ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ہم آہنگی پر مبنی تعلقات چاہتا ہے''۔ (دی نیوز، 8 اکتوبر 2009)۔

فوج کا یہ ردعمل دراصل اس کی بے چینی کی جزوی عکاسی کرتا ہے جس میں پاکستان میں طاقت کا ایک نیا توازن سامنے آ رہا تھا جو فوج کی قیمت پر سویلین اداروں کی وقعت میں اضافے کا سبب بن سکتا تھا۔ یہ گویا عائشہ صدیقہ کے بقول وسیع تناظر میں ادارہ جاتی مفاد کا مظہر تھا جس

میں فوج کے ردعمل کی وضاحت کی گئی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کیری لوگر بل کو مسترد کر سکتا ہے۔ البتہ حالیہ برسوں کے دوران دگرگوں اقتصادی صورتحال اور عسکری حوالے سے انحصار کے تناظر میں اس بات کے بہت کم امکانات تھے کہ اسٹیبلشمنٹ بل مسترد کرے گی کیونکہ اس انحصار کی بدولت پاکستان کے طاقت کی مساوات میں فوج کی برتر پوزیشن قائم تھی۔ صدر اوباما نے 15 اکتوبر 2009ء کو بل پر دستخط کر دیے اور یوں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں یہ مستقبل کے پاک امریکہ تعاون کی بنیاد بن گیا۔

جی ایچ کیو پر حملہ

10 اکتوبر 2009ء کو ہفتے کے روز طالبان عسکریت پسندوں نے فوجی انداز میں راولپنڈی میں جی ایچ کیو پر حملہ کر دیا اور احاطے میں گھس گئے۔ جب سکیورٹی اہلکاروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے فائرنگ شروع کر دی اور دستی بم پھینکے۔ دونوں جانب سے فائرنگ کے تبادلے میں 6 سکیورٹی اہلکار اور 4 دہشت گرد موت کا شکار ہوئے۔ کچھ طالبان جی ایچ کیو کی عمارت میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور درجنوں افراد کو یرغمال بنا لیا۔ پوری رات اندھا دھند فائرنگ ہوتی رہی۔ صبح کے وقت فوج کے ایلیٹ ایس ایس جی کمانڈوز بیشتر یرغمالیوں کو چھڑوانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کارروائی میں مزید 4 دہشت گرد مارے گئے جبکہ ان کا سرغنہ عقیل عرف ڈاکٹر عثمان زندہ پکڑ لیا گیا۔ جاں بحق ہونے والے فوجیوں میں ایک بریگیڈیئر اور لیفٹیننٹ کرنل بھی شامل تھے۔ سکیورٹی کے 2 اہلکار، 9 دہشت گرد اور 3 سویلین، مجموعی طور پر 20 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میڈیا رپورٹوں میں خیال ظاہر کیا گیا کہ اس کارروائی کے ڈانڈے پنجاب سے ملتے ہیں جہاں جنوبی اضلاع میں ہر گزرتے روز کے ساتھ جنونی اسلام پسندوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ میڈیا اور انٹرنیٹ پر ایک نئی تنظیم پنجابی طالبان کا بھی چرچا ہونے لگا۔

بلاخوف تردید جی ایچ کیو پر حملہ القاعدہ اور طالبان کے گٹھ جوڑ کا نہایت جراتمندانہ اور بے باک اقدام تھا کیونکہ جی ایچ کیو کے اردگرد سکیورٹی انتظامات نہایت سخت تھے۔ یہ ماننا نہایت مشکل ہے کہ یہ کارروائی خالصتاً باہر سے کی گئی۔ جی ایچ کیو کے کچھ حاضر سروس یا ریٹائر عناصر کا اس حملے میں ضرور کوئی کردار ہوگا۔

جی ایچ کیو پر حملے کے بعد اس ہفتے 2 مزید ہولناک حملے کئے گئے۔ 5 اکتوبر سوموار کو ایف سی کی وردی میں ایک خودکش بمبار اقوام متحدہ فوڈ پروگرام کے دفتر میں گھس گیا اور دھماکہ کر دیا۔ اقوام متحدہ کے ایک سفارتکار اور 3 خواتین ملازمین سمیت 5 افراد مارے گئے۔ یہ خودکش حملہ آور ڈیوٹی پر موجود 25 سے زائد اہلکاروں کو دھوکہ دینے میں کامیاب رہا۔ پھر 9 اکتوبر کو جمعہ کے روز پشاور کے مصروف ترین علاقے سوئیکارنو چوک پر ایک خودکش بمبار نے خود کو اڑا لیا۔ اس وقت سکول کے بچوں کی ایک بس وہاں سے گزر رہی تھی۔ اس واقعے میں 50 سے زائد جانیں گئیں اور ایک سو افراد زخمی ہوئے۔

ہیلری کلنٹن کا دورہ پاکستان

امریکہ کا پاکستان پر دباؤ برقرار رہا لیکن یہ مار اور پیار دونوں کا ملغوبہ تھا۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن 28 سے 30 اکتوبر کے دوران پاکستان آئیں۔ ان کا دورہ ایک نازک وقت میں ہوا کیونکہ طالبان اور القاعدہ کی قوتوں کی پاکستان کے خلاف دہشت گردی کی مہم میں تیزی آ گئی تھی۔ اس دوران پاکستان کی سلامتی اور خودمختاری کے تحفظ کے حوالے سے امریکی عزم پر پاکستان کے سیاسی حلقوں اور مقتدرہ میں سنگین خدشات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بالکل اس کے ساتھ طالبان.... القاعدہ گٹھ جوڑ کے خلاف پاکستان کی سوچ پر امریکیوں نے شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔

ہیلری کلنٹن کے دورے میں پاکستانی میڈیا نے پاکستان میں بلیک واٹر کے بڑی تعداد میں سکیورٹی اہلکاروں کی موجودگی کا الزام لگایا۔ اس سکیورٹی تنظیم نے عراق میں مجرمانہ سرگرمیوں اور کئی انسانی جانوں کے ضیاع میں ملوث ہونے کی بنا پر کافی بدنامی کمائی تھی۔ پاکستانی میڈیا نے الزام لگایا کہ بلیک واٹر دراصل سی آئی اے کی ہی ایک شکل ہے جو ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہے جس کا مقصد پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کرنا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قابل نفرت کام یعنی پاکستان کی خودمختاری کو نقصان پہنچانا تھا۔ پاکستان کے واشنگٹن میں مقیم تجزیہ نگار شجاع نواز نے امریکہ کی مذمت کی ہے کہ وہ وزیرستان جیسے مشکل علاقوں میں دہشت گردی سے لڑنے کے لئے پاکستان کو مطلوبہ اسلحہ و آلات نہیں فراہم کر رہا۔ (نواز: 2009ء)۔ اس کے علاوہ پاکستان کے دیگر

ذرائع کے مطابق جب فوج نے جنوبی وزیرستان میں آپریشن راہ نجات شروع کیا تو امریکیوں نے افغانستان کو جانے والے تمام خارجی اور داخلی راستے بند کرنے کی بجائے اس کے الٹ کیا۔ انہوں نے افغان سرحد پر کئی چوکیاں ختم کر دیں۔(ڈیلی ٹائمز،20اکتوبر2009ء)۔

امریکہ کی ایسے مبینہ فیصلے سے افغانستان سے طالبان عناصر جنوبی وزیرستان میں داخل ہوئے یا یہاں سے فرار ہو گئے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے یہ معاملہ افغانستان میں امریکی کمانڈر جنرل میکرسٹل کے ساتھ اٹھایا اور زور دیا کہ سرحد کو سیل کیا جائے۔ دوسری طرف امریکیوں نے پاکستان کے اقدامات پر تشویش ظاہر کی اور تنقید کا نشانہ بنایا۔امریکہ کا کہنا تھا کہ پاکستان جنوبی وزیرستان میں پاکستان مخالف تحریک طالبان کے خلاف تو کارروائی کر رہا ہے لیکن امریکہ پر حملوں میں ملوث شمالی وزیرستان اور کوئٹہ میں موجود طالبان کے خلاف کچھ نہیں کیا جا رہا۔امریکی تجزیہ نگاروں نے یہ خیال پیش کیا کہ پاکستان اچھے طالبان (افغانستان والے) اور برے طالبان (تحریک طالبان پاکستان اور اس کے پاکستانی اتحادی) میں تفریق کر رہا ہے۔تاہم پاکستان نے ایسے الزامات کو یکسر مسترد کر دیا۔ہیلری کلنٹن کی واشنگٹن سے پہلے ممتاز انگریزی اخبار ''ڈان'' کے ایک نامہ نگار نے ان کا انٹرویو کیا۔ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا امریکہ کا یہ مطالبہ درست ہے کہ پاکستان کے سرحد پر تعینات فوجی یونٹ اپنی جائے تعیناتی تبدیل کرتے ہوئے اسلحہ اسی مقام پر چھوڑ کر جائیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ''کسی قسم کے فوجی اسلحے کا تبادلہ ہوسکتا ہے اور مختلف جگہوں پر استعمال ہوسکتا ہے''۔(ڈان،28اکتوبر2009ء)۔پاکستانی میڈیا اس مؤقف کی یہ تشریح کی کہ یہ دراصل پاکستان کے پاس اسلحے کے حوالے سے بھارتی تشویش دور کرنا ہے۔

اسی تناظر میں جب ہیلری نے لاہور میں 29اکتوبر کو پاکستانی اخبارات کے ایڈیٹروں سے خطاب میں دعویٰ کیا کہ القاعدہ کی قیادت پاکستان میں چھپی ہوئی ہے تو کئی پاکستانیوں کو اس پر غصہ آیا لیکن وہ اس بات پر مصرر ہیں کہ ان کے الزامات ان اطلاعات کی بنیاد پر ہیں جو ان کے پاس ہیں۔انہوں نے کہا کہ میرے لئے یہ بات ماننا نہایت مشکل ہے کہ پاکستان میں آپ کی حکومت میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ القاعدہ والے کہاں ہیں اور اگر وہ واقعی انہیں پکڑنا چاہتے ہیں تو پکڑ نہیں پا رہے۔ممکن ہے کہ وہ پکڑے نہیں جا سکتے....اس کا پتہ نہیں،لیکن جتنا مجھے علم ہے یہ لوگ

ہیں پاکستان میں ہی''۔(ڈیلی ٹائمز،30اکتوبر2009ء)۔

سفارتی معنوں میں ایک اعلیٰ سفارتی شخصیت کی طرف سے عوامی سطح پر ایسا الزام نہایت بے باک تھا لیکن ہیلری نے وہی بات کی جو قبل ازیں امریکی تھنک ٹینکس اور محکمہ خارجہ کے عہدیدار کرتے رہے تھے۔ میں نے جب جولائی 2009ء میں واشنگٹن کا دورہ کیا تو کئی امریکی تجزیہ نگاروں نے میرے ساتھ یہی بات بار بار کی۔

بہر حال کلنٹن کے دورے میں عوامی، سرکاری اور عسکری شخصیات کے ساتھ ملاقاتوں میں زور اس بات پر دیا گیا کہ طالبان ....القاعدہ کے خلاف لڑنا پاکستان کے بہترین مفاد میں ہے اور یہ کہ امریکہ اس جنگ میں پاکستان کے شانہ بشانہ ہے اور امریکہ کی نیت پر شک کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔ انہوں نے بالخصوص انسدادشورش صلاحیتوں میں اضافے میں پاکستان کی مدد کے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان کی اقتصادی اور مالیاتی کارکردگی بہتر بنانے کیلئے متعدد عملی اقدامات بھی تجویز کئے اور پاکستان پر زور دیا کہ وہ اپنی ٹیکس اساس کو توسیع دے اور ٹیکس نظام میں جدت لائے۔ انہوں نے توانائی کی قلت کے سنگین مسئلے پر قابو پانے میں مدد سمیت کئی تعلیمی اور ترقیاتی منصوبوں کے لئے فنڈنگ کا بھی اعلان کیا۔

انہوں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان نومبر 2008ء کے ممبئی حملوں کے بعد تسلسل کا شکار مذاکرات بحال کرنے پر بھی زور دیا۔ بھارت حالیہ برسوں میں امریکہ کا سٹرٹیجک شراکت دار بن چکا تھا اور 2009ء میں سول نیوکلیئر ڈیل کے بعد اسے امریکہ سے خصوصی تعاون مل رہا تھا۔ اگر چہ اوباما انتظامیہ بھارت سے کچھ تناؤ رکھتی تھی لیکن صدر اوباما اور ہیلری کلنٹن دونوں نے بھارت کو یقین دلایا کہ امریکہ جنوبی ایشیا کی دیرینہ حریف طاقتوں کے دوطرفہ معاملات کے حل میں مداخلت نہیں کرے گا۔

بہر حال امریکی کانگریس نے ایک خصوصی بل کی منظوری دی جس کے تحت یہ لازمی قرار دیا گیا کہ امریکہ اس بات کی نگرانی کرے کہ اس کا پاکستان کو بھجوایا گیا اسلحہ کہاں پہنچتا ہے۔ (مراد یہ کہ فوج کے استعمال کے سوا دیگر استعمال پر علم) اور یہ تنبیہ کی گئی کہ امریکی امداد سے خطے میں طاقت کا توازن بگڑنا نہیں چاہیئے۔ اس کا اشارہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی طرف تھا۔ (ڈیلی ٹائمز، 24 اکتوبر 2009)۔ صدر اوباما کے دستخط کرنے پر یہ قانون بن گیا، مجموعی طور پر

پاکستان اور امریکہ کے ایک دوسرے سے متعلق عزائم اور مقاصد اس کھلی حقیقت پر مبنی تھے کہ یہ باضابطہ طور پر ایک دوسرے کے اتحادی اور دہشتگردی کے خلاف لڑائی میں معاون تھے لیکن باہمی اعتماد اتنا گہرا نہیں تھا۔

پاکستان کے ایٹمی اثاثے

ریاست کے اندر نام نہاد ریاست ....آئی ایس آئی کے اپنے تئیں خفیہ دفتر.... پر پشاور میں 13 نومبر 2009ء کو حملے میں آئی ایس آئی کے 10 اہلکاروں سمیت 20 افراد ہلاک ہوئے۔ یہ ایک اور ثبوت تھا کہ جنوبی اسلام پسند تنظیموں کے پھیلاؤ کے ذریعے ''اسلام کا قلعہ'' بنانے کی اس کی فخریہ کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئی تھیں۔ طالبان اور القاعدہ کے گٹھ جوڑ نے ایک بار پھر انتہائی سکیورٹی حصار میں قائم عمارتوں پر حملہ کرنے کی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ دوسری طرف میڈیا نے خبر دی کہ کچھ دہشت گردوں نے ایک ایسے علاقے میں گھسنے کی کوشش کی جہاں ایٹمی تنصیبات تھیں تاہم وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ اور انہیں بیرون خارجی حصار کے باہر روک لیا گیا۔ امریکی صحافی سیمور ہرش کہتے ہیں کہ امریکہ دہشت گردوں سے پاکستان کے جوہری اثاثوں کو بچانے کے لئے وسیع کردار ادا کرنے کا خواہاں تھا۔ ان کا اشارہ اس بابت صدر اوباما سے ایک امریکی صحافی کے سوال کی طرف تھا۔

سیمور ہرش نے ایسے کئی منظر ناموں کی نشاندہی کی ہے جس سے علاقائی اور عالمی امن خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ ان میں سے سب سے سنگین خطرہ ایٹمی ہتھیاروں کی تنصیبات پر تعینات فوج کے اندر ممکنہ بغاوت کا تھا۔ یہ خطرہ اس اندازے کی بنیاد پر ظاہر کیا گیا کہ ایسی تنصیبات پر تعینات فوجیوں اور افسروں میں طالبان۔ القاعدہ کے نظریے کے حامی موجود ہو سکتے ہیں۔ ہرش لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے پاکستانی افسروں سے ان امکانات کے حوالے سے بات چیت کی تو انہوں نے ان خدشات کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ایٹمی تنصیبات پر تعینات فوجیوں کو جانچ پڑتال کے بعد تعینات کیا جاتا ہے اور جن فوجیوں میں نظریاتی وابستگی یا سوچ پائی جاتی ہے انہیں الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سیمور ہرش کو بتایا گیا کہ ایٹمی ہتھیار ایسی سرنگوں میں رکھا جاتا ہے جو سیٹلائٹ سے نہیں دیکھی جا سکتیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کو

آپریشنل کرنے کا طریقہ کار انتہائی پیچیدہ ہے۔ایٹم بم کے مختلف حصوں کو الگ الگ رکھا جاتا ہے اور اسے چلانے کیلئے اکٹھا جوڑنا ضروری ہے۔اس طریقے کو ایسی منظّم شکل دی گئی ہے کہ جنگ یا قومی سلامتی کو خطرے کی صورت میں منتخب فوجی افسروں کا ایک گروپ ان حصوں کو تیزی سے جوڑ کر قابل استعمال بنا سکتا ہے۔(دی نیویارکر، 10 نومبر 2009)۔جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل طارق مجید نے امریکی صحافی سیمور ہرش کی طرف سے فوج میں بغاوت سے متعلق الزامات کو گمراہ کن اور محض سنسنی خیزی قرار دیا۔اس کی جگہ انہوں نے واضح کیا کہ سخت سیکورٹی نظام کو ہتھیاروں پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔انہوں نے کہا کہ:

''ہم نے سکیورٹی کا انتہائی مؤثر نظام وضع کیا ہے جو سخت حفاظتی اور رسائی کے کنٹرول پر مشتمل ہے۔سٹرٹیجک پروگرام کی ترقی کے مجموعی نگہبان کی حیثیت سے میں کسی ابہام کے بغیر زور دے کر کہتا ہوں کہ ہمارے جوہری اثاثوں سے متعلق حساس اطلاعات تک کسی غیر ملکی فرد، ریاست یا ادارے کی رسائی یا معلومات کے تبادلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا''۔(دی نیوز، 10 نومبر 2009)۔

ڈیوڈ ہیڈلے اور تہور رانا کی گرفتاری

ممبئی حملوں کی طرف میڈیا کی توجہ ایک بار پھر اس وقت مبذول ہوگئی جب نومبر 2008 میں پاکستان نژاد 2 امریکی شہری ڈیوڈ کول مین ہیڈلے (داؤد گیلانی) اور تہور حسین رانا کو حملوں میں ملوث ہونے کے الزام میں امریکہ میں گرفتار کرلیا گیا۔پاکستان میں ایک ریٹائر میجر کو ڈیوڈ ہیڈلے اور تہور رانا سے تعلق کے شبہ میں پکڑ لیا گیا۔(ڈیلی ٹائمز 26 نومبر 2009ء)۔اس پیشرفت سے اس تاثر کو تقویت ملی کہ لشکر طیبہ خالصتاً پاکستانی۔پنجابی علاقائی تنظیم ہے اور یوں اس کے علاقائی اور بین الاقوامی نیٹ ورکس سے رابطے نمایاں ہو گئے۔

بعدازاں اخبارات نے رپورٹیں شائع کیں کہ ڈیوڈ ہیڈلے دراصل سی آئی اے کا ایجنٹ تھا جو لشکر طیبہ میں پلانٹ کیا گیا تھا۔تاہم اس نے ڈبل کراس کیا اور اپنی وفاداریاں لشکر طیبہ سے وابستہ کرلیں۔سی آئی اے اس کے بھارت کے دوروں سے آگاہ تھی اور یہ کہ اس نے ممبئی حملوں میں نہایت سرگرم کردار ادا کیا لیکن نہایت خاموشی سے، بھارتی حکام نے اس سے تفتیش کا مطالبہ کیا

لیکن امریکی حکام اس سے گریزاں رہے۔

پاک بھارت تعلقات پر ریٹائرسینئر بھارتی اور پاکستانی عہدیداروں کے تاثرات

سنگا پور کے انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین سٹڈیز میں میرے مسلسل 3 سالہ قیام (2007-2010) کے دوران میری متعدد پاکستانی اور بھارتی ریسرچروں اور سینئر حکام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے ساتھ پاکستان اور بھارت کے مستقبل کے تعلقات پر طویل بحث و مباحثے کے دوران مجھے کافی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کے 2 نمونے نیچے حاضر ہیں:

بھارت کے ریٹائر سیکرٹری امور خارجہ راجیو سیکری نے 25 مئی 2009ء کو میرے ساتھ اپنی کتاب "Challenge and Strategy: Rethinking India,s Foreign Policy(2009)" کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ سنگاپور میں ہم دونوں اکٹھے انسٹی ٹیوٹ میں کام کر رہے تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ راجیو سیکری اس قدامت پسند زیرو عدم برداشت کے کلچر کے بارے میں محتاط انداز میں پر امید تھے جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات کشیدگی کا شکار تھے۔ تاہم دونوں فریقوں نے مخلصانہ کوششیں کیں۔ البتہ ان کی رائے یہ تھی کہ جب تک پاکستان میں فوج مدارالمہام ہے اور بھارت کے خلاف دہشت گردی کا سد باب نہیں کرتی تو اس وقت تک صورتحال میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان میں فوج سب سے اہم اور طاقتور ادارہ ہے اور مستقبل میں پاکستان کے ساتھ کسی بھی تصفیے کیلئے اس کو اعتماد میں لینا ضروری ہوگا اور ایسا کرنا ناممکن نہیں۔ میری بات سے انہوں نے اتفاق کیا۔

اپنی کتاب میں راجیو سیکری نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا کہ اکیسویں صدی میں بھارت کو بڑی طاقت بننے کے لئے سخت محنت کرنی چاہیئے۔ اسے جنوبی ایشیا کے ممالک کے درمیان وسیع تر مفاہمت کیلئے کام کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہ کہ خطے میں مشترکہ ثقافت اور تاریخی حوالوں کی بنیاد پر خطے کے ممالک اور عوام کے درمیان وسیع تر تعاون کیلئے سارک کے فریم ورک کو متحرک کرنے میں کردار ادا کرنا چاہیئے۔ انہوں نے بھارت پر زور دیا کہ وہ اپنے ہمسائیہ ممالک کو قائل کرنے کے لئے پورا زور لگائے کہ وہ بڑا بھائی یا بدمعاش نہیں اور یہ کہ بھارت خطے میں جمہوریت اور جمہوری تحریک کو مضبوط کرے۔ انہوں نے پاکستان کو بھارت کا مشکل ترین ہمسائیہ قرار دیتے

ہوئے کہا کہ ممبئی حملوں کے بعد پہلے سے خراب تعلقات مزید بگڑ گئے۔ البتہ کشمیر پر پاکستان کے لچکدار موقف کو سراہتے ہوئے کہا کہ جہاں تک دونوں ملکوں کے عوام کا تعلق ہے تو یہ لوگ جب بھی کرکٹ میچوں کے موقع پر ملتے ہیں تو ان کی باہمی گرمجوشی سے سخت گیر حلقوں کو شرمساری کا سامنا کرنا پڑا۔

بھارتی مصنف نے اپنی کتاب میں لکھا کہ چونکہ جہادیوں نے اب مسلح افواج کے اہلکاروں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا اس لئے یہ دونوں ملکوں کے مفاد میں ہے کہ وہ ملکر انہیں کمزور بنائیں۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ وہ پاکستان کی حوصلہ افزائی کرے تا کہ دوطرفہ تجارت میں اضافہ ہوتا کہ باہمی طور پر مفید مفاد کو فروغ مل سکے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ بھارت پاکستان کے منتخب وزیراعظم گیلانی اور صدر زرداری کے ساتھ اچھے تعلقات استوار کرے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی قرار دیا کہ بھارت کیلئے سرحدیں تبدیل کرنا ناممکن ہے۔ (سیکرٹری، 2009:45-16)۔ لیکن انہوں نے امید ظاہر کی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب جنوبی ایشیا کے ملکوں کے درمیان یورپی یونین جیسے فریم ورک کے اندر علاقائی اتحاد بنے گا اور ایسا تب ممکن ہو گا جب ''جنوبی ایشیا کی نئی نسل جس کے ذہن میں پرانی عداوت اور نفرت کی یادیں نہیں ہوں گی وہ سیاسی طاقت حاصل کرے گی''۔ (ایضاً)۔ انہوں نے 1960ء کے سندھ طاس معاہدے کو بھارت کیلئے غیر موزوں قرار دیتے ہوئے زور دیا کہ اس پر بات چیت دوبارہ شروع کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر چہ دریاؤں کا منبع بھارتی کنٹرول میں ہونے کی وجہ سے بھارت کو پاکستان پر برتری حاصل ہے اور وہ چاہے تو استحصال کر سکتا ہے لیکن مسئلہ کشمیر کے تناظر میں بات چیت کے ساتھ پانی کے مسئلے کا حل ترجیح ہونی چاہیئے۔ (ایضاً، 52-47)۔ افغانستان کے بارے میں انہوں نے تبصرہ کیا کہ اگر بھارت افغانستان میں دیرپا امن اور استحکام چاہتا ہے تو اسے افغانستان کے اندر پاکستان سے مل کر کردار ادا کرنا پڑے گا۔ (ایضاً)۔

بھارت کے اعلیٰ فوجی افسروں اور سفارت کاروں کے ساتھ میری بات چیت کا تجربہ یہ رہا کہ ان کے تاثرات بھی لگ بھگ وہی تھے جو راجیو سیکری نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ باہمی تعاون اور عدم تصادم دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے بہترین مفاد میں ہے۔

پاکستان کے سابق وزیر خزانہ شاہد جاوید برکی کے تاثرات

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ایک اور کولیگ شاہد جاوید برکی جو ورلڈ بنک کے لاطینی امریکہ کیلئے نائب صدر اور معین قریشی کی نگران کابینہ میں مختصر عرصے کیلئے وزیر خزانہ بھی رہے کا نقطہء نظر حاصل کیا۔ شاہد برکی نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کے پاکستان کے تجربے کا حوالہ دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ بھارتی قیادت ابھی تک پاکستان کا وجود تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ وہ یہ امید لگائے بیٹھی ہے کہ پاکستان مستحکم ریاست بننے میں ناکام رہے گا اور پھر دوبارہ بھارت کے ساتھ مل جائے گا۔

اسی تناظر میں شاہد جاوید برکی نے اپنی کتاب میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ماضی کے تعلقات کا حوالہ دیا اور مستقبل میں تعلقات میں بہتری لانے کیلئے تجاویز دی ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد اس ملک کو 3 بڑے مسائل نے گھیرے میں لے لیا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ بھارتی حکومت انگریزوں سے ورثے میں ملنے والے پیسے میں سے پاکستان کا حصہ دینے کو تیار نہیں تھی۔ انتہائی ضروری سامان خریدنے کیلئے بھی مالیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے حصے کے پیسے کے اجراء کیلئے وزیراعظم لیاقت علی خان اور وزیر خزانہ غلام محمد خان کو خود دہلی جانا پڑا۔ (برکی، 2001ء:70)۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ بھارتی حکومت نے اس بنیاد پر پاکستان کے حصے کی رقم روکی کہ یہ کشمیر میں جارحیت کیلئے اسلحے کی خریداری پر خرچ کی جائے گی۔ یہ صرف گاندھی کی مرن بھرت (تادم مرگ بھوک ہڑتال) تھی جس نے بھارتی حکومت کو جھکنے پر مجبور کیا۔

برکی کے مطابق دوسرا مسئلہ ان دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا تھا جو دونوں ملکوں کے اندر بہتے تھے۔ 1948ء میں ''سٹیٹس کو'' برقرار رکھنے کیلئے ایک معاہدہ کیا گیا۔ لیکن 1949ء اور 1950ء کے دوران پاکستان نے محسوس کیا کہ بھارت معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ ایک مختصر عرصے کے لئے بھارتی حکومت نے لاہور اور ملحقہ علاقوں کیلئے پانی بھی روک دیا۔ لیاقت علی خان کی طرف سے مشہور زمانہ مکا دکھانے کا واقعہ ''سٹیٹس کو'' معاہدے کی خلاف ورزی کا ہی ردعمل تھا۔ تیسرا بحران اس وقت پیدا ہوا جب پاکستان نے اپنی کرنسی کو ڈی ویلیو کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ دولت مشترکہ کے تمام رکن ممالک نے ڈالر کے ساتھ کرنسی کا الحاق کرنے کیلئے اپنی کرنسیوں کی قدر کم کی

تھی۔اس فیصلے سے پاکستان اور بھارت کی کرنسی کے درمیان شرح مبادلہ تبدیل ہوگئی اور نقصان بھارت کو ہوا۔ بھارت کے نائب وزیراعظم سردار پٹیل نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے ساتھ تجارت بند کر دی۔ برکی نے دعویٰ کیا کہ جہاں ایسے اقدامات سے پاکستان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا وہاں اسے بھارت پر انحصار کئے بغیر اپنی معیشت کو فروغ دینے کا بھی موقع ملا... پاکستان نے زیادہ ترجیح انڈسٹرلائزیشن کو دی۔انہوں نے لکھا کہ تجارتی جنگ سے پہلے پاکستان کی نصف برآمدات بھارت جاتی تھیں اور اتنی ہی درآمدات بھارت سے آتی تھیں، اس کے بعد بھارت سے درآمدات اور برآمدات دونوں کم ہوگئیں۔(برکی،2011ء:70-72)۔

اس کتاب کا لب لباب یہ تھا کہ تاریخ کا بوجھ ایک طرف رکھ کر دونوں ملک مثبت انداز میں آگے بڑھیں۔ٹھوس اقتصادی نظریے پر اپنے دلائل پر انحصار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان اور بھارت کو تعاون اور بالخصوص مفید تجارت کے ذریعے اپنے تعلقات کو فروغ دینا چاہیئے۔(ایضاً:61-145)۔

باب 16

امریکہ کی رخصتی کی تیاریاں

امریکہ کے صدر بارک اوباما نے یہ بات واضح ہونے کے بعد افغانستان سے فوجوں کے انخلا پر غور شروع کر دیا تھا کہ وہاں جنگ جیتنا ممکن نہیں اور امریکہ کے بیشتر یورپی اتحادی بھی جنگ میں شرکت کو زیادہ طول دینے پر تیار نہیں۔ حقیقت میں نیٹو ممالک میں عوام کا ردعمل زیادہ حوصلہ افزاء نہیں تھا.... یہاں تک کہ امریکہ میں بھی جنگ کی حمایت میں مسلسل کمی آ رہی تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس بات پر شک ہوتا جا رہا تھا کہ طالبان کو عسکری ذرائع سے شکست دی جا سکتی ہے۔ جب نومبر 2009ء میں صدر اوباما نے پرتگال میں اپنے نیٹو اتحادیوں سے ملاقات کی تو اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ نیٹو فوجوں کو 2014ء کے آخر تک افغانستان سے نکال لیا جائے گا۔ اس وقت تک افغانستان کی ایک مؤثر فوج کی تربیت مکمل ہو چکی ہو گی۔

افغانستان میں امریکی کمانڈر جنرل سٹینلے میکرسٹل کئی مہینوں سے افغانستان میں فوجوں کی تعداد میں 50 ہزار تک اضافے کی درخواست کر رہے تھے لیکن اوباما کو اس پر تامل تھا۔ بالآخر 30 نومبر کو ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹوں سے خطاب میں انہوں نے فوج کی تعداد میں 30 ہزار کا اضافہ کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن اس کے ساتھ 18 ماہ کے اندر فوج کے انخلا کے منصوبے پر عملدرآمد کرنا بھی شامل تھا۔ اپوزیشن ری پبلکن پارٹی نے فوجیوں کی تعداد بڑھانے کا خیر مقدم کیا لیکن شبہ ظاہر کیا کہ انخلا کی پکی تاریخ دینے سے طالبان اور القاعدہ کے حوصلے بڑھیں گے۔

امریکہ کی شکایتیں اور اندیشے برقرار

15 دسمبر کو ایڈمرل مائیکل مولن نے ان خدشات کا اعادہ کیا کہ طالبان اور القاعدہ کے دہشت گرد گروپ سرحد پار پاکستان میں پناہ لے رہے ہیں۔ کابل کے دورے میں افغان سکیورٹی فورسز کی بھرتی اور تربیت پر تبادلہ خیال کرنے کے موقع پر انہوں نے اخباری رپورٹروں کو بتایا کہ وہ اگلے مرحلے میں پاکستان جا کر وہاں کے حکام سے یہ معاملہ اٹھائیں گے۔ دریں اثنا امریکی اخبار ''لاس اینجلس ٹائمز'' نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ فوجی جنرلوں سمیت اعلیٰ امریکی حکام حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ڈرون حملوں کا دائرہ کوئٹہ تک وسیع کر دیا جائے تا کہ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں طالبان کے خلاف کارکاروائی کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈالا جا سکے.... ''تجویز کے حامی سمجھتے ہیں کہ کوئٹہ میں طالبان پر حملہ.... یا کم از کم حملے کی دھمکی.... نظر ثانی شدہ جنگی حکمت عملی کی کامیابی کیلئے نہایت اہم ہے''۔ (لاس اینجلس ٹائمز: 16 نومبر 2009)۔ اس کے بعد پاکستان میں امریکی مداخلت میں اضافہ ہوا اور ہیلری کلنٹن نے کشمیر پر پاک بھارت مذاکرات کی بحالی پر زور دیتے ہوئے خبردار کیا کہ اگر یہ مسئلہ حل نہ کیا گیا تو دہشتگرد دونوں ملکوں کے درمیان تصادم کو شہ دے سکتے ہیں۔

جنرل ڈیوڈ پیٹریاس وزیرستان میں پاکستان کی کامیابیوں کی تعریف کے ساتھ آگے آئے اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ پاکستان میں سویلین اقتدار کو فوج سے کوئی خطرہ ہے۔ افغانستان کیلئے نئی امریکی پالیسی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ صدر اوباما وہاں امریکی فوج کی تعداد 30 ہزار کا اضافہ کریں گے اور یہ کہ جولائی 2011ء سے فوجوں کے انخلا کے عمل کے آغاز پر تمام متعلقہ حلقوں کو اعتماد میں لیا جائے گا.... انخلا کا عمل 2014 کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔ جنرل پیٹریاس کے اس بیان سے کچھ حلقوں میں کافی اضطراب پیدا ہو گیا۔ بھارت نے تشویش کا اظہار کیا جبکہ پاکستان اور افغانستان سے بھی تشویش کی آوازیں ابھریں۔ اس عرصے کے دوران افغانستان کی فوج کو کنٹرول سنبھالنے کیلئے تربیت دی جانا تھی۔ اس دوران ڈرون حملوں کا دائرہ کار بلوچستان تک پھیلانے کی افواہوں کو پیٹریاس نے مسترد کر دیا۔ اس کیلئے انہوں نے وزیر دفاع رابرٹ گیٹس کے حالیہ بیان کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے ایسے کسی بھی منصوبے کی تردید کی تھی۔

انہوں نے افغانستان کیلئے امریکہ کی مستقبل کی پالیسی کے مزید خدو خال یہ کہہ کر واضح کئے کہ امریکہ ایسے طالبان سے بات چیت کرے گا جو تشدد ترک کر دیں لیکن یہ کہ ابھی تک چھوٹی اور درمیانی سطح کے طالبان نے مذاکرات کی امریکی پالیسی پر مثبت ردعمل ظاہر کیا ہے۔

پاکستان کے اندر دہشتگردی

دسمبر میں پاکستان میڈیا میں ایک بار پھر اس بحث نے سر اٹھایا کہ کیا پاکستان میں دہشت گردی میں غیر ملکی ہاتھ ہے۔ وزیر داخلہ رحمان ملک نے پاکستان میں امریکی تعاون سے دہشت گردوں کی کسی موجودگی کا امکان مسترد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ''پاکستان میں بلیک واٹر کا کوئی وجود نہیں، بدقسمتی سے پاکستان میں تمام دہشت گرد مقامی ہی ہیں۔ حالیہ عرصے میں 74 دہشت گرد پکڑے گئے۔ (ڈیلی ٹائمز، 11 دسمبر 2009ء)۔ رحمان ملک کئی ماہ سے یہ کہتے آئے تھے کہ ان کے پاس ناقابل تردید اور ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ بھارت دہشت گردی میں ملوث ہے بالخصوص بلوچستان کی علیحدگی پسندی کی تحریک میں اس کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے بھارتی وزیر دفاع اے کے انتھونی کو چیلنج کیا کہ وہ پاکستان آئیں تا کہ انہیں ثبوت دکھائے جا سکیں تاہم انتھونی نے دعوت نظر انداز کرتے ہوئے الزامات مسترد کر دیے۔ بظاہر بھارتی ہاتھ کے حوالے سے ثبوت وزارت داخلہ نے وزارت خارجہ کو بھجوائے۔ البتہ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے موصول ہونے والے مواد پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ یہ ثبوت یقیناً ننگے، مردہ اور ختنوں کے بغیر افراد کے تصاویر پر مبنی تھے۔

28 دسمبر 2009ء کو کراچی میں یوم عاشور پر خوفناک حملہ کیا گیا جس میں 43 افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد احتجاج کے دوران 2 ہزار دکانوں یا کاروباری مراکز آگ لگا دی گئی یا تباہ کر دیا گیا۔ نقصان کا اندازہ 30 سے 50 ارب روپے لگایا گیا۔ حکام نے دعویٰ کیا کہ فسادات فوری اشتعال کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت کارروائی کی گئی۔ 2009ء کے دوران دہشت گردی کے نتیجے میں پاکستان میں ہلاکتوں کی تعداد نے ماضی کے واقعات کو مات دے دی۔ افغانستان سے نیٹو اور امریکی فوج کے انخلا کے آغاز کی پکی تاریخ پر مختلف حلقوں کا ملا جلا ردعمل قابل فہم تھا۔ طالبان، ان کے اتحادیوں اور ہمدردوں نے اسے امریکی زوال اور عالمگیر بالادستی کے خاتمے کا ایک اور ثبوت قرار دیا۔ پاکستان نے سرکاری سطح پر ایک ایسا

ٹھوس امن معاہدہ جس سے افغانستان میں اس کے حریف ملک بھارت کا کردار محدود ہو سکے کے بغیر انخلا پر تشویش کا اظہار کیا۔ پاکستانی فوج چاہتی تھی کہ اس کی قابلیت اور اہلیت کا اعتراف کیا جائے کیونکہ اس نے جنوبی وزیرستان اور سوات میں طالبان کو سخت ہزیمت پہنچائی تھی۔ سیاسی معنوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کو جنوب مشرقی ایشیا کی ایک بڑی طاقت تسلیم کیا جائے۔ بھارتی ردعمل نہایت سخت تھا۔ اس نے کہا کہ طالبان کو شکست دیے بغیر انخلا کا مطلب یہ ہوگا کہ طالبان کی ایک جہادی مہم بالخصوص کشمیر میں کارروائیوں کیلئے حوصلہ افزائی کی جائے۔ ایران نے سیاسی عمل آگے بڑھانے میں اپنے بہترین تعاون کا یقین دلایا۔ وہ قبل ازیں افغان حکومت کو مالی امداد بھی فراہم کرتا رہا تھا اور سوویت یونین کے قبضے کے بعد افغان پناہ گزین بھی ایران منتقل ہوئے تھے۔ ایران نے افغانستان کے ہزارہ شیعہ برادری کے توسط سے بھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔

کچھ عرصہ سے اہم کردار.... کرزئی حکومت.... طالبان کے ساتھ ممکنہ ڈیل کیلئے برطانیہ کے ساتھ تبادلہ خیال کر رہی تھی۔ ایک تجویز یہ دی گئی کہ اگر طالبان افغان آئین جو جمہوریت اور صنفی مساوات پر مبنی تھا کو تسلیم کرلیں تو انہیں حکومتی ڈھانچے کے اندر ایڈجسٹ کیا جا سکتا ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ طالبان ایک علاقائی سطح کا گروہ ہیں۔ جو غیر تعلیم یافتہ، سرکش ہیں اور صرف اپنے مخصوص عزائم کے حصول تک محدود ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہا گیا کہ طالبان سرحد کے دونوں جانب موجود افراد پر مشتمل بڑا گروہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سے اچھے روابط ہیں... اور جو طالبان کو افغانستان میں اقتدار کی جنگ میں اپنا اثاثہ قرار دیتی لیکن دوسری طرف تحریک طالبان پاکستان کو اپنانے میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ تامل کا شکار تھی۔ پھر ایسے گروہ بھی تھے جن کے روس اور ایران سے رابطے تھے۔ (شعیت کے پھیلاؤ کی زبردست حمایت کے برعکس)، طالبان گروپ بڑے پیمانے پر منشیات کی سمگلنگ میں بھی ملوث تھے۔ حتیٰ کہ اس دھندے میں ان کا امریکی اور بعض مغربی عناصر سے بھی لین دین تھا۔ اس کے علاوہ پنجابی طالبان بھی تھے جن کے جنوبی پاکستان میں بھی مضبوط گڑھ تھے۔ (امین، اوسنسکی، ڈی جارجز 2010)۔

امریکی نقطہ نظر سے القاعدہ اور ایسے تمام طالبان گروپ اور ان سے وابستہ دیگر تنظیمیں جو

امریکی مفادات کے خلاف آپس میں گٹھ جوڑ بنا کر کام کر رہی ہیں کے خلاف مؤثر کارروائی ہونی چاہیئے۔ یقیناً یہ مسئلہ بھی تھا کہ القاعدہ اب مزید صرف عربوں یا افغان جہاد میں حصہ لینے والے افغان یا پاکستانی مجاہدین پر مشتمل گروہ نہیں تھا۔ جب صدر بش نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو عراق پر حملے کی صورت میں توسیع دی تو مسلمانوں کی بنیاد پرستی میں ڈرامائی اضافہ ہوا اور پوری دنیا میں القاعدہ کے ہمنوا گروپ پیدا ہونے لگے۔ اس بات میں شبہ نہیں کہ القاعدہ قیادت بالخصوص مشہور زمانہ اسامہ بن لادن کا تعاقب اور تباہی ایک اہم معاملہ تھا۔ یہ مقصد حاصل کرنے کا مطلب یہ پیغام دینا تھا کہ امریکی سکیورٹی کیلئے خطرہ بننے والوں پر پوری زمین تنگ کر دی جائے گی۔ امریکہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ القاعدہ کے خلاف کارروائی کے لئے پاکستان کا تعاون ضروری تھا۔ دوسری طرف امریکی فوجی اور انٹیلی جنس ماہرین کو یقین تھا کہ امریکی اور نیٹو فورسز کے خلاف دہشتگردی میں ملوث القاعدہ اور طالبان لیڈر رفاٹا بالخصوص شمالی وزیرستان اور کوئٹہ میں روپوش تھے۔ امریکہ یہ شبہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ اعلیٰ ترین افغان طالبان لیڈروں کو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے طاقتور عناصر کی پناہ حاصل تھی۔ جس کا مطلب درپردہ کارروائیوں سمیت کثیر پہلو سرگرمیاں جاری رکھنا تھا۔ اس سٹرٹیجی کی وضاحت کیری لوگر بل میں کی گئی جس میں 5 سال کیلئے فراخدلانہ امداد کا وعدہ کیا گیا لیکن شرط لگائی گئی کہ پاکستان شمالی وزیرستان میں چھپے دہشت گرد رہنماؤں اور ان کے مقامی حمایتیوں بالخصوص حقانی نیٹ ورک کے خلاف کارروائی کرے۔ دوسری جانب 2009ء میں ہیلری کلنٹن کے دورے کے موقع پر پاکستانی میڈیا نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں امریکہ کے سینکڑوں خفیہ اہلکاروں بالخصوص بلیک واٹر فرم کی موجودگی کی تفصیل دی گئی۔

میکرسٹل نے جنوری 2010 کے شروع میں پاکستان کا دورہ کیا۔ امریکی سفارتخانے میں صحافیوں سے گفتگو میں انہوں نے کہا کہ پاکستان اور امریکہ جبکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان اعتماد کا فقدان ایک بڑا مسئلہ ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کیلئے سب سے اچھا کام ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اعتماد سازی کریں۔ حسب روایت انہوں نے طالبان کے خلاف پاکستان کی کارروائیوں میں حالیہ کامیابیوں پر پاکستان کی تعریف میں بھی چند کلمات کہے لیکن اس کے ساتھ مطالبہ کیا کہ شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کے خلاف بھی مزید کارروائی کی جائے۔ (ڈیلی ٹائمز، 5 جنوری 2010ء)۔

لنکیسٹر ہاؤس میں بین الاقوامی کانفرنس

امریکہ سٹرٹیجک سوچ پر غالب آنے والے ایسے ہی اندیشہ کے تناظر میں برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن نے لندن کے لنکیسٹر ہاؤس میں متعلقہ ممالک کو ایک کانفرنس میں مدعو کیا۔ اس کانفرنس کی تیاری کے سلسلے میں متفقہ مؤقف کیلئے چین، ترکی، ایران اور روس نے استنبول میں ملاقات کی۔ 28۔29 جنوری کو 70 ملکوں اور اقوام متحدہ نے افغان حکومت کی 50 کروڑ ڈالر کی اس مہم کی حمایت کی جس کے تحت دہشتگردوں کو ہتھیار پھینک کر ملازمتیں اور دیگر مراعات دینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اس کانفرنس کی نمایاں بات یہ تھی کہ افغانستان میں ممکنہ امن معاہدے کے لئے پاکستان کی اہم حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ دوسری جانب بھارت کو استنبول کے رابطہ گروپ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ (احمد 2010ء)۔ کانفرنس میں یہ بات واضح ہوگئی کہ امریکی اور نیٹو فوجی دستے جولائی 2011ء سے انخلا شروع کر دیں گے اور ان کی جگہ سکیورٹی معاملات سنبھالنے کیلئے افغان فوج کی تربیت کا آغاز کیا جائے گا۔ یہ کانفرنس بھارت کیلئے ایک دھچکا تھی جو مسلسل یہ اصرار کرتا آیا تھا کہ طالبان کو بیک جنبش قلم شکست دی جائے کیونکہ وہ ایک ایسے نظریے پر کاربند تھے جو خالصتاً عسکریت پسندی اور توسیع پسندی پر مبنی ہے اور ان کے ساتھ کسی بھی رعایت بھارتی سلامتی کے لئے شدید خطرے کے مترادف ہوگی۔

لنکیسٹر کانفرنس کے شروع میں ایک مایوس کن صورتحال بھی سامنے آئی۔ وہ یہ کہ صدر حامد کرزئی نے کانفرنس سے پہلے لویہ جرگہ میں طالبان نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی تھی جو انہوں نے مسترد کر دی۔ دوسری جانب جنرل کیانی نے دلچسپ تاثرات بیان کئے۔ انہوں نے کہا کہ ''پاکستان طالبانائزڈ'' افغانستان نہیں چاہتا۔ پاکستان اسی طرح افغانستان کیلئے جنگ نہیں چاہتا جس طرح اپنے لئے نہیں چاہتا''۔ اور یہ کہ ان کے ملک کا افغانستان کو کنٹرول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ انہوں نے افغان فوج کی تربیت اور مدد کیلئے پاکستان کے تعاون کی بھی پیشکش کی۔ انہوں نے کانفرنس میں ایک اہم نقطہ اٹھایا کہ سرد جنگ اور نائن الیون کے بعد کی صورتحال میں بھی پاکستان بدستور جغرافیائی حوالے سے ایک اہم ملک ہے اور نیٹو پر زور دیا کہ وہ اس معروضی حقیقت کا اعتراف کرے۔ (ڈیلی ٹائمز، 2 فروری 2010ء)۔ چند روز قبل پاکستان آرمی کے

ترجمان میجر جنرل اطہر عباس نے اعلان کیا کہ اگلے 6 سے 12 ماہ کے دوران فوج کوئی بڑا آپریشن نہیں کرے گی۔ فوج یہ اعزاز حاصل کرنا چاہتی تھی کہ پاکستان میں ایک منتخب حکومت برسر اقتدار تھی اور فوج نے سیاسی عمل کو فطری راستے پر چلنے دینے میں مدد کی تھی۔ (ڈان، 22 جنوری 2010ء)۔

بھارت کا دو محاذوں پر مبنی نظریہ اور جنوبی ایشیا میں تعاون سے متعلق امریکی مشورہ

دریں اثنا شملہ میں بند دروازے کے پیچھے ایک سیمینار میں بھارتی آرمی چیف جنرل دیپک کپور نے اعلان کیا کہ بھارتی فوج مستقبل میں جنگ کی صورت میں چین اور پاکستان سے بیک وقت نمٹنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھارتی فوج کو آبنائے ملاکا سے خلیج فارس تک علاقے سے باہر بھارتی مفادات کے تحفظ کیلئے اپنی سٹرٹیجک پہنچ میں اضافہ کرنا ہوگا اور اپنے جزائر والے علاقوں اور بحر ہند میں قائم خطوں کا تحفظ یقینی بنانا ہوگا۔ (بلومینتھل، یکم دسمبر 2011)۔

اس سے پہلے 3 جنوری 2010ء کو بھارت کے وزیر امور خارجہ ایس ایم کرشنا نے ایک انٹرویو میں واضح کیا کہ چین کی پاکستان کو اسلحے کی فراہمی اور آزاد کشمیر میں چینی فوج کی سرگرمیوں پر بھارت کو بدستور تشویش ہے اور یہ کہ بھارت ان تمام معاملات پر چین کے ساتھ بات کر رہا ہے۔ اس بات کہ آخر بھارت آزاد کشمیر میں سرگرمیوں کو ''غیر قانونی'' کیوں سمجھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جموں و کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان اور چین دونوں کی وہاں موجودگی کا کوئی جواز نہیں۔ (انڈین ایکسپریس، 2 جنوری 2010ء)۔ جنرل دیپک کپور کی Two Front Doctorine پر پاکستان کا ردعمل بھی مضحکہ خیز تھا۔ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل طارق مجید نے اس بات پر شبہ ظاہر کیا کہ جنرل کپور نے ایسی کوئی ڈاکٹرن تیار کی ہے اور اگر انہوں نے تیار کی ہے تو چین کو چھوڑ دیں، جنرل دیپک کپور اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھارتی مسلح افواج ایسا نہیں کر سکتیں جبکہ پاکستانی فوج عسکری طور پر ایسا کر سکتی ہے۔ (دی ٹائمز آف انڈیا، 2 جنوری 2010ء)۔

پاکستان اور بھارت دونوں طرف سے جارحانہ لہجے کے تناظر میں امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے جنوبی ایشیا کا دورہ کیا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ تحریک طالبان پاکستان، افغان

طالبان اور لشکر طیبہ پر مشتمل القاعدہ سنڈیکیٹ پورے خطے کیلئے خطرہ ہے۔ یہ نہ صرف افغانستان، نہ صرف پاکستان کیلئے خطرہ ہے بلکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تصادم پیدا کر کے پورے خطے کو تصادم کا شکار کر سکتا ہے۔ یہ نہایت خطرناک ہوگا کہ اس سنڈیکیٹ میں سے کسی ایک گروہ کو ٹارگٹ کیا جائے بلکہ اس پورے گروپ کے خلاف لڑنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بات تمام ملکوں کے لئے اہم ہے کہ وہ آپس میں رابطے کر کے دہشت گرد گروپوں کا صفایا کریں۔ افغانستان میں بھارت اور پاکستان کی شفاف سرگرمیوں کی تجویز دیتے ہوئے وزیر دفاع نے اس بات کی تردید کی کہ بھارت کو ایسی سرگرمیوں میں کوئی فوجی کردار دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کابل کی ترقی کیلئے ایک ارب 30 کروڑ ڈالر کی بھارتی امداد نہایت اہم ہے، پھر انہوں نے یہ تبصرہ کیا کہ:

''آیئے ایک دوسرے کے ساتھ دیانتداری سے پیش آئیں۔ پاکستان میں حقیقی شبہ پایا جاتا ہے کہ بھارت افغانستان میں کن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ افغان حکومت کی وسیع تر امداد پر توجہ مرکوز کی جانی چاہیئے لیکن ایک دوسرے کیلئے شفافیت کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا''۔ (ڈیلی ٹائمز، 21 جنوری 2010ء)۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی قربانیوں پر جنرل کیانی کا تبصرہ

جنوری کے آخر میں جنرل اشفاق پرویز کیانی نے برسلز میں نیٹو ہیڈ کوارٹرز کا دورہ کیا اور دہشتگردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے کردار اور اس کی دفاعی ترجیحات کی وضاحت کی۔ واپسی پر سینئر پاکستانی صحافیوں کو بریفنگ میں انہوں نے کہا کہ پاکستان بھارت کی ''کولڈ سٹارٹ سٹریٹجی'' کے مقابلے میں آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ جو ان کے بھارتی ہم منصب نے پیش کی تھی۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان پر ڈبل گیم کھیلنے کے الزامات پر انہوں نے دعویٰ کیا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستانی قوم نے جان و مال کی فقید المثال قربانیاں دی ہیں۔ جہاں نیٹو اور اتحادی افواج کے 1582 افراد مارے گئے وہاں گزشتہ 8 سال کے دوران پاکستان کے 2273 افسروں اور جوانوں نے اپنی جان قربان کی جبکہ صرف ایک سال کے دوران 6512 فوجی زخمی ہوئے۔ پاکستان کے 173 انٹیلی جنس اہلکار شہید ہوئے جبکہ افغانستان میں اتحادی افواج کے صرف

11 افسر کام آئے۔ ہمارے شہداء میں ایک تھری سٹار، ایک ٹو سٹار جنرل اور 5 بریگیڈیئر شامل ہیں۔ ہم نے امریکہ پر واضح کیا ہے کہ وہ افغانستان کے مستقبل کا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے پاکستان کے مفادات کو بھی مدنظر رکھے۔ اور یہ کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات کے برے ریکارڈ کے پیش نظر بھارتی خطرات سے نمٹنے کی تیاریاں کم نہیں کر سکتے کیونکہ بھارت کی فوج اور جنگی تیاریاں پاکستان مخالف ہیں۔ (نیشن، 4 جنوری 2010)۔

اس سے پہلے رابرٹ گیٹس کے دورے کے تناظر میں بھارت نے پاکستان کو مذاکرات کی بحالی کی پیشکش کی تھی۔ اس کے فوراً بعد 16 جماعتی جہاد کونسل کے چیئرمین حزب المجاہدین کے رہنما سید صلاح الدین نے مظفر آباد میں کہا کہ ''کشمیر کا مسئلہ بات چیت سے کبھی حل نہیں ہو سکتا اور کشمیر کو بھارتی قبضے سے آزاد کرانے کا واحد راستہ جہاد ہے...... میں اپنے سرحد پار (کشمیری) بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم بھارت کی کشمیر سے رخصتی تک آپ کے ساتھ ہیں''۔ اس موقع پر اجلاس کے بعد جاری کردہ بیان میں کہا گیا کہ ''بھارت کا قبضہ ختم ہونے تک جہاد جاری رہے گا۔ اگر اس کام میں پاکستان مادی مدد نہیں کر سکتا تو کم از کم سیاسی اور اخلاقی حمایت جاری رکھے''۔ (ڈیلی ٹائمز، 5 فروری 2010ء)۔

پاکستان میں امریکی فوجیوں کی ہلاکت، ممتاز طالبان لیڈروں کی گرفتاری

10 فروری کو پاکستان کے انگریزی روزنامہ ڈیلی ٹائمز نے خبر شائع کی کہ سوات کے قریبی علاقے لوئر دیر میں ایک فوجی قافلے کو بم دھماکے کا نشانہ بنانے کے واقعے میں 3 امریکی فوجی اور 4 طالبات سمیت 9 افراد ہلاک ہو گئے۔ یہ امریکی فوجی مقامی فوجیوں، صحافیوں اور حکام کے ساتھ ایک گرلز سکول کا افتتاح کرنے جا رہے تھے۔ حملے میں 95 سکول طالبات سمیت 115 افراد زخمی بھی ہوئے۔ اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے کے بیان میں بتایا کہ مارے جانے والے امریکی فوجی حکومت پاکستان کی درخواست پر فرنٹیئر کانسٹیبلری کو تربیت دے رہے تھے۔ پولیس نے 9 ہلاکتوں کی اطلاع دی۔ جن میں 4 سکول طالبات اور 3 ''غیر ملکی'' شامل تھے۔

اس دوران خوشی کا کچھ اظہار اس وقت کیا گیا جب طالبان کے فوجی کمانڈر اور ملا عمر کے دست راست ملا عبدالغنی برادر کو کراچی سے پکڑ لیا گیا۔ بی بی سی نے بتایا کہ گرفتاری امریکی اور

پاکستانی اہلکاروں کی مشترکہ کارروائی کے نتیجے میں ہوئی۔(17 فروری،2010)۔صوبہ سرحد سے بھی بعض دیگر طالبان لیڈر پکڑے گئے۔بعدازاں پاکستانی میڈیا نے بتایا کہ کراچی سے ملاعمر اور بیت اللہ محسود کے 2 مزید ساتھیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔(ڈیلی ٹائمز، یکم مارچ 2010)۔

اسلامی عسکریت پسندی پر شجاع نواز کا بیان حلفی

واشنگٹن کے تھنک ٹینک اٹلانٹک کونسل کے ڈائریکٹر برائے ساؤتھ ایشیا سینٹر شجاع نواز نے 11 مارچ 2011ء کو امریکی ایوان کی خارجہ تعلقات سب کمیٹی برائے مشرق وسطی وجنوبی ایشیا کے روبرو بیان حلفی ریکارڈ کرایا۔انہوں نے پاکستان میں بڑھتی عسکریت پسندی پر معلومات دیں اور تجزیہ پیش کیا۔انہوں نے تسلیم کیا کہ تحریک کشمیر میں معاونت کیلئے بنائی گئی جہادی تنظیم لشکر طیبہ ایک طاقتورسنی پنجابی تحریک میں تبدیل ہو چکی ہے جس کا ایجنڈا وسیع تر علاقائی کردار پر مشتمل ہے۔انہوں نے کہا کہ:

''پاکستان کے سول اور فوجی حکمرانوں نے اس تحریک کی بھارت کا مقابلہ کرنے والے اثاثے کے طور پر حمایت کی تاکہ دشمن کو''ہزاروں زخم'' لگا کر متنازعہ علاقے کے حل پر رضامند کیا جا سکے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس حمایت یافتہ تنظیم نے اپنی سمت خود متعین کر لی اور جہادی جنگجوؤں کی بھرتی کیلئے زرخیز لیکن محروم علاقوں وسطی اور جنوبی پنجاب کو اپنا ہدف بنالیا......لشکر طیبہ نے اپنی شاخیں پورے ملک میں پھیلا دیں اور اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے مالی وسائل حاصل کئے اور پھر خود کفیل تنظیم بن گئی۔دکانوں،مساجد اور عیدوں کے تہواروں میں جہاد کشمیر کے لئے صندوق رکھنے سے اسے تیزی سے ذرائع آمدنی ملنے لگے۔اس نے سماجی بہبود کی تنظیم جماعۃ الدعوۃ کے ساتھ ناتے جوڑ لئے جس نے لشکر طیبہ کی طرف سے سماجی خدمات کی آڑ میں بھرتیوں کا کام کیا۔ایسا کرتے ہوئے لشکر طیبہ دراصل پاکستان کے کرپٹ سیاسی نظام کی کمزوریوں سے کھیل رہی تھی جو عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہا اور صرف اشرافیہ کی خدمات پر مامور رہا......جوں جوں لشکر طیبہ خود کفیل ہوتی گئی تو آئی ایس آئی نے اپنا کنٹرول بتدریج کم کرنا شروع کر دیا۔لیکن جنرل پرویز مشرف کے ماتحت پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کو لشکر طیبہ کے خود کفیل ہونے کی سمجھ آہستہ آہستہ آئی اور انہوں نے اسے بتدریج قبول کیا۔لشکر طیبہ کے بارے میں غیر

یقینی آراء 2002ء میں بھی واضح تھی۔ اس ابہام کا اظہار آسٹریلین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے جنرل مشرف کے انٹرویو سے بھی ہوا جب انہوں نے انٹرویو کرنے والے کی اس بات کو چیلنج کیا کہ لشکر طیبہ پر پابندی لگائی جا چکی تھی۔ مشرف کا خیال تھا کہ صرف جیش محمد پر پابندی لگائی گئی ہے۔ آج لشکر طیبہ کالعدم قرار دی چکی ہے لیکن جماعۃ الدعوۃ بدستور فعال تنظیم ہے۔

جنرل مشرف نے کشمیر میں سیاسی درجہ حرارت کم کرنے کی کوشش کی اور ریاستی سطح پر لشکر طیبہ سے دوری اختیار کرنا شروع کر دی۔ البتہ یہ عمل اس انداز میں نہیں کیا گیا جس طرح کیا جاسکتا تھا...... لشکر طیبہ کو غیر مسلح کئے بغیر، دوبارہ تربیت دینے اور جنگجوؤں کی بھرتی سے روکنے کے ٹھوس اقدامات کے بغیر اس پر پابندی لگائی گئی۔ خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کے کچھ سابق اہلکار عسکریت پسندی میں شامل ہو گئے جنہوں نے انہیں کشمیر میں جنگ کی تربیت دی اور رہنمائی بھی کی......۔

اس بات کے کافی شواہد اب موجود ہیں کہ سپاہ صحابہ اور جیش محمد کے القاعدہ اور طالبان سے رابطے ہیں۔ لشکر طیبہ کے وسیع تر علاقائی قوت کے طور پر ابھرتے کردار نے اسے سٹوڈنٹس اسلامک مومنٹ آف انڈیا اور حرکۃ الجہاد الاسلامی بنگلہ دیش کے ساتھ رابطوں کے ذریعے بھارت بلکہ افغانستان تک اپنے عزائم کو توسیع دینے کی طرف ترغیب دی ہے۔ یہ علاقائی استحکام کیلئے سنگین خطرہ ہے۔ ممبئی حملے جیسا ایک اور حملہ پاکستان اور بھارت کو تصادم کے قریب لاسکتا ہے اور یہ ایسا پہلو ہے جس سے ہماری راتوں کی نیندیں حرام ہونی چاہئیں۔ پاکستان میں سول اور فوجی قیادت کو اب ملکی سطح پر ابھرنے والی عسکریت پسندی سے لاحق خطرے کا احساس ہونے لگا ہے۔ بظاہر فوج نے تحریک طالبان کو تتر بتر کر دیا ہے لیکن اسے لشکر طیبہ کی صورت میں اپنے اندر بڑے خطرے کا اب بھی سامنا ہے۔ خود میری 1970ء سے 2005ء کے دوران پاکستان آرمی میں بھرتی سے متعلق ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ فوج اسی علاقے سے بڑی تعداد میں بھرتی کر رہی ہے۔ سماجی اور اقتصادی حالات میں تبدیلی لائے بغیر وہ اسلامی عسکریت پسندی جو جڑ پکڑتی نظر آرہی ہے وہ فوج میں نفوذ شروع کر دے گی''۔ (نواز کا کانگریس میں بیان، 11 مارچ 2010ء)۔

پاکستان کی صورتحال پر ایسے بے لاگ تبصرے سے واشنگٹن میں مقیم سکیورٹی امور کے تجزیہ نگاروں کی سوچ اور اصلاحات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے جب جولائی 2009ء کو میں نے واشنگٹن ڈی سی کا دورہ کیا تو میں نے شجاع نواز سے تفصیلی گفتگو کی اور ان کی کتاب Crossed

Swords کے بارے میں کئی وضاحتیں بھی مانگیں، میں نے پنجاب کابینہ کے سابق رکن سید مواحد حسین شاہ سے تناؤ کا شکار پاک امریکہ تعلقات پر انٹرویو بھی کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ افپاک پالیسی بریفنگ کے وقت وائٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ القاعدہ کے خلاف کارروائی میں پرعزم تھا اور اس مقصد کے حصول پر بھرپور توجہ مرکوز کرے گا۔ پاکستانی امریکن لیڈرشپ سنٹر کے ڈائریکٹر طحہ گایا، امجد اور نورین بابر نے بھی امریکہ پاکستان تعلقات پر میرے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ دونوں ملکوں کو محض انسٹرومینٹل بنیادوں پر نہیں بلکہ ایمانداری پر مبنی تعلقات استوار کرنے کی ضرورت ہے۔

امریکہ میں قیام کے دوران میں نے امریکہ کی سکیورٹی سے متعلق حکام سے بھی بات چیت کی ان میں والٹر اینڈرسن، کرسٹائن فیئر، سفیر وینڈی چیمبرلین، ووڈرو ولسن سنٹر کے ڈائریکٹر ساؤتھ ایشیا رابرٹ ہاتھ وے، پروفیسر سیلگ ہیری سن اور ڈاکٹر ٹیریسٹا شیفر شامل تھے۔ ان سب نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ اور پاکستان کے اتحاد میں پائے جانے والے اعتماد کے فقدان پر نمایاں زور دیا۔ دوسری طرف سفیر رچرڈ باؤچر اور سفیر رابن رافیل نے باہمی عدم اعتماد کے مسئلے کا اعتراف کرتے ہوئے پاکستان کو گھیرے میں لینے والے مسائل کو بہتر انداز میں سمجھنے پر زور دیا اور تسلیم کیا کہ پاکستان نے بلاشبہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اکبر ایس احمد کے ساتھ ملاقات میں مجھے نائن الیون کے بعد امریکہ میں مسلمانوں کی حالت زار کی اندر کی صورتحال جاننے کا موقع ملا۔

پاکستان کی امریکہ سے فرمائشیں

مارچ کے مہینے میں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی اور جنرل اشفاق پرویز کیانی سمیت کئی اعلیٰ پاکستانی عہدیداروں نے مزید اقتصادی اور عسکری امداد حاصل کرنے کیلئے امریکہ کے دورے کئے۔ پاکستان کی طرف سے امریکہ کو 56 صفحات پر مشتمل دستاویز پیش کی گئی جس میں بغیر پائلٹ کے ڈرون طیاروں، ہیلی کاپٹروں اور مالی امداد سمیت متعدد درخواستیں شامل تھیں۔ پاکستان امریکہ سے اسی طرح سویلین جوہری تعاون چاہتا تھا جس قسم کا معاہدہ امریکہ اور بھارت کے درمیان کیا گیا تھا۔ پاکستانی حکام نے افغانستان میں بھارت کے بڑھتے کردار پر بھی تشویش کا

اظہار کیا۔امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی نے کہا کہ پاکستان چاہتا ہے کہ خطے میں اس کی سکیورٹی معاملات کے بارے میں تشویش کا ازالہ کیا جائے گا۔ جنرل کیانی نے امریکہ کے سینئر دفاعی عہدیداروں سے ملاقاتیں کیں تاکہ دوطرفہ تعاون میں اضافے کے طریقوں پر تبادلہ خیال کیا جاسکے۔(ڈیلی ٹائمز، 24 مارچ 2010ء)۔

تھمپو میں امن مذاکرات

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کے درمیان اپریل کے آخر میں بھوٹان کے دارالحکومت تھمپو میں سارک سربراہ کانفرنس کے موقع پر ملاقات ہوئی۔ دونوں رہنماؤں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اپنی سرزمین ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ دیگر موضوعات کے علاوہ کشمیر، سیاچن اور سرکریک پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔ بھارتی خارجہ سیکرٹری مسز نروپماراؤ نے تبصرہ کیا کہ وزیراعظم گیلانی دہشت گردی سے متعلق بھارتی خدمات پر سنجیدہ تھے اور انہوں نے ممبئی حملوں کے مشتبہ ملزموں کے ٹرائل کی رفتار تیز کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔انہوں نے کہا کہ ''ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہے''۔(دی ہندو، 30 اپریل 2010)۔اس دوران امریکی میڈیا نے رپورٹ دی کہ پاکستان نے بھارتی سرحد سے ایک لاکھ فوجی ہٹا کر افغان سرحد پر منتقل کر دیے ہیں۔اس خبر کی پاکستان نے فوری تردید کی۔ میجر جنرل اطہر عباس نے تبصرہ کیا کہ:

''ہماری مسلح فورسز مغربی (افغان) سرحدوں پر دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کر رہی ہیں۔ہمیں مشرقی سرحدوں پر روایتی (Conventional) جنگ کا سامنا ہے۔ چنانچہ بھارت کے ساتھ مشرقی سرحدوں پر تعینات فوجوں کو کم نہیں کیا جا سکتا......مشرقی سرحدوں پر جتنی فوج کی ضرورت ہے وہ اب بھی وہاں موجود ہے اور اسے ہٹا کر مغربی سرحدوں پر لگانا خارج از امکان ہے''۔ البتہ پاکستان میں میرے بعض باخبر ذرائع نے بتایا کہ بھارتی سرحدوں کے ساتھ فوجوں کی تعداد میں کچھ کمی کی گئی لیکن اس کا اعتراف کرنا سیاسی طور پر بالخصوص اسٹیبلشمنٹ کے نقطۂ نظر سے درست نہ ہوتا۔ بھارتی خطرے کا فیکٹر قومی سلامتی کے نظریے میں فطری ہے جس پر فوج کے ادارہ جاتی مفادات کا انحصار ہے۔

آئی ایس آئی کے سابق ایجنٹ کا قتل

30 اپریل کو آئی ایس آئی کے سابق ایجنٹ خالد خواجہ کو ایک غیر معروف عسکریت پسند گروپ ایشین ٹائیگرز نے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا۔ اغواء کے ایک ماہ بعد شمالی وزیرستان کے علاقے میر انشاہ میں اس کی لاش برآمد ہوئی۔ وہ وہاں مشہور زمانہ کرنل امام (سلطان امیر تارڑ) اور پاکستان نژاد برطانوی صحافی سعد قریشی کے ساتھ گیا تھا۔ خالد خواجہ کو سر پر گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ لاش کے قریب ایک خط میں یہ لکھا گیا کہ امریکہ کے ہر ایجنٹ کا یہی انجام ہوگا۔ خالد خواجہ پاکستان ائیرفورس میں سکواڈرن لیڈر رہا تھا اور بعدازاں آئی ایس آئی میں چلا گیا۔ وہ اسامہ بن لادن سے قریبی تعلق کا دعویٰ کرتا تھا۔ بظاہر اسے جہاد پر کھلم کھلا موقف اور القاعدہ کی حمایت پر آئی ایس آئی سے نکال دیا گیا تھا۔ (ڈیلی ٹائمز، یکم مئی 2010ء)۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے خالد خواجہ کو ایک بین الاقوامی ٹی وی نیٹ ورک پر یہ کہتے سنا: ''تم (اہل مغرب) زندگی کو اہمیت دیتے ہو جبکہ ہم (مسلمان) دنیا میں اپنے قیام کو عارضی عرصہ سمجھتے ہیں لہٰذا تم آخر کس طرح ہمارے ساتھ لڑ سکتے ہو؟''۔ وہ جو پیغام دینا چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ جہاد تمام مسلمانوں کا فطری فریضہ ہے اور شہادت ایک مقدس اور آبرومندانہ منزل ہے۔ اس موقع پر میں خالد خواجہ کی زمین پر اپنی زندگی میں تضاد محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ایک عمر گزار کر درمیانی عرصے میں پہنچ چکا تھا اور اس کی داڑھی میں کچھ سفید بال بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ اس نے اپنی ذات کو کبھی خودکش حملوں کیلئے پیش نہیں کیا لیکن نہایت کامیابی کے ساتھ دوسروں کو اس کام کے لئے قائل کیا۔ اس کے نتیجے میں کئی زندگیاں تباہ ہوگئیں جبکہ وہ خود جہاد کے دوران شہادت کا درس دینے کے لئے زندہ رہا۔ اس کی موت بزعم خود خود ساختہ نیکوکاری پر مبنی دہشت گردی کی ستم ظریفی ہے۔ بعض گروپوں کے نزدیک وہ نہ صرف سی آئی اے کا ایجنٹ بلکہ قادیانی بھی تھا۔

فیصل شہزاد

خالد خواجہ کے قتل کے بعد یہ سازشی نظریات گردش کرنے لگے کہ کس نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا اور وہ آخر کیسے پکڑا گیا...... اس سے انٹیلی جنس اداروں بالخصوص آئی ایس آئی کے اندر پیچیدہ نیٹ ورکس اور دشمنیوں، اسلام پسند گروہوں اور ان کے گٹھ جوڑ، صحافیوں اور ٹی وی ٹاک شوز

کے جعلی دانشوروں کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ لیکن ایسی خبروں سے سنسنی خیزی اور اشتیاق صرف اندرونی سطح پر پیدا ہوا۔ یکم مئی کو سینکڑوں میل دور نیویارک میں ہونے والے ایک واقعے سے پاکستان دہشتگردی کے ایک مرکز کے طور پر دنیا کے سامنے آ گیا۔ پاکستانی ائیرفورس کے ریٹائرڈ ائیر وائس مارشل کا 31 سالہ بیٹا جو امریکی شہری بھی تھا کو نیویارک کے ٹائم سکوائر میں کار بمنگ کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ ایک ہوشیار راہگیر نے پارک ہونے والی مشکوک کار دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی۔ متعلقہ حکام نے دھماکے سے پہلے بروقت بم ناکارہ بنا کر دہشت گردی کا تدارک کر دیا۔ 3 مئی کو فیصل شہزاد کو ایمریٹس ائیر لائن کی فلائٹ سے اسلام آباد فرار جاتے ہوئے حراست میں لے لیا گیا۔

فیصل شہزاد روایتی خودکش بمبار کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا کیونکہ اس کی پیدائش اور پرورش ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ دوران تفتیش انکشاف ہوا کہ اس کے دورہ کراچی میں اسلام پسندوں نے اسے اپنے مقاصد کیلئے بھرتی کیا۔ اس نے بمباری کی کوشش کے 10 مراحل کا اعتراف کیا۔ امریکی میڈیا نے بتایا کہ فیصل نے اعتراف کیا کہ اس نے وزیرستان میں سرگرم عسکریت پسند اسلام پسند گروہ کے دہشت گردی کے تربیتی کیمپ میں بم بنانے کی تربیت حاصل کی۔ امریکہ میں اس کی گرفتاری پر غم و غصے پر مبنی بحث شروع ہوگئی اور ایسی تجاویز بھی دی گئیں کہ امریکی سرزمین پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے عناصر کی طرف سے دہشت گردی کے ایک اور حملے سے تادیبی انداز میں نمٹا جائے۔ اس کے لئے پاکستان میں زمینی فوج کی تعیناتی کو بھی مناسب قرار دیا گیا۔ پاکستانی حکومت اور میڈیا نے شکوہ کیا کہ فیصل امریکی شہری ہے اور اس کی حرکتوں پر پاکستان کو موردالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اگرچہ یہ ایک جائز مؤقف تھا لیکن اس سے اس حقیقت سے آنکھ نہیں چرائی جا سکتی کہ فیصل کے دہشتگردانہ رویے کی جڑیں پاکستان میں تھیں۔ 5 اکتوبر 2010 کو اسے پیرول کی سہولت کے بغیر عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

چند روز قبل 23 ستمبر کو پاکستان نژاد ایک اور امریکی ڈاکٹر عافیہ صدیقی جو پیشے کے لحاظ سے نیورولوجسٹ ہیں کو 86 سال قید کی سزا سنائی گئی۔ ان کے خلاف 3 امریکی افسروں اور دیگر امریکی ملازمین کے قتل، قاتلانہ حملے، آتشیں اسلحہ رکھنے اور چلانے کے الزامات ثابت ہوئے تھے انہیں 2008ء میں افغانستان سے گرفتار کیا گیا تھا۔ امریکیوں کو یقین تھا کہ عافیہ صدیقی القاعدہ کی جنونی رکن ہے۔ اس کی گرفتاری پر پاکستانی معاشرے کے کئی حلقوں میں سخت ردعمل ظاہر کیا گیا۔ وزیر

اعظم یوسف رضا گیلانی نے اپنی منطق بگھاری اور کہا کہ عافیہ کے مقدمے کیلئے امریکی وکیل کی فیس پاکستانی حکومت دے گی۔ پاکستان کے اسلام پسندوں کے نزدیک عافیہ صدیقی امریکہ کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مہم کا ثبوت بن گئی۔

امریکی صدر اور انتظامیہ کو امریکہ میں مستقبل میں ایٹمی ہتھیاروں کے حملے پر تشویش لاحق تھی۔ اس لئے وہ مجموعی طور پر طالبان کی بجائے القاعدہ پر توجہ مرکوز کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جولائی 2011 سے افغانستان سے نیٹو فورسز کے انخلا کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ صدر اوباما نے واشنگٹن پوسٹ کے باب ووڈ ورڈ سے بات چیت میں کہا کہ وہ افغان حکومت کو بتائیں گے کہ امریکہ ان کے ملک کی سلامتی اور استحکام کیلئے پرعزم ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ان کے اپنے لوگ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں۔ (ووڈ ورڈ 2010ء: 377)۔

لاہور میں احمدیوں پر حملہ

اس دوران پاکستان میں جہادی سرگرمیاں جاری رہیں۔ 28 مئی کو جمعہ کے اجتماع کے دوران عبادت میں مصروف احمدیوں پر 2 خودکش حملے کئے گئے۔ اس کارروائی میں 100 سے زائد افراد اپنی جانوں سے گئے۔ سکیورٹی حکام نے اس حملے میں جنوبی پنجاب میں تحریک طالبان پر شبہ ظاہر کیا کیونکہ یہ تنظیم اب صوبہ سرحد سے باہر بھی اپنا جال بچھا رہی تھی۔ دہشتگردی کی نئی کھیپ کا تعلق لشکر جھنگوی، جیش محمد، سپاہ صحابہ پاکستان سے تھا۔ یہ تمام دیوبندی گروہ تحریک طالبان اور القاعدہ سے منسلک تھے۔ وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے تبصرہ کیا کہ "جنوبی پنجاب میں چھپے عسکریت پسند اب منظر عام پر آ رہے ہیں"۔ انہوں نے بتایا کہ پورے ملک میں 20 ہزار سے زائد مدارس ہیں جن میں سے 44 فیصد پنجاب میں واقع ہیں۔ حکومت نے 29 تنظیموں پر پابندی لگا دی اور ان تنظیموں سے تعلق رکھنے والے 1764 افراد مطلوب افراد کی فہرست میں شامل ہیں......ان مطلوب افراد میں سے 729 جنوبی پنجاب کے ہیں۔ ایک سکیورٹی عہدیدار نے یقین ظاہر کیا کہ بہاولپور میں جیش محمد کا ہیڈ کوارٹر طالبان کیلئے بھرتیاں کرنے میں ملوث ہے۔ (ڈیلی ٹائمز، 31 مئی 2010)۔

سیلاب کی تباہ کاریاں، فوجی بجٹ میں اضافہ اور امریکہ کا عملی اقدامات کا مطالبہ

2010ء کے موسم گرما میں مون سون کی بارشیں ملکی تاریخ کے بدترین سیلاب کا باعث بنیں جس سے غیر معمولی تباہی اور بربادی ہوئی۔ تباہی کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ سیلاب سے 2 کروڑ افراد متاثر جبکہ 80 لاکھ اپنے گھروں سے محروم ہوئے۔ بین الاقوامی امداد پہنچنے میں کچھ دیر لگی تاہم اقوام متحدہ نے امداد متاثرین سیلاب تک پہنچانے کیلئے میکانزم قائم کر دیا۔ صدر آصف زرداری جوان دنوں اپنی جائیدادوں اور مالیاتی اثاثوں کی دیکھ بھال کے لئے یورپ کے دورے پر تھے ملک میں اتنی تباہی کے باوجود فوری طور پر واپس پاکستان نہ آئے۔ ان کا موقف تھا کہ قوم کی مدد کے لئے وزیراعظم اور ان کی کابینہ کے ارکان پاکستان میں موجود ہیں۔ ان کے ایسے رویے پر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر شدید تنقید کی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد متاثرین سیلاب کی امداد کے لئے حکومت نے ایک منظّم مہم کا آغاز کیا لیکن یہ دراصل اسلام پسند تنظیمیں تھیں......جن کا انتہا پسندانہ ایجنڈا اور دہشت گردانہ سرگرمیاں بالکل عیاں تھیں...... جو اپنے نیٹ ورک کے ساتھ متاثرین سیلاب کی مدد کے لئے آگے آئیں۔ لیکن یہ سرگرمیاں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے لئے ڈراؤنا خواب تھیں جنہیں خوف تھا کہ اس طرح انتہا پسند عناصر عوام میں اپنی حمایت میں اضافہ کر لیں گے۔ امریکہ نے سیلاب زدگان کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک اہم فیکٹر یہ تھا کہ بھارت نے 40 لاکھ ڈالر امداد کی پیشکش کی۔ جو بعد ازاں بڑھا کر 2 کروڑ ڈالر کر دی گئی۔ وزیر خارجہ شاہ محمود نے امداد قبول کر لی تاہم اس پر انہیں دائیں بازو کے ممتاز اخبار نوائے وقت کی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ (نوائے وقت، 15 اگست 2010)۔ چنانچہ پاکستان نے بھارت کو مشورہ دیا کہ وہ امداد اقوام متحدہ کے توسط سے بھجوائے۔

یکم ستمبر کو اقوام متحدہ نے تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کو غیر ملکی دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا۔ بیت اللہ محسود کے جانشین حکیم اللہ محسود اور اس کے قریبی ساتھی ولی الرحمان کو بین الاقوامی دہشت گرد قرار دے دیا گیا اور امریکی محکمہ خارجہ نے ان دونوں سے متعلق اطلاعات کی فراہمی کیلئے 50 لاکھ ڈالر کا انعام رکھ دیا۔ ٹی ٹی پی کو غیر ملکی دہشت گرد تنظیم قرار دینے کے بعد اس کی کسی قسم کی امداد کرنا یا اس کے ساتھ لین دین غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ ٹی ٹی پی کی امداد کرنے

والے کے مالیاتی اثاثے منجمد کر دیے جاتے۔ پاکستان میں سازشی نظریات میں کہا گیا کہ ٹی ٹی پی ایک جارحیت پسند اور فتنہ پرور تنظیم ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکہ نے پاکستان کے طول و عرض میں تباہی پھیلانے والی ٹی ٹی پی پر پابندی لگانے میں لمبا عرصہ لیا۔ اس سے پاکستانیوں میں یہ شک وشبہ جنم لینے لگا کہ ٹی ٹی پی کو بعض غیر ملکی طاقتوں کی در پردہ حمایت حاصل ہے۔

بہر حال امریکہ نے بھی متاثرین سیلاب کیلئے بھاری امداد کی پیشکش کی۔ ہیلری کلنٹن اور رچرڈ ہالبروک نے زور دیا کہ بحالی کی مجموعی لاگت خود پاکستان کو برداشت کرنا ہوگی۔ انہوں نے تجویز دی کہ پاکستان کے امیر طبقوں پر ٹیکس لگا کر آمدن کے ذرائع پیدا کئے جائیں۔ اسی دوران پاکستان کے دورے پر آئے ہالبروک نے کہا کہ امریکہ طالبان کے خلاف پاکستانی فوج کی لڑائی میں کوئی ''سستی'' قبول نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ فوج سیلاب زدہ علاقوں میں امدادی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ انہوں نے کہا کہ مجموعی صورتحال میں کوئی تبدیلی آئی ہے نہ طالبان پیچھے ہٹے ہیں اور چونکہ امریکہ افغانستان میں مشکل صورتحال میں پھنسا ہے، اس لئے ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستانی فوج کی طرف سے کوئی سستی دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ (ڈیلی ٹائمز، 18 ستمبر 2010ء)۔ ایسے بے باک مطالبے سے ظاہر ہوا کہ امریکہ محسوس کرتا تھا کہ امریکی امداد کے عوض پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کوئی خدمات انجام دینا پڑیں گی۔

جمہوری طور پر منتخب حکومت کا ردعمل اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ملک کی 71 سرکاری یونیورسٹیوں کے بجٹ میں کٹوتی کر دی جائے۔ اس پر کئی وائس چانسلروں نے استعفے کی دھمکی دے دی۔ اس کے برعکس پارلیمنٹ نے 11-2010ء کے بجٹ میں دفاعی بجٹ 5.14 ارب ڈالر سے بڑھا کر 6.41 ارب ڈالر کر دیا۔ یہ گزشتہ برس کی بہ نسبت 30 فیصد اضافہ تھا۔ (احمد، 12 اکتوبر 2010ء)۔ یہ بات مدنظر رکھی جائے کہ فوجی اخراجات میں اضافہ بھارت کے عسکری بجٹ میں 12 فیصد اضافے کے جواب میں کیا گیا۔ اس موقع پر پاک بھارت تعلقات پر بے رحمانہ مؤقف رکھنے والے حلقے نے پاکستان کو درپیش مشکلات پر کوئی آواز نہ اٹھائی۔

مشرف کے اعترافات

اس مرحلے پر اب ریٹائر جنرل پرویز مشرف نے بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں دہشت

گردی پھیلانے میں پاکستان کے کردار کے حوالے سے چونکا دینے والے اعترافات کئے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ پاکستان نے آخر کیوں کشمیر میں لڑنے والے عسکریت پسندوں کو تربیت دی تو سابق صدر نے کہا کہ اس کی ایک وجہ کشمیر کے مسئلے سے نواز شریف کی لاتعلقی تھی جس کی وجہ سے پوری دنیا نے اس مسئلے کی طرف اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ (ٹائمز آف انڈیا، 5 اکتوبر 2010ء)۔ انہوں نے کہا کہ انہیں کارگل میں محاذ کھولنے کا حکم دینے پر کوئی شرمندگی نہیں۔ اور کہا کہ ہر ملک کو اپنے قومی مفادات کے فروغ کا بھرپور حق حاصل ہے۔ انہوں نے اس بات پر بین الاقوامی برادری کی مذمت کی کہ وہ بھارت کو تو سٹرٹیجک معاہدوں کا مستوجب سمجھتی ہے لیکن پاکستان کے ساتھ خودسر ریاست کے طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ امریکہ کی بدترین غلطی ہوگی اگر وہ طالبان کو شکست دیے بغیر افغانستان سے نکل جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''عسکریت پسندی نہ صرف پاکستان، بھارت اور کشمیر میں جاری رہے گی بلکہ شاید یورپ، برطانیہ اور امریکہ بھی زد میں آئیں گے، یہ میرا یقین ہے''۔ (ایضاً)۔

مشرف کی طرف سے کشمیری عسکریت پسند گروہوں کو تربیت دینے کے اعتراف پر ہکا بکا پاکستانی دفتر خارجہ نے سابق سربراہ کے بیان کو ''بے بنیاد'' قرار دیا۔ ترجمان عبدالباسط نے کہا کہ ''مجھے معلوم نہیں کہ مشرف کو کس چیز نے یہ بات کہنے پر مجبور کیا کیونکہ میں پاکستان میں نہیں تھا اور مجھے پتہ نہیں کہ اس کا مقصد کیا ہے لیکن جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے تو میں ایسی بے سروپا باتوں کو یکسر مسترد کرتا ہوں''۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کشمیریوں کی جدوجہد کی مکمل حمایت کرتا ہے جو خالصتاً مقامی اور قانونی اور اقوام متحدہ کے چاٹر اور بین الاقوامی قانون کے مطابق ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، 5 اکتوبر 2010ء)۔

انگریزی اخبار ڈان نے 18 اکتوبر 2010ء کو بتایا کہ امریکی حکام نے اعتراف کیا ہے کہ ممبئی حملوں میں ملوث امریکی شہری ڈیوڈ کولمین ہیڈلے لشکر طیبہ اور دیگر دہشت گرد تنظیموں میں ان کا شامل کردہ ایجنٹ تھا۔ ایف بی آئی سمیت امریکہ کے وفاقی حکام کی عدالت میں پیش کردہ دستاویزات سے پتہ چلا کہ امریکہ کو امید تھی کہ ڈیوڈ ہیڈلے کے ذریعے وہ القاعدہ قیادت تک پہنچ جائے گا۔ لیکن ہیڈلے خودسر ہو گیا اور ہاتھوں سے نکل گیا۔ لشکر طیبہ ڈیوڈ ہیڈلے کی برین واشنگ کرنے میں کامیاب رہی اس کے بعد وہ صرف مخصوص اطلاعات ہی

اپنے امریکی افسروں تک پہنچاتا۔

امریکہ پاکستان ''سٹرٹیجک مذاکرات''

کچھ عرصے بعد گہرے شکوک وشبہات اور تناؤ کے ماحول میں واشنگٹن میں پاک امریکہ سٹرٹیجک مذاکرات شروع ہو گئے۔ اوبامہ انتظامیہ نے امریکی ساختہ اسلحے کی خریداری کے لئے پاکستان کو 2 ارب ڈالر کی فوجی امداد دینے کی منظوری دی۔ بالخصوص انسداد دہشت گردی کے آلات خریداری کیلئے۔ یہ منظوری کانگریس کی منظوری سے مشروط تھی اور منظوری کی صورت میں 2012ء سے 2016ء کے دوران امداد ملنی تھی۔ لاہور کے انگریزی اخبار ''ڈیلی ٹائمز'' کے 24 اکتوبر 2010ء کو ایک دبنگ اداریے میں کہا گیا کہ امریکہ کو پاکستانی فوج میں ناقابل اعتبار پارٹنر ملنے کا تجربہ ہوا ہے۔ مشرف دور میں امریکی امداد ایسے اسلحے کی خریداری پر خرچ کی گئی جس کا انسداد دہشت گردی کی سرگرمیوں سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ لیکن بھارت کا مقابلہ کرنے کیلئے اسلحے کے ہر قسم کے ڈھیر لگائے گئے۔ اور یہ کہ اب پاکستانی فوج کو یقین ہے کہ امریکی امداد کی منظوری مل بھی گئی تو اس کی انتہائی جانچ پڑتال ہوگی اور آڈٹ ہوگا۔ پاکستان کی انسداد دہشتگردی کی صلاحیتوں میں اضافہ شمالی وزیرستان میں بھرپور فوجی آپریشن سے مشروط ہوگا جہاں نہ صرف القاعدہ نیٹ ورک ہے بلکہ ٹی ٹی پی اور مبینہ طور پر القاعدہ بھی موجود ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ پاکستان اس کارروائی سے کنی کترا رہا تھا اور اس کا مؤقف تھا کہ شمالی وزیرستان میں کوئی بھی کارروائی ''قومی مفاد'' کی روشنی میں ہوگی۔ ایسے مؤقف کو امریکہ نے آخری امریکی فوجی کے افغانستان سے انخلا تک افغان طالبان سے رابطے برقرار رکھنے کی حکمت عملی کے طور پر دیکھا۔ اس کے بعد اداریے میں یہ تبصرہ کیا گیا۔

''حالیہ مذاکرات میں امریکہ اپنے اس اصرار سے پیچھے نہیں ہٹا کہ شمالی وزیرستان میں آپریشن کیا جائے۔ ایسا نظر نہیں آتا کہ پاکستان اپنی افغان یونٹوں کو خالی کر دے گا جسے وہ امریکہ کے انخلا کے بعد افغانستان کی صوابدید پر چھوڑ سکتا ہے۔ پاکستانی فوج نے افغانستان میں سٹرٹیجک گہرائی کے لئے بہت کچھ داؤ پر لگایا ہے اور اگر امریکہ پاکستان کو افغان مذاکرات سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو امکان ہے پاکستانی فوج سفارتکاری اور مذاکرات سے قطع نظر افغان طالبان

کے ذریعے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گی۔

امریکہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں پاکستان ٹی ٹی پی کو ہزیمت سے دوچار کرنے کی تیاری کررہا تھا۔ لیکن امریکہ کا اصل دشمن اب بھی متحرک تھا اور امریکہ اس سے خوش نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سپر پاور اب بھی میٹھی میٹھی باتوں اور کبھی کبھار دھمکی کی زبان استعمال کرنے کی پالیسی پر چل رہی تھی۔ لیکن چوہے بلی کا یہ کھیل ہمیشہ کیلئے جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو دونوں اتحادیوں کے درمیان تصادم ہوسکتا تھا جس کا نتیجہ آخر کار پاکستان کے نقصان کی صورت میں نکلتا۔

چنانچہ روایتی ٹافیاں یعنی مسئلہ کشمیر اور ہمارے سول نیوکلیئر منصوبے......آسمان پر پھینکی گئیں۔ دونوں صورتوں میں امریکہ کا جھکاؤ بھارت کی طرف دیکھا جاسکتا تھا۔ اوبامہ انتظامیہ بطور سٹرٹیجک اتحادی بھارت کے قریب آرہی تھی۔ مسئلہ کشمیر حل کرنا اوباما کا انتخابی وعدہ تھا۔ لیکن اب یہ ایسا معاملہ تھا جس پر امریکہ ''ثالثی'' نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہمارا امریکہ سے سول نیوکلیئر تعاون میں بھارت سے برابری کا مطالبہ عجیب تھا کیونکہ ماضی میں پاکستان کو ایٹمی پھیلاؤ کا مرتکب قرار دیا گیا تھا اور اسے علاقائی مشکلات کا مرکز بھی کہا گیا۔ چنانچہ ہمارے پاس چین پر انحصار کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ جو ایک آزمودہ دوست ہے اور امریکی دباؤ پر پیچھے بھی نہیں ہٹے گا۔

مجموعی طور پر مذاکراتی عمل بداعتمادی کی خلیج پاٹنے میں کسی حد تک معاون ثابت ہورہا ہے لیکن 2ارب ڈالر کی امداد کے ''طریقہ کار'' پر شکوک وشبہات بھی اپنی جگہ موجود ہیں''۔

نومبر میں سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے اپنی سوانح عمری Decision Points شائع کی جس میں انہوں نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ کس طرح ان کی انتظامیہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت کیلئے پاکستان کو قائل کرنے کے عمل میں واہموں اور شکوک و شبہات کا شکار رہی۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہوگئے کہ پاکستان انتہا پسند عسکریت پسندوں کے خلاف پورے جذبے سے کام نہیں کرے گا۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ پاکستان نے انتہا پسندوں کے خلاف کارروائی کی بھاری قیمت ادا کی اور پاکستانی فوجوں نے پیچیدہ افغان سرحد پر کئی برسوں تک القاعدہ کے خلاف کامیابی کے ساتھ کارروائیاں کیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ مشرف یا تو اپنے وعدے پورے نہیں کرسکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے

علاوہ آئی ایس آئی میں کچھ عناصر کے طالبان عہدیداروں سے قریبی روابط تھے۔ دیگر حلقے یہ چاہتے تھے کہ امریکہ افغانستان سے انخلا کی صورت میں اس بات کی ضمانت دے کہ وہاں بھارت اپنا اثر ورسوخ نہیں بڑھائے گا۔ انہوں نے کتاب میں ان فوجیوں سے اپنی ملاقات کا بھی ذکر کیا جو افغانستان میں خدمات انجام دینے کے بعد واپس آئے۔ سپیشل فورسز کے اہلکاروں نے صدر بش سے کہا کہ ''انہیں پاکستان کی حدود کے اندر کارروائی کی بھی اجازت دی جائے''۔ انہوں نے لکھا کہ امریکی ڈرون طیارہ پریڈیٹروڈیو جاسوسی اور لیزر گائیڈڈ بم چلانے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ میں نے انٹیلی جنس کو اجازت دی کہ وہ انتہا پسندوں پر دباؤ بڑھائیں۔ اس ضمن میں کئی تفصیلات خفیہ ہیں لیکن میرا حکم جاری ہونے کے فوراً بعد ڈرون حملوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بش نے کہا کہ پاکستان کے تامل کی وجہ اس کے ذہن پر بھارت کا سوار ہونا تھا۔ تقریباً ہر ملاقات میں مشرف نے بھارت پر گڑبڑ کا الزام لگایا۔ (ڈان، 10 نومبر 2010ء)۔

ڈرون حملے

اس تناظر میں یہ بات بھی اہم ہے کہ ڈرون حملوں ...... جنہیں ہمیشہ پاکستانی میڈیا نے مطعون کیا...... میں معصوم افراد بھی مارے جاتے رہے۔ پاکستان یہ اصرار کرتا آیا تھا کہ ڈرون حملے کرنے کے لئے درکار ٹیکنالوجی اور آلات اسے فراہم کئے جائیں لیکن امریکہ نے ایسی درخواستوں کو درخور اعتنا نہ جانا۔ اوباما کے دور میں ڈرون حملوں کی تعداد اور غیر مقبولیت دونوں بڑھ گئی۔ بالخصوص انتہائی قوم پرستوں، دائیں بازو کے میڈیا اور اسلام پسندوں میں۔ امریکہ کے نقطہء نظر سے ڈرون حملے طالبان اور القاعدہ رہنماؤں کو امریکی فوجیوں کی زندگی خطرے میں ڈالے بغیر نشانہ بنانے کا مؤثر طریقہ ہے۔ البتہ پاکستانی فوج اور حکومت کا عوامی سطح پر حملوں کی مذمت کرنا اور اسے پاکستان کی خودمختاری کی خلاف ورزی قرار دینا ایک گمرہ کن امر تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ڈرون حملوں میں پاکستان اور امریکہ کی فوجوں اور ان کے خفیہ اداروں کے درمیان قریبی تعاون پایا جاتا تھا اور اگست 2009ء میں ٹی ٹی پی کے سربراہ بیت اللہ محسود کی ہلاکت امریکی ڈرون حملے سے ہوئی اور اس کی موجودگی کی جگہ کی نشاندہی پاکستان نے کی تھی۔ (احمد، 2009ء)۔

بلوچستان میں بڑھتا تشدد

جہاں پاکستان کے دیگر حصوں میں اسلامی بنیاد پرستی پر مبنی تشدد مرکزی دھارے کی سیاست کا خاصہ بن چکی تھی وہاں بلوچستان کی صورتحال بھی انتہائی دھماکہ خیز رہی۔ زیادہ تر جھڑپیں بلوچ علیحدگی پسندوں اور سکیورٹی فورسز کے درمیان ہوئیں لیکن ہزارہ شیعہ اقلیت پر جنونی سنی انتہا پسندوں اور بلوچستان میں پنجابی آبادکاروں پر حملوں میں بھی سینکڑوں جانیں تلف ہوئیں۔ ایسی پر تشدد صورتحال میں امریکہ نے یہ دعویٰ جاری رکھا کہ افغان طالبان لیڈر صوبے میں روپوش ہیں۔ بلوچستان میں پشتو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے اور طالبان نے ان کے اندر ہی محفوظ ٹھکانے بنا لئے تھے۔ طالبان مبینہ طور پر نیٹو آئل ٹینکروں اور کنٹینروں پر حملوں میں ملوث تھے کیونکہ کراچی سے قندھار کے لئے یہ سپلائی گزشتہ کئی سالوں سے جاری تھی۔ بلوچستان سمگلروں، ڈاکوؤں، اغواء کاروں اور دیگر جرائم پیشہ عناصر کا گڑھ بن چکا تھا۔ کئی بلوچ سرداروں کی نجی فوج اور نجی جیلیں تھیں اور وہ خود مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے لیکن صوبے میں تشدد کی اصل وجہ سیاسی تھی جس کا آغاز نواب اکبر بگٹی کے قتل کے بعد ہوا جس کے بعد وفاقی فورسز اور بلوچ قوم پرستوں میں تصادم جاری تھا۔ بلوچ رہنماؤں کا دعویٰ ہے کہ فورسز کے ہاتھوں سینکڑوں افراد اغوا کے بعد لاپتہ ہیں۔ ان میں سے کئی کو دوران حراست بیدردی سے مارڈالا گیا یا وہ اب تک لاپتہ ہیں۔ (بلوچستان میں تصادم اور عدم تحفظ، 2010: تالپور، 3 اپریل 2011)۔ حکومت پاکستان مسلسل کہتی رہی کہ بلوچستان میں شورش کے پیچھے بیرونی طاقتوں بالخصوص بھارت کا ہاتھ ہے۔

امریکہ میں وسط مدتی الیکشن میں ڈیموکریٹس کی شکست اور اوبامہ کا دورہ بھارت

صدر اوبامہ نے امریکہ کے وسط مدتی انتخابات میں اپنی پارٹی کی بھاری شکست کے فوراً بعد نومبر میں بھارت کا دورہ کیا۔ اپوزیشن ری پبلکن پارٹی کو ایوان نمائندگان میں برتری حاصل ہوگئی البتہ سینٹ میں ڈیموکریٹک پارٹی کی معمولی برتری باقی رہی۔ امریکی ووٹروں کو ملکی معیشت کی زبوں حالی پر سخت تشویش لاحق تھی۔ انتخابی مہم کے دوران امیدواروں اور ووٹروں کی طرف سے قومی سلامتی کے معاملات یا غیر ملکی جنگوں کا شاید ہی ذکر کیا گیا ہو۔ چنانچہ نہ صرف نیٹو اتحادی ملکی سطح پر عوامی حمایت سے محروم ہو رہے تھے بلکہ ''افپاک'' خطے میں دہشت

گردی کے خلاف مہم کا سرخیل بھی ایسی صورتحال سے دوچار تھا۔ اس سوچ کہ طاقت کے بل بوتے پر یہ جنگ جیتنا ممکن نہیں نے ان حلقوں کو بیخ پا کر دیا جو القاعدہ اور ان کے سخت گیر طالبان اتحادیوں کے صفائے کے خواہاں تھے۔

بھارتی اخبار ٹائمز آف انڈیا کے چندآ نند راجگھٹا (20 ستمبر 2010ء) کے مطابق بھارت کے دورے کی تیاریوں کے موقع پر صدر اوبامہ نے اس سٹریٹجی کی تیاری پر کام شروع کر دیا کہ بھارت اگر سلامتی کونسل کی مستقل نشست چاہتا ہے تو اسے مسئلہ کشمیر ہر صورت میں حل کرنا ہوگا۔ یوں بھارت کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو ''افپاک'' سے منسلک کرنے کے اعتراضات سے قطع نظر امریکہ کشمیر سے بالواسطہ ربط چاہتا تھا۔ امریکہ کے نقطہ ءنظر سے مسئلہ کشمیر حل ہونے کی صورت میں پاکستان میں استحکام آتا اور وہ اپنی سرزمین سے القاعدہ اور طالبان جنگجوؤں کا پوری یکسوئی سے خاتمہ کرنے کا کام کرتا اور علاقے سے امریکی فورسز کے انخلا میں بھی معاونت کرتا۔ اس حکمت عملی کا خالق مبینہ طور پر افپاک حکمت عملی کا بانی بروس ریڈل تھا البتہ بروس ریڈل اور دیگر امریکی پالیسی سازوں کو اندازہ تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان مفاہمت میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کی فوج تھی۔ ان کو توقع تھی کہ پاکستان کی سول قیادت اس ڈیل پر تیار ہو جائے گی لیکن اس بات کا شبہ تھا کہ کیا جنرل اشفاق پرویز کیانی بھی رضامند ہو جائیں گے۔ ایڈمرل مائیک مولن کو چھوڑ کر بیشتر اعلیٰ امریکی حکام کا خیال تھا کہ جنرل کیانی بھارت سے تعلقات قائم کرنے کے حوالے سے سخت مؤقف رکھتے ہیں۔ مبینہ طور پر کیانی نے امریکی عہدیداروں سے ملاقات کے دوران کہا کہ ''میں پہلا شخص ہوں گا جو یہ تسلیم کروں گا، میں India-Centric ہوں''۔ (راجگھٹا)۔

بھارتی حکومت اور میڈیا نے البتہ اقدام پر ناپسندیگی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ بیشتر بھارتی اپوزیشن پارٹیوں نے بھی امریکی ثالثی میں پاک بھارت مذاکرات کی مخالفت کی۔ وسط مدتی انتخابات میں بڑی شکست سے دوچار ہونے کے بعد اوبامہ کی اپنی حیثیت بھی اس حوالے سے مشکوک ٹھہری تھی۔ اسی لئے انہوں نے بھارت کے 3 روزہ دورے میں کشمیر کے مسئلے پر بات چیت سے گریز کیا۔ بھارتی پارلیمنٹ کے خصوصی اجلاس سے خطاب میں انہوں نے امریکہ اور بھارت کے درمیان تعلقات کو 21 ویں صدی کے ناگزیر اور تاریخ ساز تعلقات قرار دیا۔ انہوں نے سائنس کی ترقی میں بھارت کے کردار کو سراہا اور سلامتی کونسل میں بھارت کی مستقل نشست

کے مطالبے کی بھی حمایت کی۔ اپنی تقریر میں وزیر اعظم من موہن سنگھ نے دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتے اعتماد پر نہایت اطمینان کا اظہار کیا۔ دونوں ملکوں کی طرف سے ایک دوسرے کے لئے ایسے نیک جذبات کے اظہار پر پاکستان میں تشویش کا اظہار کیا گیا جہاں کی حکومت اور میڈیا اس بات پر شاکی تھے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی بھاری قربانیوں کے باوجود امریکہ پاکستان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ پاکستان کی سالمیت اور خود مختاری خطرے میں پڑنے کے سازشی نظریات کی مارکیٹ ایک بار پھر کھل گئی اور یہ کہ مغرب کے عیسائی اور بھارت کے ہندو پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے کے درپے ہیں۔

مزاروں پر حملے

پاکستان میں دہشت گردی نئے نئے اہداف کے ساتھ جاری رہی۔ اس بار ملک کی اکثریتی بریلوی آبادی کیلئے قابل احترام صوفیوں کے مزاروں کو نشانہ بنایا گیا۔ جن مشہور مزاروں پر حملے کئے گئے ان میں داتا دربار لاہور (یکم جولائی 2010ء)۔ عبداللہ شاہ غازی کراچی (7 اکتوبر 2010ء)، دربار بابا فرید الدین گنج شکرؒ (25 اکتوبر 2010ء) اور ڈیرہ غازی خان میں سخی سرور کا مزار شامل تھا۔ ان حملوں میں سینکڑوں پیروکار جاں بحق ہو گئے۔ اس کے علاوہ بعض کم معروف مزاروں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ طالبان اور ان سے منسلک گروپ ان حملوں میں ملوث تھے اور انہوں نے کارروائیوں کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ لیکن سوال یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ انتہا پسندی اس لئے پھیلی پھولی کیونکہ ریاستی سطح پر عسکریت پسندوں کی سرپرستی کی گئی جواب کنٹرول سے باہر ہو کر آزادانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان حملوں کا مقصد بلاشبہ یہ تھا کہ طالبان اور القاعدہ کے بنیاد پرست مکتبہ فکر کے علاوہ تمام عقائد کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان کی درسی کتابوں میں یہ سبق پڑھایا جاتا ہے کہ برصغیر میں پرامن انداز میں اسلام پھیلانے میں صوفی بزرگوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ طالبان جس سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں اس سے اس بات میں شک وشبہ پیدا ہوتا ہے۔ (احمد، 2011)۔

چین کے وزیر اعظم کا بھارت اور پاکستان کا دورہ

دسمبر 2010ء میں چین کے وزیر اعظم وین جیاباؤ بھارت اور پاکستان کے دورے پر

آئے۔ پاکستانی میڈیا نے اس دورے پر کافی توجہ دی۔ پاکستان اور چین کی دوستی کو بڑی بڑی اصطلاحات کے ساتھ پیش کیا گیا...... ہمالیہ سے اونچی، سمندروں سے گہری وغیرہ وغیرہ...... یہ بات قابل فہم لگتی ہے کہ پاکستانی قیادت اپنے ایسے دوست کے ایسے ملک سے تعلقات پر تشویش کا شکار تھی جس کے ساتھ پاکستان کی روایتی دشمنی تھی۔ چین اور بھارت نے باہمی تجارت کا حجم 2015ء تک 100 ارب ڈالر تک بڑھانے پر آمادگی ظاہر کی۔ چین کی بھارت کو برآمدات درآمدات کے مقابلے میں بہت زیادہ تھیں۔ چینی وزیراعظم نے کہا کہ بھارت اور چین کے تعلقات میں مزید اضافے کی گنجائش ہے اور ان کو تصادم کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ چین نے سرحدی تنازعے پر کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ چین کو بھارت کی طرف سے سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننے کے عزائم پر بھی تشویش لاحق ہے۔

دورے کے اگلے مرحلے میں وین جیاباؤ جب پاکستان آئے تو انہوں نے پاکستان میں 21 ارب ڈالر سرمایہ کاری کا اعلان کیا۔ انہوں نے پاکستان کو یہ یقین بھی دلایا کہ ان کا ملک ہمیشہ پاکستان کا قابل اعتماد دوست رہے گا اور اسے کبھی نیچا نہیں ہونے دے گا۔ یقیناً چین چاہتا تھا کہ بھارت کی امریکہ سے قربت بڑھنے کی صورت میں بھارت پر دباؤ برقرار رکھا جائے۔ بھارت میں قیام کے دوران چین کے وزیراعظم نے اس بات سے بھی اتفاق نہیں کیا کہ 26 نومبر 2008ء کے ممبئی حملوں میں پاکستان کا ہاتھ تھا۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ چین نے دونوں ملکوں کو مشورہ دیا کہ وہ مسئلہ کشمیر بات چیت کے ذریعے حل کریں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ چین کو اس بات پر کم تشویش نہیں تھی کہ چینی صوبہ سنکیانگ میں عدم استحکام کے حوالے سے پاکستان اور بھارت دونوں طالبان قسم کی جہادی سرگرمیوں کا مرکز بن رہے تھے۔ (احمد، 4 جنوری 2011ء)۔

شمالی وزیرستان میں کارروائی کے لئے امریکہ کا پاکستان پر دباؤ

وسط دسمبر میں پاکستان میں امریکی سفیر ڈیوڈ کیمرون، وزیر دفاع رابٹ گیٹس سمیت کئی اعلیٰ امریکی حکام نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کو شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں کے ٹھکانے تباہ کرنے چاہیئں۔ اور کہا کہ یہ کارروائی ہونے تک پاکستان دہشت گردی کا مرکز بھی رہے گا اور امریکی سلامتی اور مفادات کیلئے خطرہ بھی۔ یہ بیانات دینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ تاثر

دیا جارہا تھا کہ پاکستان...... موسم سرما اور بعض دیگر عوامل کی بنا پر...... شاید آپریشن نہیں کرسکتا۔ لیکن پاکستان سے کہا گیا کہ اس کے باوجود وہ دہشتگردی کے خلاف جنگ میں اتحادی کے طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ یہ بیانات 5 صفحات پر مشتمل اس غیر خفیہ سمری کے تناظر میں سامنے آئے جن میں افغانستان میں امریکی فوجوں کی تعداد میں اضافے کے اثرات کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ افغانستان میں امریکی اتحادیوں کو ''نمایاں آپریشنل کامیابیاں'' حاصل ہوئی ہیں لیکن پاکستان میں پیشرفت غیر یقینی ہے۔ پاکستان کی افغانستان کے ساتھ سرحدیں ہی اوبامہ کی افغانستان میں حکمت عملی کی کامیابی میں بڑی رکاوٹ ہیں کیونکہ اس سرحد سے عسکریت پسند بلا روک ٹوک افغانستان میں چلے جاتے ہیں۔ (ڈان، 17 دسمبر 2010ء)۔

اس سے پہلے ہیلری کلنٹن کے اکتوبر 2009ء میں دورے میں پاکستانی میڈیا نے پاکستان میں سینکڑوں امریکی خفیہ اہلکاروں کی موجودگی کی رپورٹیں شائع کیں تھیں...... بلیک واٹر کا بالخصوص ذکر کیا گیا تھا۔

گورنر پنجاب سلمان تاثیر کا قتل

نومبر 2010ء میں شیخوپورہ کی ایک عدالت نے توہین رسالت کے مقدمے میں ایک غریب مسیحی اور 4 بچوں کی ماں آسیہ بی بی کو سزائے موت اور 1100 امریکی ڈالر کے برابر جرمانے کی سزا سنائی۔ توہین مذہب کے مقدمے میں کسی خاتون کو پھانسی کی سزا سنانے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر پوری دنیا میں شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات کی زینت بنی۔ جہاں پوپ سمیت دنیا بھر سے بین الاقوامی شخصیات نے آسیہ بی بی کیلئے رحم کی اپیلیں کیں وہاں پاکستان میں مذہبی جنونیت کا غیر معمولی دورہ پڑا اور خود حکمران پیپلز پارٹی کے اندر گہری تقسیم بھی نظر آئی۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کے انتہائی وفادار کارکن اور گورنر سلمان تاثیر نے عدالتی فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ توہین مذہب کے قانون کا غلط استعمال روکنے کے لئے اس میں ترمیم کی جائے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آسیہ بی بی سے جیل میں ملاقات بھی کی جہاں خاتون نے اس بات کی تردید کی کہ اس نے حضورؐ کی شان میں کوئی توہین آمیز کلمات کہے تھے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے اس کپ سے پانی پیا جس سے مسلمان خواتین پیتی تھیں۔ اس بات سے ان میں تلخ کلامی

ہوئی جس کے نتیجے میں آسیہ پر توہین رسالت کا الزام لگا دیا گیا۔ گورنر سلمان تاثیر نے آسیہ بی بی کے مؤقف سے اتفاق کیا اور اس کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا۔ انہوں نے صدر آصف زرداری پر زور دیا کہ وہ آسیہ کو معاف کردیں جو انہوں نے کر دیا۔ دوسری طرف وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی، وزیر داخلہ رحمان ملک اور وزیر قانون بابر اعوان نے ایسے بیانات دیے جن میں توہین رسالت قانون میں کسی مداخلت کی مخالفت کی گئی۔ لاہور ہائی کورٹ نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ وہ وکلاء حضرات جو حال ہی میں مشرف حکومت کے خاتمے کی وجہ بنے اور انہیں جمہوریت کا محسن بھی قرار دیا جا رہا اب آسیہ بی بی کو پھانسی دینے کا مطالبہ کرنے میں آگے آگے تھے۔ ضلعی بار ایسوسی ایشنوں نے ایک ایک کر کے قرار دادیں بھی منظور کیں۔ قانونی برادری کی طرف سے ایسا انتہا پسندانہ مؤقف ایک Confessional State میں جمہوریت کی حدود کا واضح عکاس تھا۔ اس دوران تمام سنی اور شیعہ جماعتوں اور تنظیموں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا مقصد ان کے بقول حرمت رسول کا تحفظ کرنا تھا۔ (نیوز، 12 دسمبر 2010ء) سلمان تاثیر کو آسیہ بی بی کی حمایت پر منکر اسلام قرار دیا گیا جس کا مقصد مغرب کو خوش کرنا تھا۔ ان کے قتل کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ (احمد، 2011ء)۔

4 جنوری 2011ء کو سلمان تاثیر کو ان کی سکیورٹی پر مامور پولیس کمانڈو ملک ممتاز حسین قادری نے ہی گولی ماردی جبکہ اس کے دیگر ساتھی منہ دیکھتے رہے۔ بعد ازاں ممتاز قادری نے نہایت فخر کے ساتھ ٹی وی پر اور پھر عدالت میں اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ اس نے کہا کہ سلمان تاثیر موت کے مستحق تھے کیونکہ انہوں نے توہین رسالت قانون کو ڈریکولائی (کالا قانون) قرار دیا تھا۔ جب سلمان تاثیر کی موت کا سرکاری سطح پر اعلان کیا گیا تو سینکڑوں ممتاز علما نے فتویٰ دیا کہ سلمان تاثیر کی تکفین و تدفین اسلامی طریقے سے نہ کی جائے۔ (مراد یہ کہ انکے نزدیک گورنر دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے تھے: مترجم)۔ مرکزی بنیاد پرست پارٹی جماعت اسلامی کے سربراہ منور حسن نے سلمان تاثیر پر الزام لگایا کہ انہوں نے ''blasphemy law'' کو تنقید کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کی دلآزاری کی۔ اسلام پسندوں نے اصرار کیا کہ ممتاز قادری کو باعزت رہا کیا جائے کیونکہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اپنا اسلامی فرض نبھایا۔ ممتاز قادری نے عدالت میں فخریہ طور پر کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں نے سلمان تاثیر کو قتل کیا اور یہ کہ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرنیوالوں کو سزا دے۔ بہرحال عدالت نے اس پر قتل کی فرد جرم عائد کی۔ جج نے اپنے

فیصلے میں قرار دیا کہ قانون میں توہین رسالت قانون موجود ہے جو توہین رسالت کے مرتکب افراد کو نجی طور پر سزا دینے سے روکتا ہے۔ایک گورنر کے قتل سے یہ حقیقت طشت از بام ہوئی کہ سکیورٹی اور پولیس اداروں میں کس درجے تک انتہا پسندی گھر کر چکی ہے۔اس کے علاوہ جو جنونی ماحول ملا حضرات نے پیدا کیا وہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ معاشرے میں پر تشدد رویے کس طرح پھیل چکے ہیں۔بعد ازاں انسداد دہشتگردی کی عدالت نے ممتاز قادری کو قتل کا مرتکب قرار دیتے ہوئے پھانسی کی سزا سنائی۔(ڈیلی ٹائمز،2 اکتوبر 2011ء) البتہ فیصلہ سنانے کے فوراً بعد جج پرویز علی شاہ نہ صرف ملتان کے مزاروں پر حاضری دینے گئے بلکہ بیرون ملک چلے گئے۔آسیہ بی بی آج بھی جیل میں ہے۔

تاریخی کردار کرنل امام کا قتل

24 جنوری کو انگریزی اخبار (دی نیشن) نے رپورٹ دی کہ سلطان امیر تارڑ جو کرنل امام کے نام سے مشہور تھے کو شمالی وزیرستان میں اغواء کاروں نے قتل کر دیا۔یہاں دوبارہ یاد کراتا چلوں کہ وہ 2010ء کے موسم بہار میں آئی ایس آئی کے سابق ایجنٹ خالد خواجہ اور برطانیہ کے پاکستان نژاد صحافی اسد قریشی کے ساتھ وہاں گئے۔30 اپریل 2010ء کو خالد خواجہ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔اغواء کاروں نے اسے امریکی ایجنٹ قرار دیا۔اسد قریشی کو رہا کر دیا گیا۔(بادی النظر میں بھاری تاوان ادا کرنے پر) کرنل امام افغان جہاد میں کردار ادا کرنے پر بہت مشہور تھا اور اسے ملا عمر کا استاد بھی کہا جاتا تھا۔اس کی موت سے پہلے ریکارڈ کی گئی ویڈیو فوٹیج میں (غالباً جولائی 2010 میں ریکارڈ کی گئی) کرنل امام پاکستانی حکام سے کہہ رہا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اغواء کاروں کے دہشتگرد ساتھیوں کو اس کی زندگی بچانے کیلئے رہا کر دیا جائے۔(یوٹیوب،22 جنوری 2011ء)۔

کرنل امام کے قتل پر ٹی ٹی پی نے ایک ویڈیو فوٹیج جاری کی جس میں تحریک طالبان کے سربراہ حکیم اللہ محسود کی موجودگی میں کرنل امام کو گولی ماری جا رہی تھی۔نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعروں میں ایک شخص نے کرنل امام کو کئی مرتبہ گولیاں ماردیں۔مرنے سے پہلے کرنل گھٹنے کے بل بیٹھا قابل رحم حالت میں نظر آیا۔اس کے قتل کی اصل وجہ یہ تھی کہ اغواء کاروں نے تاوان کی ادائیگی کا جو

مطالبہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ (نیشن، 24 جنوری 2011ء)۔

وفاقی وزیر اقلیتی امور شہباز بھٹی کا قتل

پاکستانی معاشرے میں مذہبی اقلیتوں کو دہشت زدہ کرنے کی روش انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ 2009ء میں پنجاب کے شہر گوجرہ میں جنونیوں کے گروہوں نے مسیحیوں کے گاؤں پر اس الزام میں دھاوا بول دیا کہ انہوں نے قرآنی نسخہ نذر آتش کیا تھا۔ اس الزام کی تردید مسیحی برادری نے کی لیکن اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ حسب روایت حملہ آوروں کو ملاؤں نے مذہبی تحفظ دیا جن کے مطابق مسلمانوں کیخلاف ایسے جرائم کی سزا موت تھی اور اس پر عملدرآمد پر مسلمان کا مذہبی فریضہ تھا۔ گوجرہ میں عیسائیوں کے گھر جلا دیئے گئے اور کم از کم 8 افراد مارے گئے۔ متعدد افراد زخمی ہوئے۔ پورا گاؤں مستقل انتہا پسندوں کے نشانے پر تھا اوران کا قہر سب پر ٹوٹا۔ اس موقع پر حکومت نے کسی حد تک مؤثر انداز میں ایکشن لیا۔ وزیر اعظم گیلانی نے خود متاثرہ گاؤں کا دورہ کیا اور متاثرین کیلئے امداد کا اعلان کیا۔ انہوں نے وفاقی وزیر مذہبی امور شہباز بھٹی جو خود مسیحی تھے کو حکم دیا کہ وہ اس گاؤں میں قیام رکھیں اور متاثرین کو ریلیف کی فراہمی کے عمل کی نگرانی کریں۔ رومن کیتھولک عقیدے کے حامل شہباز بھٹی نے پہلے پولیس کی کارروائی اور بعد ازاں تحقیقات کو غیر مؤثر قرار دیا۔ اس کے بعد شہباز بھٹی کو قتل کی دھمکیاں ملنا شروع ہوگئیں۔ کچھ مہینوں کے بعد آسیہ بی بی کو توہین رسالت کیس میں سزائے موت ہوگئی۔ شہباز بھٹی توہین رسالت قانون پر تنقید کے حوالے سے کافی بے باک تھے۔ گورنر سلمان تاثیر کے قتل کے بعد وفاقی وزراء میں وہ واحد شخص تھے جو اس قانون میں ترمیم کے حامی تھے۔

2 مارچ 2011ء کو اسلام آباد میں موٹر سائیکل سوار 2 مسلح افراد نے شہباز بھٹی کی کار پر اس وقت فائرنگ کر دی جب وہ اپنی والدہ سے ملاقات کر کے واپس آ رہے تھے۔ حملہ آوروں نے شہباز بھٹی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا لیکن ڈرائیور کو چھوڑ دیا۔ بظاہر انہیں مطلوبہ سکیورٹی فراہم نہیں کی گئی تھی حالانکہ انہیں روزانہ کی بنیاد پر دھمکیاں مل رہی تھیں۔ وزیر داخلہ رحمان ملک نے آنجہانی وزیر کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ روزانہ والدہ سے ملنے چلے جاتے تھے۔ بالالفاظ دیگر ان کا کہنا تھا کہ شہباز بھٹی نے زیادہ سکیورٹی کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ سلمان تاثیر کے قتل کے بعد یہ شک وشبہ ظاہر کیا

جا رہا تھا کہ کیا سکیورٹی فورسز قابل اعتبار ہیں کہ نہیں۔ حتیٰ کہ رحمٰن ملک نے سلمان تاثیر کو بھی انتہائی سکیورٹی کے درجے میں شامل نہیں کیا تھا۔ شہباز بھٹی کے قتل پر مسیحی برادری نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ ایک بھی مسلمان عالم نے قتل کی مذمت نہیں کی۔ دوسری طرف وزراء اور وزیر اعظم نے آنجہانی وزیر کی آخری رسوم میں شرکت کی اور اظہار ہمدردی کیا۔

باب 17

اسامہ بن لادن کا خونین انجام

اقوام متحدہ نے ستمبر 2010ء میں تحریک طالبان پاکستان کو دہشتگرد تنظیم اور اس کے 2 سرفہرست لیڈروں کو بین الاقوامی دہشتگرد قرار دیا تھا۔ 20 جنوری 2011ء کو ٹی ٹی پی کے ایک اور لیڈر قاضی حسین کو دہشتگردوں کی بھرتی اور تربیت کے الزام میں دہشتگردوں کی فہرست میں شامل کرلیا گیا۔ اس روز برطانیہ نے اپنی سرزمین پر ٹی ٹی پی پر پابندی لگادی۔ البتہ ایسے اقدامات کے باوجود ان سازشی نظریات کا خاتمہ نہ ہوسکا کہ تحریک طالبان سی آئی اے اور ''را'' کی پروردہ تھی۔ 26 جنوری کو اس سازشی نظریے کو اور بھی تقویت ملی جب ایک سابق امریکی فوجی ریمنڈ ڈیوس جو پرائیویٹ سکیورٹی فرم بلیک واٹر کا ملازم اور سی آئی اے سے منسلک تھا نے لاہور میں 2 مسلح افراد کو سرعام قتل کردیا۔ میڈیا میں ایسی اطلاعات آئیں کہ اس کا اصل نام ریمنڈ ڈیوس نہیں تھا۔

بہرحال لاہور کے علاقے مزنگ چونگی میں دونوں افراد کے خون میں لت پت پڑے ہونے کی فلم بھی ریمنڈ ڈیوس نے اپنے موبائل فون سے بنالی۔ یہ بات واضح تھی کہ وہ اس صورتحال میں ذرا بھی بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہوا اور اس نے نہایت مہارت کے ساتھ دونوں مسلح افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ پولیس حراست میں ڈیوس نے دعویٰ کیا کہ اس نے اپنے دفاع میں دونوں حملہ آوروں کو ہلاک کیا۔ اس واقعے میں تیسرا شخص بھی ہلاک ہوا۔ وہ ایک راہگیر تھا جو اس کار کی زد میں آ گیا جو امریکی سفارتخانے کی تھی اور ریمنڈ ڈیوس کو بچانے سڑک کی غلط سمت سے آرہی تھی۔ اس کار کا ڈرائیور پراسرار طور پر موقع سے غائب ہوگیا۔ ریمنڈ ڈیوس نے سفارتی تحفظ کی درخواست

کرتے ہوئے کہا کہ اسے رہا کر دیا جائے۔ امریکہ نے بھی ڈیوس کے دعوے کی حمایت کی اور اس کی فوری رہائی پر زور دیا۔ ایک غیر معمولی اقدام کے طور پر صدر اوباما اور وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے ٹی وی پر ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کی اپیلیں کیں۔ 6 فروری کو ڈیوس کے ہاتھوں قتل ہونے والے ایک شخص کی بیوہ شمائلہ کنول نے اس خدشے کے پیش نظر بھاری مقدار میں نیند کی گولیاں کھا کر زندگی ختم کر لی کہ ڈیوس کو مقدمے کے بغیر رہا کیا جا رہا ہے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ملزم کو رہا نہ کیا جائے اور خون کا بدلہ خون ہونا چاہئے۔ ڈیوس کو اس طرح قتل کیا جائے جس طرح اس کے شوہر کو مارا گیا۔ (دنیا نیوز، 8 فروری 2011ء)

ایک ویڈیو کلپ میں دکھایا گیا کہ ریمنڈ ڈیوس سے ایک پولیس سٹیشن میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی اس دوران خفیہ طریقے سے ویڈیو ریکارڈنگ بھی کی گئی۔ ابتدائی تفتیش میں اسے یہ دعویٰ کرتے دیکھا جا سکتا تھا کہ اسے لاہور میں امریکی قونصلیٹ میں تعینات کیا گیا اور یہ کہ اس نے جائے وقوعہ پر آنے والے پہلے پولیس افسر کو اپنا پاسپورٹ دے دیا تھا۔ اس موقع پر ٹی وی کے اینکر نے دنیا ٹی وی کے رپورٹر نصیر واہگہ سے مزید تفصیل دینے کو کہا۔ نصیر واہگہ نے تبصرہ کیا کہ ڈیل ڈول سے ریمنڈ ڈیوس ہرگز سفارتکار نہیں لگتا اور یہ کہ وہ جاسوس ہے۔ ایک پیشہ ور جاسوس جس نے 2 افراد کو مشاقی سے قتل کیا۔ اس نے ٹی وی کی ونڈ سکرین سے نشانہ باندھ کر دونوں افراد کے سر پر گولیاں ماریں۔ اس کے بعد ان کی تصاویر بنائیں پھر نہایت اطمینان سے کار میں بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرنے لگا۔ نصیر واہگہ نے بتایا کہ ریمنڈ ڈیوس کی کار میں کئی قسم کی بندوقیں تھیں۔ اس کے علاوہ 100 گولیاں تھی جبکہ سٹل اور ویڈیو کیمرے بھی تھے۔ (دنیا نیوز، 9 فروری 2011ء) ایک اور کلپ میں 15 فروری 2011ء کو ریمنڈ ڈیوس دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ سفارتکار ہے اور اس نے پولیس کے سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ وہ غصے سے اپنی نشست سے اٹھتا ہے اور اپنے ہاتھ سے جھٹک کر تفتیش کرنے والوں کو انکار کرتا ہے۔ (دنیا نیوز، 15 فروری 2011ء)

جس وقت پاکستان میں یہ حیران کن واقعات رونما ہو رہے تھے اس وقت امریکہ نے دھمکی دی کہ اگر ڈیوس کو رہا نہ کیا گیا تو وہ پاکستان کے ساتھ روابط منقطع کر دے گا اور پاکستانی سفیر حسین حقانی کو نکالنے کے ساتھ امداد بھی بند کر دے گا۔ (ڈان، 9 فروری 2011ء)۔ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کی ہیلری کلنٹن کے ساتھ مجوزہ ملاقات منسوخ کر دی گئی۔ بعدازاں اوبامہ انتظامیہ نے

اس بات کی تردید کی کہ یہ سب اقدامات سوچے سمجھے تھے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ امریکہ پاکستانی حکومت پر احکامات کی تعمیل کیلئے بے باک انداز میں دباؤ ڈال رہا تھا۔ امریکہ پر پاکستان کے اقتصادی اور فوجی انحصار جبکہ دیگر غیر ملکی طاقتوں جن پر امریکہ کا اثر ورسوخ کام کرتا تھا کے تعاون کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بالکل واضح تھی کہ ریمنڈ ڈیوس کیس کا فیصلہ بین الاقوامی قانون اور سفارتی قواعد کے مطابق نہیں ہوگا۔ ایک ایسی کمزور منتخب حکومت جو امریکی سپورٹ کی محتاج تھی اور ایک ایسی فوج جو امریکی سرپرستی کی بنیاد پر تیار ہوئی کا مطلب تھا کہ حاوی امریکہ ہی رہے گا۔

اصل مسئلہ ریمنڈ ڈیوس کی کاؤبوائے قسم کی بہادری کیخلاف پاکستانی عوام کے اشتعال آمیز ردعمل کا تھا۔ دائیں بازو اور انتہائی توہم پرست میڈیا اور مذہبی جماعتوں نے مطالبہ کیا کہ ریمنڈ ڈیوس پر دوہرے قتل کا مقدمہ عدالت میں چلایا جائے۔ محدود استثنیٰ کے ساتھ لبرل حلقوں نے بھی امریکی خودسری اور پاکستان کی خودمختاری کی بے حرمتی پر ناک بھوں چڑھائی۔ کالم نگاروں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ آخر ایک سفارتکار کس طرح آتشیں اسلحے کے ساتھ پاکستان کے انتہائی مشہور شہر میں دندنا رہا تھا اور اس نے ایک مصروف سڑک پر پاکستانی شہریوں کو گولی ماردی اور پھر نہایت اطمینان سے لاشوں کی تصاویر بنائیں۔

حکومت کا ردعمل متضاد تھا۔ جہاں رحمٰن ملک کی سربراہی میں طاقتور وزارت داخلہ نے تصدیق کی کہ ریمنڈ ڈیوس کے پاس سفارتی پاسپورٹ ہے وہاں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے تردید کی کہ ریمنڈ ڈیوس کی کوئی سفارتی حیثیت ہے۔ اور اس لئے اس کیخلاف فوراً قانونی کارروائی ہونی چاہئے۔

اس کھینچا تانی میں شاہ محمود قریشی سے وزارت خارجہ کا قلمدان واپس لے لیا گیا اور کوئی اور وزارت پیش کی گئی جسے لینے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ غصے میں آ کر شاہ محمود قریشی نے اس کا جواب حکومت پر تنقید سے دیا کہ وہ امریکہ کے سامنے کھڑی نہیں ہو رہی۔ انہوں نے کہا کہ ہیلری کلنٹن نے مجھ پر دباؤ ڈالا کہ میں ریمنڈ ڈیوس کی سفارتی حیثیت تسلیم کرلوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ (ڈیلی ٹائمز، 13 فروری) اس موقع پر پیپلز پارٹی کی مشینری متحرک ہوگئی۔ گیلانی اور زرداری کے وفاداروں نے شاہ محمود قریشی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اشفاق کیانی سمیت بعض دیگر اعلیٰ جنرلوں نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ امریکہ نے پاکستان میں سینکڑوں ایجنٹ

بھیج رکھے ہیں۔ جو پاکستانی حکام کے علم میں لائے بغیر خفیہ معلومات جمع کر رہے تھے۔ سول حکومت نے مئوقف یہ اختیار کیا کہ ریمنڈ ڈیوس کیس کا فیصلہ عدالت پاکستانی قوانین اور قانونی طریقہ کار کے مطابق کریگی۔

اس دوران سینیٹر جان کیری پاکستان آئے۔ انہوں نے 15 فروری کو لاہور میں پریس کانفرنس کی اور پاک امریکہ تعلقات کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے 3 افراد کی موت پر افسوس کرتے ہوئے متاثرہ خاندانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن ان کی گفتگو میں اس نکتے پر توجہ مرکوز کی گئی کہ ریمنڈ ڈیوس سفارتکار ہے اس لئے اسے جینوا کنونشن کے تحت سفارتی استثنیٰ حاصل ہے۔ جان کیری نے بڑے اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف سے بھی ملاقات کی۔ انہوں نے بھی یہی مئوقف اختیار کیا کہ فیصلہ پاکستانی قانون کے مطابق کیا جائے۔ جماعت اسلامی کے امیر منور حسن نے ڈیوس کے سفارتی استثنیٰ کے تمام دعوؤں کو مسترد کر دیا۔ ایک غیر معمولی اقدام کے طور پر صدر اوبامہ نے وائٹ ہاؤس سے ایک بیان جاری کیا کہ ریمنڈ ڈیوس سفارتکار ہے اور سفارتی استثنیٰ کی بنا پر اسے رہا کرنا چاہئے۔ ٹی ٹی پی نے حکومت کو خبردار کیا کہ ریمنڈ ڈیوس جاسوس ہے اور اسے رہا نہ کیا جائے۔ (ڈان، 16 فروری 2011ء)۔

امریکہ کے سکیورٹی امور کے ماہر سٹیفن کوہن نے NDTV پر پاکستانی ٹاک شو میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ بات واضح ہے کہ ریمنڈ ڈیوس عام سفارتکار نہیں کیونکہ سفارتکار اس طرح اسلحہ لے کر نہیں گھومتے یا لوگوں کو گولیاں نہیں مارتے۔ اس کی موجودگی اور سرگرمیوں سے بے خبری پاکستانی انٹیلی جنس اداروں کی ناکامی ہے۔ البتہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ایسے ناخوشگوار واقعات اس لئے رونما ہو رہے ہیں کیونکہ پاکستان افغانستان کے اندر امریکی اور نیٹو تنصیبات پر حملے کرنے والے دہشتگردوں سے نمٹنے میں ناکام رہا ہے۔ اس سے امریکہ اور جنوبی ایشیاء میں عدم سلامتی پیدا ہو رہی ہے۔ (این ڈی ٹی وی، 23 فروری 2011ء) اس قسم کی دلیل سے ان شبہات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ سی آئی اے پاکستان میں اپنی انٹیلی جنس اطلاعات جمع کر رہی تھی اور ڈیوس کے پاکستان کے 2 افراد کو قتل کرنے سے پاکستانی انٹیلی جنس اداروں میں اختلافات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے نقطہء نظر سے پاکستان بھاری امریکی امداد ملنے کے باوجود حقانی اور دیگر دہشتگرد نیٹ ورکس کیخلاف کارروائی نہیں کر رہا تھا۔ بہر حال یہ کہانی بھی تبدیل ہوگئی کہ ریمنڈ ڈیوس نے دونوں

افراد کو آخر کیوں قتل کیا۔ ان کے مسلح ڈاکو ہونے کی بجائے میڈیا نے بتایا کہ وہ آئی ایس آئی کے ایجنٹ تھے اور ریمنڈ ڈیوس کی غیر قانونی سرگرمیوں پر نظر رکھنے پر مامور تھے۔ اس پر پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کیلئے گھناؤنی سازشیں کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ان خفیہ سرگرمیوں میں ٹی ٹی پی اور اس سے منسلک تنظیموں کو پنجاب میں پیسہ دینا بھی شامل تھا جو پاکستان میں خودکش بم حملوں سمیت دہشتگردی کی دیگر سرگرمیوں میں ملوث تھیں۔ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی سازش کا اصل مقصد پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر قبضہ کرنا تھا۔ بالالفاظ دیگر الزام یہ تھا کہ ڈیوس پاکستان کو توڑنے کے منصوبے کا روح رواں تھا۔

حتی کہ امریکی حکام نے انکشاف کیا کہ ریمنڈ ڈیوس سی آئی اے کیلئے کنٹریکٹ پر کام کرتا تھا۔ آئی ایس آئی کے ایک عہدیدار نے نام خفیہ رکھنے کی شرط پر بتایا کہ ریمنڈ ڈیوس کے فاٹا میں رابطے تھے اور وہ دونوں مقتول افراد کو جانتا تھا۔ (ڈیلی ٹائمز، 9 فروری 2011ء) دنیا نیوز چینل نے ایک ویڈیو کلپ میں وہ تصاویر دکھائیں جو ریمنڈ ڈیوس نے لاہور کے بھارتی سرحد کے ساتھ حساس علاقوں کی کھینچی تھیں۔ یہ بھی دکھایا گیا کہ جن افراد کو قتل کیا گیا اور یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس سے لگتا ہے کہ ریمنڈ نے اسے اپنے دفاع میں گولی ماری۔ میڈیا نے بتایا کہ ریمنڈ ڈیوس کے موبائل فون اور سیٹلائٹ فون ڈیوائس سے ملنے والا ڈیٹا حاصل کر لیا گیا ہے۔ (یوٹیوب، 11 فروری) اس سیٹلائٹ ٹیکنالوجی سے اسے اپنی لوکیشن کا بالکل ٹھیک پتہ چلتا تھا۔ ڈیوس اسلام آباد، لاہور، پشاور اور قبائلی علاقوں میں جاتا رہا تھا اور علاقے میں ہونیوالے ڈرون حملوں میں ملوث تھا۔

یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ ڈیوس کی گرفتاری کے بعد ڈرون حملوں میں خلل آ گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد نقصان کے ازالے کی سرگرمیاں بھی فوراً قانون کے مطابق ورثا کو ''دیت'' کی رقم کی ادائیگی پر بھی بحث شروع کر دی گئی۔ ایسے اقدام پر انسانی حقوق کی تنظیموں نے تنقید کی کیونکہ اس طرح پیسے کے بل بوتے پر مجرموں کی رہائی کی راہ ہموار ہو جاتی اور غیرت کے نام پر قتل کے کیسوں میں اہل خانہ بھی مجرموں کو معاف کر سکتے تھے۔ کچھ علما نے مؤقف اختیار کیا کہ ڈیوس کے معاملے میں دیت اور قصاص کے اسلامی قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ حکومت نے وہی ''اصولی'' مؤقف برقرار رکھا کہ اس معاملے کا حل صرف قانونی طریقے سے نکالا جائے گا۔ 16 مارچ کو

پاکستان کی ایک عدالت نے ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کا حکم دیا کیونکہ اس نے مقتولین کے ورثا کو دیت کی رقم ادا کر دی تھی۔ اس کیس کی سماعت جج نے جیل میں کی جس میں لواحقین بھی موجود تھے اور انہوں نے رقم وصول کر لی۔

ملزم کی طرف سے 30 کروڑ20لاکھ ڈالر کی رقم کافی پر کشش تھی۔ وکلاء استغاثہ نے بعد ازاں انکشاف کیا کہ حکام نے اس ڈیل سے انہیں دور رکھا اور تمام عمل نہایت خفیہ طریقے سے مکمل کیا گیا۔ پورے ملک میں ہونیوالے مظاہروں اور عوامی غم و غصے سے قطع نظر امریکی دباؤ جاری رہا۔ ہیلری کلنٹن نے اس بات کی تردید کی کہ امریکی حکومت نے دیت کی رقم ادا کی۔ (دی نیوز، 17 مارچ 2011ء) ایسا لگتا ہے کہ رقم کی فراہمی کا کام غیر سرکاری عناصر کے ذریعے پس پردہ رہ کر کیا گیا۔ اس بات پر ملک کے طول و عرض میں شور مچ گیا کہ پاکستان نے اپنی خودمختاری اور قومی غیرت پر سمجھوتہ کر لیا ہے لیکن اس افراتفری میں یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکی کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ جہاں امریکہ کے اہم مفادات وابستہ تھے وہاں وہ پاکستان سے بھی کچھ توقعات رکھتا تھا۔

ڈرون حملے پھر شروع' پاکستان پر دباؤ میں اضافہ

جس روز ڈیوس رہا ہوا شمالی وزیرستان میں امریکہ نے ڈرون حملہ کیا جس میں 40افراد بظاہر سویلین مارے گئے۔ یہ لوگ معمول کے معاملات پر جرگے کیلئے وہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ اس اقدام پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو شدید خفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ ایک ایسے وقت پر امریکہ کی طرف سے پاکستانی عوام کے جذبات کی سراسر بے حرمتی تھی جبکہ پورے ملک میں امریکہ مخالف جذبات کی لہر جاری تھی۔ آئی ایس پی آر کے مطابق آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے معصوم شہریوں کی ہلاکت کی شدید مذمت کی اور یہ کہا کہ ایسے حملے قابل قبول نہیں۔ (17 مارچ 2011) ۔ اس حملے کے بعد امریکی سفیر کیمرون منٹر کو دفتر خارجہ کو طلب کر کے شدید احتجاج کیا گیا۔ مبینہ طور پر پاکستان ایئر فورس کو ملک کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی صورت میں تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ ڈرون حملے 2004ء سے جاری تھے اور یہ بات عام تھی کہ یہ ڈرون طیارے بلوچستان کے شمسی ایئر بیس سے اڑان لیتے تھے۔

یہ بات شک وشبے پر مبنی تھی کہ کیا ہر ڈرون حملے میں پاکستانی حکام کی رضامندی شامل ہوتی ہے؟۔ شمالی وزیرستان کے اس تازہ ترین حملے پر بہرحال پاکستانی حکام کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔ پاکستان میں بڑے پیمانے پر پائے جانے والے عوامی غم وغصے کے تناظر میں اس بات کا امکان نہیں تھا کہ فوج کو حملوں سے بری الزمہ قرار دیا جاتا۔ البتہ حسب روایت واشنگٹن کی طرف سے اشک شوئی کے کچھ اقدامات بھی کئے گئے۔ اس کے ساتھ اعلیٰ عہدیداروں کی طرف سے یک زبان ہوکر یہ شکوہ بھی دہرایا گیا کہ پاکستان شمالی وزیرستان میں دہشتگردوں کے ٹھکانے ختم کرنے کیلئے واضح ارادے نہیں رکھتا۔

اس کی مخصوص مثال ایڈمرل مائیک مولن کی واشنگٹن میں کی گئی پریس کانفرنس تھی جس میں انہوں نے کہا کہ شمالی وزیرستان میں پاکستانی فورسز کی کارروائی کی بات نہایت ہی اہم معاملہ ہے۔ انہوں نے انسداد دہشتگردی کیلئے پاکستانی عوام کی تعریف کی لیکن یہ بھی کہا کہ اس مہم کو شمالی وزیرستان تک توسیع دی جائے جہاں القاعدہ اور حقانی نیٹ ورک قائم تھا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان نے وادی سوات اور دیگر علاقے دہشتگردوں سے پاک کرنے کے دوران ہزاروں فوجیوں اور شہریوں کی جانوں کی قربانی دی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ امریکہ افغانستان میں بھارت کے بڑھتے اثر ورسوخ پر پاکستان کے تحفظات سمجھتا ہے۔ (ڈان 18 مارچ 2011ء)

علاقائی امن کیلئے کچھ اقدامات

کرکٹ ورلڈ کپ 2011ء کے سیمی فائنل میں پاکستان اور بھارت کے درمیان میچ کے موقع پر کرکٹ ڈپلومیسی ایک بار پھر متحرک ہوگئی جب بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے وزیراعظم گیلانی کو موہالی سٹیڈیم بھارتی پنجاب میں میچ دیکھنے کی دعوت دی۔ ہزاروں پاکستانی شائقین کو میچ دیکھنے کیلئے ویزے دیئے گئے۔ حسب روایت ان کا بھارت میں گرمجوشی اور فراخدلی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ بالکل اس طرح جس طرح پاکستان میں ایسے مواقع پر بھارتی شائقین کا استقبال کیا جاتا رہا تھا۔ دونوں وزرائے اعظم نے امن عمل آگے بڑھانے کا عزم کیا اور دہشتگردوں سے متعلق انٹیلی جنس معلومات کے تبادلے کیلئے ہاٹ لائن قائم کرنے پر بھی اتفاق کیا گیا۔ اس کے بعد وزارت خارجہ کے افسروں کو تعلقات معمول پر لانے کیلئے متحرک کیا گیا۔ (ڈیلی ٹائمز 31

مارچ 2011ء)

جنرل شجاع پاشا کا سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کا دورہ

جہاں تک امریکہ پاکستان تعلقات کا تعلق ہے تو آئی ایس آئی کے ڈی جی جنرل شجاع پاشا نے اپنے وفد کے ساتھ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کیا اور 11 اپریل کو سی آئی اے کے سربراہ لیون پنیٹا سے ملاقات کی۔ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے تناظر میں جنرل پاشا نے مبینہ طور پر پاکستان میں مستقبل میں سی آئی اے کی خفیہ سرگرمیوں پر وسیع تر کنٹرول کا سخت مئوقف اختیار کیا۔ امریکیوں کو بتایا گیا کہ باہمی اعتماد کی واضح خلاف ورزی کی گئی ہے اور ایک واضح ضابطہ اخلاق تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جنرل پاشا نے سی آئی اے سے کہا کہ پاکستان میں کام کرنے والے سی آئی اے کے اہلکاروں اور کنٹریکٹروں کی مکمل فہرست فراہم کی جائے اور واضح کیا کہ ان میں سے بعض کو پاکستان سے نکالا بھی جاسکتا ہے۔ امریکی نقطہء نظر سے اس اقدام سے پاکستان کے اندر سے ڈرون حملوں پر کچھ قدغن لگ سکتی تھی۔ سی آئی اے نے 2010ء میں 118 ڈرون حملے کئے یہ تعداد حالیہ برسوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھی۔ (ڈیلی ٹائمز 13 اپریل 2011) سی آئی اے نے تصدیق کی کہ پاکستان میں انسداد دہشتگردی کے کام کیلئے اس کے 300 ایجنٹ موجود ہیں۔ (ڈیلی ٹائمز، 14 اپریل)۔ لیکن یہ وہ تعداد تھی جس کی پاکستان کی منظوری سے تعیناتی عمل میں لائی گئی تھی۔

اعلیٰ اختیاراتی وفد کا دورہ کابل

وسط اپریل کو وزیراعظم یوسف رضا گیلانی، آرمی چیف جنرل اشفاق کیانی اور ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل شجاع پاشا پر مشتمل اعلیٰ اختیاراتی وفد نے کابل کا دورہ کیا۔ وہاں کے حکام سے مذاکرات کے نتیجے میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ افغانستان سے غیرملکی فوجوں کے انخلا کے بعد امریکہ کی منظوری سے دونوں ملکوں کا مشترکہ کمیشن بنایا جائے گا جو مصالحتی عمل آگے بڑھائے گا۔ افغان صدر حامد کرزئی کو امید تھی کہ یہ جوائنٹ کمیشن طالبان کے ساتھ امن معاہدے کی کوئی سبیل نکالے گا۔ (ڈیلی ٹائمز، 17 اپریل 2011)۔

آئی ایس آئی پر سنگین تنقید

ایسی متنوع پیشرفت کا مطلب یہ نہیں کہ امریکہ نے ان دہشتگرد گروپوں کے خلاف پاکستان پر کارروائی کے لئے دباؤ کم کر دیا تھا جو امریکی مفادات کے لئے نقصان دہ تھے۔ حقیقت میں اس کی شدت مزید بڑھ گئی تھی۔ انگریزی اخبار میں ''مولن کی آئی ایس آئی پر تلخ تنقید'' کے عنوان سے طویل رپورٹ شائع کی جو ایڈمرل مائیک مولن کے دورہ اسلام آباد میں ڈان کے رپورٹ باقر سجاد سید سے انٹرویو پر مشتمل تھی۔ مائیک مولن نے کہا کہ آئی ایس آئی حقانی اور دیگر دہشت گرد نیٹ ورکس کو شمالی وزیرستان اور دیگر مقامات پر تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ آئی ایس آئی کے حقانی گروپ کے ساتھ تعلقات قابل قبول نہیں اور یہی تعلقات پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں تناؤ کی بنیادی وجہ ہیں۔ انہوں ے اشارہ دیا کہ سی آئی اے ٹھوس موجودگی کے ساتھ پاکستان کی صورتحال کی مانیٹرنگ جاری رکھے گی اور یہ کہ شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک پر اس وقت تک ڈرون حملے جاری رہیں گے جب تک آئی ایس آئی حقانیوں سے لاتعلقی اختیار نہیں کر لیتی۔ انہوں نے مبینہ طور پر یہ بھی کہا کہ: ''یہ میرا مقدس فریضہ ہے کہ میں ہر وہ ممکن اقدام کروں جس سے یہ یقینی بنایا جا سکے کہ حقانی نیٹ ورک افغانستان میں عسکریت پسندوں کی مدد کرنے کے قابل نہ رہے''۔ انہوں نے ایک ایسے غیر مستحکم منظر نامے کی تصویر کشی کی جس میں کئی دہشت گرد گروپ آپس میں بتدریج منسلک ہوتے چلے جائیں گے اور کہا کہ ''چاہے یہ حقانی نیٹ ورک ہو یا القاعدہ ، جماعۃ الدعوۃ یا لشکر طیبہ ہو۔ مجھے ان تنظیموں کی بابت جو پریشانی لاحق ہے وہ یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں ان تنظیموں کے درمیان ایک اتحاد قائم ہو چکا ہے جو زیادہ سے زیادہ پریشان کن ہے۔ چنانچہ حکیم اللہ محسود کی سربراہی میں ٹی ٹی پی بھی خطے سے باہر عزائم کی حامل ہے''۔

ایڈمرل مولن نے اعادہ کیا کہ ان پہلوؤں سے کوئی نتیجہ اخذ کریں تو اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ...... ''پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدی علاقے دنیا میں دہشت گردی کا مرکز ہیں''۔ ڈان کو انٹرویو کے دوران انہوں نے ایک سے زائد مواقع پر یہ تجویز دی کہ قبائلی

علاقوں سے ابھرنے والے دہشت گردی کے خطرے سے نمٹنے کیلئے بھارت افغانستان اور پاکستان قریبی تعاون کریں۔ کچھا کا دکا ریمارکس سے انہوں نے پاکستان کے انسداد دہشت گردی کے اقدامات کو بھی سراہا۔ انہوں نے زور دیا کہ دوطرفہ تعلقات کو لاحق چیلنجوں کے باوجود پاکستان اور امریکہ کی فوج میں تعلقات نہایت مضبوط ہیں۔ (ڈان 21 اپریل 2011)

جنرل کیانی نے امریکہ کے سب سے بڑے فوجی کمانڈر کی طرف سے ایسے الزامات کو یکسر مسترد کر دیا۔ انہوں ے پوری شدومد سے یہ منفی پراپیگنڈہ مسترد کر دیا کہ پاکستان کے اقدامات کافی نہیں اور یہ کہ پاکستان کی سمت واضح نہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ''فوج کے جاری آپریشن دہشت گردی کو شکست دینے کے ہمارے قومی عزم کے غماز ہیں''۔ (ڈان، 21 اپریل 2011ء)۔ اگلے ہی روز شمالی وزیرستان میں ایک اور ڈرون حملہ ہوا جس میں بچوں سمیت 21 افراد ہلاک ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ دہشت گردوں کے اڈے تباہ کرنے کیلئے امریکہ اپنی تن تنہا کوششیں جاری رکھنا چاہتا تھا۔ (ڈان، 22 اپریل 2011)۔ اس سے بھی زیادہ خفت آمیز دستاویز چند روز بعد نیویارک ٹائمنر نے شائع کی جس میں آئی ایس آئی کو 2007ء میں ''دہشت گردی کی حمایت کرنے والا ادارہ'' قرار دیا گیا تھا۔ (ڈان، 25 اپریل 2011)۔ 26 اپریل کو دہشت گردوں نے پاکستان نیوی کے سٹاف کو لے جانے والی بسوں پر حملہ کیا۔ 4 افراد ہلاک اور 56 زخمی ہوئے۔ ٹی ٹی پی نے حملے کی ذمہ داری قبول کر لی اور کہا کہ ایسی کارروائیاں اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک پاکستانی مسلح افواج امریکہ کی شہہ پر اپنی سرزمین پر اپنے لوگوں کو مارنا ترک نہیں کر دیتیں۔ (ڈیلی ٹائمنر، 27 اپریل 2011)۔

اوبامہ انتظامیہ نے کانگریس میں افغانستان اور پاکستان کی صورتحال پر اپنی ششماہی رپورٹ پیش کی جس میں بلا حیل و حجت یہ کہا گیا کہ ''پاکستان میں عسکریت پسندی کو شکست دینے کی کوئی واضح سمت نہیں، حالانکہ پاکستان نے ایک لاکھ 47 ہزار فورسز کی غیر معمولی تعیناتی کر رکھی ہے''۔ (لینڈے، 5 اپریل 2011ء)۔ رپورٹ میں پاکستان کی طرف سے ملک کے شمال مغربی

علاقوں میں انسداد دہشت گردی کے آپریشن کرنے میں ناکامی پر تشویش ظاہر کی گئی اور بتایا کہ پاکستانی فورسز نے 2 سالوں کے دوران مہمند ایجنسی میں 3 بڑے آپریشن کئے ......البتہ اس رپورٹ میں مزید کارروائیوں کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ (بالخصوص شمالی وزیرستان میں)۔ رپورٹ میں پاکستان کی تشویشناک اقتصادی صورتحال کو ''پاکستان کے وسط مدتی استحکام کے لئے سب سے بڑا خطرہ'' قرار دیا گیا۔ (نیویارک ٹائمز)۔

آپریشن جیرونیمو Operation Geronimo

2 مئی 2011ء کی آخر شب بالآخر امریکہ نے پاکستان کے کنٹونمنٹ شہر ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کا سراغ لگا لیا۔ امریکی فورسز ایک بڑی عمارت میں گھس گئیں اور 40 منٹ کے آپریشن میں القاعدہ کے مشہور زمانہ سربراہ کو ہلاک کر ڈالا۔ اسامہ اور اس کے پاکستانی محافظوں کی لاشیں ہیلی کاپٹر پر پاکستان کی حدود سے باہر منتقل کر دی گئیں۔ اسامہ کی تلاش کا کام 11 ستمبر کے حملوں سے بھی پہلے شروع کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ امریکی اہداف پر امریکہ کے اندر اور باہر حملوں میں ملوث تھا۔ لیکن نائن الیون کو ہزاروں امریکی شہریوں کی ہلاکت کے بعد اسامہ کی تلاش دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کی اولین سکیورٹی ترجیح بن گئی۔ اس کے پیروکاروں نے اس کی شخصیت کے گرد ایک روحانی حصار کھینچ رکھا تھا...... وہ اسلام کا ایسا ہیرو ہے جو مسلح جدوجہد سے اسلام کی سربلندی بحال کرے گا۔ امریکی فورسز کی طرف سے سراغ لگانے تک اسامہ نے کامیابی کے ساتھ اپنا دباؤ برقرار رکھا تھا۔ امریکی فورسز نے امریکی اڈے پر اسامہ کے خلاف کارروائی کے لئے کئی ہفتے تک مشق کی۔

اسامہ کے خلاف ''آپریشن جیرونیمو'' کا عوامی سطح پر اعلان صدر بارک اوبامہ نے کیا۔ اپنی طویل اور محتاط طریقے سے لکھی گئی تقریر میں انہوں نے اعلان کیا کہ صدارت کا منصب سنبھالنے کے فوراً بعد انہوں نے سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پینٹا کو ہدایت کی تھی کہ القاعدہ کے خلاف جنگ میں اسامہ کو گرفتار یا ہلاک کرنے کو اولین ترجیح بنایا جائے۔ اس کے باوجود کہ ہم القاعدہ نیٹ

ورک کے خاتمے، تباہی یا اسکی شکست کیلئے مربوط کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے خطاب میں یہ بھی کہا کہ:

''گزشتہ سال اگست میں ہماری انٹیلی جنس کمیونٹی کی محنت شاقہ کے بعد مجھے بتایا گیا کہ اسامہ بن لادن ممکنہ طور پر کہاں ہوسکتا ہے۔ اس امر کی تصدیق میں مزید کئی ماہ لگ گئے۔ میں نے نیشنل سکیورٹی کی اپنی ٹیم سے کئی ملاقاتیں کیں کیونکہ پاکستان کے عین بیچ میں واقع کمپاؤنڈ میں اسامہ بن لادن کے چھپے ہونے کی مزید اطلاعات مل رہی تھیں۔ اور آخر کار گزشتہ ہفتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کارروائی کیلئے اتنی اطلاعات کافی تھیں اور حکم جاری کیا کہ اسامہ کو انصاف کے کٹہرے تک لانے کے لئے آپریشن کیا جائے۔

آج میری ہدایت پر امریکہ نے ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے ٹھکانے کو ہدف بنانے کے لئے آپریشن کا آغاز کیا۔ ایک چھوٹی سی امریکی ٹیم نے غیر معمولی جرات اور صلاحیت کے ساتھ آپریشن کیا۔ کارروائی میں کسی امریکی فوجی کو نقصان نہیں پہنچا۔ انہوں نے عام شہریوں کو نقصان نہ پہنچانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ فائرنگ کے تبادلے کے بعد انہوں نے اسامہ کو مار ڈالا اور اس کی لاش قبضے میں لے لی۔ حالیہ برسوں کے دوران میں نے برملا واضح کر دیا تھا کہ اسامہ بن لادن کی اگر پاکستان کی حدود میں موجودگی ثابت ہوئی تو امریکہ کارروائی کرے گا۔ اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے تعاون سے ہمارے انسداد دہشتگردی آپریشن سے ہمیں اسامہ بن لادن کو تلاش کرنے میں مدد ملی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بن لادن نے پاکستان کے خلاف بھی جنگ شروع کر رکھی تھی اور پاکستانی عوام کے خلاف حملوں کا حکم دے رکھا تھا''۔

اگلی ہی صبح کئی ٹیلی ویژن چینلوں پر پاکستانی ماہرین نے اسامہ بن لادن کے قتل کے معاملے پر تبادلہ خیال کیا۔ اکثر مبصرین کی رائے تھی کہ کسی بھی حالات میں پاکستانی حکام کے تعاون کے بغیر امریکہ کا ایسا آپریشن کرنا ممکن نہیں تھا، پورا دن گزر گیا لیکن وزیر اعظم یا صدر

پاکستان میں سے کسی نے قوم سے خطاب کر کے اسے سرکاری مؤقف پر اعتماد میں نہ لیا۔ البتہ کچھ دیر بعد پاکستان کے دفتر خارجہ نے مختصر بیان جاری کر کے بتایا کہ یہ آپریشن خالصتاً امریکیوں نے خود کیا اور اس میں پاکستان کا کوئی کردار نہیں (دنیا نیوز، 2 مئی 2011، ان، 3 مئی)۔

کئی حلقوں نے اس تاثر کو مسترد کر دیا کہ امریکی ہیلی کاپٹر پاکستان کو بتائے بغیر پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے۔ امریکہ کے قومی سلامتی کے نائب مشیر جان برینن نے پریس کانفرنس میں آپریشن کے بارے میں دیگر معلومات بھی فراہم کیں۔ انہوں نے اس بات کو یکسر مسترد کر دیا کہ خفیہ آپریشن کے بارے میں پاکستان کو کچھ بتایا گیا تھا۔ یہ خالصتاً امریکی فورسز کی کارروائی تھی۔ امریکہ کے انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز American Navy Seals کے اہلکار افغانستان سے 2 ہیلی کاپٹروں پر ایبٹ آباد پہنچے۔ پاکستان کی حدود میں پہلے سے تعینات 2 امریکی طیارے بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اسامہ کے ٹھکانے کا پتہ ایبٹ آباد میں اسامہ کے ایک کوریئر کی نشاندہی سے لگا۔

یہ کوریئر قبل ازیں گوانتانا موبے کے حراستی مرکز میں قید رہا۔ اس کی رہائی کے بعد اس پر نظر رکھی گئی کیونکہ توقع تھی کہ اسامہ بن لادن کو اپنے ساتھیوں سے رابطے کرنے کی ضرورت تھی اس طرح ایبٹ آباد کے اس کمپاؤنڈ میں اسامہ کے چھپے ہونے کی تصدیق ہو گئی۔ جان برینن نے کہا کہ یہ بات تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ اسامہ کو ملک کے اندر سے کوئی سپورٹ حاصل نہیں تھی اور یہ کہ اسامہ گزشتہ 5، 6 سال سے اس جگہ پر مقیم تھا۔ البتہ جان برینن نے یہ واضح نہیں کیا کہ ان کی سپورٹ سے مراد حکومت پاکستان تھی یا ان کا اشارہ فوج یا آئی ایس آئی کی طرف تھا۔ بن لادن کے ساتھ 3 دیگر مرد اور ایک عورت بھی موت کا شکار ہوئے۔ ان میں کوریئر، اس کا بھائی، اسامہ کا ایک بیٹا اور ایک بیوی شامل تھے۔ بن لادن بادی النظر میں اس عمارت میں اپنی 2 بیویوں اور 6 بچوں کے ساتھ مقیم تھا۔ کچھ اور بچے بھی تھے۔ برینن نے بتایا کہ آپریشن صرف 40 منٹ میں مکمل کر لیا گیا اور اوبامہ اور ان کے قریبی ساتھی لمحہ بہ لمحہ اس کارروائی سے (بذریعہ سیٹلائٹ) باخبر

رہے۔ پاکستان کی طرف سے کسی ردعمل سے پہلے ہی امریکی طیارے اس کی حدود سے نکل چکے تھے۔ البتہ ایک ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا کیونکہ اس کے پر عمارت کی دیوار سے ٹکرا گئے۔ کسی امریکی فوجی کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا اور یہ لوگ بخیر و عافیت اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ گئے۔ اس کے علاوہ آپریشن کرنے والی ٹیم نے عمارت کے اندر موجود تمام دستاویزات بھی قبضے میں لے لیں۔

جان برینن کی وضاحت صدر اوبامہ کے ابتدائی بیان کی تصحیح تھی کہ اسامہ کی تلاش میں پاکستان سے کوئی تعاون حاصل کیا گیا تھا۔ برینن نے میڈیا کو بتایا کہ بن لادن کی میت افغانستان سے بحیرہ عرب میں موجود امریکی بحری جہاز تک پہنچائی گئی جہاں اسلامی طریقے کے مطابق اس کی آخری رسومات ادا کرنے کے بعد اسے سمندر میں دفن کر دیا گیا۔ (یوٹیوب، 2 مئی 2011)۔

پاکستان میں ٹی وی کے ٹاک شوز میں خوفناک سازشی نظریات کی گردان شروع کر دی گئی۔ امریکہ کی طرف سے اسامہ بن لادن کی لاش نہ دکھانے کو اس بات کا ثبوت قرار دیا گیا کہ اس کی جگہ کسی اور کو مار دیا گیا ہے اور یہ کہ پورے کا پورا ڈرامہ جعلی تھا۔ زید حامد، اوریا مقبول جان اور پراچہ جیسے نام نہاد سکیورٹی ماہرین نے یہ تبصرہ فرمایا کہ یہ جعلی ڈرامہ محض اس لئے رچایا گیا کہ صدر اوبامہ 2011ء الیکشن جیت سکیں۔ جیسا کہ توقع تھی انہوں نے بڑی شدومد سے زور دیا کہ پاکستان کے خلاف اصل سازش بے نقاب ہوا چاہتی ہے۔ دوسرا بنیادی مقصد پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کرنا جبکہ پہلا بنیادی مقصد پاکستان کو دولخت کرنا ہے۔ اس بڑی سازش میں نہ صرف نیٹو اور امریکہ کو ملوث قرار دیا گیا بلکہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' اور اسرائیلی ادارہ موساد کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ البتہ سابق سفیر ظفر ہلالی نے اسامہ بن لادن کی موت سے انکار کو محض فریب خیال قرار دیا۔ (دنیا نیوز، 3 مئی 2011)۔

توقع کے مطابق بھارت کا پاکستان کے خلاف ردعمل کافی سخت تھا۔ بھارت کا سرکاری مؤقف وزارت داخلہ نے جاری کیا۔ ''اس حقیقت (اسامہ بن لادن کی پاکستان میں موجودگی) سے ہمارے ان خدشات کو تقویت ملتی ہے کہ مختلف دہشت گرد تنظیموں کو پاکستان میں محفوظ ٹھکانے

میسر ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ممبئی میں دہشت گرد حملوں کے منصوبہ سازوں، کنٹرولرز اور ہینڈلرز کو بدستور پاکستان میں پناہ دستیاب ہے''۔ (ٹائمز آف انڈیا، 2 مئی 2011ء)۔

سی آئی اے کے سربراہ لیون پنیٹا نے اس بات کی مزید وضاحت کی کہ آخر اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی کے دوران پاکستان کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیا۔ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ امریکہ کو خدشہ تھا کہ پاکستان کے خفیہ اہلکار القاعدہ کے سربراہ کو چوکنا نہ کر دیں۔ انہوں نے آپریشن کی مزید تفصیلات کا بھی انکشاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ صدر اوبامہ کو یہ تجویز بھی دی گئی کہ اسامہ کے ٹھکانے پر بی 52 طیاروں سے بمباری کی جائے یا کروز میزائل سے براہ راست حملہ کیا جائے۔ فضائی حملے کو خارج از امکان قرار دیا گیا کیونکہ اس صورت میں شہری ہلاکتوں کی صورت میں 'کولیٹرل ڈیمیج' زیادہ ہونے کا احتمال تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اسامہ بن لادن کی سیٹلائٹ تصویر جیسا کوئی فول پروف ثبوت نہیں تھا جو کارروائی کی منصوبہ بندی کرنے والی اوبامہ کی ٹیم کو ملتا۔ (دی نیوز، 3 مئی 2011ء)۔

دوسری جانب آئی ایس آئی اس وضاحت کے ساتھ سامنے آئی کہ جس بڑے مکان میں اسامہ بن لادن موجود تھا اس کی تلاشی 2003 میں لی گئی تھی لیکن وہاں کچھ بھی مشکوک نہیں پایا گیا۔ چنانچہ اس پر مزید نظر نہ رکھی گئی۔ البتہ 3 مئی کو بی بی سی کے نمائندے علیم مقبول ٹی وی پر مکان کے ہمسائے میں مقیم شخص سے گفتگو کرتے نظر آئے کہ سکیورٹی فورسز روزانہ کی بنیاد پر بالخصوص شام کو قرب وجوار میں مقیم افراد کے شناختی کارڈ چیک کرتی تھیں۔ غیر ملکی نامہ نگاروں کی دیگر ہمسائیوں سے گفتگو میں مزید تفصیلات سامنے آئیں۔ پتہ چلا کہ ہر روز ایک سرخ کار میں بکرا اس عمارت کے اندر پہنچایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا کہ جب کبھی کرکٹ کھیلتے ہوئے بچوں کی بال عمارت کے اندر چلی جاتی تو وہ کبھی واپس نہ کی جاتی۔ البتہ اس کے بدلے معقول رقم ادا کر دی جاتی۔ اور یہ کہ یہ سب کچھ فوج کے علم میں آئے بغیر ہوتا رہا زیادہ قابل اعتبار نہیں تھا۔ سابق ڈی جی آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل اسد درانی اور معروف تبصرہ نگار اکبر ایس احمد کا بی بی سی نے

انٹرویو کیا۔ دونوں نے اس بات کو خارج از مکان قرار دیا کہ حکام کو ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کا علم نہیں تھا بلکہ اسد درانی نے تو یہ تک کہا کہ ہوسکتا ہے امریکی نیوی سیلز کے آپریشن کو پاکستان کی طرف سے زمینی سپورٹ بھی حاصل ہو۔ انہوں نے کہا کہ عوام کے اشتعال انگیز ردعمل کے ڈر سے پاکستان اس آپریشن کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا تھا۔ پاکستان کے علم میں لائے بغیر امریکہ کے آپریشن کی بات خود آپریشن میں شامل ہونے کے اعتراف سے زیادہ قابل قبول تھی۔

البتہ اوبامہ انتظامیہ مسلسل یہ کہتی رہی کہ پاکستان کو سرے سے اس آپریشن کی اطلاع نہیں دی گئی۔ پاکستان کی طرف سے دہشت گردی کی پرورش کرنے پر امریکی میڈیا حتیٰ کہ ممتاز ڈیموکریٹ رہنماؤں کی طرف سے شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ جنوبی فلوریڈا کے رکن کانگریس ایلن ویسٹ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ حکومت پاکستان اسامہ بن لادن کی امریکی فورسز سے طویل روپوشی چھپانے اور اس سے تعاون میں ملوث ہوسکتی ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ پاکستان کی طرف سے اسامہ بن لادن کی موجودگی کے بارے میں واضح وضاحت کے بغیر پاکستان کے لئے ہر قسم کی امداد بند کردی جائے۔ انہوں نے یہ بھی امکان ظاہر کیا کہ اسامہ بن لادن کی گرفتاری میں پاکستان نے بھی درپردہ تعاون کیا ہوتا کہ نائن الیون کے بعد جاری ہونے والی 20 ارب ڈالر کی امداد کا جواز پیش کیا جاسکے۔ (ڈیلی ٹائمز، 5 مئی 2011ء)۔ امریکہ کی طرف سے فراہم کردہ مزید تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ آپریشن کے دوران اسامہ بن لادن نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس نکتے پر یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا مزاحمت کئے بغیر اسامہ کی ہلاکت بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی نہیں؟۔ امریکی اٹارنی جنرل نے یہ نکتہ پیش کیا کہ امریکہ پر دہشت گردی کے حملے کا حکم دے کر اسامہ نے گویا اعلان جنگ کیا تھا اس لئے اس کا خاتمہ جائز ہدف تھا۔

اس آپریشن کے حوالے سے کچھ اور انوکھی پیشرفت بھی دیکھنے میں آئی۔ امریکہ نے فیصلہ کیا کہ اسامہ کی لاش ٹی وی پر نہیں دکھائی جائے گی کیونکہ گولیاں لگنے سے یہ بری طرح مسخ ہوگئی

تھی۔امریکی حکام نے دعویٰ کیا کہ اسامہ کو مناسب اسلامی رسوم کی ادائیگی کے بعد سمندر برد کر دیا گیا۔زمین پر قبر نہ بنانے کی وجہ یہ تھی کہ مبادا اسامہ کے مداح اس کا مزار بنالیں۔(ڈیلی ٹائمز،3 مئی 2011)۔یہ بات حیران کن نہیں کہ اس موقع پر بھی پاکستان میں سازشی نظریات گردش کرنے لگے۔یہ کہ اسامہ بن لادن عرصہ پہلے مر چکا تھا اور امریکہ نے افغانستان میں شکست کی خفت مٹانے کیلئے یہ جعلی ڈرامہ رچایا: اسامہ کو زندہ پکڑ لیا گیا تھا۔بعد میں امریکہ نے ایک فوٹیج جاری کی جس میں وہ اپنے ٹھکانے میں بیٹھا تھا اور قبل ازیں دکھائی گئی تصاویر کے مقابلے میں بوڑھا نظر آرہا تھا۔کچھ اور عرصے بعد القاعدہ نے تصدیق کر دی کہ اسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں آپریشن کے دوران ہلاک کر دیا گیا تھا۔انتہائی بنیاد پرست پاکستانیوں نے ملک بھر میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔اس کے ساتھ احتجاجی مظاہرے ہوئے جن میں اسامہ کے قتل کا انتقام لینے کی دھمکیوں کے نعرے لگائے گئے۔(ڈان،7 مئی 2011ء)

اس دوران قدرے تاخیر سے اپنے ردعمل میں پاکستان کے دفتر خارجہ نے اسامہ بن لادن کے ایبٹ آباد میں ٹھکانے پر حملے پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ نے پاکستان کی خودمختاری کی خلاف ورزی کی اور یہ کہ یہ رویہ قابل قبول نہیں۔وزیراعظم گیلانی نے فرانس کے دورے میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ اسامہ بن لادن کے ٹھکانے کے بارے میں آگاہ نہ ہونا بین الاقوامی برادری کی بھی ناکامی ہے کیونکہ وہ بھی انٹیلی جنس اطلاعات جمع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔(ڈیلی ٹائمز،5 مئی 2011ء)۔

دوسری طرف یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ حکومت پاکستان نے سی آئی اے کے ایجنٹوں سمیت سینکڑوں خفیہ اہلکاروں کو پاکستان کے ویزے جاری کر کے اسامہ کی تلاش میں مدد کی تھی۔ان لوگوں نے کم وبیش آزادی کے ساتھ نہایت خفیہ طریقے سے اپنی درپردہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔اس کی ایک مثال اسی سال کے شروع میں ریمنڈ ڈیوس کا واقعہ تھا۔اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ صدر زرداری، وزیراعظم گیلانی اور وزیرداخلہ رحمٰن ملک سمیت وفاقی حکومت کو اسامہ

کے معاملے میں اندھیرے میں رکھا گیا ہو۔ یہ بات مدنظر رہے کہ اسامہ کو پناہ دینے کا عمل پیپلز پارٹی کے برسراقتدار آنے سے کہیں پہلے شروع ہو چکا تھا۔

بعدازاں پاکستانی مسلح افواج کے سربراہان پارلیمنٹ میں پیش ہوئے جہاں ان سے امریکہ کی طرف سے پاکستانی حدود کی خلاف ورزی پر پوچھ گچھ کی گئی۔ قومی اسمبلی نے ایبٹ آباد آپریشن کو ملک کی خودمختاری پر حملہ قرار دیتے ہوئے مذمتی قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد میں افسوس کا اظہار کیا گیا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں 30 ہزار شہریوں اور 5 ہزار سکیورٹی اہلکاروں کی جان کی قربانی دینے کے باوجود دنیا ان قربانیوں کو نظرانداز کر رہی ہے۔ (دی نیوز، 14 مئی 2011ء)۔ ایک اور حیران کن ردعمل میں اپوزیشن لیڈر نواز شریف نے فوج اور سکیورٹی فورسز کے روایتی مؤقف کے برعکس پاکستانیوں پر زور دیا کہ وہ بھارت کو اپنا ''سب سے بڑا'' دشمن نہ سمجھیں۔ انہوں نے بھارت سے تعلقات کی بحالی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم آگے بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ضروری ہوگا۔ اگر بھارت سے تعلقات بہتر ہو جائیں تو حکومت کے اخراجات 50 فیصد کم ہو سکتے ہیں۔ (ڈان، 17 مئی 2011ء)۔

مزید حیران کن باتیں ابھی باقی تھیں۔ پاکستانی ائیرفورس کے سربراہ نے پاکستانی میڈیا کو بتایا کہ شمسی ائیرفیلڈ دراصل متحدہ عرب امارات کے کنٹرول میں تھا اور عرب شہزادے اسے عقاب بازی Falconry کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح میں نے پہلی بار جولائی 2009ء میں کرسٹائن فیئر سے سنی تھی۔ البتہ اس انکشاف سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہو سکی کہ امریکی بہرحال 2011ء سے یہ اڈہ استعمال کر رہا تھا اور کئی مواقع پر ڈرون طیاروں نے بھی شمسی ائیربیس سے ہی پرواز کی۔ (ڈان، 19 مئی 2011ء)۔ انگریزی اخبار ڈان نے 20 مئی کو امریکہ کے کئی خفت آمیز سفارتی مراسلے (Cables) شائع کئے۔ جو اسے وکی لیکس سے ملے تھے۔ جن میں انکشاف کیا گیا کہ جنرل کیانی اپنے عوامی سطح پر بیانات کے برعکس امریکہ پر زور دیتے رہے کہ وہ ڈرون حملوں میں اضافہ کرے۔ ایسی درخواستوں کی تاریخ 2008 سے شروع ہوتی ہے۔ اگلے روز مزید کئی

مراسلوں میں انکشاف کیا گیا کہ امریکہ کو پاکستان میں خفیہ سرگرمیاں جاری رکھنے میں کافی ڈھیل حاصل تھی۔ امریکی سفیر این پیٹرسن کے مطابق ایسی رعایات 2009 سے حاصل تھیں۔ ان میں انٹیلی جنس فیوژن مراکز بھی شامل تھے جن میں امریکی اور پاکستانی دونوں ملکر کام کرتے۔ (ڈان، 21 مئی 2011ء)۔ پاکستانی فوج نے ایسے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا۔ اس بیان کے بعد امریکہ کے بعض ٹرینرز کو پاکستان سے نکل جانے کو کہا گیا۔

طالبان کا انتقام

اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد یہ خدشات درست نکلے کہ انتقامی حملے کئے جائیں گے کیونکہ فاٹا سمیت مختلف علاقوں میں کئی تباہ کن کارروائیاں کی گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ شدت 22 مئی کو محسوس کی گئی جب دہشتگردوں نے کراچی کے مہران نیول بیس پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے نیوی کے 2 سرویلنس طیارے تباہ اور نیوی افسر سمیت 10 اہلکار ہلاک کر دیے۔ باقی جاں بحق ہونے والوں میں نیوی کے 3 کمانڈوز، 3 فائر مین، ایک سیلر اور 2 پیرا ملٹری اہلکار شامل تھے۔ 15 دیگر زخمی ہو گئے۔ اس موقع پر بعض امریکی ''کنٹریکٹر'' اور چینی انجینئر بھی وہاں موجود تھے۔ (ڈان ،23 مئی 2011)۔ تحریک طالبان پاکستان نے حملے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مزید حملوں کی دھمکی دی۔

نیول بیس پر حملے سے مغرب اور بھارت کے دفاعی تجزیہ نگاروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور یہ سوال اٹھنے لگا کہ کیا پاکستان کے جوہری اثاثے محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ بی بی سی کے سفارتی اور دفاعی نامہ نگاروں جو ناتھن مرکس نے رپورٹ دی کہ پاکستان کے پاس 70 سے 80 ایٹمی ہتھیار موجود تھے جو طالبان کے ہاتھ لگنے سے ایسی تباہی پھیلا سکتے ہیں جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ (مرکس، 23 مئی 2011ء)۔ ہیلری کلنٹن نے پاکستانیوں سے کہا کہ امریکہ کی مخالفت اور سازشی نظریات سے کچھ بھلا نہیں ہوگا اور زور دیا کہ دونوں ملک اپنا تعاون مزید بڑھائیں کیونکہ یہی دونوں کے مفاد میں ہے۔ (ڈان، 27 مئی 2011ء)۔ مئی کا مہینہ اس ہولناک خبر کے ساتھ

اختتام پذیر ہوا کہ ہونہار پاکستانی صحافی سلیم شہزاد کی لاش اسلام آباد کے قریب سے برآمد ہوئی۔ اسے کئی روز پہلے اغواء کیا گیا تھا اور اس کی لاش پر تشدد کے نشانات تھے۔ یہ بعد میں منکشف ہوا کہ سلیم شہزاد کے پاس ایسے شواہد تھے کہ پاکستانی نیوی کے اندر القاعدہ کے سیل نے مہران نیول بیس پر حملے میں مدد کی تھی۔ بظاہر آئی ایس آئی نے اسے پہلے اس خبر کی رپورٹنگ پر وارننگ جاری کی تھی کہ پاکستان نے ملا عمر کے قریبی ساتھی ملا برادر کو رہا کر دیا ہے۔ (سید، 3 جون، 2011)۔ بعد ازاں حکام نے ایک حاضر سرور بریگیڈئیر اور 3 میجروں کو کالعدم تنظیم حزب التحریر کے ساتھ رابطوں کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ (بی بی سی نیوز، 23 جون 2011ء)۔

اوبامہ کا افغانستان سے فوجی انخلا کا اعلان

اگرچہ امریکہ پہلے ہی اعلان کر چکا تھا کہ افغانستان سے فوجوں کے انخلا کا عمل جولائی 2011 سے شروع کر کے 2014 کے آخر تک مکمل ہو جائے گا لیکن یہ عمل کیسے شروع ہوگا اس بارے میں کوئی بیان جاری نہیں کیا گیا تھا۔ ایبٹ آباد آپریشن میں امریکہ کے لئے سب سے قابل نفرت شخصیت سے جان خلاصی ہونے کے بعد صدر اوبامہ نے مناسب سمجھا کہ وہ فوجوں کے انخلا کا منصوبہ منظر عام پر لے آئیں۔ 23 مئی کو انہوں نے امریکی عوام سے خطاب کیا اور انہیں بتایا کہ جولائی میں انخلا کا آغاز کر کے سال کے آخر تک 10 ہزار جبکہ اگلی گرمیوں تک 33 ہزار امریکی فوجی وطن واپس آ جائیں گے۔ ان کی جگہ افغان فورسز سکیورٹی کی ذمہ داری سنبھال لیں گی جبکہ افغانستان میں امریکی مشن لڑائی کی بجائے صرف تعاون تک محدود ہو جائے گا۔ 2014 میں انخلا کا عمل مکمل ہو جائے گا جب افغان فورسز خود اپنی سکیورٹی سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گی۔ اوبامہ نے کہا کہ امریکہ دہشت گردوں کی پناہ گاہوں کے خلاف مزید کارروائی کے لئے تیار ہے اور یہ کہ پاکستان سے زیادہ کسی اور ملک کو انتہا پسندوں سے خطرہ نہیں۔ (ڈیلی ٹائمز، 24 جون 2011ء)۔

پاکستان پر دباؤ جاری

اس پیشرفت کے ساتھ روایتی کام بھی جاری رہے: امریکہ کی پاکستان کو وارننگ کہ وہ

سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف حصہ لے جبکہ پاکستان کا امریکہ کے سخت اور غیر ہمدردانہ رویے کی شکایت۔ اس کے بعد امریکہ کے بعض حکام کا یہ اعتراف کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ناگزیر ہے اور اس نے عظیم خدمات انجام دیں اور کئی قربانیاں دیں۔اس دوران آئی ایس آئی نے 5 افراد کو گرفتار کیا جن پر اسامہ کے خلاف کارروائی سے پہلے سی آئی اے کیلئے مخبری کا الزام تھا۔ایک ملزم مبینہ طور پر فوج کا میجر تھا جس نے اسامہ کی رہائشگاہ جانے والی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں کی کاپی کی۔ البتہ فوج نے گرفتار افراد میں میجر شامل ہونے کی تردید کی۔ (ڈیلی ٹائمز، 16 جون 2011ء)۔تعلقات میں اس وقت مزید بگاڑ آیا جب پاکستان نے مزید امریکی ٹریز واپس بھجوانے کا فیصلہ کیا جبکہ اعلیٰ امریکی عہدیدار نے الزام لگایا کہ آئی ایس آئی سلیم شہزاد کے قتل میں ملوث تھی۔

بلاشبہ پے ماسٹر امریکہ پاکستان سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ القاعدہ کے حوالے سے ڈیلیور کرے۔ یوں امریکہ کے وزیر دفاع لیون پینٹا نے پاکستانیوں سے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کے جانشین ایمن الظواہری کا بھی تعاقب کرے۔ (ڈیلی ٹائمز، 10 جولائی 2011ء)۔اگلے روز اوبامہ انتظامیہ نے اعلان کیا کہ پاکستان کے لئے سالانہ 2 ارب ڈالر کی فوجی امداد کا ایک تہائی حصہ...... 80 کروڑ ڈالر...... معطل کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ دونوں حکومتوں کے درمیان اس بات پر اختلافات ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کیسے لڑی جائے۔ پاکستان نے ردعمل میں کہا کہ اس نے پہلے بھی امریکہ سے درخواست کی تھی کہ روکی گئی رقم غیر فوجی منصوبوں کیلئے مختص کر دی جائے۔ بعد میں ایک سرکاری بیان میں کہا گیا کہ پاکستان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکی امداد کی ضرورت نہیں۔ کچھ ماہرین نے فوری طور پر خبردار کیا کہ اس طرح پاکستان چین کے مزید قریب ہو سکتا ہے...... یہ وہ بات ہے جس پر امریکہ کو ہمیشہ سے تشویش رہی کیونکہ وہ اسامہ بن لادن کے خاتمے کے بعد کے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان پر اپنا مستقل دباؤ برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

دونوں ملکوں کے درمیان بظاہر تناؤ کا شکار تعلقات کے برعکس امریکہ نے مختلف دنوں میں شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ڈرون حملوں میں میزائلوں کی بارش کردی جس سے 48 افراد مارے گئے۔(ڈیلی ٹائمز، 13 جولائی 2011ء)۔اس طرح یہ بات عیاں ہوگئی کہ امریکہ کے اس عزم میں کوئی کمی نہیں آئی کہ وہ افغانستان میں امریکی فوج کو نشانہ بنانے والے دہشت گردوں کو کسی طرح بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔تاہم جب پاکستان کی سپریم کورٹ نے 2009ء میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملے کے مبینہ ماسٹر مائنڈ ملک اسحاق کو ضمانت پر رہا کردیا تو ایک بار پھر یہ بحث چھڑ گئی کہ دہشت گردی کے سنگین اقدامات میں ملوث عناصر کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا جاتا ہے۔اس طرح پاکستان کے سیاسی اور قانونی نظام کے بارے میں بین الاقوامی برادری بدستور تشویش میں مبتلا رہی۔(ڈیلی ٹائمز 15 جولائی 2011)۔

7 اگست 2011ء کو انتہائی باخبر امریکی خاتون آر جے ہل ہاؤس جنہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو بلیک واٹر جیسی تنظیموں کے سپرد کرنے (آؤٹ سورس) کے موضوع پر سپیشلائز کیا ہے نے اپنے بلاگ پر ایک سٹوری ارسال کی جس کا عنوان تھا....اسامہ بن لادن کا سراغ مخبر سے لگا جبکہ کوریئر کی بات کور سٹوری تھی.....اس سٹوری میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ امریکہ کو اسامہ بن لادن کے بارے میں ٹھوس اطلاعات پاکستان کے ایک انٹیلی جنس افسر سے ملیں جسے ڈھائی کروڑ ڈالر نقد اور فیملی سمیت امریکہ میں رہائش کا لالچ دیا گیا۔مبینہ طور پر اس افسر نے امریکیوں کو بتایا کہ سعودی عرب اسامہ بن لادن کو نظر بند رکھ کر پناہ دینے کیلئے پیسے دے رہا تھا۔ (The Spy who billed me, 7Aug 2011)۔

8 اگست 2011ء کو امریکی اخبار ''نیویارکر'' نے نکولس شیمڈل کی ایک مفصل رپورٹ شائع کی جس کا عنوان تھا ''اسامہ بن لادن کو پکڑنا: ایبٹ آباد میں اس رات کیا ہوا تھا''۔اس رپورٹ میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ آپریشن کی رات پاکستان کے تمام دفاعی حصار اور راڈاروں کا رخ مشرقی سمت کو یعنی بھارت کی طرف موڑ دیا گیا یوں وہ افغان سرحد سے آنے والے ہیلی کاپٹروں کا

سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شیمڈل کے مطابق اسامہ بن لادن غیر مسلح تھا: لیکن اسے ہلاک کرنے کا فیصلہ پہلے کیا جا چکا تھا۔

نواز شریف کا سیفما کانفرنس سے خطاب

نواز شریف نے 13 اگست 2011 کو پاکستان کی قدامت پسند خارجہ پالیسی سے مکمل لا تعلقی کا اظہار کر دیا۔ وہ لاہور میں ساؤتھ ایشین فری میڈیا ایسوسی ایشن (سیفما) کے زیر اہتمام کانفرنس میں مدعو بھارتی صحافیوں سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت اور پاکستان ثقافت، خوراک، عادات، سوچ اور فطرت پسندی کے لحاظ سے ایک ہیں۔ انہوں نے اس بات کی مذمت کی کہ بطور وزیر اعظم پاک بھارت تعلقات میں بہتری لانے کی ان کی کوششوں کو جنرل پرویز مشرف نے سبوتاژ کر دیا جنہوں نے کارگل کا مس ایڈونچر شروع کیا تھا۔ انہوں نے بھارتی سیاسی قیادت بالخصوص اٹل بہاری واجپائی کی تعریف کی جو خلوص کے ساتھ اچھے تعلقات کی خواہاں تھی۔ نواز شریف نے کہا کہ بھارت اور پاکستان باہمی تجارت اور کامرس کے ذریعے بہت حاصل کر سکتے ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں مجموعی بہتری سے مسئلہ کشمیر کے حل کی بھی صورتحال نکل آئے گی۔ انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام اس قرآنی تصور پر کیا کہ اللہ رب العالمین ہے، رب المسلمین نہیں۔ اس لئے یہ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہمسائے بھارت کیلئے اچھے جذبات رکھے۔ انہوں نے توقع کی کہ سرحد کی دوسری جانب لوگ بھی ایسے جذبات کو فروغ دیں گے۔ (سیفما، یوٹیوب 13 اگست، 2011ء)۔

دہشت گردی کی ہلاکت آفرینی

دہشت گردی کے خلاف نام نہاد ''جنگ'' میں شامل ہونے کے نتیجے میں پاکستان کو تباہ کن نتائج بھگتنا پڑے۔ انسانی جانوں کے ضیاع کے علاوہ اربوں ڈالر کا مالی نقصان ہوا اور دہشت گردی ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ پاکستان دہشت گردی اور انتہا پسندی کا بڑا شکار ہے۔ اس حقیقت کو ان طاقتوں نے محسوس نہیں کیا نہ تعریف کی کہ جو اپنے مفادات کے تحفظ پر توجہ مرکوز

کئے ہوئے تھیں، یہ رویہ قابل فہم تو ہے لیکن انسداد دہشت گردی کی سرگرمیوں سے پاکستان کو پہنچنے والے نقصان عظیم کی بھی اس تناظر میں اہمیت سمجھنی ضروری تھی۔ اسلام آباد میں قائم پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پیس سٹڈیز (پی آئی پی ایس) کی ایک تحقیق کے مطابق اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد صرف 2 مئی سے 22 جولائی 2011ء کے درمیان پاکستان میں دہشت گردی کے 102 حملے وقوع پذیر ہوئے۔ ان حملوں میں 489 افراد ہلاک اور 698 زخمی ہوئے۔ اگرچہ پاکستان میں 1980 کے عشرے سے دہشت گردی نے گھر کر رکھا تھا لیکن اس کی نوعیت فرقہ وارانہ تصادم اور غیر مسلموں پر حملوں تک محدود تھی لیکن نائن الیون کے بعد حکومتی شخصیات اور تنصیبات کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا گیا۔ یہ سرگرمیاں جاری رہیں اور 2005 میں ان میں شدت آ گئی اور 2007 میں اس وقت نکتہ عروج میں پہنچ گئیں جب اسلام پسندوں نے ٹی ٹی پی کی چھتری تلے جمع ہونا شروع کر دیا۔

اس عرصے کے دوران کئی تنظیمیں اور 'سلیپنگ سیل' وجود میں آ گئے۔ یوں دہشت گردی کی عدم مرکزیت کا ڈراؤنا خواب جنم میں آیا جس سے نمٹنا کسی ریاست حتیٰ کہ گیریژن سٹیٹ کی صلاحیت رکھنے والی ریاست کیلئے بھی ناممکن تھا۔ ایسی دہشتگردانہ سرگرمیوں کے ساتھ عسکریت پسند تنظیموں اور جماعت اسلامی جیسی جماعتوں کی طرف سے متوازی بے رحمانہ پراپیگنڈہ بھی کیا گیا (انڈرسٹینڈنگ ملی ٹینٹس میڈیا ان پاکستان، 2010)۔ جماعت اسلامی کے پاس انتہائی منظم اشاعتی شعبہ اور ایسے نظریات اور آراء ہوتے ہیں جو عدم برداشت اور مغرب اور بھارت مخالف قوم پرستی کو فروغ دیتے ہیں۔ (گریر، 2011ء)۔ انتہائی قوم پرست ٹاک شوز کے بھونپو بھی روزانہ کی بنیاد پر خوف اور نفرت کا پرچار کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات حیران کن نہیں کہ ایسے پراپیگنڈے کا اثر بھی نفرت انگیز ہونا ناگزیر ہے۔

پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی رپورٹ برائے 2006 بتاتی ہے کہ 2006 میں فرقہ وارانہ حملوں اور تصاویر کے واقعات سمیت دہشت گردی کے 657 حملے ہوئے جن کے نتیجے میں 907 افراد ہلاک اور 1543 زخمی ہوئے۔ ان حملوں میں معاشی نقصان اربوں روپے میں ہوا۔

2007ء میں دہشت گردی کے 1442 حملے ہوئے۔ان میں طالبان، پاکستانی جہادی،فرقہ وارنہ گروپ اور بلوچ قوم پرست شامل تھے۔اس سال3448افراد ہلاک اور5353زخمی ہوئے۔اس طرح2005اور2006 کی بہ نسبت نقصانات میں بالترتیب491.7فیصداور127فیصد ہوئے۔ان میں بے نظیر بھٹو کے قتل کا بھی واقعہ شامل تھا۔(پی آئی پی ایس سکیورٹی رپورٹ 2007، 2008)۔ 2008 کے دوران ایسے2148حملے ہوئے جن میں2267افراد ہلاک اور4558زخمی ہوئے۔یوں 2005 سے اب تک ان حملوں میں نا قابل یقین حد تک 746 فیصد اضافہ ہوا۔(پی آئی پی ایس رپورٹ2008، 2009: 4)۔انسانیت کے خلاف ایسے حملوں میں اضافہ 2009 میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔اس سال2586حملے ہوئے اور3021افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ 7334زخمی ہوئے۔سب سے زیادہ حملے این ڈبلیو ایف پی (1137) میں ہوئے، بلوچستان میں792 جبکہ فاٹا میں559حملے ہوئے۔اس طرح پنجاب میں 46، سندھ میں 30، اسلام آباد میں 12 اور آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں 5، 5 ایسے واقعات ہوئے۔ (پی آئی پی ایس سکیورٹی رپورٹ برائے 2009-10ء)۔2010 میں دہشت گردانہ حملوں میں 11 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔اس سال شورش پسندی اور فرقہ واریت سمیت دہشتگردی کے 2113 واقعات ہوئے۔ان حملوں میں 2913افراد ہلاک جبکہ 5824زخمی ہوئے۔سب سے آگے بلوچستان رہا جہاں 737 حملے ہوئے، اس کے بعد فاٹا(720)، خیبر پختونخوا (459)، سندھ (111)، پنجاب (62)، گلگت بلتستان(13)، اسلام آباد(6)اور پھر آزاد کشمیر(5) کا نمبر رہا۔(پی آئی پی ایس رپورٹ 2010-11)۔2011 کے آغاز میں اسلام آباد میں گورنر پنجاب سلمان تاثیر اور وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور شہباز بھٹی کو بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔یوں2010ء میں حملوں میں کمی کتنی اہم ہوسکتی ہے۔وہ قابل بحث ہے۔نیا رجحان دیکھنے میں آیا کہ خون آشام جہادی عناصر ریاستی سکیورٹی کے انتہائی حساس حصوں میں نفوذ کر گئے۔22 جولائی 2011 تک مجموعی طور پر دہشت گردی کے 237 واقعات ہوئے، 613افراد موت کے منہ میں چلے گئے جبکہ 541زخمی ہوئے۔2007 کو جب ایسے واقعات نے شدت اختیار

کرنا شروع کی تھی سے 22 جولائی 2011ء تک 11 ہزار 726 افراد ہلاک اور 23 ہزار 37 زخمی ہوئے۔(پی آئی پی ایس،2011ء)۔

اسامہ بن لادن کی موت کے بعد

ایبٹ آباد میں ''آپریشن جیرونیمو'' میں اسامہ بن لادن کی موت کے بعد پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات میں کشیدگی نکتہ عروج پر پہنچ گئی۔ پاکستان پر حقانی نیٹ ورک، ملا عمر اور ایسے دیگر عناصر کے خلاف کارروائی کیلئے امریکی دباؤ اب سفارتی تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے بالکل واضح ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ممتاز امریکی رہنماؤں کے بیانات اہمیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر 22 ستمبر کو سبکدوش ہونے والے امریکی چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف ایڈمرل مائیک مولن نے امریکی سینٹ میں بیان حلفی کے دوران دعویٰ کیا کہ شمالی وزیرستان میں قائم حقانی نیٹ ورک بلاشبہ آئی ایس آئی کی شاخ ہے۔ یہ بیان ایک ہفتہ قبل کابل میں امریکی سفارتخانے پر حملے کے تناظر میں دیا گیا۔ مائیک مولن نے یہ کہا کہ پاکستان انتہا پسندی افغانستان کو برآمد کر رہا ہے اور خبردار کیا کہ امریکہ اپنے فوجیوں کے تحفظ کیلئے ایکشن لے گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارے فوجیوں کو ہلاک کرنا جاری رکھیں گے تو ہم خاموش تماشائی بنے نہیں بیٹھیں گے۔ وزیر دفاع لیون پینٹا جو اس موقع پر موجود تھے نے بھی مایوسی کا اظہار کیا اور کہا کہ امریکہ اپنے فوجیوں کا تحفظ کرے گا۔ (ڈان،22 ستمبر 2011)۔

اگلے روز وائٹ ہاؤس کے ترجمان جے کارنی نے کہا کہ: ''یہ بات اہم ہے کہ حکومت پاکستان حقانی نیٹ ورک کے ساتھ جو رابطے ہیں وہ توڑ دے اور اس کے خلاف کارروائی کرے''۔ (ایضاً)۔ سخت الفاظ پر مشتمل بیان اس وقت جاری کیا گیا جب پاکستان کی وزیر خارجہ حنا ربانی کھر نیویارک میں تھیں۔ انہوں نے ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا: ''ایک اتحادی، ایک پارٹنر کی سر عام تضحیک اور اس پر الزام تراشی قابل قبول نہیں''۔ (The Straits Times، 24 ستمبر 2011)۔ پاکستان کے فوجی سربراہ جنرل کیانی نے ایڈمرل مولن کے الفاظ کو ''حقائق کے منافی اور

بدقسمتی'' قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایسے کلمات سے مستحکم اور پرامن افغانستان کیلئے بامقصد اور تعمیری مذاکرات کا ماحول قائم کرنے میں مدد نہیں ملے گی۔ یہ وہ مقصد ہے جو پاکستان کا مطمح نظر ہے۔ (ڈیلی ٹائمز، 24 ستمبر 2011)۔ اس کے بعد ایک پاکستانی عہدیدار کی طرف سے یہ بیان جاری ہوا کہ پاکستان کا فوری طور پر حقانی گروپ کے خلاف کارروائی کا کوئی منصوبہ نہیں۔ (ڈان، 26 ستمبر 2011)۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مؤقف اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ پاکستان افغان سیاست کے حوالے سے حقانی نیٹ ورک کو ایک اثاثہ اور اپنے مفادات کیلئے اہم سمجھتے ہوئے امریکہ کو نظر انداز کرنے کا خواہاں تھا۔ مقصد کابل میں بھارتی اثر ورسوخ کے آگے بند باندھنا تھا۔ چند روز بعد امریکہ نے اپنے مؤقف میں یہ کہتے ہوئے ترمیم کی کہ امریکہ ایڈمرل مولن کی بات سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتا۔ وائٹ ہاؤس کے ترجمان جے کارنی نے اپنی حکومت کی تشویش کا ان الفاظ میں اظہار کیا: ''یہ محض زبان نہیں جو میں نے استعمال کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے کہ حقانی نیٹ ورک اور حکومت پاکستان کے درمیان رابطے موجود ہیں۔ ان رابطوں کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ پیچیدہ ہے۔ لیکن اس بات کا سوال نہیں پیدا ہوا کہ حقانی گروپ کو پاکستان میں محفوظ ٹھکانے میسر ہیں''۔ (ایضاً: 29 ستمبر 2011ء)۔

جلتی پر پانی چھینکنے کا یہ مطلب نہیں کہ امریکہ نے اپنا یہ بنیادی مؤقف تبدیل کر لیا تھا کہ پاکستان اور حقانی نیٹ ورک کے درمیان تعلقات موجود ہیں۔ 4 اکتوبر کو افغانستان اور بھارت نے سٹرٹیجک پارٹنرشپ کے معاہدے کا اعلان کیا۔ سیاسی اور سکیورٹی تعاون پر دونوں ملکوں نے دہشتگردی کے خلاف مل کر لڑنے اور بھارت نے افغان نیشنل آرمی کی تربیت میں تعاون کا عزم کیا۔ (ڈان، 5 اکتوبر 2011ء)۔ اس پر پاکستان کا تشویش کا اظہار کرنا حیران کن نہیں۔

میموگیٹ سکینڈل

10 اکتوبر کو پاکستان نژاد امریکی بزنس مین منصور اعجاز نے فنانشل ٹائمز میں ایک تحریر میں

الزام لگایا کہ پاکستان کے امریکہ میں سفیر حسین حقانی نے انہیں ایک خفیہ میمو (مراسلہ) دیا اور کہا کہ یہ ایڈمرل مائیک مولن تک پہنچایا جائے۔ اس میمو میں مبینہ طور پر پاکستان ملٹری اور انٹیلی جنس اداروں میں اصلاحات کیلئے امریکہ سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ یہ ''انکشاف پاکستانی میڈیا میں گرما گرم موضوع بن گیا اور منصور اعجاز نے 17 نومبر کو اپنے الزامات کا اعادہ کیا۔ اس کے نتیجے میں جنرل کیانی نے صدر زرداری سے ملاقات کی (تصویر بھی اخبارات کو جاری کی گئی) اور انہیں بتایا کہ فوج نے اس کا سخت نوٹس لیا ہے، حسین حقانی نے الزامات کی تردید کی لیکن انہیں اسلام آباد واپس طلب کرلیا گیا۔ آخر میں انہیں سفارتی منصب سے استعفیٰ دینا پڑا۔

اس دوران بی بی سی نے ایک ڈاکومنٹری چلائی جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ آئی ایس آئی اور پاکستانی فوج اس دیرینہ سازش میں ملوث تھے کہ افغانستان میں دہشت گردی کے حملوں کیلئے افغان طالبان کی حمایت کی جائے۔ حسب توقع پاکستان نے دہشت گردی سے تعلق یا اس کی کسی حمایت کے الزام کی سخت الفاظ میں تردید کی۔

بہر حال میموگیٹ سکینڈل بدستور پاکستانی میڈیا کا مرکز موضوع بنا رہا۔ منصور اعجاز نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے آئی ایس آئی کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل شجاع پاشا کی درخواست پر 22 اکتوبر کو ان کے ساتھ لندن میں ملاقات کی جس میں، میں نے انہیں فنانشل ٹائمز میں شائع ہونے والے اپنے آرٹیکل کے پس منظر سے آگاہ کیا اور حسین حقانی کے ملوث ہونے کے ثبوت دیے۔ جنرل پاشا نے بعد ازاں ملاقات کی تصدیق کی اور کہا کہ وہ منصور اعجاز کی باتوں سے مطمئن ہیں۔ (دی نیوز، 16 دسمبر 2011ء)۔ بظاہر میمو اس تناظر میں لکھا گیا کیونکہ صدر زرداری کو خطرہ تھا کہ فوج سویلین حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاری کر رہی تھی۔ (واشنگٹن ٹائمز، 21 دسمبر 2011)۔ برطانوی اخبار انڈی پینڈنٹ نے منصور اعجاز کے حوالے سے یہ خبر شائع کی کہ اسامہ بن لادن کی موت کے فوراً بعد شجاع پاشا نے کئی عرب ممالک، سعودی عرب زیادہ قابل ذکر...... کے دورے کئے اور زرداری، گیلانی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے امداد مانگی۔ (انڈی پینڈنٹ، 14 دسمبر 2011)۔ آئی ایس پی آر نے

حسب توقع اس الزام کو بے بنیاد اور گمراہ کن پراپیگنڈہ قرار دیا۔ (ڈان، 22 دسمبر 2011)۔

پاک امریکہ تعلقات اور متفرقات

الزامات اور تردیدوں کے دوران پاک امریکہ تعلقات اس وقت بد سے بدتر ہو گئے جب 26 نومبر کو نیٹو کے طیارے نے افغانستان سے پاکستان کی سرحدی چوکیوں (سلالہ چیک پوسٹ) پر بمباری کی جس سے 24 فوجی ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ (ڈیلی ٹائمز، 27 نومبر 2011)۔ اس سے پاکستان میں شدید اشتعال پھیل گیا۔ پاکستان کے راستے جانے والی نیٹو سپلائی پر پابندی لگا دی گئی چنانچہ ہزاروں ٹن سامان راستے میں روک دیا گیا۔ افغانستان میں تعینات نیٹو افواج کیلئے تقریباً 55 فیصد سپلائی پاکستان کے راستے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ امریکہ کو 15 یوم کے اندر 11 ستمبر تک شمسی ائیر بیس خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔ جہاں سے ڈرون طیارے پرواز کرتے تھے۔ حالانکہ اب تک پاکستان اس ائیر بیس پر امریکی کنٹرول کی تردید کرتا آیا تھا۔ امریکی اور نیٹو حکام کی طرف سے معذرتوں اور واقعے کی انکوائری کے وعدوں کے باوجود پاکستانی قیادت کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ روس اور چین نے بھی پاکستان کی خودمختاری کی خلاف ورزی کی مذمت کی۔ (ڈیلی ٹائمز، 29 نومبر 2011ء)۔ شدید ردعمل کا ایک اور اظہار بون کانفرنس کے بائیکاٹ کے اعلان سے ہوا جو 5 دسمبر کو متوقع تھی۔ اس سے پہلے جرمنی کی میزبانی میں پہلی بون کانفرنس نائن الیون کے بعد 2001ء میں ہوئی تھی۔

دوسری بون کانفرنس کا مقصد 2014ء میں امریکی اور نیٹو فورسز کے انخلا کے بعد افغانستان میں امن واستحکام برقرار رکھنے کے لئے امریکہ اور نیٹو اور روس سمیت علاقائی طاقتوں کے درمیان مفاہمت کی راہ ہموار کرنا تھا۔ پاکستان پر بائیکاٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کی گئی۔ یہ درخواست ہیلری کلنٹن اور جرمن چانسلر اینجلا مرکل نے کی اور پاکستان کے فیصلے کو بدقسمتی قرار دیا۔ البتہ پاکستانی قیادت اس موقع پر ڈٹی رہی اور اپنے مؤقف میں کوئی نرمی نہ دکھائی۔ (ڈان، 30 نومبر 2011ء)۔ پاکستان کے فیصلے کو افغانستان کے بارے میں اس کے عزائم کے تناظر میں لیا

گیا۔اس کے بعد پاکستان نے نیٹو بمباری کے واقعے کی مشترکہ تحقیقات کی پیشکش بھی مسترد کر دی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان معاہدے پر اتفاق موجود تھا کہ 2014ء میں امریکی فوج کے افغانستان سے انخلا کے باوجود کچھ تعداد میں امریکی فوجی اس کی سرزمین میں موجود رہیں گے۔یوں افغانستان کی مستقبل کی سیاست کی سمت غیرواضح رہی۔

دوسری جانب پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں وزیرخارجہ حنا ربانی کھر کے دورہ دہلی کے بعد کچھ بہتری دیکھنے میں آئی۔حنا ربانی کا بھارت میں گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔حنا ربانی اور بھارتی وزیرخارجہ ایس ایم کرشنا نے اس امید کا اظہار کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات میں نمایاں بہتری آئے گی۔انہوں نے منموہن سنگھ سے بھی ملاقات کی اور اپنی حکومت کی طرف سے نیک خواہشات کا پیغام پہنچایا۔ایک بار پھر 2 حریف ملکوں کے درمیان تیز سفارتی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔اکتوبر میں حنا ربانی کھر نے اعلان کیا کہ پاکستان نے بھارت کو انتہائی پسندیدہ ملک قرار دینے کا اصولی فیصلہ کرلیا ہے۔(ڈان، 12 اکتوبر 2011ء)۔یہ درجہ بھارت پاکستان کو کئی سال پہلے دے چکا تھا۔انہوں نے بتایا کہ اس فیصلے میں فوج کو بھی اعتماد میں لیا گیا ہے۔(نیشن، 6 نومبر 2011)۔تاہم بعدازاں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے ایک بیان میں واضح کیا کہ بھارت کو انتہائی پسندیدہ ملک قرار دینے پر غور ہو رہا ہے لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔(دی ہندو، 17 نومبر 2011ء)۔ایسا لگتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے حتمی کلیئرینس روک لی گئی تھی۔

داخلی محاذ پر حکمران پیپلز پارٹی اور اپوزیشن کی بڑی جماعت مسلم لیگ (ن) کے درمیان کشمکش ایک بار پھر انتہا کو پہنچ گئی۔مسلم لیگ (ن) نے مطالبہ کیا کہ صدر زرداری اور وزیراعظم گیلانی کو استعفیٰ دے کر عوامی غیض وغضب کا سامنا کرنا چاہیئے۔(ڈان، 29 اکتوبر 2011)۔ سابق کرکٹر عمران خان کی جماعت تحریک انصاف جو قبل ازیں کئی سالوں سے زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کرسکی اس نے 30 اکتوبر 2011ء کو لاہور میں ایک بڑا عوامی جلسہ کیا۔لاکھوں شرکا کے اجتماع سے خطاب میں عمران خان نے کرپشن اور ٹیکس چوری کے خاتمے کا مطالبہ کرتے ہوئے

خبردار کیا کہ اگر بڑے سیاستدانوں نے اپنے اثاثوں کا اعلان نہ کیا تو وہ سول نافرمانی کی ملک گیر تحریک چلائیں گے۔ (ڈیلی ٹائمز، 31 اکتوبر)۔ 10 سے 17 نومبر کے دوران روایتی سیاسی رجحان کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی سیاستدان یکے بعد دیگرے تحریک انصاف میں شمولیت اختیار کرنے لگے۔ نام نہاد میمو گیٹ سکینڈل کے اہم کردار منصور اعجاز نے 3 دسمبر کو نیوز ویک میگزین میں اپنے آرٹیکل میں سنسنی خیز انکشاف کیا کہ 2 مئی کو ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی کا نہ صرف پاکستانی سفیر حسین حقانی بلکہ صدر آصف زرداری کو بھی پیشگی علم تھا۔ (ڈان، 3 دسمبر 2011)۔ حسین حقانی نے الزام کی فوری تردید کرتے ہوئے کہا کہ:

''میں منصور اعجاز کے الزامات کو بے بنیاد، من گھڑت اور جھوٹ قرار دیتے ہوئے سختی سے مسترد کرتا ہوں۔ میں ایک بار پھر ان کے پہلے الزام کی بھی تردید کرتا ہوں کہ میں نے امریکی چیئرمین جوائنٹ چیفس کو کوئی میمو لکھا یا بھیجا تھا''۔ (ڈان، 3 دسمبر 2011)۔

حسین حقانی نے دھمکی دی کہ اگر نیوز ویک نے منصور اعجاز کے آرٹیکل سے لاتعلقی کا اظہار نہ کیا تو وہ جریدے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ دوسری طرف نواز شریف نے سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر کے میمو گیٹ سکینڈل کی تحقیقات کی استدعا کی۔ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ جب عدالت نے وزارت دفاع سے جواب مانگا تو اس نے تحریری طور پر کہا کہ وزارت دفاع کا فوج یا آئی ایس آئی کی سرگرمیوں پر کوئی کنٹرول نہیں۔ (دی نیوز، 21 دسمبر 2011ء)۔ دوسری طرف فوجی سربراہ جنرل اشفاق کیانی نے اپنے تحریری جواب میں کہا کہ میمو ایک حقیقت تھی جس کا مقصد فوج کا مورال گرانا تھا۔ (ڈیلی ٹائمز، 22 دسمبر 2011)۔

وزیراعظم گیلانی فوج کے خلاف پھٹ پڑے

وزارت دفاع کی طرف سے یہ بیان دینا کہ فوج اور آئی ایس آئی اس کے کنٹرول سے باہر ہے وہ وزیراعظم کی طرف سے فوج کے خلاف غیر معمولی تنقید تھی۔ حالانکہ محض چند روز قبل انہوں نے کہا تھا کہ فوج اور حکومت کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں۔ وزیراعظم گیلانی نے اس امر کی

مذمت کی کہ سازشی عناصر ان کی حکومت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ براہ راست فوج کا نام لئے بغیر انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ فوج دراصل ریاست کے اندر ریاست ہے۔ انہوں نے اپنے انتہائی تنقیدی کلمات میں دعویٰ کیا کہ جہاں ایک طرف حکومت 2008 میں ممبئی حملوں، 2 مئی کو اسامہ بن لادن کی ہلاکت اور 26 نومبر کو سلالہ چیک پوسٹ پر نیٹو کے حملوں کے تناظر میں امریکی دباؤ کے بعد سکیورٹی اداروں کے ساتھ کھڑی رہی وہاں فوج اور آئی ایس آئی کا گٹھ جوڑ ریاست کے اندر ریاست کے طور پر کام کر رہا ہے۔ ایک اور تنقیدی ریمارکس میں انہوں نے دیگر باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ:

"اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ وزارت دفاع کے ماتحت نہیں تو پھر ہمیں اس غلامی سے نکل جانا چاہیئے، اس پارلیمنٹ کی کوئی اہمیت نہیں، اس نظام کی کوئی وقعت نہیں، پھر آپ خودمختار نہیں ......انہیں ریاستی خزانے سے پیسہ دیا جا رہا ہے، آپ کے ریونیو اور ٹیکسوں سے......اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ وہ حکومت کے ماتحت نہیں تو وہ غلطی پر ہے۔ وہ حکومت کے ماتحت ہیں اور ماتحت ہی رہنا پڑے گا کیونکہ ہم پاکستان کے عوام کے منتخب کردہ نمائندے ہیں...... بدترین حالات میں بھی ہم نے ان کی تنخواہیں دگنی کر دیں......انہیں پارلیمنٹ کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ جوڈیشل کمیشن (جو اسامہ بن لادن پر حملے اور اس کی پاکستان میں موجودگی کا نہ پتہ ہونے کی تحقیقات کر رہا تھا) ہم سے امریکیوں کو ویزوں کے اجرا کا پوچھ رہا ہے......لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسامہ بن لادن کیونکر یہاں پچھلے 6 سال سے رہ رہا تھا؟، وہ کس قسم کے ویزے پر ایبٹ آباد میں مقیم تھا؟۔ اگر وہ بغیر ویزہ پاکستان میں داخل ہوا تو سکیورٹی کہاں گئی؟......"۔ (ڈان 22 دسمبر 2011)۔

اس کے بعد جنرل کیانی واضح کیا کہ فوج حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی نہیں کر رہی اور نہ جمہوریت کو پٹڑی سے اتارا جائے گا۔ اس پر گیلانی نے کہا کہ انہیں جنرل کیانی اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل پاشا پر پورا اعتماد ہے اور یہ کہ حکومت اپنی مدت پوری کرے گی۔ چیف جسٹس افتخار چودھری نے ایک بیان جاری کیا کہ ماضی کی طرح عدلیہ اس بار نام نہاد نظریہ ضرورت کے

تحت فوجی بغاوت کی توثیق نہیں کرے گی۔ (ڈان، 24 دسمبر 2011)۔ 2011 کا سال وزیراعظم گیلانی کے اس اعلان کے ساتھ اختتام پذیر ہوا کہ قبل از وقت انتخابات نہیں ہوں گے اور صدر زرداری اور جنرل کیانی کے درمیان تعلقات خوشگوار ہیں۔ (ڈیلی ٹائمز، 31 دسمبر 2011ء)۔

2011ء کے اختتام پر پاک امریکہ تعلقات

دریں اثناء امریکہ نے پاکستان کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ امریکی کانگریس نے قرارداد منظور کی کہ جب تک پاکستان اس بات کی قابل اعتبار یقین دہانی نہیں کراتا کہ وہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے سنجیدہ ہے۔ اس کی 70 کروڑ امداد منجمد کر دی جائے۔ پاکستان نے اس فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا۔ (ڈیلی ٹائمز، 13 دسمبر 2011)۔ بعد ازاں کانگریس نے امداد منجمد کرنے کے حق میں ووٹ دے دیا۔ (دی نیوز، 17 دسمبر 2011) اور طریقہ کار کے مطابق بل دستخط کیلئے امریکی صدر کے پاس چلا گیا۔ اس پر امریکی محکمہ خارجہ نے ایک بیان جاری کیا کہ ابھی صرف کانگریس نے ایک بل منظور کیا ہے اور اس کی حیثیت قانون کی نہیں جب یہ قانون بن جائے گا تو حکومت اس کے تقاضے پورے کرے گی۔ یہ بھی تجویز دی گئی کہ سویلین امداد میں کٹوتی نہیں کی جائے گی۔

پاکستانی حکام نے اعلان کیا کہ پاکستان کے راستے افغانستان میں نیٹو اور امریکی فورسز کیلئے سپلائی فوری طور پر بحال نہیں کی جائے گی۔ پاکستانی سرحدی حدود کی خلاف ورزی اور پاکستانی فورسز پر حملوں کے حوالے سے ''زیرو ٹالرنس'' پر بھی زور دیا گیا۔ یہ بھی اطلاع دی گئی کہ امریکی فوجیوں نے 11 دسمبر کو شمسی ائیر بیس خالی کر دیا ہے۔ دوسری جانب نیٹو کے فوجی سربراہ نے جنرل کیانی سے پاکستان کے ساتھ معمول کے تعلقات بحال کرنے کیلئے رابطہ کیا۔ امریکی وزیر دفاع لیون پینٹا نے ایک بیان جاری کیا کہ افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کامیابی کے لئے پاکستان کے ساتھ مستحکم تعلقات ضروری ہیں۔ (ڈیلی ٹائمز، 14 دسمبر)۔ اس کے علاوہ یہ کہ پاکستان 2012ء میں اسرائیل اور افغانستان کے بعد امریکی امداد (2965 ملین ڈالر) حاصل کرنے والا تیسرا بڑا ملک بن جائے گا۔ (ڈان، 14 دسمبر 2011ء)۔ اس کے ساتھ پینٹا گون

نے 26 نومبر کو سلالہ پوسٹ پر حملے پر اظہار افسوس کر کے صلح جوئی کا اشارہ کیا اور کہا کہ اس بدقسمت حملے کی وجہ باہمی رابطوں میں فقدان تھی۔ (ڈان، 22 دسمبر)۔ اشتعال انگیزی اور کراہت آمیزی کے بعد اشک شوئی کرنا پاک امریکہ تعلقات کا خاصہ تھا۔ بالفاظ دیگر پاکستان اور امریکہ کے درمیان امداد لینے اور دینے والا تعلق جاری رہنے کی توقع تھی۔

چنانچہ 2011 کے اختتام پر پاکستان اور اس کے اردگرد کی صورتحال انتہائی آتش فشانی اور غیر یقینی رہی۔ پاکستانی فوج کے ''ڈی فیکٹو'' اختیارات قائم دائم رہے۔ بلکہ میموگیٹ سکینڈل کے تناظر میں اور 26 نومبر کو نیٹو کی سلالہ پوسٹ پر بمباری کے حوالے سے تصادم کی کیفیت کے باعث اس میں اضافہ ہو گیا۔ چاہے یہ ایک گزرنے والا مرحلہ تھا لیکن ایک فریب یا پاکستان کی طرف سے امریکہ پر انحصار کم کرنے کی حقیقی خواہش بھی پائی جاتی تھی۔ تلخ حقائق یہ ہیں: پاکستان کا امریکہ پر فوجی اور اقتصادی انحصار بدستور کافی زیاد تھا۔ امریکہ طویل عرصے سے پاکستان کے اندرونی معاملات میں ملوث رہا تھا اس لئے اس کے پاکستان کے فوجی اور انٹیلی جنس شعبوں سے تعلقات بھی گہرے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بطور سپر پاور امریکہ کو اب بھی فوجی اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں برتری حاصل تھی...... اس کا واضح ثبوت ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے خلاف آپریشن سے ملا۔ اس تناظر میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے عزم سے دستبردار ہونا پاکستان کیلئے اتنا آسان نہیں تھا۔ امریکہ نے اس عزم کا مطلب یہ لیا کہ پاکستان حقانی نیٹ ورک اور دیگر امریکہ مخالف گروپوں کے خلاف کارروائی کرے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ مابعد نو آبادیاتی گیریژن سٹیٹ کے آثار بدستور نمایاں تھے اور پاکستان کے سیاسی منظر نامے میں کافی اجاگر تھے۔

باب 18

تجزیہ اور خلاصہ

تاریخی ورثہ

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ وہ مذہبی عقیدے کے لحاظ سے ایک قوم ہیں اور اس کیلئے انہیں ایک الگ خود مختار ملک درکار ہے یہ نظریہ ہندوستان کی تقسیم کا باعث بنا۔ شروع میں دوسری جنگ کی تینوں بڑی فاتح طاقتوں نے اس دعوے کو مختلف وجوہات کی بنا پر زیادہ پذیرائی نہ بخشی۔ جہاں برطانیہ جنوبی ایشیا کی بدستور بڑی طاقت رہنے کی توقع کر رہا تھا...... حتیٰ کہ ہندوستان سے نکلنے کے بعد بھی...... اس کا یہ بھی خیال تھا کہ متحدہ ہندوستان سے وہ زیادہ فوائد حاصل کر سکتا تھا کیونکہ غیر منقسم ہندوستان معاشی اور عسکری لحاظ سے مضبوط ہوتا اور یوں سوویت یونین کے یہاں قدم جمانے کی راہ میں مزاحم ہوتا لیکن اس اندازے پر 1947 کے موسم بہار میں نظر ثانی کی گئی اور ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں پاکستان کے قیام کو زیادہ سود مند سمجھا گیا۔ بعد میں جب برطانیہ نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا تو اس نے پاکستان اور بھارت دونوں کو دولت مشترکہ میں شامل کر کے اپنے مفادات کو پہنچنے والا نقصان محدود رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ اس کثیر النسل ملک کو وسائل کی فراہمی میں مدد دی جا سکے۔ اس وقت انگریز اس بات کا اندازہ نہ لگا سکے کہ ہندوستان سے انخلا کی صورت میں عالمی سیاست میں ان کا کردار ڈرامائی طور پر کم ہو جائے گا۔

امریکہ ہندوستان کی آزادی کا چیمپئن تھا اور اس نے جنگ عظیم کے دوران برطانیہ پر دباؤ

ڈالا کہ وہ ہندوستان کو خود مختاری دے دے تاہم پاکستان کے قیام کے معاملے میں اس کا رویہ غیر ہمدردانہ تھا۔ یہ رویہ انگریزوں کی طرف سے اقتدار مسلم لیگی لیڈروں کے حوالے کرنے کے آخری ایام تک برقرار رہا۔ مسلم لیگ کی طرف سے کمیونزم کے پھیلاؤ کے آگے بند باندھنے میں قابل انحصار اتحادی کے طور پر اپنی مارکیٹنگ سے امریکہ زیادہ متاثر نہ ہوا۔ بالخصوص روز ویلٹ انتظامیہ جو مشترکہ سکیورٹی، امن اور جمہوریت کے حق میں سوویت یونین کے ساتھ دوستی کو فروغ دینا چاہتی تھی کی موجودگی میں یہ بات سچ تھی۔ سوویت یونین بھی ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے متفکر تھا لیکن انگریز دور کے آخری ایام میں وہ اس پر قائل ہو گیا کہ ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے کا مسلمانوں کا مطالبہ جائز تھا۔ یوں وہ بھی نظریہ پاکستان کا حامی ہو گیا لیکن منقسم برصغیر کے نتائج پر اس کے اندیشے برقرار رہے۔

ہندوستان کی تقسیم کا سب سے اہم پہلو انڈین آرمی کی تقسیم کا سوال تھا۔ انگریزوں کے لئے یہ انتہائی سٹرٹیجک اہمیت کا حامل معاملہ تھا۔ وہ امید کر رہے تھے کہ تقسیم ہند کے بعد بھی جنوبی ایشیا پر ان کا کنٹرول برقرار رہے گا اور سوویت یونین کے کسی حملے کی صورت میں ہندوستانی فوج کا نہایت اہم کردار ہوتا۔ اس لئے انہوں نے متحدہ فوج کی حمایت کی...... چاہے ہندوستان تقسیم ہی کیوں نہ ہو جائے۔ البتہ مسلم لیگ نے اصرار کیا کہ وہ صرف اسی صورت میں پاکستان میں اقتدار قبول کرے گی اگر ہندوستان کی فوجوں کو تقسیم کر کے الگ بری، بحری اور فضائی فوج بنائی جائے گی۔ اس موقع پر برطانوی اسٹیبلشمنٹ نے ایک اور اندازہ لگایا کہ: خلیج فارس کے علاقے میں مفادات کے تحفظ اور کمیونزم کے خلاف پاکستان کے فوجی اڈوں اور تنصیبات کا استعمال ان کے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔

3 جون 1947 کے پارٹیشن پلان میں ہندوستان کے ساتھ انڈین آرمی، رائل انڈین نیوی اور رائل انڈین ائیر فورس کی تقسیم کو بھی باضابطہ شکل دی گئی۔ فوجوں اور ان کے اثاثوں کی تقسیم آسان کام نہیں تھا کیونکہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے بعض معاملات پر اعتراضات کئے تھے

اور یہ کہ کانگریس اور سکھ لیڈر بلدیو سنگھ کی طرف سے اثاثوں کی تقسیم مکمل ہونے کے بعد بھی پاکستان کو اس کا جائز حصہ دینے کی مخالفت عیاں تھی۔ دوسری طرف پاکستان میں مقبول سوچ کے برعکس شواہد بتاتے ہیں کہ یکم اگست 1947ء تک ماؤنٹ بیٹن جو 14 اگست تک متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل رہے وہ پاکستان کو مسلح افواج میں منصفانہ حصہ دینے کے خواہاں تھے۔ بعد میں صرف بھارت کا گورنر جنرل بننے پر انہوں نے صرف اسی ملک کی نمائندگی کی۔

جغرافیے کے خدوخال

دنیا کا نقشہ دیکھیں تو پاکستان منفرد جغرافیائی خدوخال کا حامل نظر آئے گا۔ اس کے دونوں حصے (مشرقی اور مغربی) ایک دوسرے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھے۔ ان کے درمیان ایک طاقتور اور باوسیلہ ہمسائیہ تھا۔ صورتحال میں مزید پیچیدگی اس بات سے آئی کہ پاکستان کے بڑے شہر بھارتی سرحد کے ساتھ واقع تھے جبکہ مغربی سرحد پر ایک غیر دوست ہمسائیہ افغانستان تھا۔ چنانچہ امریکہ کی طرف سے سرد جنگ کیلئے قومی سلامتی ڈاکٹرن بنانے سے کہیں پہلے پاکستان سکیورٹی کا ڈراؤنا خواب تھا۔ دوسری جانب پاکستان اپنے جغرافیائی محل وقوع کو اس بات کیلئے استعمال کرسکتا تھا کہ وہ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے میں اپنی حیثیت پر امریکہ کو قائل کر سکے۔ نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں ...... عام تاثر کے برعکس امریکہ کو لبھانے کا کام بانی پاکستان نے کیا تھا یہ اور بات ہے کہ ممکن ہے انہیں اس بات کا مشورہ فوجی ماہرین نے دیا ہو۔ یہ فوجی ماہرین انگریز اور پاکستانی دونوں ہو سکتے تھے۔ بہر حال پاکستان کی مقتدر اشرافیہ برسوں تک بلا تکان پینٹا گون اور امریکی محکمہ خارجہ کو اس بات پر قائل کرنے میں لگی رہی کہ پاکستان کمیونزم کے خلاف فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور معاشی اور فوجی امداد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

بھارت سے خطرہ

شروع سے ہی پاکستان کی دفاعی اور سکیورٹی ڈاکٹرن اور خارجہ پالیسی کا محور بھارت تھا اور

اس کا خاص پہلو کشمیر تھا۔ یہ بنیادی مسائل پاکستان کی رائے عامہ کی سوچ کی عکاسی نہیں کرتے تھے۔ یہاں اس بات کی نفی نہیں کی جارہی کہ نومولود پاکستان بقا کی مشکل جدوجہد کررہا تھا۔ بھارتی قیادت کے کچھ ہتھکنڈے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کو ناکام ثابت کر کے بھارتی یونین میں واپسی کی توقع کررہی تھی۔ پاکستان کے مصائب اور واہموں کی فہرست کافی لمبی ہے: مسئلہ کشمیر، پاکستانی سرحدوں کے قریب 1950 کے عشرے اور بعد میں بڑے پیمانے پر فوجی مشقیں، 1971 میں مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت جس کے نتیجے میں پاکستان ٹوٹ گیا، 1974ء میں بھارت کا ایٹمی تجربہ اور 1980 کے عشرے کے آخر میں براس ٹیکس فوجی مشقیں۔ یقیناً بھارت کے بھی اپنی نوعیت کے مصائب تھے۔ لیکن وہ ہمارے موضوع کا حصہ نہیں۔ ہمارے اس تحقیقی کام کا محور پاکستان ہے۔

البتہ یہ نظریہ کہ بھارت پاکستان کی بقا نہیں چاہتا کے تجزیے کی ضرورت ہے۔ وہ بھی اس تناظر میں کہ پاکستان کی بھارت کے ساتھ 3 مکمل جنگوں سمیت 5 عسکری تصادم میں سے 4 میں پہل پاکستان نے کی۔ یکم جنوری 1948ء کو جب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی ثالثی میں سیز فائر عمل میں آیا تو کشمیر کا بمشکل ایک تہائی حصہ پاکستان کے قبضے میں تھا جبکہ باقی ماندہ تمام کشمیر بھارت کے پاس تھا۔ یہ خوف کہ مہاراجہ کشمیر خفیہ طور پر بھارت کے ساتھ الحاق کی سازباز کررہا تھا جیسا کہ میجر جنرل شاہد حامد دعویٰ کرتے ہیں اس کو دوٹوک انداز میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ اگر ایسا ہوجاتا تو بھارت کی سرحدیں جی ایچ کیو کے بہت قریب آجاتیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ 64 برسوں میں 1949ء کی سیز فائر لائن میں واحد تبدیلی یہ آئی کہ 1972ء میں شملہ معاہدے کے تحت اسے کنٹرول لائن تسلیم کرلیا گیا۔

دوسرا فوجی معرکہ 1965ء کے موسم بہار میں رن آف کچھ میں ہوا۔ بظاہر اس لڑائی میں پاکستانی فوج کی کارکردگی زبردست رہی تاہم امریکہ کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکی Patton ٹینک اور جدید اسلحہ استعمال کیا گیا۔ اس کامیابی پر پاکستانی فوج اور

محکمہ خارجہ کے عقابوں میں نام نہاد احساس برتری پیدا ہو گیا۔ اسی احساس تفاخر کا نتیجہ کشمیر فتح کرنے کی دوسری کوشش کی صورت میں نکلا اور حریت پسندوں یا مجاہدین کی شکل میں وہاں دراندازداخل کئے گئے۔ اس موقع پر بھارت نے لڑائی میں شدت لانے اور لاہور کے قریب بین الاقوامی سرحد پار کرنے میں ذرا بھر تامل نہ کیا۔ 6 ستمبر کو شروع ہونے والی بھرپور جنگ 17 روز تک جاری رہی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اور ان کے سخت گیر وزیر خارجہ زیڈ اے بھٹو کو یہ جان کر دھچکا لگا کہ بھارتی فوج نہ صرف مختلف محاذوں پر زبردست مزاحمت کر رہی تھی بلکہ کئی جگہوں پر پاکستان کیلئے ہزیمت کا باعث بھی بن رہی تھی۔ چند روز کے اندر ہی جانی نقصان میں اضافہ ناقابل برداشت ہو گیا۔ اس کے باوجود سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر کی قیادت میں پراپیگنڈا مشینری نے زمین، فضا اور سمندر میں پاکستانی فتوحات اور برتری کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ ایک دیومالا یہ بھی تھی کہ جنرل اختر ملک کشمیر کے علاقے اکھنور پر قبضہ کر کے بھارتی فوج کی پیشقدمی روکنے ہی والے تھے کہ ان کی سینئر قیادت نے کمانڈ تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ 4 ستمبر کی تاریخ کو وہ اہم دن قرار دیا گیا جب پاکستان کے اقدامات کو کمانڈ میں تبدیلی کے ذریعے سبوتاژ کر دیا گیا۔ یوں بھارتی فوج کو ایک بار پھر منظم ہو کر اکھنور پر قبضہ روکنے کا موقع مل گیا۔ اس متنازعے واقعے کے بارے میں ہم نے کتاب میں مختلف نقطہء نظر پیش کئے۔ کمانڈ میں تبدیلی کے نتیجے میں ایک دن کی تاخیر کی اہمیت کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ محض اس سے تاریخ کا دھارا بدل سکتا تھا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ جنرل اختر کے اپنے جذباتی دفاع میں کئی سقم نظر آئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ اکھنور کی طرف پیشقدمی ان کی فوری ترجیح نہیں تھی۔ اس لئے یہ دیومالا کہ کشمیر پاکستانی فوج کی دسترس میں تھا وہ درخواعتنا نہیں۔ حقیقت میں بھارتی فوج زیادہ بہتر تیاری کے ساتھ میدان جنگ میں آئی اور زیادہ مؤثر اور منظم طریقے سے جنگ لڑی۔

تیسری جنگ اس وقت چھڑ گئی جب بھارتی فوج نے نومبر 1971ء میں مشرقی پاکستان میں مداخلت کی تاکہ بنگالیوں کو پاکستان سے آزادی دلانے میں ان کی مدد کی جا سکے۔ مشرقی پاکستان

میں خانہ جنگی چھیڑنے کی وجہ یہ تھی کہ فوج انتخابات میں کامیابی کے باوجود اقتدار عوامی لیگ کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ پاکستان ٹوٹنے کی صورت میں نکلا۔ جہاں بھارت کی ہندوانہ جارحیت کو پاکستان کی بقا کی دشمن ہونے کی بات کی جاتی ہے وہاں اس بات کا مناسب حد تک اعتراف نہیں کیا گیا کہ مغربی پاکستان کے حکمران طبقے نے بھارت کو یہ موقع فراہم کیا۔ یہ واقعہ اس کی بھرپور مثال ہے۔ دوسری طرف تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ اندرا گاندھی اور ان کے جنرلوں کے پاس واضح پلان تھا جس پر مؤثر انداز میں عملدرآمد کیا گیا۔

بچے کھچے پاکستان کا وزیر اعظم بننے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے بھارت مخالف سابق مؤقف کو تبدیل کر دیا لیکن جب بھارت نے ایٹمی تجربہ کیا تو انہوں نے مشہور زمانہ فقرہ کہا کہ ''ایٹم بم بنانے کے لئے چاہے پاکستانیوں کو گھاس کھانا پڑی تو وہ کھائیں گے''۔ اس تناظر میں پاکستان کے سکیورٹی خدشات بھارت کی اشتعال انگیزی سے بڑھتے رہے۔ 1980ء کے عشرے میں پاکستان اور بھارت سیاچن گلیشئر کے محاذ پر صف آراء ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں بھارت نے سیاچن پر مستقل فوجی چوکیاں قائم کر لیں۔ اس سے پہلے پاکستانی سرحد کے قریب بڑی فوجی مشقیں 'براس ٹیکس' ہونے سے پاکستان کا عدم تحفظ کا احساس فزوں تر ہو چکا تھا۔ مئی 1998 میں پاکستان اور بھارت کی طرف سے ایٹمی تجربات کے دھماکوں کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان تباہی کے آثار بڑھ گئے۔ کارگل کی چھوٹی جنگ بھی جنرل مشرف اور ان کے ہمنوا جنرلوں کی طرف سے بھیجے گئے دراندازوں کی کارروائی کا نتیجہ تھی۔ تاکہ ان چوکیوں پر قبضہ کیا جائے جو بھارتی فوج عموماً سردیوں میں خالی کر دیتی تھی۔ اس جنگ سے نہ صرف تباہی ہوئی بلکہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان خصوصاً پاکستانی فوج کے خودسر ہونے کا تاثر بھی پھیلا۔ بھارت اس معرکے میں فائدے میں رہا کیونکہ اس کے بعد مسئلہ کشمیر پر بین الاقوامی فورموں میں پاکستان کو جو ہمدردیاں حاصل تھیں وہ کم ہو گئیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی جنگ تو نہیں ہوئی لیکن وہ لاحاصل محاذ آرائیوں میں بدستور مصروف رہے۔ دونوں ملکوں نے بجٹ کا بڑا حصہ دفاعی صلاحیتوں کیلئے مختص کیا۔ جیسا کہ

پیری بوزن کہتے ہیں کہ ایسے دفاعی اخراجات سے وسیع تر احساس تحفظ پیدا ہونا ضروری نہیں۔اس کے برعکس اسلحے کی دوڑ سے ترقیاتی ایجنڈے متاثر ہوتے ہیں اور عدم تحفظ میں اضافہ ہوتا ہے اور دونوں طرف ذاتی مفادات کی تکمیل کی راہ ہموار ہوتی ہے اور ریاستی تصادم سے معاشی اور دیگر فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔میکاولی کے اس نظریے کہ......اقوام کی آزادی کا یقینی انحصار فوجی طاقت پر ہوتا ہے......کا بھرپور استعمال کیا گیا۔تاہم فوجی اخراجات کی حقیقت آگاہ کرنے کی بجائے تصادم کے خطرے کو زیادہ ابھارنے کا نتیجہ خطرناک نکلتا ہے...... یعنی دونوں طرف کی فوجی اسٹیبلشمنٹ قومی وسائل کا بڑا حصہ ہڑپ کر لیتی ہیں۔پاکستان کے معاملے میں بھی ایسا ہے جبکہ بھارت چین سے لاحق بڑے خطرے کا رونا روتا ہے۔جہاں تک پاکستان اور بھارت دونوں کے پاس نام نہاد جوہری اثاثوں کی موجودگی کا تعلق ہے تو جنگ نہ ہونے کا مطلب امن نہیں۔دہشتگردی جس انداز میں بڑھی ہے اس میں مکمل جنگ کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔اس امر نے سزا سے بچنے کے جھوٹے نظریات کیلئے عمل انگیز کا کام کیا ہے۔حتیٰ کہ نومبر 2008ء میں ممبئی حملوں کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہا۔دوسری جانب پاک بھارت تعلقات میں کچھ بہتری بھی دیکھی جا سکتی ہے۔دونوں نے حادثاتی ایٹمی جنگ کے امکانات کم کرنے کیلئے اقدامات کئے ہیں۔دونوں فریق سالانہ بنیادوں پر اپنی ایٹمی تنصیبات کی فہرست، دہشتگردی اور دیگر متعلقہ معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ایک ہاٹ لائن بھی قائم ہے۔اس سے صورتحال میں بہتری کی امید ہے۔

اس دوران دونوں فریقوں نے امن کے فروغ کا عندیہ دیا لیکن روایتی جارحانہ تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی دیکھنے میں نہیں آ سکی۔اس ضمن میں مشرف کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کی کوشش جوں کی توں صورتحال میں تبدیلی کیلئے سنجیدہ قدم تھا۔واجپائی اور من موہن سنگھ نے بھی اسی گرمجوشی سے جواب دیا۔مجموعی طور پر بھارت مسئلہ کشمیر کے حل میں کم ہی دلچسپی رکھتا ہے اور ''سٹیٹس کو'' ہر صورت میں برقرار رکھنے کا خواہاں ہے۔بھارت، پاکستان اور کشمیریوں تینوں کی جیت پر مبنی مسئلہ کشمیر کا Non- teritorial حل اس لا حاصل مقابلے کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

افغانستان

قیام پاکستان کے بعد افغانستان نے اقوام متحدہ میں پاکستان کو رکنیت دینے کی مخالفت کی تھی یوں دونوں ملکوں کے درمیان طویل بدگمانی کا آغاز ہو گیا۔ وجہ تنازعہ ڈیورنڈ لائن ہے جسے افغان حکومت بین الاقوامی سرحد تسلیم نہیں کرتی۔ اپریل 1978 میں کابل میں کمیونسٹوں کی حکومت کے قیام اور پھر اس حکومت کو سہارا دینے کیلئے سوویت یونین کے ہزاروں فوجیوں کی آمد کے بعد افغانستان میں مزاحمتی تحریک شروع ہوئی جس سے ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور لاکھوں افغانوں کو پاکستان میں پناہ لینا پڑی۔ پاکستان کے ذریعے امریکہ، سعودی عرب کا جہاد شروع کیا گیا جس کے نتیجے میں پاکستان کو افغانستان میں اپنی مضبوط موجودگی مل گئی اور اس کے کمانڈروں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سٹرٹیجک وسعت اب ممکن ہے...... یعنی افغانستان کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن اور پھر اس سے آگے وسط ایشیا تک توسیع...... کچھ عرصے کے لئے پاکستان کو اس وقت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جب شمالی اتحاد نے پاکستان نواز پختون اسلام پسندوں پر غلبہ پا لیا۔ یہی وقت تھا جب بھارت نے شمالی اتحاد کے اتحادی کی حیثیت سے اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ البتہ 1996ء میں جب طالبان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو پاکستان کا افغانستان میں اثر و رسوخ بحال اور بھارت کا محدود ہو گیا۔ پاکستان طالبان حکومت کا مرکزی سرپرست بن گیا اور سعودی عرب اور عرب امارات کے ساتھ وہ واحد ملک تھا جس نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا۔ طالبان نے اپنے ہی عوام پر دہشت مسلط کر دی جس پر پاکستان کے انتہا پسندوں اور اسلام پسندوں نے ایک اسلامی ریاست کے طور پر جشن منایا۔ تاہم ایسے حالات میں بھی طالبان نے ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم نہیں کیا جس سے پاکستان کے طالبان پر اثر و رسوخ محدود ہونے کا واضح تاثر ملتا ہے۔ نومبر 2001ء میں طالبان کے زوال اور حامد کرزئی کے برسر اقتدار آنے کے بعد پاکستان ایک بار پھر دفاعی پوزیشن میں چلا گیا۔ اس کے بعد کی تمام کہانی سب کو معلوم ہے اور ہم نے گزشتہ صفحات میں اسے بیان بھی کیا ہے۔

اتحاد سازی

پاکستان کی طرف امریکہ کو سوویت یونین کے خلاف اپنی خدمات پیش کرنے کی کوششیں پاکستان کے قیام سے پہلے ہی شروع کر دی گئی تھیں۔ جب پاکستان بن گیا تو سیاسی اور فوجی قیادت نے انتھک سفارتی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ امریکہ کئی برس تک ٹس سے مس نہ ہوا اور وہ جنوبی ایشیا کو اس مرحلے پر چنداں اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا اور سوویت یونین کو یورپ میں روکنے کیلئے اتحاد سازی کی ٹھوس کوششوں پر توجہ برقرار رکھی۔ اس سوچ میں بتدریج تبدیلی آئی۔ صدر ہیری ٹرومین کی نیشنل سکیورٹی ڈاکٹرن، میکارتھی ازم کے بڑے پیمانے پر پرچار اور سرد جنگ نے پاکستان کے بطور فرنٹ لائن سٹیٹ امیدوار بننے کی راہ ہموار کر دی۔ 1951ء میں امریکہ کی طرف سے پاکستان کے لئے پہلی اقتصادی اور عسکری امداد آئی۔ بعدازاں آئزن ہاور اور وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈولس پاکستان کی یک مذہب نوعیت کے گرویدہ ہو گئے اور پہلے 1954ء اور پھر 1959 میں فوجی معاہدے کئے گئے جس سے پاکستان کو مزید امداد ملنے کی راہ ہموار ہو گئی۔ تاہم پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کا ہنی مون دورانیہ مختصر ثابت ہوا۔ 1950 کے عشرے کے آخر میں امریکہ پر واضح ہو گیا کہ پاکستان امریکہ کے ساتھ اتحاد میں اس لئے داخل ہوا تا کہ بھارت کے مقابلے میں خود کو مسلح کر سکے۔ لیکن چونکہ پاکستان وسطی ایشیا کی سوویت ریاستوں کی فضائی جاسوسی کے لئے امریکہ کو سہولیات فراہم کر رہا تھا اس لئے اسے ایک مفید ساتھی ہی سمجھا گیا۔ بہرصورت امریکی امداد نے پاکستان کو متاثر کن صنعتی ترقی کے قابل بنا دیا۔ اس سے ملازمتوں کے مواقع اور دولت کی ریل پیل ہوئی لیکن مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان وسائل کی تقسیم منصفانہ نہیں تھی۔ امریکی اس بات کے خواہاں تھے کہ ان کے اتحادی ممالک فری مارکیٹ کا اصول اپنائیں اور ہر قسم کی سوشلزم اور ریاستی کیپٹل ازم پر سرمایہ دارانہ نظام کی برتری کی مثالیں قائم کریں۔ پاکستان فری مارکیٹ اکانومی کا ماڈل بن کر ابھرا جسے غربت سے نکلنے کیلئے تائیوان اور جنوبی کوریا نے اپنا لیا۔ اس کے بعد پاکستانیوں نے بھارت کے ساتھ مسلح تصادم کا فیصلہ کیا اور معاشی ترقی کی بجائے جنگ

میں سرمایہ کاری کی اور اس کا الزام پاکستانی قیادت کے سر جاتا ہے۔

امریکہ اس وقت چوکنا ہو گیا جب پاکستان نے بھارت کے خلاف معرکہ رن آف کچھ میں امریکی پیٹن ٹینک استعمال کئے۔ یہ امریکہ کے ساتھ اس معاہدے کی خلاف ورزی تھی کہ امریکی اسلحہ بھارت کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ دوسری جانب پاکستانیوں کو پہلی بار 1962ء کی بھارت چین سرحدی جھڑپ میں اندازہ ہوا کہ امریکہ ہندوستان کے ساتھ اتحاد کو ترجیح دیتا ہے اور چین سمیت کسی بھی بھارت مخالف طاقت کے خلاف ہر ممکن امداد دینا چاہتا ہے۔ بھارت کے لئے امریکہ کی معاشی اور عسکری امداد بڑھنے پر ایوب خان سخت ملول ہوئے حالانکہ بھارت پاکستان کی طرح امریکہ کا اتحادی نہیں تھا۔ اس کے باوجود پاکستانی امریکی پیغام سمجھنے سے قاصر رہے۔ یوں جب 1965ء کی جنگ کے دوران امریکہ نے پاکستان اور بھارت دونوں پر اسلحے کی فروخت کی پابندی لگائی تو بھٹو نے جز بز ہو کر کہا کہ جارح بھارت تھا۔ 1965 کے بعد اگرچہ پاک امریکہ تعلقات سرد مہری کا شکار رہے لیکن یہ امریکہ ہی تھا جس کی وارننگ نے بھارت کو 1971 میں مغربی پاکستان پر حملے سے باز رکھا حالانکہ اندرا گاندھی ایسا بھی چاہتی ہوں گی۔ پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک بار پھر اس وقت گرمجوشی پیدا ہوئی جب 1979ء میں سوویت یونین نے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کیں۔ یہ گرمجوشی دونوں ملکوں کی طرف سے خالصتاً سیاسی اندازوں کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ جہاں تک پاکستان کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے تو ممکن ہے کہ امریکیوں کو 1958ء کی فوجی بغاوت کا علم ہو لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ انہوں نے فوج کو بغاوت کے لئے شہ دی ہو۔ جنرل ضیاء الحق کے طویل دور آمریت میں امریکہ پاکستان کے داخلی معاملات سے اس وقت لاتعلق رہا جب ضیاء الحق اسلامائزیشن کے ذریعے عوام پر جبر کر رہے تھے۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے اپنی ہمنوا ریاست سعودی عرب کی مدد سے 1950ء کی دہائی میں انتہا پسند اسلام کی سرپرستی کا عمل شروع کیا اور 1960ء کے عشرے میں اسے منظم شکل دی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ نیلسن پالمیئر نے بتایا ہے کہ مذہب کو استعمال کر کے آمرانہ حکومتوں کو دوام بخشا امریکہ کی نام نہاد

قومی سلامتی نظریے کا حصہ تھا جس کے تحت امریکہ نے لاطینی امریکہ میں فوجی حکمران ٹولوں کی طرف آنکھیں بند کر لیں...... یہ فوجی حکمران ٹولے بڑے پیمانے پر بے رحمی کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزریوں میں ملوث تھے۔ جب پاکستان میں سویلین حکومت بحال ہوئی اور بے نظیر بھٹو اور نواز شریف جمہوری انتخابات کے ذریعے اقتدار میں آئے تو وزیراعظم کے منصب کی طاقت اور وقار کو بری طرح دھچکا لگا۔ وزیراعظم کی جگہ فوج اور کچھ بااثر بیوروکریٹ ہی پاکستانی سیاست کے مدارالمہام تھے۔ اس عرصے میں پاکستان کی داخلی سیاست میں امریکہ کی...... بطور نجات دہندہ اور ثالث...... مداخلت نہایت نمایاں ہوگئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ داخلی سیاست اور پاک بھارت مذاکرات میں بطور ثالث اس کا کردار محدود نوعیت کا تھا۔ کارگل کے مس ایڈونچر میں امریکہ نے فاصلہ اختیار کر لیا۔ جب جنرل مشرف نے نواز شریف حکومت کا تختہ الٹ کر فوجی حکومت قائم کر لی تو امریکہ کی ناراضگی فزوں تر ہوگئی۔ دوسری جانب بھارت کو سٹرٹیجک اتحادی بنانے کی سرتوڑ امریکی کوششیں جاری رہیں۔ بھارت نے بھی اسی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ البتہ پاکستان اور امریکہ کا اتحاد نئے عزم کے ساتھ نائن الیون کے بعد پھر وجود میں آ گیا، لیکن دونوں ملکوں کی قیادت کی طرف سے دہشت گردی کی لعنت کے خاتمے کے لئے دیے گئے منافقانہ بیانات اور ایک دوسرے کی اہمیت کے کھوکھلے دعوؤں کے باوجود یہ اتحاد خالصتاً ''انسٹرومینٹل'' نوعیت کا تھا، امریکہ طالبان اور القاعدہ کے خلاف کارروائی میں مؤثر نتائج ظاہر کرنے کی صورت میں پاکستان کی فوج کو امداد دینے کا خواہاں تھا۔ پاکستان یہ خدمات مخصوص بنیادوں پر انجام دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ امریکہ کی رخصتی کے بعد افغانستان میں بعض طالبان پاکستان کے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔

بہرصورت ایک سپر پاور اور نوآبادیاتی دور سے وجود میں آنے والی درمیانی سطح کی طاقت، کے مابین غیر مساوی طرز کا تعلق رہا، امریکہ نے اسامہ بن لادن کی تلاش کیلئے پاکستان پر دباؤ ڈال کر سینکڑوں ویزے حاصل کر لئے۔ ایسی خفیہ سرگرمیوں کا پتہ اس وقت چلا جب سوئے اتفاق

ریمنڈ ڈیوس کا کیس سامنے آیا۔ اس کے بعد 2 مئی 2011ء کو آپریشن جیرونیمو میں امریکی سیلز کے ایک دستے نے ایبٹ آباد کے ایک خفیہ ٹھکانے میں اسامہ بن لادن کو ٹھکانے لگا دیا۔ وکی لیکس سے طشت از بام ہونے والی امریکی اور پاکستانی فوج کی خفیہ خط و کتابت سے انکشاف ہوا کہ پاکستان میں ڈرون حملے نہ صرف پاکستانی فوج کی معاونت سے کئے گئے بلکہ بعض حملے تو فوج کی درخواست پر کئے گئے۔ اس کے باوجود بلاشبہ ایبٹ آباد آپریشن کے بعد امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں انتہائی بگاڑ آ گیا۔ 26 نومبر 2011ء کو سلالہ چیک پوسٹ پر نیٹو طیارے کی بمباری سے بداعتمادی گویا اپنی انتہا پر پہنچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان کا امریکہ پر انحصار بہت زیادہ ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان مسلح تصادم کے خدشات کے باوجود ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ یقینی بات ہے کہ پس پردہ تعلقات کی بحالی کیلئے کوششیں کی گئی ہو لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ اعصاب کی جنگ تھی اور امریکہ حقانی گروپ، ملا عمر اور دیگر اہم افغان طالبان کے معاملے میں آسانی سے ہتھیار پھینکنے والا نہیں تھا۔ اس بارے میں امریکہ کی مشہور ''مار اور پیار'' والی پالیسی نہایت نمایاں رہی۔ دوسری طرف پاکستان جنوب مغربی ایشیا کی ایک بڑی طاقت ہے۔ اس کی فوجی طاقت اور جوہری اثاثے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ امریکہ کو بھی اس کا اندازہ تھا کیونکہ ''افپاک'' ریجن بلکہ وسیع تر تناظر میں جنوبی ایشیا کے معاملات سے منسلک ہے۔

چین

پاکستان کا چین کے ساتھ تعلق حقیقت پسندانہ، طاقت کے توازن اور میرے دشمن کا دشمن میرا دوست قسم کی جمع تفریق پر مشتمل ہے۔ البتہ اگرچہ چین نے پاکستان کو مگ طیارے اور دیگر ساز وسامان فراہم کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ 1965ء، 1971 کی جنگ میں پاکستان کی طرفداری کرتے ہوئے بھارت پر حملہ کر کے اپنی سلامتی کا کوئی رسک لیتا۔ ہاں جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو مبینہ طور پر چین نے پاکستان کو جوہری صلاحیت حاصل کرنے میں مدد دی۔ یہ دراصل چین کی اس پالیسی سے مطابقت رکھتا ہے کہ بھارت کو مغرب میں پاکستان کی

سرحد کی طرف مصروف رکھا جائے۔ چین اور پاکستان افغان جہاد کا بھی حصہ تھے لیکن نائن الیون کے بعد ایک قسم کی کشیدگی اور پیچیدگی سامنے آنے لگی۔ جہاں چین نے جنوبی پاکستان کے ساحل پر گوادر بندرگاہ کی تعمیر شروع کی اور بلوچستان میں سونے سمیت دیگر قیمتی دھاتوں کی کان کنی کے حقوق حاصل کئے وہاں صوبہ سنکیانگ کے یغور باشندوں نے پاکستان کی اسلام پسند تنظیموں کے ساتھ نیٹ ورکنگ کا آغاز کر دیا۔ ان میں سے کچھ یغور واپس گئے اور چینی اقتدار کے لئے مزاحمت اور شورش کا باعث بنے۔ چین کے ردعمل پر پاکستان نے سخت کارروائیاں کیں۔

سعودی عرب

پاکستان کا تیسرا بڑا مربی ملک سعودی عرب تھا۔ وہابی حکومت اور پاکستان میں اس کے ممدوح حلقوں کے درمیان 1960ء کی دہائی میں اس وقت رابطے استوار ہوئے جب امریکہ کی اشیر باد سے مصر میں جمال عبدالناصر کے بائیں بازو پر مشتمل قوم پرست حکومت کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک نظریاتی نیٹ ورک تشکیل دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس کے انعقاد سے پاکستان کو سعودی عرب میں مارکیٹنگ کا کافی موقع ملا۔ کیونکہ اس کے بعد ہزاروں پاکستان بسلسلہ روزگار خلیجی فارس کے خطے میں گئے۔ لیکن یہ دراصل ضیاء الحق کی فوجی بغاوت، 1972ء کا افغان کمیونسٹ انقلاب، شیعہ لیڈر خمینی کی زیر قیادت شیعہ ایران کا عروج اور دسمبر 1979ء میں سوویت یونین کی افغانستان میں مداخلت تھی جس نے سعودیوں کو پاکستانی سیاست میں اندرونی اور خارجی دونوں محاذوں پر نمایاں کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔

ایرانی ملاؤں نے سیاسی اسلام کے اقتدار کو ایک نظریے کے طور پر پیش کیا جسے اقتدار پر قبضے اور قرون وسطیٰ دور کی مطلق العنانیت کے قیام اور انتخابات اور پارلیمنٹ جیسی جدید روایات اور اداروں کو نرغے میں لانے کیلئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ہر چندان دونوں کو شیعہ ملاؤں کے غلبے کی حکومت کیلئے استعمال کیا گیا۔ اس پیغام کی گونج پوری اسلامی دنیا میں سنائی دی تاہم فرقہ وارانہ اکثریت ہونے کے باعث سنی قیادت کی حمایت کی گئی۔ یہ کردار سعودی عرب نے سنبھال لیا جس

نے جنرل ضیاء الحق کی حکومت اور سوویت یونین کی افغانستان میں دراندازی کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے موزوں سمجھا۔ پاکستان کے حوالے سے ایرانی۔سعودی درپردہ جنگ کا مطلب تھا پاکستانی شیعوں اور سنیوں میں فرقہ وارانہ دہشت گردی...سعودی عرب کے اثر ونفوذ کے مضر اثرات کی گہرائی کا پوری طرح ابھی تک اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ اس کی وجہ سے پورے پاکستانی معاشرے میں زہر پھیل گیا۔

ہزاروں پاکستانی فوجی سعودی عرب میں تعینات ہوئے اور پرکشش تنخواہوں اور مراعات کے باعث اپنی قسمت بنائی۔ چنانچہ سعودی عرب کے ساتھ تعلق کو ''ادارہ جاتی مفاد'' کی سوچ پاکستانی فوج کے افسر طبقے میں پذیرائی حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ سعودی عرب میں کام کرنے والے لاکھوں پاکستانیوں پر ایسا اسلام آشکار ہوا جو ان کی متنوع روایات سے مختلف تھا۔ یہ امر پریشان کن ہے کہ سعودی عرب کے معاشرے اور حکومت کی طرف سے توہین آمیز سلوک کے باوجود کئی پاکستانی انتہا پسندی اور عدم برداشت کا کلچر لے کر واپس لوٹے۔انتہا پسندی اور دہشت گردی اب معاشرے کے تمام طبقوں میں سرایت کر چکی تھی۔ طالبان اور دیگر انتہا پسند تنظیموں کا احیا اس کا شاخسانہ تھا۔

داخلی محاذ پر فوج کا عروج

سیاست میں فوج کی مداخلت کی بڑی وجہ سیاست کی ناکامی تھی۔ 1951ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان، مارچ 1958ء میں ڈاکٹر خان صاحب اور پھر ڈپٹی سپیکر مشرقی پاکستان اسمبلی شاہد علی کے قتل کے واقعات کے ساتھ خستہ حال معیشت، خوراک کے بحران نے ایسی حکومتوں کی عدم مقبولیت میں اضافہ کر دیا جو شروع سے ہی عام انتخابات میں قانونی حیثیت حاصل کئے بغیر برسر اقتدار آتی رہیں۔یہی وہ حالات تھے جن میں فوج نے سیاست میں کردار اپنانا شروع کر دیا۔ 27 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان نے پہلی فوجی بغاوت کی۔ دوسری بغاوت اس وقت ہوئی جب سینئر فوجی کمانڈروں کے جنرل ایوب پر دباؤ ڈالا کہ وہ مارچ 1969 میں اقتدار جنرل یحییٰ کے

سپرد کردیں۔ لی پورٹ جنہوں نے پاکستان کو گیریژن سٹیٹ قرار دیا ہے انہوں نے اس کی تشریح کی کہ یہ دراصل فوج کے بطور ادارہ پاکستانی سیاست میں حتمی ثالث کی طاقت رکھنے کا ثبوت ہے۔

تیسری فوجی بغاوت جنرل ضیاء الحق نے جولائی 1977ء میں بھٹو کی مسلسل روبہ زوال حکومت کا خاتمہ کر کے کی۔ بھٹو کو مخالفین کی گوشمالی کرنے کی پالیسی کے باعث سیاسی جماعتوں کی سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ ضیاء الحق نے آہنی ہاتھوں کے ساتھ پاکستان پر حکومت کی اور خود کو سویلین حکمران بنانے تک کی بھی زحمت نہیں کی۔ سیاستدانوں پر فوج کی بالادستی تھی۔ ان کے بعد آنے والی بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتیں قطعی بے اختیار تھیں جبکہ فوج اور بعض طاقتور بیوروکریٹ ہی طاقت کے محور تھے اور ویٹو کے اختیارات رکھتے تھے۔ اس موقع پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو ''عمیق ریاست'' کہا جانے لگا۔ نواز شریف نے تعطل کا شکار اسلامائزیشن کا پراجیکٹ بحال کرنے کی کوشش کی اور شریعت کو ملک کا سپریم قانون قرار دینا چاہا۔

جنرل مشرف نے نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور 1999ء میں ملک میں چوتھی فوجی حکومت قائم کر لی۔ ان کے دور حکومت میں فوجی افسروں کی سول شعبوں کی طرف منتقلی کا عمل نہایت تیزی اختیار کر گیا۔ 2008ء میں ان کے زوال اور سویلین حکومت قائم ہونے سے یہ حقیقت تبدیل نہ ہوئی کہ ڈی فیکٹو طاقت بدستور فوج کے پاس رہی۔ مشرف کے فوجی جانشین جنرل اشفاق کیانی نے سیاستدانوں کو سیاسی عمل آگے بڑھانے کا موقع دیا۔ لیکن حکومت اور اپوزیشن کے درمیان محاذ آرائی کے دوران کئی مواقع پر مداخلت کی تاکہ جمہوری عمل عدم استحکام کا شکار نہ ہو۔ موجودہ حالات میں یہ فارمولا مؤثر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ فوج کی بلوچستان میں مداخلت متنازعہ رہی ہے البتہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ علیحدگی پسندگی کے طاقتور چیلنجوں کی جڑیں صوبے میں ہی موجود ہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے وقت سے یہ بات شک وشبے سے بالاتر ہے کہ بھارت اور افغانستان کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے خارجہ پالیسی کون تشکیل دیتا ہے یا دفاعی

پالیسی...... بالخصوص جوہری ہتھیاروں کے حوالے سے...... کون بناتا ہے۔فوج نے کئی مواقع پر صدر آصف علی زرداری کو معمول سے ہٹ کر آراء ظاہر کرنے پر مسترد کر دیا۔ وہ یہ کہ مقبوضہ کشمیر میں جو عناصر سرگرم عمل ہیں وہ دہشت گردی میں ملوث ہیں یا یہ کہ پاکستان پہلے ایٹم بم کا استعمال نہیں کرے گا۔ یا پھر 26 نومبر 2008ء کو ممبئی حملوں کی مشترکہ تحقیقات میں تعاون کے بارے میں وزیر اعظم گیلانی اور زرداری کی آمادگی۔ 2011ء کے اختتام تک یہ صورتحال برقرار ہے۔ (کتاب تحریر کرنے کے وقت تک) ایسا لگتا ہے کہ کوئی ''بریک تھرو'' ممکن ہے کیونکہ پاکستان بھارت کو تجارتی شعبے میں پسندیدہ ملک کا درجہ دینے پر غور کر رہا ہے تاہم خارجہ پالیسی میں اس اہم تبدیلی کے عملی نفاذ تک کوئی کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فوج کے عروج کے پیچھے آئی ایس آئی اور دیگر خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ تھا جو اپنی قانونی حدود سے ہٹ کر اپنے کردار میں پھیلاؤ لاتی رہیں۔ ایم کیو ایم جیسی لسانی اور حرکۃ المجاہدین، جیش محمد اور لشکر طیبہ سمیت جیسی کشمیر میں کردار والی جماعتوں کی پشت پناہی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ریاستی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے اطلاعات جمع کرنے کی بجائے تشدد کے ماہرین کو زیادہ طاقت اور استحکام بخشا گیا۔ تاہم اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فوج کے اندر اختلافی آوازیں بھی ابھرتی رہیں۔فوج کوئی پتھر کا بت انہیں۔ وہاں سخت گیر اسلام پسندوں کے ساتھ سوجھ بوجھ والے سیکولر ذہن کے افسر بھی موجود ہیں۔ اس بات کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ انٹیلی جنس ایجنسیاں ہمیشہ آپس میں تعاون نہیں کرتیں یا باہم متفق نہیں ہوتیں بلکہ ان میں مسابقانہ دوڑ بھی ہوتی ہے۔ یہ انکشافات نئے نہیں کیونکہ ایسے بڑے اداروں اور تنظیموں میں کام کرنے والے متنازعہ امور پر مختلف نقطہء نظر کے حامی ہو سکتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ یا عمیق ریاست deep state کا تصور بلاشبہ حقیقی ہے کیونکہ ادارے اور تنظیمیں اپنے ماتحت اہلکاروں کے مفادات سے زیادہ اجتماعی مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بہر حال اس بات پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی فوج جس میں بری فوج (آرمی) مرکزی حیثیت کی حامل ہے اس کو نہ صرف خارجہ اور دفاعی پالیسیوں بلکہ اندرونی سیاست میں بھی ڈی فیکٹو ویٹو کے

اختیارات حاصل ہیں۔اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ ریاست کے اندر ریاست جس میں آئی ایس آئی بالخصوص ''اسلام کے قلعے'' کی دیو مالا کے بارے میں بڑھ چڑھ کر کردار ادا کرتی رہی۔ البتہ ایسے نظریات کہ فوج شروع سے ہی سول حکومتوں کا تختہ الٹ کر ریاست پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے درپے تھی کو مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی تصدیق کیلئے کوئی ٹھوس شواہد نہیں مل سکے۔ علوی کے نظریے سٹرکچول ازم کو البتہ کچھ استثنٰی ضرور حاصل ہے۔ سٹرکچول وضاحتیں کمزور ٹھوس ثبوت پر مبنی ہیں کیونکہ یہ کسی معاشرے کے ڈھانچے کے خمیر میں ہوتا ہے جس کی بنا پر معاشرے کا ایک مخصوص رویہ ہوتا ہے۔ ہماری تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ فوج سیاسی عمل کی ناکامی اور نظریاتی اور معاشرتی مقاصد میں ابہام کی بنا پر اقتدار سنبھالتی رہی۔

مظہر عزیز بتاتے ہیں کہ پہلی فوجی بغاوت نے ایک مثال قائم کر دی جس کے بعد کئی اور بغاوتیں ہوئیں۔ یوں ایک نمونہ وجود میں آ گیا کیونکہ فوج کی بار بار مداخلت نے سیاستدانوں کی حیثیت کو کمزور کر دیا اور نمائندہ اداروں کے وقار کو نقصان پہنچایا۔ یہ دلیل درست ہے لیکن مظہر عزیز یہ بتانے کے خواہاں نظر آتے ہیں کہ Path-dependency کا مطلب سول اور فوجی حکومتوں کا باری باری چکر ہے۔ گویا ایسے مظہر کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ ہماری اس کتاب میں تحقیق پورے زور سے ثابت کرتی ہے کہ ایسے سیاسی طرز عمل سے جڑے تشدد اور شورش کو کنٹرول کرنا کافی مشکل ہے اور اگر ایسی صورتحال برقرار رہتی ہے تو یہ نظام کی تباہی پر بھی منتج ہوسکتی ہے۔ پارلیمانی روایت کی سطح پر استحکام بھی عنقا رہتا ہے۔ 2011ء کے آخری مہینوں میں وزیر اعظم گیلانی اور آرمی چیف کیانی کے درمیان کشمکش سے اشارہ ملتا ہے کہ فوج کی بالادستی کو مطلق یا ناگزیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ پاکستانی فوج کے اس وقت امریکہ کے ساتھ روابط کم ترین سطح پر ہیں۔ جہاں یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی سویلین حکومت اس سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہے وہاں یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ فائدہ اتنا زیادہ ہوگا کہ طاقت کے توازن کی سمت میں بڑھا جا سکے؟۔ اس وقت پاکستان پاکستان معمول کے چین آف کمانڈ سے کافی دور ہے جو فوج اور بیوروکریسی پر سویلین

لادستی کو ادارہ جاتی شکل دے سکے۔ یہاں بعض دیگر مسائل بھی ہیں، موجودہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں 2008ء کو برسر اقتدار آئیں اور ان کی مدت 2013ء کو ختم ہو گی (واضح رہے کہ کتاب پہلے لکھی گئی، 2013ء میں الیکشن ہو چکے ہیں اور اس وقت 2015 نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت قائم ہے: مترجم) لیکن اپوزیشن جماعتیں پھر تصادم کی راہ پر گامزن ہیں اور حکومت کو عوام کی عظیم طاقت کی مدد سے ہٹانے کی دھمکی دے رہی ہیں۔ ایسے حالات میں پاکستان کی نوخیز جمہوریت کا بدستور خطرات کا شکار رہنا ایک مستقل مسئلہ ہے۔

شناخت کی سیاست

پاکستان کی سیاسی مشکلات میں پیچیدگیاں قومی شناخت کی عجیب سوچ سے ابھری ہیں۔ تمام ریاستیں ایسی بڑی قومی شناخت پر زور دیتی ہیں جو انہیں دیگر ریاستوں سے منفرد بناتی ہے۔ عملی ریاستیں بلا تردد قومی شناخت کی طرف جانے پر کام کر سکتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک قومی سلامتی برقرار رکھنے، آبادی کی ضروریات پوری کرنے کیلئے اقتصادی اقدامات کرنے، امن وامان کی بحالی، بنیادی خدمات کی فراہمی، فلاح و بہبود اور تعاون سے زیادہ کوئی اور کام اہم نہیں۔ دوسری جانب نظریاتی ریاستیں ایسے عظیم آئیڈیل کے حصول میں پرعزم ہوتی ہیں جو سماجی انجینئرنگ کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر نظریاتی ریاست سیکولر مقاصد سے ماورا.... یعنی شہریوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانا.... اقدامات کرتی ہے تو افراد کی خودمختاری پر زیادہ جامع انداز میں قدغن لگاتی ہے۔ 7 مارچ 1949ء کی قرارداد مقاصد میں پاکستانی پارلیمنٹ کی بجائے حاکمیت اعلیٰ خدا کی ذات میں رکھنے کی بات کی گئی۔ جس سے آئین کے خدوخال میں مذہبی رنگ شامل کرنے کی نظریاتی اساس مہیا ہو گئی۔ ایسے خدوخال میں اسلامی قانون کی بالادستی قائم ہو گئی یعنی پاکستان کے تمام قوانین قرآن و سنت کے تابع ہوں گے۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں جامع اسلامائزیشن نے اس عمل کو مزید گہرا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں خواتین اور مذہبی اقلیتوں کے خلاف قانونی عمل کے ذریعے امتیازی اقدامات کئے گئے۔ ایسی پالیسیوں کے غیر اختیاری نتائج یہ نکلے

کہ اس دور میں سنی شیعہ خلیج گہری ہوگئی اور سنیوں کے ذیلی فرقوں کے درمیان اختلافات اور تصادم بھی ابھر کر سامنے آئے۔

مرکز صوبہ تعلقات

فوج کے غلبے والا مضبوط مرکز نہ صرف طاقتور فوج اور سول بیوروکریٹس اور نسبتاً کمزور منتخب اداروں اور منتخب حکومتوں کے درمیان عدم توازن کا عکاس تھا بلکہ وفاقی نظام کے اندر پارلیمانی روایات کے خلاف ایگزیکٹو اختیارات کے استعمال کی بالواسطہ پراڈکٹ بھی تھا۔ اس کا اظہار شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کی برطرفی سے ہوا اور بعد میں ایسے کئی اور اقدامات کئے گئے۔ ان میں نمایاں اقدام اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینا تھا جس سے مشرقی پاکستان میں بنگالی اکثریت میں شدید اشتعال پھیل گیا۔ سندھ میں فوجیوں اور پنجابیوں کو زمینوں کی الاٹمنٹ سے بلوچوں اور سندھیوں میں ناراضگی کا عنصر پھیل گیا اور نتیجتاً متاثرہ علاقوں میں ہمیشہ فوج کی موجودگی ناگزیر ہوگئی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی پاکستان ٹوٹنے پر منتج ہوئی۔ بلوچستان میں مرکز۔صوبہ کشیدگی مسلسل برقرار رہی اور گاہے بگاہے خطرناک سطح پر بھی پہنچتی رہی۔ مسائل کے حل کے لئے فوج ذرائع کا استعمال عموماً دانشمندانہ نہیں ہوتا۔

پاکستان میں دہشت گردی

11 ستمبر 2001ء کے دہشت گردی کے حملوں جن کا حکم القاعدہ نے دیا تھا کے باعث فلسفہ جہاد کا سپر پاور کے مفادات کے ساتھ براہ راست تصادم ہوا جس نے سعودی عرب کی مدد سے خود ہی اس فلسفے کی پرورش کی تھی۔ جنرل مشرف کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت کے فیصلے سے پاکستان تحریک طالبان اور اس کی اتحادی تنظیموں کی دہشت گردی سے دوچار ہوگیا۔ عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ دہشت گردی کی یہ کارروائیاں فوج اور انٹیلی جنس اداروں کے اندر خودسر عناصر......معدودے چند......کی مدد سے کی گئی۔ پاکستان میں تشدد سے لبریز سیاسی کلچر نمو پانے کے باعث کم از کم 35 ہزار پاکستانی اپنی زندگی سے محروم ہو گئے اور اس سے زیادہ

تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ ان میں فوج اور آئی ایس آئی کے اہلکار، گورنر پنجاب سلمان تاثیر اور وفاقی وزیر شہباز بھٹی بھی شامل ہیں۔ ریاست اور معاشرے کی ہر سطح پر جنونی جہادی گروپ اور سیل موجود نظر آتے ہیں۔ ان گروپوں پر کنٹرول پانے اور ان کو غیر مؤثر کرنے تک داخلی سطح پر دہشت گردی سے وہ دھماکہ خیز صورتحال پیدا ہو سکتی ہے جو وسیع تر تناظر میں پاکستان کیلئے بقا کا خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔

بیرونی سطح پر دہشت گردی

مبینہ طور پر پاکستان میں قائم گروپوں کی بیرون ملک دہشت گردی کے جرائم کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں حرکتہ المجاہدین، جیش محمد اور لشکر طیبہ کی طرف سے بھارت اور بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں حملے شامل ہیں۔ پاکستان نژاد امریکی اور برطانوی شہری دہشت گردی کے کئی حملوں میں ملوث رہے۔ کم از کم ایک واقعہ...... ممبئی میں 26 نومبر 2008ء کو حملے...... لشکر طیبہ کے ارکان کی سرگرمیوں کا ثبوت دینے کے لئے کافی ہے۔

امریکہ کو پاکستان میں چھپے القاعدہ اور افغان طالبان سے کافی تکالیف ہیں جو افغانستان میں امریکی فوجیوں کے خلاف کارروائی میں ملوث ہیں۔ شمالی وزیرستان میں قائم حقانی گروپ/ ملا عمر سمیت مطلوب افغان طالبان کی امریکی فہرست میں شامل ہے جنہیں گرفتار یا ہلاک کرنا امریکہ کا مطمح نظر ہے۔

یقیناً اسلامی جنگجوؤں میں انتہا پسندی کی پشت پناہی کرنے کی بڑی ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ امریکہ نے اپنا ایک سپاہی مروائے بغیر روسیوں کو افغانستان سے واپس دھکیل دیا اور یوں مشرقی یورپ میں کیونزم کو دفن ہونا پڑا۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے امریکہ نے خون میں ڈوبا سیاسی ورثہ پیچھے چھوڑا جس کے تحت ہر وہ شخص موت کا حقدار ہے جسے اسلام کا دشمن قرار دیا گیا ہو۔ یہ ورثہ رئیل ازم سکول آف انٹرنیشنل ریلیشنز کی طرف سے امن واستحکام کا فارمولا پیش کرنے میں بے مائیگی کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اس کے سوا ہتھیاروں، تباہ کن ہتھیاروں اور بے اصولی پر مبنی

ہتھیاروں کا تصور پایا جاتا ہے۔اب یہ اخلاقیات کے فلسفیوں،مؤرخین پر ہے کہ وہ اندازہ لگائیں کہ امریکہ نے سرد جنگ کے دوران خود کو لبرل کیپٹل ازم کا چیمپئن ثابت کرنے کیلئے جنوبی اسلام کی طاقت بڑھا کر دنیا کو کیا نقصان پہنچایا،اور یہ کہ دنیا پر چھائے اس کے طویل سایوں پر کیسے نظر رکھی جائے۔

مابعد سامراجی دور عسکری ریاست

تان تائی یونگ نے یہ کہا ہے کہ نو آبادیاتی دور کی ہندوستانی فوج کا بڑا حصہ پاکستان کو ورثے میں ملا۔سٹیفن کوہن نے قرار دیا ہے کہ پاکستان آرمی کی بھرتی زیادہ تر انہی علاقوں سے جاری رہی جو پاکستان کی کل آبادی کا تقریباً 9 فیصد ہے۔حال ہی میں شجاع نواز نے بتایا کہ فوجی بھرتی کا حلقہ اب وسیع ہو گیا ہے۔اگرچہ افسروں کی اکثریت اب بھی روایتی بھرتی والے علاقوں سے ہو رہی ہے۔اس کے علاوہ ''ضیا بھرتی'' وسطی پنجاب کے قدامت پسند اور جنوبی پنجاب کے بنیاد پرست علاقوں سے تعلق رکھتی ہے۔انہوں نے شبہ ظاہر کیا کہ ایسی فوج بالخصوص افسر طبقے کے اسلام پسند جہادی اقدار سے جلد متاثر ہونے کے خدشات زیادہ ہوں گے۔اس کے علاوہ جیسا کہ عائشہ صدیقہ بتاتی ہیں کہ فوج کا پاکستانی معیشت میں بھی نمایاں عمل دخل ہے۔اس کے علاوہ 1960ء کے عشرے میں امریکہ اور ورلڈ بنک سے ملنے والی امداد کو معیشت کی بہتری کیلئے استعمال میں نہیں لایا گیا۔اس کی بجائے پاکستانی قیادت نے 1965ء میں کشمیر میں مس ایڈونچر شروع کر دیا جس کا نتیجہ بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں نکلا۔اس وقت سے گاہے بگاہے پاکستان کی معیشت میں بہتری آتی رہی لیکن دہشت گردی،کرپشن،اور بدانتظامی نے اس عمل کو سخت نقصان پہنچایا۔ایسی صورتحال میں تعلیم یافتہ نوجوانوں نے مسلح افواج میں کیریئر بنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔چنانچہ سماجی،نظریاتی اور اقتصادی عوامل نے مل کر پاکستان ملٹری کو طمع کا حامل ادارہ بنا دیا۔ہیرالڈ لاس ویل نے زور دیا ہے کہ گیریژن سٹیٹ میں تشدد کے ماہرین بدستور بنیادی حیثیت کے حامل رہیں گے اور پاکستان میں اس کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔

البتہ لاس ویل کی بڑی دلیل یہ تھی کہ عسکری ریاست فرضی غیر ملکی جارحیت کے خوف کے نام پر پھلے پھولے گی...... وہ خوف جو تشدد کے ماہرین ریاست اور معاشرے پر اپنی سیاسی اور نظریاتی گرفت کے لئے استعمال کریں گے۔ ہماری کتاب میں اس پہلو پر تفصیلاً بات کی گئی ہے۔ لاس ویل نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ فوجی کلچر اور عسکری احساس تفاخر کے فروغ میں بڑا نقصان جمہوریت کا ہوتا ہے۔ جمہوریت اگر اپنا وجود برقرار رکھتی بھی ہے تو اس کی حیثیت نمائشی رہتی ہے۔ اس کی بجائے خوف کا کلچر فروغ پاتا ہے جسے اس کے تناسب سے زیادہ بڑھایا جاتا ہے یوں ایک کٹھ پتلی طبقہ وجود میں آتا ہے جو اپنی سلامتی اور بقا کے لئے ہمیشہ تشدد کے ماہرین کی طرف دیکھتا ہے۔ پاکستان کے معاملے میں ایسا بالکل سچ نظر آتا ہے۔

تاہم پاکستان میں جمہوریت کے مسئلے پر ایک نیا تھیس اس کتاب میں متعارف کرایا گیا ہے، جس میں یہ دلیل دی گئی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کے امکانات شروع سے ہی زیادہ روشن نہیں تھے۔ اہل سیاستدانوں کی کمی، نچلی سطح تک مقبول سیاسی پارٹی کی عدم موجودگی کے ساتھ محمد علی جناحؒ کی رحلت اور لیاقت علی خان کا قتل وہ عوامل تھے جنہوں نے جمہوریت کے لئے موافق ماحول نہ پیدا ہونے دیا۔ مغربی پاکستان کا طاقتور جاگیردار طبقہ اور مغربی پاکستان میں موجود قومی بورژوا چاہتے تھے کہ ریاست خود ہی مستحکم ہو اور پھلے پھولے۔ اس امر سے علوی صاحب کی ''اوور ڈویلپڈ سٹیٹ'' کی سماجی اساس فراہم ہوئی۔ اس کے ساتھ بلکہ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ یہ ابہام شروع سے ہی پایا جاتا تھا کہ پاکستان کیونکر وجود میں آیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے خصوصی ریاست کے طور پر قائم ہونے والی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اسلام اور ریاست کے درمیان تعلق زیادہ واضح نہیں رہ سکا۔ جناح کی طرف سے 11 اگست 1947ء کی فقید المثال تقریر جس میں مذہب اور ریاست کا تعلق ختم کرنے کی بات کی گئی تھی وہ ان کے قریبی ساتھیوں تک کو قائل نہ کر سکی۔ 7 مارچ 1949ء کو قرارداد مقاصد نے اسلام، ریاست اور شہریوں کے درمیان تعلق کا سانچہ فراہم کر دیا۔ اور یہ کہ اس قرارداد کی طرف سے اسلام پسند خدوخال ناگزیر نہیں تھے لیکن اس

بات کا اوپر بتائے گئے منفی عوامل کی روشنی میں قوی امکان تھا کہ ان کا اثر جمہوریت پر پڑے گا۔ نہایت شروع میں ہی ریاست کی مطلق العنان شکل ابھر کر سامنے آ گئی۔ غلام محمد اور سکندر مرزا جیسے طاقتور سول سرونٹس نے وزیراعظم کا کردار بے معنی بنا دیا جبکہ ایک اور سول سرونٹ چودھری محمد علی نے ایسا آئین تشکیل دیا جس میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ اور خدا کی رضا کو سپریم قرار دیا گیا۔ 1958ء کی فوجی بغاوت نے مطلق العنانیت کے عمل کو مکمل کر دیا۔ ایوب خان کے دور میں مطلق العنانیت جدت پسند، ضیاء الحق کے دور میں بنیاد پرست اور مشرف کے دور میں ''اعتدال پسند'' تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے تحت جمہوریت پر ان کی ذاتی آمرانہ اور خودسر سیاست کے باعث سمجھوتہ کیا گیا۔ آنے والے برسوں میں سویلین حکمرانوں کے مقابلے میں طاقت کا توازن فوج کے حق میں ہو گیا۔

عسکری ریاست کے نظریے میں غیر ملکی جارحیت کے خوف کی خصوصی حیثیت کو سیاستدانوں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ دونوں کی طرف سے زبردست حمایت حاصل ہوئی۔ یہ جناح تھے جنہوں نے امریکیوں کو دعوت دی کہ وہ پاکستان کو کمیونزم کے خلاف فرنٹ لائن ریاست کے طور پر استعمال کریں۔ ایوب خان نے اس حکمت عملی کو اضافی دلائل اور امریکی انتظامیہ کو قائل کرنے کی انتھک کوششوں سے مزید تقویت پہنچائی۔ لہذا...... حقیقی یا فرضی...... بیرونی جارحیت کا خوف بھارت کے خطرے اور افغانستان کے ساتھ کشیدہ تعلقات کے تناظر میں شروع سے ہی نمایاں رہا۔ سرد جنگ کے مخصوص تقاضوں اور بین الاقوامی نظام میں متحدہ چین آف کمانڈ اور امن کی کمی سے پیدا ہونے والی انارکی کو پاکستان کی حکمران اشرافیہ نے امریکی سرپرستی کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ پاکستان کے پاس جو اسلحہ تھا اس نے پاکستان میں ایک قسم کا جھوٹا احساس برتری پیدا کیا جو کئی مس ایڈونچرز کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ میکس ویبر کا یہ مشاہدہ کہ شروع کے مسلم معاشروں میں جنگجو طبقے اور ان کی اخلاقیات نے اقتدار کے ڈھانچے کی تشکیل کی جو پھر عسکریت پسندی کے کلچر کی تاریخی ہیئت کی صورت میں آگے بڑھی اور ضیا دور میں نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔

نام نہاد افغان جہاد نے پاکستانی سیاست میں فوج اور آئی ایس آئی کے عمل دخل میں زبردست اضافہ کر دیا۔ جس سے عسکری ریاست کو ایک سکیورٹی سٹیٹ (جس کی نیلسن پالمیئر مذمت کرتے ہیں) کے خدوخال اپنانے میں مدد ملی۔ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں جسے فوج نے اپنی خاص Preserve بنالیا ہے۔ چین اور سعودی عرب کی سرپرستی نے ترقی، انڈسٹری اور معیشت کے مسائل پر قابو پانے کیلئے اضافی وسائل فراہم کئے۔ ایسی تمام پیشرفت ہائے سے فوج مضبوط ہوئی اور اعلیٰ فوجی کمانڈروں کو پاکستانی سیاست میں عملاً ڈی فیکٹو ویٹو کی طاقت ملنے کی راہ ہموار ہوئی۔ یوں جدید صنعتی انفراسٹرکچر کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والی خرابیوں میں اتحاد سازی، ملک کی مخصوص سیاسی صورتحال اور نظریاتی جوڑتوڑ سے نوآبادیاتی نظام کے بعد کی عسکری ریاست کو دوام بخشا جو ''اسلام کے قلعے'' کا استعارہ ہے۔

مستقبل کی چند جھلکیاں

اوپر کی گئی بحث کی روشنی میں ہم پاکستان سے متعلق مستقبل میں ہونے والی بعض پیشرفت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

1: بھارت سے خطرہ

بھارت سے خطرے کا تاثر ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ مستقل ہے۔ جب تک باہمی اعتماد کا فقدان پایا جائے گا اس وقت تک بھارت کی عسکری بالادستی ہمیشہ خطرہ رہے گی جس کیلئے پاکستانی فوج کو مناسب ڈیٹرنٹ کی تیاری کرنا ہوگی۔ دوسری جانب یہ بات مشکوک ہے کہ کیا ''سٹرٹیجک گہرائی'' اس کا مناسب جواب ہے۔ کوئی بھی نام نہاد Strategic Depth اس حقیقت کو تبدیل نہیں کرسکتی کہ لاہور سمیت پنجاب کے بڑے قصبے اور شہر اس جگہ پر رہیں گے جہاں پر فی الوقت ہیں۔ یعنی سرحد کے بالکل قریب۔ ایسی منفی معروضی جغرافیائی حقیقت سے پیچھا چھڑانے کی امید بہت کم ہے۔ بھارت میں کوئی علاقہ فتح کر کے توسیع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں مہم جوئی کے معاملے میں دیکھنے میں آیا۔ اس کے علاوہ افغانستان میں بعض اقدامات

کے ذریعے وسط ایشیا تک توسیع کے خطرناک عزائم بھی قابل فہم نہیں۔

پاکستان بھارت کی طرف سے کسی بھی ایڈونچر کا توڑ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ایٹم بم اور میزائل ٹیکنالوجی ہمیں بھارت پر فتح پانے کی یقین دہانی نہیں کرا سکتے۔لیکن دونوں طرف یقینی تباہی ضرور آئے گی۔البتہ ایک طاقتور اور مضبوط ہمسایہ ہونے کا مطلب لازمی خطرہ نہیں ہوتا۔ کینیڈا کے بالکل ساتھ انتہائی طاقتور ملک امریکہ ہے۔اس طرح یورپ کی چھوٹی اقوام جیسا کہ آئرلینڈ، بلجیم اور ہالینڈ کی مثالیں موجود ہیں۔ برطانیہ اور فرانس ایٹمی طاقت کے حامل ملک ہیں جن کے درمیان چھوٹا سا سمندر رود بار انگلشیہ موجود ہے۔ان کے درمیان جنگوں کی طویل تاریخ موجود ہے۔لیکن اب یہ بہت قریبی اتحادی ہیں۔اگر بھارت اور پاکستان اپنے اختلافات دور اور تنازعات حل کرلیں تو دونوں کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی کا خطرہ کم ہو جائیگا۔اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر بھارت پاکستان کے ساتھ مسلح تصادم کا آغاز نہ بھی کرتا تو پاکستان کی سرحد کے قریب فوجی مشقوں، 1962 میں اس کی چین کے ساتھ جنگ کے بعد عسکری پالیسی اور 1974ء میں ایٹمی ہتھیار کے تجربے سے کشیدگی اور پاکستان میں خطرے کے احساس نے جنم لیا۔ اگرچہ بھارت کے یہ اقدامات چین کے خطرے کے تدارک کیلئے تھے لیکن اس بات سے پاکستان میں بھارت کے عزائم اور ارادوں سے متعلق کمی نہیں آئی۔ 1971ء میں بھارت کی فوجی مداخلت اور اس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہونے سے پاکستان کی حکمران اشرافیہ میں گردش کرنے والی پیشنگوئی پوری ہوگئی۔اس المیے نے پاکستان کی قومی نفسیات پر گہرے نشان چھوڑے جو اس حقیقت سے میل نہیں کھاتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والا بحران جمہوری اقدار اور حکومت سازی کا حق تسلیم کرنے میں پاکستانی سیاستدانوں اور فوج کی ناکامی کا نتیجہ تھا۔

دوسری جانب یہ بات درست ہے کہ پاکستان کی حکمران اشرافیہ بھارت سے خطرے کی آڑ میں مضبوط تر ہوئی۔ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ 1951ء میں امریکی ہتھیاروں کی پہلی کھیپ وصول کرنے سے پہلے پاکستان حقیقتاً بھارت سے تعلقات میں کمزور ترین پوزیشن میں تھا لیکن

بھارت نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ نہیں کیا۔ بالکل اس طرح 2009ء میں جب پاکستانی فوج سوات اور جنوبی وزیرستان میں آپریشن کر رہی تھی تو مشرقی سرحدوں پر پاکستانی فوجوں کی تعداد کم ترین سطح پر چلی گئی۔ البتہ دفتر خارجہ نے اس تاثر کی تردید کی۔ اس وقت فاٹا، سوات اور افغان سرحد کے ساتھ واقع حساس علاقوں میں سینکڑوں فوجی تعینات ہیں۔ اب بھی بھارت اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں نہیں نظر آتا۔ اس لئے بھارت سے لاحق خطرے کے مکمل تصور کو اس تناظر میں جانچنے کی ضرورت ہے۔ فرضی بھارتی عزائم کا اندازہ لگانے کیلئے خطرے اور خطرے کے تصور میں فرق کرنا اہم ہے۔ خطرے کے امکان کو آسانی کے ساتھ بڑھایا جا سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ فوج کی طرف سے قومی وسائل کے بڑے حصے کے استعمال کی صورت میں نکلے گا۔

صدر آئزن ہاور نے امریکہ کے فوجی۔ صنعتی کمپلیکس کے بہت زیادہ بااثر اور طاقتور ہونے سے خبردار کیا تھا، پاکستان میں یہ طاقت اور اثر ورسوخ کسی شک وشبے سے بالاتر ہے۔ البتہ عملی معنوں میں اس کا بہت زیادہ اثر ترقیاتی عمل پر پڑتا ہے حالانکہ پاکستان کو ترقی کی فوری ضرورت ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف خوراک، تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات سے صرف نظر کرنا پڑ رہا ہے بلکہ توانائی کے شعبے کے وسائل بھی متاثر ہو رہے ہیں اور اس وجہ سے مڈل اور لوئر مڈل کلاس میں سخت ناراضگی اور مایوسی پائی جاتی ہے۔

پاکستانی اور بھارتی اسٹیبلشمنٹ دونوں میں ایسی بصیرت اور جرات کا فقدان ہے جس کے تحت کشیدگی میں کمی کیلئے ٹھوس اقدامات کئے جا سکیں، امرتسر اور لاہور اس طرح مظفر آباد اور سری نگر کے درمیان بس سروس مفید اور اچھے اقدامات ہیں لیکن گزشتہ 65 سالوں کی بدگمانی کے خاتمے کیلئے مزید جراتمندی پر مبنی خیر سگالی کی ضرورت ہے۔ سیاچن کے مسئلے کے حل کے ذریعے دونوں ملک افرادی اور مادی نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ فی الوقت یہ محاذ دونوں ملکوں کے درمیان غالباً سب سے زیادہ بے کار مشق ہے۔

جنوبی ایشیا کی موجودہ اور مستقبل کی حقیقتیں سکیورٹی کے ایسے تصور کی متقاضی ہیں جو قومی سلامتی کی تشریح تک محدود نہ ہو۔ علاقائی اور انسانی سکیورٹی کو بھی اس میں شامل کیا جانا چاہیئے۔ ماحولیاتی آلودگی جس نے اب پوری دنیا کو لپیٹ میں لیا ہے اس سے جنوبی ایشیا بالخصوص متاثر ہو رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت سمیت خطے کے دیگر ملکوں کے درمیان پانی کے مسئلے، آبادی اور دیگر چیلنجوں سے نمٹنے کیلئے تعاون کے بغیر صنعتی اور معاشی نمو سے پیدا ہونے والے مسائل سے جنوبی ایشیا زبردست تباہی اور بربادی کا شکار ہو سکتا ہے۔

دونوں طرف خیر سگالی کا جذبہ بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ باہمی تعلقات کو گھنانے والی تمام بیماریوں کے علاج کیلئے اچھی ہمسائیگی والے تعلقات کو قبول کرنے کی جرات اور عزم کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ کشمیر کا مسئلہ ناقابل حل نہیں۔ یہی وہ تصادم کی علامت ہے جو فوجی مسابقت کے ذریعے وسائل کے ضیاع کا باعث ہے۔ اسے امید اور خوش امیدی کی علامت بھی بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بہرحال باہمی تعاون اور برداشت کرنے کی سب سے اچھی مثال سندھ طاس کا آبی معاہدہ ہے۔ جو اتنے سالوں بعد بھی دونوں ملکوں کے درمیان پانی کی تقسیم کا ذریعہ ہے۔ حالیہ برسوں کے دوران پاکستان اور بھارت کے مابین کئی تنازعات نے سر اٹھایا لیکن فریقین نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بین الاقوامی ثالثی کو آواز دی اور اس کے فیصلوں کو تسلیم کیا۔ تنازعہ کشمیر درحقیقت آبی۔ سیاسی مسئلہ Hydro-political ہے۔ اس کے حل کی کوئی صورت نہیں۔ یہ دراصل سٹیٹس کو برقرار رکھنے کا معاملہ ہے جس کے دوران دونوں ملک ایک دوسرے کو رعایتیں اور فائدے دے سکتے ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پاک بھارت تعلقات میں مصالحت کی موجودہ روح صفر سے آغاز کر کے جیت۔ جیت کے فارمولے کی راہ میں رکاوٹ دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ کنٹرول لائن بین الاقوامی سرحد بن سکتی ہے لیکن یہ محض علامتی ہونی چاہیئے اور کشمیر کے دونوں طرف ہندو، مسلم، بودھ، سکھ اور دیگر باشندے پوری آزادی کے ساتھ آرپار جانے چاہیئں۔ بین

الاقوامی معیشت بین الاقوامی سرحدوں کو ناقابل عبور رکاوٹیں اور قصہ پارینہ قرار دیتی ہے۔ سارک کا فریم ورک باہمی طور پر مفید تجارت کے فروغ کیلئے موجود ہے جس سے دولت اور خوشحالی آ سکتی ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ اس موقع سے سنجیدگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ 2004 کی اسلام آباد سربراہ کانفرنس کے بعد سے پاک بھارت تعلقات تعمیری انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ 26 نومبر 2008ء کے ممبئی حملوں کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنوبی ایشیا کے لوگ محنتی، ہنر منداور کاروباری ہیں اور ثقافتی تنوع اور دانش جو تاریخی پہلو کی حامل ہے کے ساتھ اچھی ہمسائیگی کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں اور دوستی اور یکجہتی پر مبنی تعلقات کو فروغ مل سکتا ہے۔ پاکستانی اور بھارتی قیادت کو ماضی کی تلخیوں سے پیچھا چھڑانے اور اپنے عوام کے مفاد کیلئے جرات کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اگر بھارت اور پاکستان ایسا تجارتی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس سے دونوں کو فائدہ ہو تو فوائد بے بہا ہوں گے۔ بنگلہ دیش اور بھارت نے حال ہی میں مشترکہ صنعتی منصوبے، بالخصوص پٹ سن کے شعبے میں، شروع کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ اسی قسم کے منصوبے بھارت اور پاکستان بھی شروع کر سکتے ہیں جس سے پاکستان کو کافی فائدہ یقینی ہوگا۔

2: افغانستان

جنوبی ایشیا میں ڈرامائی تبدیلی افغانستان سے امریکی اور نیٹو افواج کا انخلا ہے۔ یہ انخلا 2014 کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔ کم از کم صدر اوبامہ کی اعلانیہ پالیسی یہی ہے۔ البتہ یہ بات واضح نہیں کہ امریکی 1989ء کی طرح ایک دم سے اس خطے سے نکل جائیں گے۔ (نوٹ کتاب پہلے لکھی گئی ہے۔ امریکہ نے اس دوران افغانستان میں کچھ تعداد میں فوج تعینات رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، مترجم)۔ اب کی بار امریکہ کو یہ یقینی بنانا ہوگا کہ طالبان کابل میں دوبارہ واپس نہ آ جائیں۔ البتہ ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی اور افغانستان میں نیٹو۔ امریکہ کے بعد کی صورتحال مبہم اور پر تشدد رہے گی۔ اگر کابل میں مغرب نواز حکومت کا خاتمہ ہوتا ہے تو افغانستان میں پھر سے خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں پاکستان اور بھارت بھی تنازعے سے

لاتعلق نہیں رہیں گے، لیکن اگر یہ فائدہ نقصان کی حکمت عملی چھوڑ دیں جس کا اب تک انہوں نے افغانستان میں مظاہرہ کیا ہے تو دونوں ملک افغانستان کی اعتدال پسند حکومت قائم ہونے میں مدد کر سکتے ہیں۔

ایسی صورتحال میں پاکستان جائز طور پر یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ ڈیورنڈ لائن کو دونوں ملکوں کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیا جائے۔ یہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحدوں کی حد بندی کے کام کا نقطہء آغاز ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں بھارت اور امریکہ افغانستان کو یہ قائل کرنے میں بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں کہ ڈیورنڈ لائن کو باضابطہ سرحد تسلیم کرنے سے سرحد پر آباد قبائلیوں کی دونوں طرف آمدورفت متاثر نہیں ہوگی۔ بلکہ افغانستان کو زیادہ فائدہ ہوگا کیونکہ جنوبی اور وسطی ایشیا کے درمیان تجارت بڑھے گی۔ ایسا اس لئے ہوگا اگر بین الاقوامی سرحد سٹیٹ اتھارٹی کی علامت بن جائے اور دونوں طرف عوام کی آمدورفت بھی متاثر نہ ہو۔ دیگر الفاظ میں نام نہاد ''افپاک'' خطے میں حالات معمول پر آنے اور امن کے قیام کا مطلب وسیع تناظر میں پاکستان اور بھارت کے درمیان حالات معمول پر آنا ہے۔

3: بیرونی عوامل پر انحصار

اگرچہ پاکستان کے انحصار پر حتمی بات کرنا ابھی باقی ہے لیکن مجموعی طور پر امریکہ، چین اور سعودی عرب کی سرپرستی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مطلوب ہی نہیں۔ سقوط سوویت یونین کے بعد پاکستان کا فرنٹ لائن ریاست کا کردار مزید درکار نہیں تھا اور موجودہ تعلقات ڈانواں ڈول ہیں اور القاعدہ کے خطرے کے خاتمے کیلئے اسے پاکستان کو استعمال کرنے کی مزید ضرورت نہیں۔ اس وقت امریکہ کی حمایت محدود اور مشروط ہے اور اس میں تعزیرات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ اور مغرب کو بالعموم پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے حوالے سے بھی تشویش ہے۔ طالبان قسم کی بغاوت یا چند سرکش جرنلوں کی طرف سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے اعلان کا جواب مغرب پیشگی کارروائی کی صورت میں دے گا۔ یہ بات اہم ہے کہ پاکستان ایٹمی

سرزمین پر انتہا پسندی اور دہشت گردی سے نمٹ رہا ہے اور بین الاقوامی قوانین کے معیارات اور روایات پر عمل کرتے ہوئے اسلام یا پاکستان کے دشمنوں کی حقیقی یا فرضی سازشوں سے لاتعلقی اختیار کرے۔ دوسری طرف امریکہ کے ساتھ دوستانہ اور اچھے مراسم برقرار رکھنا پاکستان کے مفاد میں ہوگا۔ پاکستان کو جنوبی ایشیا کے ترقی پسند ملک کے طور پر جدید اور ترقی یافتہ بنانے کے لئے امریکہ کا معاشی اور تعلیمی تعاون ضروری ہے۔

اسلام پسندی اور بھارت کے خطرے کی چینی خارجہ پالیسی میں موجودگی تک چین بھی تعاون جاری رکھے گا۔ دوسری جانب اگر چین اور بھارت اپنے تعلقات بہتر بنا لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان چین کی حمایت سے محروم ہو جائے گا۔ بلکہ پاکستان ان دونوں ملکوں کے درمیان پل کا کام کرسکتا ہے۔ چین بھارت سے نمٹنے کیلئے ہمیشہ پاکستان کی حمایت کرے گا۔ لیکن اس بات کا امکان نہیں کہ وہ پاکستانی فوج کے کشمیر یا کسی اور جگہ مس ایڈونچر کی حمایت کرے گا۔

سعودی عرب کا اثر ورسوخ نظریاتی طور پر نہایت غالب ہے اور اس کا ایک معاشی پہلو بھی ہے۔ سعودی عرب یا دیگر خلیجی ریاستوں میں پرکشش عہدوں پر تعیناتی...... بحثیت مجموعی اس تعلق نے پاکستان میں پائی جانے والی چھوٹی سی جمہوری جدت پسندی کو نقصان پہنچایا ہے اور یہ تعلق مستقبل میں بھی ضرررساں ہوگا۔ 2011 کے ''عرب سپرنگ'' نے عرب ملکوں میں جمہوریت کے فروغ کے حوالے سے امید کی شمع روشن کی ہے۔ جب تک ایران اور سعودی عرب جیسی دولتمند ریاستیں اسلامی دنیا کی اپنی طرز کی فرقہ وارانہ قیادت کیلئے بے انتہا دولت کا استعمال کرتی رہیں گی اس وقت تک جمہوری جدوجہد کو دہشت گرد ملیشیاؤں اور انتہا پسندانہ پراپیگنڈے کے ذریعے خطرات لاحق رہیں گے۔

4: فوج کا کردار

آنے والے مہینوں اور سالوں میں پاکستان کی سمت کا انحصار فوج کے کردار پر ہوگا۔ یہ ملک کا سب سے طاقتور ادارہ رہا ہے اور ماضی سے ناتا توڑنے کیلئے اسے خود تنقیدی کا سنجیدگی کے

ساتھ آغاز کرنا پڑے گا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قومی اور ریاستی سکیورٹی کے حوالے سے فوج یکا وتنہا کردار ادا کرتی رہے گی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ مسئلہ یہ نہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کا راستہ فوجی بغاوتوں کے ذریعے روکا گیا ہے، سیاسی طبقہ ہمیشہ جمہوریت کے لئے پرعزم رہا ہے۔ جس کا معاصر معنوں میں مطلب اہم قومی امور پر منتخب نمائندوں کو فیصلہ سازی کا اختیار دینا ہے۔ اس کا مطلب صرف اکثریت کی حکمرانی اور اقلیت کے حقوق نہیں بلکہ افراد، بلاتفریق جنس انسانی حقوق کا تحفظ اور شہریوں میں عدم تفریق روا رکھنا ہے۔ یہ وہ اساس نہیں جس پر پاکستانی سیاستدانوں نے سیاست کی۔ اسی طرح فوج کا جمہوری تصور یہ رہا ہے کہ ایسی طاقتور انتظامیہ ہو جو صدر کے مطلق العنان اختیارات کے ماتحت کام کرے۔ ان حالات میں جمہوریت اور بنیادی پرستی کے خاتمے کے لئے ایک مفصل مباحثے کی ضرورت ہے اور قانون کی حکمرانی یقینی بنانے کے ساتھ ایک عملی، روشن خیال اور قانون کی حکمرانی اور بین الاقوامی قوانین سے ہم آہنگ فارمولہ بنانے کی بھی ضرورت ہے۔

پاکستان کو درپیش مسائل میں سب سے گمبھیر مسئلہ کرپشن، دگرگوں معیشت اور ملک کے طول وعرض میں پھیلی سماجی اور معاشی ناہمواری ہے۔ حکمران طبقہ بالخصوص جاگیردار طبقہ ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ ایک غریب ملک کے دفاعی اخراجات بہت زیادہ ہیں لیکن اس سے ترقیاتی عمل متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ غربت نے پاکستان کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ حیران کن نہیں کہ جہادی عناصر غریب نوجوانوں کو ترغیب دیں۔ سب سے زیادہ خود کش بمبار معاشرے کے سب سے محروم طبقے سے آئے ہیں۔ یہ بھی حیران کن نہیں کہ ان کی اکثریت خیبر ختونخوا کے قبائلی علاقوں سے آتی ہے جبکہ جنوبی پنجاب بھی دہشت گرد تنظیموں کی بھرتی کا مرکز ہے۔ پاکستان گزشتہ 30 سال سے جس دلدل میں پھنسا ہے اس سے نکلنے کے لئے اسے سماجی اور اقتصادی ترقی کو ترجیح دینا ہوگی۔

خلاصہ

یہ کتاب پاکستان کے نو آبادیاتی نظام کے بعد بطور گیریژن سٹیٹ یا عسکری ریاست کردار کو اجاگر کرتی ہے۔ ''اسلام کے قلعے'' کی رنگین تصویر انتہائی پیچیدہ تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، نظریاتی اور عسکری سکیورٹی عوامل کا شاخسانہ ہے۔ ایسے عوامل نے پاکستان کے سیاسی ارتقا پر ایک ایسی اکثریت والی ریاست کے طور پر اثر ڈالا ہے جو سرد جنگ کے تناظر میں طوائف الملوکی پر مبنی سیاسی نظام، کشیدگی سے معمور جنوبی ایشیا اور نظریاتی زیادتیوں سے لبریز اندرونی حالات سے متاثر ہے۔ ایسے حالات میں پاکستان نے عسکری ریاست کے وہ خدوخال حاصل کر لئے ہیں جو 1940ء کی دہائی میں ہیرالڈ لاس ویل نے بتائے تھے۔ البتہ بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی یا پیداوار اور معیشت پر کنٹرول سے وجود میں آنے کی بجائے یہ عسکری ریاست بیرونی دشمن سے بقا کے خطرے سے دوچار ہے۔ عسکری اور سیاسی دونوں طرح کا حکمران طبقہ غیر ملکی امداد سے ملک کی ترقی کے عمل پر سمجھوتہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں صنعتی پسماندگی سے عبارت رکاوٹوں کے باعث پاکستان ایک عسکری ریاست کے طور پر ابھر سکتا ہے۔ لہٰذا پاکستان نو آبادیاتی نظام کے بعد ایک ایسی عسکری ریاست بنا جس کے سخت گیر رہنما اور ان کے حامی ''اسلام کے قلعے'' کے رومانس میں مبتلا ہیں۔

تاہم...... حتیٰ کہ پاکستان کے حکمران طبقے کی طرف سے بین الاقوامی نظام میں پائی جانے والے سقم کو کامیابی سے استعمال کیا گیا۔ ایک غریب طرز حکمرانی والے ملک سے ایٹمی صلاحیت کے حامل درمیانی طاقت کے ملک تک اس کی طاقتور ڈونر ممالک کے دباؤ کے سامنے آشکار ہونے سے اس کی سالمیت پر کئی پہلوؤں سے سمجھوتہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی تحریک کی جڑیں ملک کے اندر ہیں لیکن اس سوچ کے فروغ میں غیر ملکی امداد اور پراپیگنڈے نے بھی کافی ہاتھ ڈالا۔ چنانچہ بدترین غربت اور ناخواندگی نے اب بھی معاشرے کے بڑے طبقے کو جکڑ رکھا ہے۔

ریاست اندرونی سطح پر اپنا کنٹرول کھوتی نظر آتی ہے کیونکہ جنونی عناصر جہاں چاہتے ہیں ہدف بناتے ہیں۔ پاکستان کی عالمگیر دہشت گردی کے مرکز اور خودسر ریاست کے طور پر شہرت برقرار رہے۔ پاکستان سے باہر دہشت گردی کا ایک اور حملہ پاکستان کی سکیورٹی اور بقا کے لئے خطرناک صورتحال پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات اہم ہے کہ پاکستان کی اقتدار کی مساوات کے سٹیک ہولڈرز...... خصوصاً فوج...... ایسی طویل المدت اور دیرپا پالیسی اور سٹریٹیجی تشکیل دیں جو امن واستحکام اور خوشحالی کی پیامبر بن سکے اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے میں معاون ثابت ہو...... اور اس طرح ہمسایہ ممالک بھی ایسے جذبے کا مظاہرہ کریں۔

PAKISTAN THE GARRISON STATE:
Origins, Evolution, Consequences (1947-2011)

(PAKISTAN ASKARI RIYASAT:
IBTEDA, IRTIQA AUR NATAEJ 1947-2011)

Ishtiaq Ahmed
Urdu translation: M. Vaseem

Publisher: **Mashal Books**
RB-5, Second Floor,
Awami Complex, Usman Block, New Garden Town,
Lahore-54600, Pakistan.

Telephone & Fax: 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

Printers: EPH Printers, Lahore.

Price Rs: 990/-

Mashal is a small organization dedicated to the publishing of books on social, cultural and developmental themes of contemporary relevance. Trends in modern thought, human rights, the role of women in development, issues of governance, environmental problems, education and health, popular science, drugs and creative literature relating to these and other themes are the focus of Mashal's programme.

While Mashal works for the widest dissemination of its publications, it is a non-commercial and non-profit enterprise. Mashal therefore seeks the support of individuals and aid giving agencies worldwide which consider the foregoing objectives worthy of promotion.

مشعل معاشرتی، معاشی اور ثقافتی امور اور عہد حاضر سے متعلق ترقیاتی موضوع پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ جدید فکری رجحانات، انسانی حقوق، بہتر نظم و نسق، ترقی میں خواتین کے کردار، ماحولیات اور قومی و عالمی تخلیقی ادب مشعل کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔

مشعل کی کوشش ہے کہ اس کی مطبوعات وسیع پیمانے پر دستیاب ہوں۔ یہ ایک غیر تجارتی اور غیر نفع مند ادارہ ہے۔ چنانچہ مشعل ایسے پاکستانی اور غیر ملکی اداروں اور افراد سے امداد کا خواہاں ہے جو مشعل کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔

مشعل بکس

فہرست کتب

سماجی مسائل (Social Issues)

اسلامی ریاست کا خواب	طارق فتح	760/-
جام اور خنجر	ریان آئسلر	580/-
تصور عدل	امرتیا سین	750/-
تشخص اور تشدد	امرتیا سین	250/-
دشمن کی تلاش	ضیاء میاں	150/-
Making Enemies: Pakistan 's Crises of State and Society	تالیف: ضیاء میاں اور افتخار احمد	200/-
پاکستان ہندوستان ایٹمی امن ریڈر	ترجمہ: مصطفیٰ نزیر احمد	200/-
Pakistan India Nuclear Peace Reader	(Collection of Articles)	200/-
قرآن کے بنیادی موضوعات	ڈاکٹر فضل الرحمٰن	320/-
اسلام اور جدیدیت	ڈاکٹر فضل الرحمٰن	320/-
پولیس شہری معاشرے کا اہم بازو	شفقت تنویر مرزا	400/-

سیاست (Politics)

پاکستان برادری ازم، سیاست اور سرپرستی	اناطول لیوین	80/-
افغانستان ۔ بھارت کی مداخلت	ڈینیل نارفوک	100/-
پاکستانی میڈیا اور مذہبی مباحث	خالد احمد، ڈاکٹر مہدی حسن	140/-
دیوانگی کے بیچ فرزانگی	تری دیویش مائنی	360/-

جنوبی ایشیا میں اقلیتوں کے حقوق	ریتا منچندا	360/-
جنوبی ایشیائی بحران: رجحانات اور متوقع نتائج	تالیف: مائیکل کریپان اور نیٹ کوہن	380/-
پاکستان کی جنگ	(مجموعہ)	400/-
بلوچ قوم پرستی اور توانائی کی سیاست	رابرٹ جی۔ ورسنگ	160/-
پاکستان کا مستقبل	سٹیفن پی۔ کوہن	220/-
مذہب گروہی تعلقات اور تنازعہ کشمیر	یوگندر سکند	300/-
اچھی اور بری حکومت	جیف ملکن	460/-
ایٹم بم کی دہشت	جوزف سورن سی آنی	230/-
علم کی سلطنت	ونے لال	400/-
اسلامی ریاست ۔ جواز کی تلاش	شہرام اکبرزادے	170/-
بھارت میں ہندو مسلم محاذ آرائی	تالیف: محمد اشفاق خان	300/-
ہندوستان میں فرقہ فرستی اور اس کا جواب	اصغر علی انجینئر	400/-

جنرل (General)

اسلام تشدد پسندی کے بغیر	مصطفیٰ اکیول	600/-
ابن بطوطہ کے ملک کل اور آج	تالیف: مائیکل ایلیٹ	280/-
مسلم ذہن اسلامی شعور کی تفہیم	ریاض احمد	640/-
ملتان گزیٹئر 1947ء	شفقت تنویر مرزا	460/-
تہذیبوں کی کایا کلپ	کیرن آرمسٹرانگ	500/-
The Evolution of Devolution	(Newspaper Articles)	300/-
Earthquake	Faisal Awan	200/-
زلزلہ	فیصل اعوان	200/-
ایناٹومی	ڈاکٹر خالد سہیل	140/-
[illegible]	کیرن آرمسٹرانگ	340/-
لفظوں کی [illegible]	خالد احمد	360/-

صحت (General Health)

الزائمر کو پسپا کرنا	ڈاکٹر جیرلڈ ویورنک	100/-
موت کے سامنے (کینسر سے مقابلہ کرنے والی خاتون کی آپ بیتی)	سینڈرا اسٹین گریبر	250/-
حمل اور بچے کی پیدائش	وائی ایم سالمن	250/-
بچے اور صحت	ڈاکٹر ایچ ایل ٹین	200/-
فیملی ڈاکٹر	ڈاکٹر ابرار احمد	200/-
ایچ آئی وی ایڈز	ایلزبتھ ریڈ	150/-
فرسٹ ایڈ	ڈاکٹر ابرار احمد	250/-

سائنس (Science)

الہ دین کا چراغ: مغربی سائنس کو مسلمانوں کی دین	جون فریلی	680/-
طاقت کا سراب	عبدالحمید نیّر	800/-

ماحولیات اور ترقیات (Environment & Development)

تباہ شدہ تہذیبیں	جیرڈ ڈائمنڈ	450/-
تیل اور گیس خاتمہ قریب ہے ...	جیریمی لیگٹ	300/-
ماحولیات کی رپورٹنگ صحافیوں کے لیے	جرنلسٹ ہینڈ بک	120/-
ماحولیات قانون اور ہم	ش فرخ	110/-
جال	جیمز گولڈ سمتھ	85/-

خواتین اور ان کے مسائل (Women Issues)

تحریکِ نسواں: ثقافت، موضوعیت اور نمائندگی	جسبیر جین	500/-
امن کی سیاست میں خواتین کا کردار	پاولا بینرجی	540/-
شہرزاد مغرب میں (تجزیہ)	فاطمہ مرنیسی	400/-
پاکستان کی فعال خواتین: فصیلوں کے ادھر	ش۔ فرخ	250/-

میرے بچے میری دولت	تالیف: ڈیبی ٹیلر	250/-
گھر کے اندر گھر کے باہر	بوثائنہ شعبان	200/-

تعلیم (Education)

عالمی ثقافت کی لغت	کے اے انتھونی اپیا	450/-
An Introduction to Reporting in Pakistan	Frank Jossi	90/-

جہاد اور عسکریت پسندی (Jehad & Militancy)

گرہ کھلتی ہے: جہاد کے دور کا پاکستان	جان آرشمٹ	600/-
القاعدہ کا دوسرا روپ	کامل طویل	130/-
اسامہ کی تلاش	پیٹر ایل برگن	440/-
جہادی استدلال	جون کیلزے	440/-
کائناتی جنگ کیسے جیتی جائے؟	رضا اصلان	400/-
30 سالہ کشمکش: افغانستان میں حکومت مخالف مزاحمت 1978-2011	ڈاکٹر انتونیو گسٹیزی	300/-
غربت اور دہشت گردی؟	ایلن بی کروگر	190/-
دہشت کے بعد	اکبر احمد	280/-
The Fluttering Flag of Jehad	Amir Mir	700/-
A to Z of Jehadi Organization in Pakistan	Amir Rana	800/-

فلسفہ اور نفسیات (Philosophy & Psychology)

والتئیر	قاضی جاوید	200/-
روسو	قاضی جاوید	200/-

کرداری علوم (Behavioural Sciences)

اپنی طاقت پہچانو	انتھونی رابنز	300/-

ٹھنڈے دل سے سوچئے	ہائی رچلس	350/-
مقدر بنانے کے خواب	انتھونی رابنز	220/-

تاریخ (History)

امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں 1776 سے 2003 تک	مائیکل بی اورن	900/-
طویل بٹوارہ اور جدید جنوبی ایشیا کی تشکیل	وزیرہ فضیلہ یعقوب علی زمیندار	600/-
تقسیم ہند: واقعات، حکمت عملی اور تیاری	مشیر الحسن	800/-
منقسم قوم کی وراثت: آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمان	مشیر الحسن	600/-
اسطور کی تاریخ	کیرن آرمسٹرانگ	180/-
ہندوستان کے مسلمان	امت پانڈیا	200/-

معاشیات (Economics)

معاشی تکون کا نچلا حصہ	سی کے پرہلاد	300/-
قوموں کی اصل دولت	ریان آئسلر	340/-
کلچر اور کاروبار جاپان میں	شوجی ہایاشی	200/-

ناول (Fiction)

کورین

زندگی سے نجات	(کورین ناول)	یونگ ہاکم	260/-
بونا آدمی	(کورین ناول)	چوسے ہوئی	300/-
ڈوبتے سورج کی تصویر	(کورین کہانیاں)	وان سو پارک	270/-
سنہری ققنس	(کورین افسانے)	سوہ جی مون	240/-
جھلستے دنوں کے خواب	(کورین ناول)	کورین خواتین افسانہ نگار	180/-

انڈین

شکستہ ستون پر دھوپ	(انڈین)	عطیہ حسین	400/-

حویلی کے اندر	(انڈین)	رمہ مہتا	210/-
سچ کہانیاں	(انڈین)	تالیف: کالی پریس	250/-

جاپانی

چار ناولٹ	(جاپانی)	کنزابورواوے	200/-
اعتراف	(جاپانی)	فیومیونیوا	320/-
موسم گل	(جاپانی)	این سی کارور	250/-
کالی بارش	(جاپانی)	ماسوجی۔ایبوسے	200/-
برما کا ستار	(جاپانی)	مچیوٹا کی یامہ	200/-
چوبیس آنکھیں	(جاپانی)	ساکئی سوبئی	200/-
خاموشی	(جاپانی)	سوشاکواینڈو	200/-
شجر گلنار	(جاپانی)	شاکوکیزاکی	200/-
بے موسم کا پھول	(جاپانی)	لین ڈنلپ	200/-
جدید جاپانی افسانے	(جاپانی)	وین سی۔ گیسل	200/-
نہتے سپاہی	(جاپانی)	کیجی ناکازاوا	120/-

بنگلہ دیشی

طوفان	(بنگلہ دیشی)	سلینہ حسین	200/-
دریا بی بی	(بنگلہ دیشی)	شوکت عثمان	200/-

انڈونیشی

بے منزل راستہ	(انڈونیشی)	مختار لیوبس	200/-
دکھ درد کے جزیرے	(انڈونیشی)	پرمودیہ آنندطور	250/-
دھرتی کے دکھ	(انڈونیشی)	پرمودیہ آنندطور	230/-

تھائی لینڈ

سپنوں کی موت	(تھائی لینڈ)	کھمان کھون کھائی	200/-
ساون دیس	(تھائی لینڈ)	پیرا سدھم	200/-

تائیوانی

جنگ کے دکھڑے	(تائیوانی)	باؤنن	200/-
قصائی کی بیوی	(تائیوانی)	لی آنگ	200/-

دیگر ممالک

کامروپ کی کہانی	(آسامی ناول)	ڈاکٹر اندرا گوسوامی	200/-
خون خاک نشیناں	(ویت نامی)	ڈونگ تھو ہاؤنگ	200/-
کانٹوں کی کھیتی	(ملائیشیا)	شانن احمد	200/-
بیراگ	(سری لنکا)	مارٹین وکرم سنگھ	250/-
بکھرتی دنیا	(افریقہ)	چنوا اچیبے	200/-
آگ کی دہلیز	(جنوب مشرقی ایشیا)	ٹریور کرولن	200/-
ادھورے مرد	(چائنا)	یانگ ینگ لنگ	125/-
میری انطونیا	(امریکن)	ترجمہ: قاضی جاوید	200/-
ابابیل	(مراکش)	لیلیٰ ابوزید	200/-

بچوں کی کہانیاں (Children)

ندیدی گائے	(جاپانی)	ترجمہ: چی زورو جاوید	100/-
شیر پر مرغا	(جاپانی)	ترجمہ: چی زورو جاوید	150/-
سفید گھوڑا	(جاپانی)	ترجمہ: چی زورو جاوید	150/-

Mashal Books

RB-5, Second Floor, Awami Complex, Usman Block,

New Garden Town Lahore-54600, Pakistan.

Telephone & Fax: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

پاکستان۔ عسکری ریاست

ابتدا، ارتقا اور نتائج (1947-2011)

اس تحقیقی کتاب میں ایک معمہ حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے: 1947ء میں آزادی کے وقت پاکستانی فوج کے پاس اسلحے کی کمی تھی اور ریاست کے مؤثر عضو کے طور پر کام کرنے کے لئے اسے انفراسٹرکچر اور ٹریننگ کی ضرورت تھی۔ وہ سیاست میں براہ راست ملوث نہیں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ فوج نہ صرف ایٹمی صلاحیت کی حامل درمیانی سطح کی قوت بن گئی بلکہ یہ ملک کا ایسا طاقتور ادارہ بھی بن گیا جس کے پاس سیاست کے معاملات میں ''ویٹو'' پاور بھی آ گئی۔ ایسا 'کیسے' اور 'کیوں' ہوا اور اس کے نتائج 'کیا' ہوئے؟۔ اس کا کھوج پاکستان کو لاحق حقیقی اور تصوراتی خطرات اور بین الاقوامی سیاست کی نوعیت کے ملغوبے میں ملتا ہے۔ جس کے تحت پاکستان کے فوجی اور سول دونوں قسم کے حکمرانوں نے پاکستان کو فرنٹ لائن ریاست کے طور پر پیش کر کے امریکی حکومت کو اس کے حریف روس کے مقابلے میں ایکسپلائٹ کیا۔ اس کا مقصد بھارت کے مقابلے میں اسلحے اور وسائل کے حصول کی امید تھی۔

ڈاکٹر اشتیاق احمد سیاسی علوم کے استاد ہیں، آپ نے اسٹاک ہام یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ڈاکٹریت کی ہے۔ آپ کئی سال اسٹاک ہام یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے ہیں، آپ تین سال سنگاپور یونیورسٹی کے شعبہ جنوبی ایشیا میں وزٹنگ پروفیسر رہے۔ آج کل آپ جی سی یونیورسٹی لاہور میں وزٹنگ پروفیسر ہیں۔ اس سے پہلے لمز (LUMS) میں بھی وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے ہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، پنجاب کی تقسیم پر آپ کی کتاب اس موضوع پر سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

مشعل بکس
mashbks@brain.net.pk
Ph: 042-35866859

پاکستان - عسکری ریاست

ابتدا، ارتقا اور نتائج (1947-2011)

ڈاکٹر اشتیاق احمد

ترجمہ: ایم وسیم

مشعل

پڙهندڙ نَسُل ـ پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڇوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بـہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعوىٰ ڪري ٿـو تـہ پَڪَ ڄاڻو تـہ اُهو ڪُـوڙو آهـي. نـہ ئـي وري پَـنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪـڏهن ڪـو اهـڙي ڪوشش ڪـري ٿو تـہ پَڪَ ڄاڻو تـہ اُهو بِہ ڪُوڙو آهي.

جهڙيءَ طَرَح وڻـن جا پَـنَ ساوا، ڳاڙها، نيـرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرنـدڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهنـدڙ يـا وِڙهنـدڙ ۽ پڙهنـدڙ بـہ ٿـي سگهـن ٿـا. ٻيـن لفظن ۾ پَـنَ ڪا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نـہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تـہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پـر ممڪـن آهـي تـہ ڪـي ڪـم اُجرتـي بنيـادن تـي بـہ ٿِيـن. اهـڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَبِئي جي مـدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيِٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَمَلَ مـان ڪـو بـہ مـالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ ڪان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مـان جيڪـڏهن ڪـو پيسا ڪمـائي سگهـي ٿو تـہ ڀلي ڪمـائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٺاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالههَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَمر- گولو،
جيکي بہ ڪٽين، جيکي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄڪلهہ ڪي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۾ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽتر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)